

نوجوانوں کی زندگی

سینئر ڈائجسٹ

ماہنامہ

جولائی 2013

نوجوانوں کی
معلوماتی

پاک سوسائٹی

www.paksociety.com

www.paksociety.com



من مائی کرنے والے ایک
نادان کی خوش فہمیاں



آپ کے ہاتھوں کی ایک نغمہ نگار
آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ



سینس کی شائستہ قارئین کی تحفہ
شیر باتیں نگاروں کے لیے خوش مشورے



خواہشوں کے جنگل میں ایک
صاحب دانش کی حقیر سی آرزو



پُر جوش قفسار پر کرنے والی لڑکی
اور ایک ستم زدہ عورت کی پیتا



گل نظار سے رہ چننا ایک
مسافر بے نوا کی روداد حیات



گھر کو گھر بنانے اور رشتوں کی
اساس کو واضح کرتی ایک شاہکار کہانی



ماضی کا آئینہ اختیار اور اختیار انسانوں
کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات



کسی کے عشق پر اپنی ذات کو مٹانے والے
ایک بچے عاشق کا قصہ



کٹھن آزمائشوں میں پورا اترنے
والے ایک اور معتبر ولی کا قصہ



خوابوں کے منظر میں حقیقی
پناہ کی متلاشی ایک حسینہ کی سادگی



اسرار اور تحیر کے پردے میں
پیدا ایک منفرد طویل سلسلہ



جذباتی بھونچال، سرکش موجوں کے
درمیان ٹھوپانے والے رشتوں کی داستان



محبت اور سریر کا
ایک دلچسپ سنگم



ستہ دام آنے والے ایک
بلند پرواز پیچھی کی روداد



محبت کی راکھ میں سلگتے
حبذبات کی کارفرمایاں

آئیڈیل بلیک لائبریری
0334-8630911

خوابتشی

میتھ کا ہرکا لگا ہے۔ پرناٹے بہرہ ہے ہیں۔ برآمدے سے ایک لڑکے کی آواز آرہی ہے۔ "چلتی میں مرچیں بادل کی کریمیں" میری بھالی ام ریمانہ نے ایک کانڈ پر چٹاں قاف لکھ کر اداس کے بالائی حصے میں دھاگا پرو کر ہار سٹکار کی ٹہنی میں لٹکا دیا ہے۔ بس اب کوئی دم میں بادل چٹ جائیں گے۔ میرا ہنر دیا میں دروازے سے داخل ہو کر میرے سامنے آن بیٹھا ہے۔ وہ بہت اداس دکھائی دیتا ہے۔ چند لمحے بعد وہ آپ ہی آپ ایک اداس محویت کے ساتھ خودکھائی کے انداز میں معروف نظم ہو جاتا ہے۔

"ستا ہے کہ ایک ہی معاشرے میں ایک ہی زبان ہو۔ لے اور ایک ہی سا احساس رکھنے والے دو گروہ، دو جماعت، آج گروہ ایک دوسرے کا جیٹا ہوا ہے ہیں۔ میں نے غلط کہا، جیٹا ہو نہیں، یہ تو سات سو ساڑھے سات سو برس کا بگڑا ہوا لہو ہے۔ اردو معاشرے کی سیاست اور اردو تہذیب کی تاریخ کا بگڑا لہو۔ یہاں میں اس سے بھی زیادہ کڑوی بات کہوں گا اور وہ یہ کہ میرا اور تمہارا سڑا ہوا لہو۔ میں تو اب اپنے وجود سے قہقہے کھانے لگا ہوں۔ میں وقت کی ایک سڑا ہوا ہوں۔ میرے وجود کی سمتیں مڑی ہوئی ہیں۔"

"میرا لہو ایک بہتان اور اتہام ہے۔ میرا لہو انٹ رہا ہے اور وہ تلاطمی ہے کہ بس اسی زندگی کے پہاڑ سے کٹ گیا ہوں اور ایک جو ہڑبن کے رہ گیا ہوں۔ مجھے "جو ہڑ" پر یاد آیا کہ میرے بزرگ اپنی زبان کو کوثر و تسنیم سے دھلی ہوئی زبان کہتے تھے۔ کوثر و تسنیم سے دھلی ہوئی زبان۔ ہنڈ، ہشت۔

"اردو تہذیب کے بے چارے بزرگوں، حالی شان بزرگوں کے کچھ نام ہیں جو کی ترتیب کے بغیر میرے ذہن میں آ رہے ہیں۔ مسعود سعد سلمان لاہوری، امیر خسرو، بخت کبیر، رحیم (عبدالرحیم خان خاناں)، شمس العشق، خواجہ بندہ نواز، گیسو دراز، قلی قلیب شاہ، وجہی، فضل، شاعر شاعران ولی، سراج، مرزا مظہر جان جاناں، ارسلانے بند خان آرزو، خدائے سخن میر، مرزا اسودا، میرامن، حیدر بخش حیدری، شیر علی افسوس، نظیر، مصطفیٰ، لہو رام دیگر، خدائے سخن میر انیس، غالب علی کل غالب، سچر و مرشد حضرت بہادر شاہ ظفر، سید احمد خاں، حالی، محمد حسین آزاد، نذیر احمد، شبلی، نواب امداد امام اثر، دیا شکر نسیم، رتن ناتھ سرشار، علامہ اقبال، شمس پریم چند، علامہ نیا فتح پوری، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی، مولانا مظفر علی خاں، جوش ملیح آبادی، فراق، جگر، یگانہ چنگیزی، منٹو، مولانا عبدالجبار سالک، ان م راشد، کرشن چندر۔ یہ ہیں اردو تہذیب کے چند چادران نام۔ مگر یہ کیوں تھے؟ انہیں کیوں ہونا چاہیے تھا؟ ان کے نہ ہونے سے آخر کیا فرق پڑتا؟ ان کے ہونے سے آخر کیا فرق پڑتا؟ جب کہ ان کے وارث ہم ہیں، بے ہودہ ترین ہم۔ میتھ تو بھی بھی برستا ہے، پرناٹے تو بھی بھی بپتے ہیں، پر ان ناموں کے وارث ایک دوسرے کا لہو روڑ بھاتے ہیں۔ میں، تم اور ہم سب لہو پہنے اور بھانے کا لگا تار، موسم منانے اور خاک کو لہو سے رچانے میں ایسے طاق اور مشاق ہو گئے ہیں کہ صل ملی۔

میں تمہاری زبان کی گرہ کھولنے والوں، اسے اس کے طور سے بولنے والوں اور اس ناشدنی کے جوہر تولنے والوں میں سب سے زیادہ بچ اور پوچ شخص ہوں۔ پر مجھ ایسے لوگ، رانیکاں لوگ تو سالہا سال سے ہونے کی طرح ہیں ہی نہیں۔ اور اس شہر، اس خود آزار اور غلوں خوار شہر کا کوئی شہری ہونے کی طرح ہو بھی کیسے سکتا ہے؟

میں اپنے حسابوں اس محنت زدہ قبیلے سے تعلق رکھتا ہوں جس نے جھیں، اردو تہذیب کے جواں فکر، نمایندہ، وقت اور حالات کے ناز پروردہ نمایندہ انھیں سیدھ کے سہاؤ پر لانا چاہا۔ پر تم نے ہمیں اپنی ٹھوکروں پر رکھا۔ ہم تمہاری بد بخت زبان کے ادیب و شاعر تھے اس لیے تم نے ہمیں دھتکار دیا۔ کیا تاریخ یہ حقیقت محفوظ نہیں رکھے گی کہ دھتکارنے والے کون تھے اور دھتکارے جانے والے کون؟

تمہارے اور ہمارے بعض معتر بزرگوں نے ایک خواب دیکھا تھا۔ وہ خواب درست تھا یا نادرست، یہ ایک بے نتیجہ بحث کی بات ہے مگر بہر حال خواب دیکھا گیا تھا اور بڑی لگن سے دیکھا گیا تھا۔ جب اس خواب کی تعبیر مل گئی تو نو ظہور اور مقدس سیاست داروں نے اس تعبیر کو خواب کے منہ پر دے مارا اور ارشاد فرمایا کہ یہ ملک انسانوں کی بہبود اور بہداشت کے لیے نہیں، فرشتوں کی بہبود اور بہداشت کے لیے حاصل کیا گیا تھا۔

یہ داستان نہ مختصر ہے اور نہ خوشگوار۔ بہر حال پھر ایک نئی نسل برروئے کار آئی، تم برروئے کار آئے اور تم نے خیالوں کے بجائے حقیقت کی، حقیقی مسئلوں کی بات کی۔ اور یہ ایک خیر ظنی کی بات تھی مگر یہ خیر ظنی صرف اپنے گروہ سے تعلق رکھتی تھی اور ہمیں سے سارا معاملہ چو پٹ ہو گیا۔ یہ طور صرف تمہی نے نہیں اختیار کیا، اس ملک کے ہر گروہ نے اختیار کیا۔

میں یہ خواہش رکھتا ہوں کہ اردو بولنے والے ہوں یا سندھی بولنے والے، بلوچ ہوں یا پنجتون، پنجابی ہوں یا سرائیکی یا دوسرے، یہ سب کے سب ان حساس اور باشعور نوجوانوں اور جوانوں کی ذمے داری ہیں جو لوگوں کا حق منوانے کی اہلیت اور استطاعت رکھتے ہوں اور جنہیں قبول عام اور قبول عوام کی سند حاصل ہو۔

سب سے زیادہ دکھ کی بات یہ ہے کہ یہاں کوئی بھی ایسا گروہ نہیں پایا جاتا جس کی جیب میں دوسرے گروہوں کے لیے بھی کوئی سڑوہ نام نہ ہو۔ میں انسانوں کو زبانوں میں، علاقوں میں، عقیدوں میں اور نسلوں میں باغنا، ذہن اور عمل کا سب سے زیادہ گندہ اور گھٹاؤ نام خیال کرتا ہوں۔

میری تعمیر ترین مگر عزیز ترین خواہش یہ ہے کہ نئی نسل کے مقتدر سیاست دان نئی توانائی، نئی پرماجرانی، نئے حوصلے اور نئے دلوں کے ساتھ اپنی صف بندی کریں، ایسی صف بندی جو اس ملک کے تمام عوام، محروم عوام کے لیے زندگی خیز اور دل انگیز امیدوں کا جاں پرور سرمایہ قرار پائے۔ یہی نہیں بلکہ سڑوہ قرار پائی۔ اور اگر ایسا نہ ہو سکا تو میں جس طرح اب اداس ہوں، آئندہ بھی اداس رہوں گا مگر بھلا میں کون؟



محترم قارئین
السلام علیکم!

جولائی 2013ء کا پہلا شمارہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ آپ کے زیرِ نظر ہے۔ سب سے پہلے تو رمضان شریف کی بے حد مبارکباد و بے مضرت دعا ہے کہ ان بابرکت مساعی میں ہماری عبادتوں اور دعاؤں کو قبول فرمائے اور ہمیں نیک عسکروں کی رحمتیں نصیب کرے (آمین) ملک میں امن اور استحکام کا قیام ختم ہو چکا اور عوام نے ہمیشہ کی طرح "نئی" حکومت سے حالات میں بہتری کی "پرانی" امیدیں بھرتے بھرتے دیکھ کر لی ہیں۔ ویسے اب امیدوں کا انداز بھی مسائل کی طرح بڑھتا جا رہا ہے۔ مضطرب و متشرد عوام اس لگاتار چلتے ہوئے کھلی قیلے سے نکل کر کیا کارنامہ انجام دیتے ہیں۔ جب تک ہم امید کی بات پر بے یقینی سے سروِ مضمر رہیں گے۔ جبکہ دوسری جانب کراچی میں بد امنی کی بدولت چھوٹی بڑی صنعتوں کا دوسرے صوبوں میں منتقلی کا عمل ایک لوگر ہے۔ اس صورتحال سے تحریر ہونے تک کی حکومت کا کوئی لائحہ عمل سامنے نہیں آیا، تا حال عوام کو پیش اور پانی کے بحران کا سامنا کر رہے نکل سے زیرِ روشنی ہے۔ بہت آنے سے پہلے ایشیائے غور و خورش کی قیمتوں میں ہوش رہا اضافہ و گام آلودی کی بین مائیاں ہر اچھوٹ کرانے میں اضافہ اور عوام کی بے بسی دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ جہاں آسماں میں بڑے بڑے تلپاس کرائے جاتے ہیں وہاں جہت سے تلپاسوں میں اضافے کے خلاف کوئی قانون سازی کیوں نہیں کی جاتی۔ بہر حال امید خیر کی ہی رکھی چاہیے اور ممکن ہے آنے والے نکل میں وہ سب کچھ ممکن ہو جائے جو جانے والے نکل میں ہم چاہتے تھے۔ اس سیاسی جوڑو کو چھوڑ کر اب ہمیں بھی اپنی عقل کی خبر لینا چاہیے کیونکہ سیاستدانوں کی طرح اپنے پیادوں سے اتنی بے خبری ابھی نہیں ہوتی۔

انگلینڈ کا تھریڈ راسٹیل، ساہیوال سے محفل میں تشریف لائے ہیں "آپ کی یاد آتی فلم نے ساتھ دیا، کاغذ نے سیدہ حاضر کیا اور ذہن نے آپ کی یاد میں پھول برسائے، دل نے گدے، سخن تحریر کیا پھر میں نے لکھا۔ جون کا شمار 20 سنی کی ایک مٹی ہوئی دوپہر کو ماسٹرموسم کو لکھ دیا۔ دوستو، محبت کوئی وقت کا پہلا دانٹس ہے، میرے رشتے، یہ جذبے تو دل کی سرزمین پر اسر تیل کی طرح چلے ہوئے ہیں، ان کو دل سے نکالنا بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔ یہ سسٹم کی محبت کی انتہائی توجہ جو ایک بار پھر حاضر محفل ہوں۔ صدر محفل شیر علی خان کو زور ہونے اور شادی کی مبارکبادیں۔ فیروز اور آپ اگر ہمیں بھی شادی پر بلائیے تو کیا مزہ تھا؟ قیصر اقبال کچھ صاحب بھی اپنے آپ کو اعلیٰ ثابت کرنے پر تے نظر آتے، ویسے آپ کو اس سے کیا؟ گوگھی کا پھول ہو یا پھول گوگھی کا۔ آپ کا تھیرہ مزہ دے گیا۔ اپنے بہت ہی محترم سید محمد رضا شاہ کی کوشش بھی اللہ اللہ کر کے کامیاب ہوگئی۔ محترمہ ساجدہ راجا بھی لوڈ شیڈنگ کا دردناک تجربہ کیا، یقیناً ان کا ٹیک اب خراب ہوا ہوگا۔ اپنے بابر بھائی کا تھیرہ اور باتیں مزہ دے گئیں، بہر حال بھائی تھہ ہوا رہیں ایسا نہ ہو کہ "آپ کے خط" کی مشینری سے یہ دو چار پرزے بھی غائب ہو جائیں۔ محترم تصویر اچھن کا تھیرہ اور یہ جملہ باہر کے موسم سے دل کا موسم متاثر نہیں ہوتا بلکہ دل کے موسم سے باہر کا موسم متاثر ہوتا ہے، زبردست لگا بے شک میں میں لگی ہوئی آگ کو ساون کی بارش بھی نہیں بجھا پاتی۔ بھائی رضوان محفل صاحب کا تھیرہ اچھا لگا۔ ویسے برادر آپ کو پتا ہونا چاہیے ماہا ایمان کا سلیکشن ہو چکا ہے۔ ستوری لگا کے۔ بہت ہی پیارے بھائی توصیف احمد صاحب، ہم شاعر لوگ دل کے اچھے ہوتے ہیں اس لیے ہمیں سب اچھا لگتا ہے۔ عدنان یوسف برادر، تھیرے کی پسندیدگی کا شکریہ۔ محمد قدرت اللہ نیازی صاحب کا تھیرہ اور ظاہرہ یاسمین کو دیا گیا مشورہ عمدہ لگا۔ رمضان پاشا کی بھاشا بھی خوب رہی۔ حبیب احمد چنائے صاحب، برادر ہمایوں سعید احمد جو کے چچے نہیں پڑا بلکہ نہادھو کے چچے پڑا ہے۔ سید کی الدین اشفاق کا تھیرہ اور اعلیٰ سوچ قابل داد ہے، یقیناً ہمارے بڑے گئے حکمرانوں کو ایسے الفاظ نہیں کہنے چاہئیں۔ سعد یہ بھاری صاحب کا محفل میں نہ ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ میرا مشورہ قبول کر کے اللہ اللہ کرتے بیٹھ گئے، تمہیں اس۔ اور یس احمد خان، شہید حبیب، عدنان یوسف، رائے قیصر اقبال کے تھیرے اچھے لگے، بہر حال محفل میں آغا فرید احمد خان، قیصر عباس بابر، نعمان پیارے اینڈ IMR بکلاں کی کئی محسوس ہوئی۔ تاریخی کہانی امیر غلام، یوسف عادل شاہ کی پرالم و پرست داستان حیات متاثر کن رہی۔ ناصر ملک کی مسافر میں چند دہائی شہر یار کے کندھے پر سر رکھے اپنے دل کا بوجھ ہٹا کر رہی ہے یقیناً کوئی ایسا ہونا چاہیے جس سے بندہ اپنا دکھ باٹ سکے۔ چند دہائی کے سفر کی اذیتیں اور اس کے ہیروں کے اک اک اپنے پورے درجہ تفصیل زبیر غزدر کر گئی ہے۔ رضوان کا کردار حقیقت سے قریب تر لگا۔ مشکلوں کی موجودہ قطعہ گئی پر تجسس اور سسٹی خیر رہی۔ آخری صفحات پر موجود دولت کے پاؤں مغرور دستور ثابت ہوئی۔ دولت کے لیے انسان پتا نہیں کیا کچھ کرتا ہے مگر یہ تو ہاتھوں کا کھیل ہے۔ عبدالرشید کی بے بسی بالکل اچھی نہ لگی کہ ایک مرتے ہوئے انسان کے ساتھ دھوکا کیا مگر انتقام قدرت سے بندہ خود کو کیسے بچا سکتا ہے؟ عبدالرشید نے جیسا کیا ویسا ہی بھرا۔ انسان دشمن میں ملک صاحب ہمیشہ کی طرح تجرموں کو کھینچ کر در تک پہنچانے میں کامیاب رہے۔ احمد اقبال کی سر پرانہ اور کاشف ذہیر صاحب کی مرضی ماں باپ کے احساسات و جذبات کو اجاگر کرتی قابلِ تحریف تحریریں ہیں یقیناً دنیاوی رشتوں میں ماں باپ کا رشتہ عظیم تر ہے یہ کہانیاں پڑھ کے جذبات سے مطلوب ہو کر بے اختیار آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ تک و ملت کے نازہ کارنا سے نے خاصا سرور کیا۔ محفل شعر و سخن میں ہمیں ناز تو صیف احمد، حافظ شاہد عمران، سید کی الدین اشفاق، ریاض بیٹ، رضوان تنویری، ساجدہ راجا، محمد قدرت اللہ نیازی اینڈ بابر عباس و سوز بابر عباس کے شاعر اچھے لگے۔

مہر اختر عباس تھراج، بھڑا اقبال غفری، کیر والا سے محفل میں چلے آ رہے ہیں "آپ کی بار سسٹن 17 سنی کو موصول ہو گیا۔ نائل ہے کہ

پسند آج۔ میری مدد پرانی سے نہایت ادب سے گزارش ہے کہ اس بار سے سلیکٹ وارنٹول لکھوا دیں۔ پلیز ہماری اس عرض کو حکام بالا تک ضرور پہنچائیں۔ آپ کی گزارش کوٹ کر لی ہے محفل میں قدم رکھنا تو وزارت کی تحریریں ملنے کا وقت تھا۔ وہیں سب سے پہلے۔ اور یس خان، آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ موبائل فون آن کے چھوٹے چھوٹے بچوں کے پاس بھی دکھائی دیتا ہے جو ان کے لیے ایک ملک چھوڑ کر چکا ہے۔ ابرار وارث، آپ کی خوشی ہے، آپ کی طرح میں بھی کی الدین نواب کا بے حد محفل ہوں۔ قیصر بھائی یہ تو بتا دیں کیا زیادہ عمر گوگھی کے پھول کی ہوتی ہے؟ وہ گلاب کا پھول نہیں، آپ نے گوگھی کا بنا دیا۔ فیروز شاہ محمد رضا نقوی صاحب اذکر آپ نے یاد کیا اور ہم بچے گئے۔ ستائے کیسے ہیں آپ؟ صابو، راجا، ہم بھی دیکھائی ہیں مگر آپ شاید کبھی خاتون ہیں جو حیات سے خط لکھ رہی ہیں۔ تصویر اچھن آپ کا خط بے حد پسند آیا ہے وجہ یہ ہے کہ آپ نے سب قارئین کے محفل کی تعریفیں کی ہیں تو کوئی ایسا نہیں ہوتا چاہے جو آپ کو پسند کر سکے۔ قدرت اللہ بھائی آپ کے لیٹر نے خوب ہنسا یا ہے۔ مسافر اسون جارتی ہے۔ میڈم کلپلے کے بارے میں عجیب امکانات اور ہے ہیں۔ نائل ناصر ملک مجھے اپنے علاقے کے نکلے ہیں۔ عائشہ فاطمہ کی لاسٹ اسٹوری اور ملت کے پاؤں پر مہم و بہت اچھی لگی۔ کہانی کی تحریف کرنا تو گویا سب کچھ یاد نہیں آ رہا کیا کہوں۔ بہر حال اس دفعہ کے سسٹن نے لوڈ شیڈنگ کی کمی پوری کر دی۔

انگلینڈ کا تھریڈ راسٹیل، ساہیوال سے محفل میں تشریف لائے ہیں "آپ کی یاد آتی فلم نے ساتھ دیا، کاغذ نے سیدہ حاضر کیا اور ذہن نے آپ کی یاد میں پھول برسائے، دل نے گدے، سخن تحریر کیا پھر میں نے لکھا۔ جون کا شمار 20 سنی کی ایک مٹی ہوئی دوپہر کو ماسٹرموسم کو لکھ دیا۔ دوستو، محبت کوئی وقت کا پہلا دانٹس ہے، میرے رشتے، یہ جذبے تو دل کی سرزمین پر اسر تیل کی طرح چلے ہوئے ہیں، ان کو دل سے نکالنا بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔ یہ سسٹم کی محبت کی انتہائی توجہ جو ایک بار پھر حاضر محفل ہوں۔ صدر محفل شیر علی خان کو زور ہونے اور شادی کی مبارکبادیں۔ فیروز اور آپ اگر ہمیں بھی شادی پر بلائیے تو کیا مزہ تھا؟ قیصر اقبال کچھ صاحب بھی اپنے آپ کو اعلیٰ ثابت کرنے پر تے نظر آتے، ویسے آپ کو اس سے کیا؟ گوگھی کا پھول ہو یا پھول گوگھی کا۔ آپ کا تھیرہ مزہ دے گیا۔ اپنے بہت ہی محترم سید محمد رضا شاہ کی کوشش بھی اللہ اللہ کر کے کامیاب ہوگئی۔ محترمہ ساجدہ راجا بھی لوڈ شیڈنگ کا دردناک تجربہ کیا، یقیناً ان کا ٹیک اب خراب ہوا ہوگا۔ اپنے بابر بھائی کا تھیرہ اور باتیں مزہ دے گئیں، بہر حال بھائی تھہ ہوا رہیں ایسا نہ ہو کہ "آپ کے خط" کی مشینری سے یہ دو چار پرزے بھی غائب ہو جائیں۔ محترم تصویر اچھن کا تھیرہ اور یہ جملہ باہر کے موسم سے دل کا موسم متاثر نہیں ہوتا بلکہ دل کے موسم سے باہر کا موسم متاثر ہوتا ہے، زبردست لگا بے شک میں میں لگی ہوئی آگ کو ساون کی بارش بھی نہیں بجھا پاتی۔ بھائی رضوان محفل صاحب کا تھیرہ اچھا لگا۔ ویسے برادر آپ کو پتا ہونا چاہیے ماہا ایمان کا سلیکشن ہو چکا ہے۔ ستوری لگا کے۔ بہت ہی پیارے بھائی توصیف احمد صاحب، ہم شاعر لوگ دل کے اچھے ہوتے ہیں اس لیے ہمیں سب اچھا لگتا ہے۔ عدنان یوسف برادر، تھیرے کی پسندیدگی کا شکریہ۔ محمد قدرت اللہ نیازی صاحب کا تھیرہ اور ظاہرہ یاسمین کو دیا گیا مشورہ عمدہ لگا۔ رمضان پاشا کی بھاشا بھی خوب رہی۔ حبیب احمد چنائے صاحب، برادر ہمایوں سعید احمد جو کے چچے نہیں پڑا بلکہ نہادھو کے چچے پڑا ہے۔ سید کی الدین اشفاق کا تھیرہ اور اعلیٰ سوچ قابل داد ہے، یقیناً ہمارے بڑے گئے حکمرانوں کو ایسے الفاظ نہیں کہنے چاہئیں۔ سعد یہ بھاری صاحب کا محفل میں نہ ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ میرا مشورہ قبول کر کے اللہ اللہ کرتے بیٹھ گئے، تمہیں اس۔ اور یس احمد خان، شہید حبیب، عدنان یوسف، رائے قیصر اقبال کے تھیرے اچھے لگے، بہر حال محفل میں آغا فرید احمد خان، قیصر عباس بابر، نعمان پیارے اینڈ IMR بکلاں کی کئی محسوس ہوئی۔ تاریخی کہانی امیر غلام، یوسف عادل شاہ کی پرالم و پرست داستان حیات متاثر کن رہی۔ ناصر ملک کی مسافر میں چند دہائی شہر یار کے کندھے پر سر رکھے اپنے دل کا بوجھ ہٹا کر رہی ہے یقیناً کوئی ایسا ہونا چاہیے جس سے بندہ اپنا دکھ باٹ سکے۔ چند دہائی کے سفر کی اذیتیں اور اس کے ہیروں کے اک اک اپنے پورے درجہ تفصیل زبیر غزدر کر گئی ہے۔ رضوان کا کردار حقیقت سے قریب تر لگا۔ مشکلوں کی موجودہ قطعہ گئی پر تجسس اور سسٹی خیر رہی۔ آخری صفحات پر موجود دولت کے پاؤں مغرور دستور ثابت ہوئی۔ دولت کے لیے انسان پتا نہیں کیا کچھ کرتا ہے مگر یہ تو ہاتھوں کا کھیل ہے۔ عبدالرشید کی بے بسی بالکل اچھی نہ لگی کہ ایک مرتے ہوئے انسان کے ساتھ دھوکا کیا مگر انتقام قدرت سے بندہ خود کو کیسے بچا سکتا ہے؟ عبدالرشید نے جیسا کیا ویسا ہی بھرا۔ انسان دشمن میں ملک صاحب ہمیشہ کی طرح تجرموں کو کھینچ کر در تک پہنچانے میں کامیاب رہے۔ احمد اقبال کی سر پرانہ اور کاشف ذہیر صاحب کی مرضی ماں باپ کے احساسات و جذبات کو اجاگر کرتی قابلِ تحریف تحریریں ہیں یقیناً دنیاوی رشتوں میں ماں باپ کا رشتہ عظیم تر ہے یہ کہانیاں پڑھ کے جذبات سے مطلوب ہو کر بے اختیار آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ تک و ملت کے نازہ کارنا سے نے خاصا سرور کیا۔ محفل شعر و سخن میں ہمیں ناز تو صیف احمد، حافظ شاہد عمران، سید کی الدین اشفاق، ریاض بیٹ، رضوان تنویری، ساجدہ راجا، محمد قدرت اللہ نیازی اینڈ بابر عباس و سوز بابر عباس کے شاعر اچھے لگے۔

انگلینڈ کا تھریڈ راسٹیل، ساہیوال سے محفل میں تشریف لائے ہیں "آپ کی یاد آتی فلم نے ساتھ دیا، کاغذ نے سیدہ حاضر کیا اور ذہن نے آپ کی یاد میں پھول برسائے، دل نے گدے، سخن تحریر کیا پھر میں نے لکھا۔ جون کا شمار 20 سنی کی ایک مٹی ہوئی دوپہر کو ماسٹرموسم کو لکھ دیا۔ دوستو، محبت کوئی وقت کا پہلا دانٹس ہے، میرے رشتے، یہ جذبے تو دل کی سرزمین پر اسر تیل کی طرح چلے ہوئے ہیں، ان کو دل سے نکالنا بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔ یہ سسٹم کی محبت کی انتہائی توجہ جو ایک بار پھر حاضر محفل ہوں۔ صدر محفل شیر علی خان کو زور ہونے اور شادی کی مبارکبادیں۔ فیروز اور آپ اگر ہمیں بھی شادی پر بلائیے تو کیا مزہ تھا؟ قیصر اقبال کچھ صاحب بھی اپنے آپ کو اعلیٰ ثابت کرنے پر تے نظر آتے، ویسے آپ کو اس سے کیا؟ گوگھی کا پھول ہو یا پھول گوگھی کا۔ آپ کا تھیرہ مزہ دے گیا۔ اپنے بہت ہی محترم سید محمد رضا شاہ کی کوشش بھی اللہ اللہ کر کے کامیاب ہوگئی۔ محترمہ ساجدہ راجا بھی لوڈ شیڈنگ کا دردناک تجربہ کیا، یقیناً ان کا ٹیک اب خراب ہوا ہوگا۔ اپنے بابر بھائی کا تھیرہ اور باتیں مزہ دے گئیں، بہر حال بھائی تھہ ہوا رہیں ایسا نہ ہو کہ "آپ کے خط" کی مشینری سے یہ دو چار پرزے بھی غائب ہو جائیں۔ محترم تصویر اچھن کا تھیرہ اور یہ جملہ باہر کے موسم سے دل کا موسم متاثر نہیں ہوتا بلکہ دل کے موسم سے باہر کا موسم متاثر ہوتا ہے، زبردست لگا بے شک میں میں لگی ہوئی آگ کو ساون کی بارش بھی نہیں بجھا پاتی۔ بھائی رضوان محفل صاحب کا تھیرہ اچھا لگا۔ ویسے برادر آپ کو پتا ہونا چاہیے ماہا ایمان کا سلیکشن ہو چکا ہے۔ ستوری لگا کے۔ بہت ہی پیارے بھائی توصیف احمد صاحب، ہم شاعر لوگ دل کے اچھے ہوتے ہیں اس لیے ہمیں سب اچھا لگتا ہے۔ عدنان یوسف برادر، تھیرے کی پسندیدگی کا شکریہ۔ محمد قدرت اللہ نیازی صاحب کا تھیرہ اور ظاہرہ یاسمین کو دیا گیا مشورہ عمدہ لگا۔ رمضان پاشا کی بھاشا بھی خوب رہی۔ حبیب احمد چنائے صاحب، برادر ہمایوں سعید احمد جو کے چچے نہیں پڑا بلکہ نہادھو کے چچے پڑا ہے۔ سید کی الدین اشفاق کا تھیرہ اور اعلیٰ سوچ قابل داد ہے، یقیناً ہمارے بڑے گئے حکمرانوں کو ایسے الفاظ نہیں کہنے چاہئیں۔ سعد یہ بھاری صاحب کا محفل میں نہ ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ میرا مشورہ قبول کر کے اللہ اللہ کرتے بیٹھ گئے، تمہیں اس۔ اور یس احمد خان، شہید حبیب، عدنان یوسف، رائے قیصر اقبال کے تھیرے اچھے لگے، بہر حال محفل میں آغا فرید احمد خان، قیصر عباس بابر، نعمان پیارے اینڈ IMR بکلاں کی کئی محسوس ہوئی۔ تاریخی کہانی امیر غلام، یوسف عادل شاہ کی پرالم و پرست داستان حیات متاثر کن رہی۔ ناصر ملک کی مسافر میں چند دہائی شہر یار کے کندھے پر سر رکھے اپنے دل کا بوجھ ہٹا کر رہی ہے یقیناً کوئی ایسا ہونا چاہیے جس سے بندہ اپنا دکھ باٹ سکے۔ چند دہائی کے سفر کی اذیتیں اور اس کے ہیروں کے اک اک اپنے پورے درجہ تفصیل زبیر غزدر کر گئی ہے۔ رضوان کا کردار حقیقت سے قریب تر لگا۔ مشکلوں کی موجودہ قطعہ گئی پر تجسس اور سسٹی خیر رہی۔ آخری صفحات پر موجود دولت کے پاؤں مغرور دستور ثابت ہوئی۔ دولت کے لیے انسان پتا نہیں کیا کچھ کرتا ہے مگر یہ تو ہاتھوں کا کھیل ہے۔ عبدالرشید کی بے بسی بالکل اچھی نہ لگی کہ ایک مرتے ہوئے انسان کے ساتھ دھوکا کیا مگر انتقام قدرت سے بندہ خود کو کیسے بچا سکتا ہے؟ عبدالرشید نے جیسا کیا ویسا ہی بھرا۔ انسان دشمن میں ملک صاحب ہمیشہ کی طرح تجرموں کو کھینچ کر در تک پہنچانے میں کامیاب رہے۔ احمد اقبال کی سر پرانہ اور کاشف ذہیر صاحب کی مرضی ماں باپ کے احساسات و جذبات کو اجاگر کرتی قابلِ تحریف تحریریں ہیں یقیناً دنیاوی رشتوں میں ماں باپ کا رشتہ عظیم تر ہے یہ کہانیاں پڑھ کے جذبات سے مطلوب ہو کر بے اختیار آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ تک و ملت کے نازہ کارنا سے نے خاصا سرور کیا۔ محفل شعر و سخن میں ہمیں ناز تو صیف احمد، حافظ شاہد عمران، سید کی الدین اشفاق، ریاض بیٹ، رضوان تنویری، ساجدہ راجا، محمد قدرت اللہ نیازی اینڈ بابر عباس و سوز بابر عباس کے شاعر اچھے لگے۔

مجھے ایک پیاری سی بیٹی عطا کی ہے اور بیٹی کا نام میں نے مبین ہار رکھا ہے، اللہ اس کے نصیب اچھے کرے۔ آمین (میلنگ یاد دل کریں) اور بات ہو جائے۔ کچھ کہانیوں کی حسب معمول اس پار بھی سب سے پہلے مسافر پڑھی۔ ناصر ملک صاحب تھا آپ کے قلم میں اور کھانا چھینا کرتے۔ مسافر نے ہم قارئین کو مکمل طور پر اپنے حیرتیں بکھڑا رکھا ہے۔ دوسرے نمبر پر باری آتی ہے کشتوں کی جوتی الجال تو ایس میں جارا ہے۔ اس کا حسب مقتدرہ سراسریت تھا کہ یہ صرف جرائم کا حاملہ کرنے والی کہانی ہے، پر اسراریت برائے نام ہے۔ آخری صفحات پر سسپنس ڈائجسٹ نے بیش یادگار اور خوب صورت کہانیاں دی ہیں، دولت کے پاپے بھی ان میں سے ایک ہے۔ عائشہ قاسم ایک زیروست لکھاری کے روپ میں نظر آئیں، ویل ڈن۔ اس پار حسام بٹ صاحب، ملک مسعود حیات صاحب کی ڈائری سے انسان دشمن نے کس نے اور حسب معمول ملک صاحب نے اس کیس کو بھی حل کر دیا اور مجرم گلاب خان کو اس کے انجام تک پہنچا دیا۔ ماؤں کے عالمی دن کے حوالے سے احمد اقبال صاحب کی تحریر سر پر اترتی تھیں اس حوالے سے ایک زیروست اور سیاری تحریر بھی شروخ کے صفحات کو آپ نے مکمل طور پر ڈاکٹر ساجد احمد کے حوالے کر دیا ہے اس بار ڈاکٹر صاحب امیر غلام نے آئے اور حسب معمول ہمیں تاریخ کی سیر کرتے رہے۔ باقی کی کہانیاں بھی اچھی اور خوب صورت تھیں اور سسپنس کے معیار کے مطابق تھیں۔ (بہت شکر ہے)

✽ اور ایس احمد خان، ناظم آباد، کراچی سے محفل میں شریک ہوئے ہیں "سردق کی دھنکی اور اٹھائے کی پہچان سے گزرتا کہانی محفل میں جاو اور آئے۔ ادارے کے بعد شیر علی خان کی مزاج پر کی اور مبارک باد دی۔ ان کے بعد اپنے آپ سے ملاقات ہوئی۔ دیگر دوستوں کے بھی نظر آ رہے تھے جہاں دلچسپ تبصروں سے مستفید ہوئے۔ پھر مقبول عام سلسلے مسافر میں حاضری دی جہاں ٹیلی کی مافی کی داستان چل رہی ہے۔ دوسرا سلسلہ کشتوں تھا وہاں بھی کہانی اپنے اختتامی مراحل میں چل رہی ہے۔ سیری کہانی تاریخ کے ہجروں سے لی ہوئی ڈاکٹر ساجد احمد کی تحریر امیر غلام تھی۔ ڈاکٹر ساجد احمد جس خوب صورت سرائے میں لکھتے ہیں وہ انہی کا خاصہ ہے، پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حقیقت میں واقعات و حالات رونما ہو رہے ہوں۔ جان لینا اور جان دینا یادداشتوں اور بادشاہ گردوں کا بیش و طیر و پاس ہے۔ سر پر اتر بھی احمد اقبال صاحب کی کہانی کی دلیل تھی جہاں جانور زندگی بھر کی کوشش کے باوجود گھر جا کر تھی دست رہا اور اس سے ملنے نہ ہو سکا۔ ماں ایسا رشک کہ بیش اولاد کو دیتی ہے طلب کچھ نہیں کرتی۔ کاشف زبیر کی فرس نے بھی بہت متاثر کیا جس میں ایک باپ نے اپنی اولاد کے اور دوسرے مشن کو پورا کیا۔ پاس وڑ بھی بہتر تھا۔ بیچ میں شکوفوں سے بھی مکتوب ہوئے۔ شعر و سخن میں اشعار نے بھی لطف دیا۔ جیت کی ہار نے مجھے پراسن دیا کہ آگ کے دیار سے گزرنے کے بعد مقتدرہ حیات فوت ہو چکا تھا۔ مات بھی اچھی لگا جہاں ایک دوست نے دوست کی مدد کی۔ دلوں کو ایمان کی روشنی سے منور کرنے والی تحریر عارف کمال تھی، ولی اللہ کے دوست ہوتے ہیں بٹنا وہ دنیا سے منسوب تھے ہیں اتنا ہی وہ ان کی طرف رہتی ہے۔ تک کا کارنامہ ترک کی چوری دلچسپ تھی۔ ایسا بھی اچھی کہانی تھی کراچی مے اپنے پائز کو تو لیا مگر انتہائی مہارت اور چالاکی کے باوجود بچھن گیا۔ آخری صفحات کی خوب صورت کہانی دولت کے پاؤں تھی جسے عائشہ قاسم نے تحریر کیا۔ بہت سی پرائز اور جائزہ تحریر تھی۔"

✽ محمد تقی عباس رقبہ میزائے موت سینٹرل جیل میانوالی سے تشریف لائے ہیں "دوسری مرتبہ خط لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ جون کا پروانہ 25 تاریخ کو لکھ کر بہت زیادہ تھی اور حسب معمول بجلی بھی نہیں تھی۔ غافل کی سینہ کو دیکھ تو دل کا رونا کا رونا ہو گیا۔ اس نے دیکھتا بھی گھٹا نہیں کیا، رونے وال کے ساتھ محفل یاراں میں گئے۔ گری پر شیر علی خان برائے نام تھے ان کو آداب کیا۔ سید محمد رضا شاہ نقوی، آپ کی پر خلوص دعاؤں کا شکریہ۔ بھائی میرا اعلیٰ (دربا خان طلحہ بنگر) سے ہے۔ انھل بار عباس اور پیاری آئی اللہ تعالیٰ آپ کو خوش و فرم رکھے۔ سیدتی الدین اشفاق، دوسروں کا دکھ و رونا دھنا چاہیے۔ پیاری بہن قصور امین اشکر ہے کہ آپ ناراض نہیں ہو گیا۔ پیاری بہن، ہم قیدیوں کے خون مڑ چکے ہیں اگر پھر بھی آپ کا دل چاہے تو میں حاضر ہوں۔ محمد قدرت اللہ نیازی، مجھے کہہ کر تاش گرل بھلا کیوں پریشان تھی۔ سیری تمام بھائیوں اور بہنوں سے گزراؤں کہ خدا کے لیے اپنے ماں باپ کا کھانا کریں، ہم میں سے تقریباً 90 فیصد اپنے والدین کی نافرمانی کی سزا میں محکوم رہے ہیں۔ سب سے پہلے مسافر پڑھی میڈم کے حالات پڑھ کر رونا آ گیا۔ قازو کا دوسرا رخ بہت برا تھا۔ اس نے چندویں کی بیٹھ میں جگر گھونپ۔ دولت کے پاؤں سنی آموز کہانی تھی۔ عبدالرشید کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ ملک مسعود حیات کی تحریر بہت پسند آئی۔ انسان ایک جرم چپانے کے لیے دوسرے جرم کر بیٹھتا ہے۔ نجر مودی صاحب یہ ٹرکی کیا چیز ہے۔ گوشت ہے یا بھڑی ہے؟ محفل شعر و سخن میں مہرین، ناز، ناصر علی صدیقی، شمیم حبیب، سلیم شہزاد کے منظر محمود کرز کا انتخاب بہت پسند آیا۔ میرا ایک سامی ہے وہ اپنی داستان حیات کہانی کا محفل میں بھیجا چاہتا ہے، مہربانی کر کے کچھ دعاؤں فرمائیں کیا وہ شائع ہو سکتی ہے؟" (سرگزشت میں بھی کہانیاں شائع ہوتی ہیں آپ بھکواں)

✽ عبدالغفور خان خشک، محمد اعجاز خشک، کوئٹہ کینٹ سے محفل کی زینت بنے ہیں "اس ماہ کا ڈائجسٹ 22 کو تو حیرت باقی ٹھیک تھی لیکن اس کا تھ پوزیوں کے بغیر سونا سونا تھا، اس کے بعد غلطی کے محفل میں داخل ہوئے تو جناب اپنے شیر علی بھائی 1 ماہ کے لیے صدارت پر فائز تھے۔ شیر علی UPS لائسنس کا بدل نہیں ہے لیکن لائسنس کی قدر اب بھی ہے یہ بی بی ایس سے اچھا ہے، آپ کو شیر علی شادی کی مبارک یاد دل ہو، ہر دینا افکار محفل میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ حسین عباس، رہائی مبارک ہو محفل میں آئیں۔ ساجدہ راجا سراجو گودھا صاحب جب بندہ خط لکھتا ہے تو خط کا انتظار ہوتا ہے لیکن جب نہیں ہوتا وہ بھی نہیں مانتا تو بندے کا سوا آف ہو جاتا ہے۔ سیدتی الدین اشفاق، آپ کی امی کا انھوں سے ہر جود کو خدا جنت الفردوس میں اپنی تمام عطا فرمائے۔ تصویر امین صاحب، ہو سکتا ہے کہ ظاہر ہو یا نہیں کسی ایسی جگہ کی ہو کہ وہاں سو پاؤں ہی نہ ہو تو لائسنس تو ہر جگہ ہے نا۔ قدرت اللہ نیازی صاحب مسافر وہاں سے سائٹ پر چلی گئی جب شہر یار کو میڈم مکتی ہے کہ میرے ساتھ اکیلے چلو تو اس راز سے پردہ تو اٹھے گا کہ کیوں کسی اور کو نہیں لے کر گئی ہے۔ عادل خان، آپ کی بات ٹھیک ہے خواجہ کاکا استعمال آپ کے ہاتھ میں ہے کہ غلط کریں یا کر سکیں۔ سب سے پہلے مسافر پڑھی، ماموں رضوان نے جو کچھ کہا تھا وہ سچ بھی کر رہی ہے اور شہر یار کی صورت میں محبت کرنے والا بھی ہے بیڑی چٹا چلا کہ میڈم سترک پاس ہے وہ بھی اچھے حالات میں ماسا"

کی کہانی نمبر 1 سر پر اتر جواں کے بارے میں بھی بہت خاص کہانی تھی۔ دلیا نے کرام کی کہانی پڑھی، رونا کو سکون ملا۔ جیت کی ہار میں ایک شخص کی موت شامل تھی لیکن وہ جیت کر بھی باقی تھی۔ دولت کے پاؤں میں عبدالرشید جیسے دولت کے پیاری ہوتے ہیں لیکن وہ نیلوفر جیسی حصار اور نیک بی بی کی قدر نہ کر سکے اور شہر بانو نے کس قدر اس اپنے والد کی دولت اپنے پاس رکھی۔"

✽ ڈاؤنریڈ۔ اسے شیا زئی، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا سے محفل میں تشریف لائے ہیں "میں لوہار تو اس لیے نہیں ہوں کہ بیکہ بچھلی سر پہ بلیک لسٹ آپکا ہوں۔ انہوں ان بات پر ہے کہ چھپنے میں سانی سے کس انٹرکٹ نیل سرگودھا میں میزائے موت کا قیدی ہوں اور متواتر خاموش قاری تھا جلی مرتبہ خاموشی توڑی لیکن بیکہ سنا ہو گیا۔ ایک مرتبہ پھر کوشش کر رہا ہوں (اچھی بات ہے آپ نے جو صلہ نہیں ہارا، اب تو خوش ہیں) انٹیشن کی دھم دھماہم رہی۔ بڑے بڑے طے جیلوں بندے، انٹیشن اعلیٰ نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی شید تک کا تہ ہو سکے (بالکل درست فرمایا آپ نے) سسپنس 20 تاریخ کو ملا۔ سیدھے یاروں کی محفل میں آگئے تھے۔ انا فقط حاش کیا۔ بلیک لسٹ دیکھی انھوں نے اس پر کچھ نہیں حکیم سید محمد رضا شاہ نقوی کا خط دیکھا، پڑھ کر خوش ہوئی۔ صدارت پر شیر علی خان اشرف فرما تھے خان صاحب مبارک ہو۔ بابا ایمان اور علامہ، ایمین صاحب کی ضرورت محسوس ہوئی۔ پھر کہانیوں کی طرف بڑھے۔ سب سے پہلے مسافر پڑھی۔ میڈم شکیلہ کا ایک کہانہ کافی اچھا محفل، ہر جگہ تھے، اس سے مستحق ملتا ہے کہ انسان مالع کی طرح حالات اور وقت کے ساتھ ساتھ کس طرح اپنے آپ کو حالات جاتا ہے۔ کشتوں میں لیاقت حسین کا کردار بہت ہی زیروست ہے۔ باقی کہانیاں اچھی پڑھ رہا ہوں۔"

✽ قیصر گل اینڈ منشی رانا تاجا دفر ہاؤسینٹرل جیل ساہیوال سے تبصرہ کر رہے ہیں "گری اف خدا، دو پہر کے وقت میزائے موت کے محل اس قدر چ جاتے ہیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے جنم سے پہلے ہی جنم میں جھونک دیا گیا ہو۔ خدا بھلا کرے ہمارے حکمرانوں کا جو بجلی کو ٹاپید کرنے پر تے ہوئے ہیں۔ پچھلے دنوں کیم تجاری کی تھنیف پڑھی۔ جس کا عنوان تھا "مسئدہ ہزیرہ" آپ یہ جان کر حیران ہوں گے کہ وہ کتاب 88 میں لکھی گئی تھی۔ اس میں پاکستان کو سفید بڑے کا نام دیا گیا ہے اور جو کچھ ہمارے حکمران آج اس دور میں کر رہے ہیں، ان کے کارناموں کو بالکل عین اصل شکل میں بیان کیا گیا ہے۔ ہر سطر پڑھتے پر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ابھی کچھ دیر پہلے ہی لکھی گئی ہو۔ جون 13، کا شمارہ 22 مئی کو موصول ہوا۔ جب میں رات 9 بجے محفل نہ ہونے کی بنا پر اندر سے میں بیٹھا دیکھ رہا تھا کہ بی بی امین کا بیٹا شہ میں مصروف تھا۔ انٹری کا ہونے کے بعد اندر روشنی میں شاد سے گا دیہا کر گیا۔ جون ایلیا صاحب سے معذرت کر کے محفل یاراں میں داخل ہوا جہاں ایڈیٹر صاحب کو بھی گرامری گروان میں مصروف پایا، ساتھ ہی انھوں نے ماسٹر اس کو 14 سال بعد کھڑ توڑتے ہوئے دکھایا، اچھا لگا۔ شیر علی خان کریم صدارت پر برا ایمان تھے اور کوئی ہانڈی پرکا رہے تھے۔ اور کس بھائی کیا بات ہے آپ نے شعر زیروست لکھا، بار بار اسٹ آپ کے شعر میں بہت پرانے دوست رہتے ہیں ان کی وجہ سے آپ بھی دوست بنا نظر آتے ہیں۔ قیصر بھائی یہ کہہ کر کیا ہے؟ شمیم حبیب آپ خوش قسمت ہیں کہ گری کے جھانپنے والے دنوں میں کوئی بیٹھنے کے علاوے کا لطف انھار ہی ہیں۔ حکیم رضا صاحب اگر آپ کچھ جگہ کے حکیم ہیں تو میرے پتے پر ہر اسے مہربانی کریں سے شمس کے ایک دوست نے بھیج دیں۔ بار عباس صاحب اپنی سسر کو بھی کھج لائے آپ اللہ بھلا کرے ان کا۔ ساجدہ راجا۔ راجا کوڑ کر کے لیے استعمال ہوتا ہے آپ ساجدہ رانی لکھا کریں۔ مئی الدین اشفاق، اللہ آپ کی والدہ کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ قصور امین میری بہن، آپ کا خط بہت اچھا تھا۔ رضوان کر پڑوی صاحب کستوری کو چھوڑیں کر پڑا اتارنے کی دوائی استعمال کریں۔ راجا صاحب نواز صاحب رانی میں ساہیوال سے آ کر رہتے تھے، پانچویں کہاں گم ہو گئے ہیں۔"

✽ ذرا خان سورہ آدم خیل سے پہلی آرہی ہیں "میں پچھلے چند سال سے سسپنس پڑھ رہی ہوں مگر خط بجلی بار لکھ رہی ہوں (خوش آمدید) جون کا سسپنس کچھ تاخیر سے ہی۔ میں سب سے پہلے سسپنس کی محفل میں ساتھیوں کے خط پڑھتی ہوں۔ قیصر اقبال کی صاحب کا خط میرا پسندیدہ ہوتا ہے، آپ قصیر بار کو لکھوں کا کھلا ڈی کہتے ہیں مگر مجھ سے پوچھیں تو سکون کا کھلا ڈی وہ ہوتا ہے جو دوسروں کے لیواں پر مسکراہٹ بکھیر دے اور یہ کہ بیٹ قیصر صاحب کو جاتا ہے۔ کہانیوں میں مجھے مسافر سب سے پسند ہے اور میڈم ٹیلی کی کہانی بہت مزہ دے رہی ہے۔ کشتوں بھی اچھی ہے اور اورنگ زیب کا کردار بہت جادو ہے۔ ملک مسعود حیات اور ملک صاحب کی کہانیاں بہت اچھی ہوتی ہیں۔ سسپنس میں آخری کہانی سسپنس کی جان ہوتی ہے۔ تاریخی کہانی اور اللہ کے دیوں کے واقعات بھی مملو بات کا خزانہ ہوتے ہیں۔ سانی چھوٹی کہانیاں بھی اور محفل شعر و سخن بھی لا جواب ہیں۔" (بہت شکر ہے)

✽ چودھری احمد خان، بکری، راولپنڈی سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں "سسپنس 18 مئی کی مسج ملا۔ اتنی گری، بجلی عید کے چاند کی طرح قاتب۔ مطالعہ کے بعد خط لکھنا آسان نہیں۔ اللہ عیہ جون ایلیا، سچ پر داشت کر کے سچ پر چل کر پوری دیا کے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ شیر کی زیروست دہاڑ سے ڈر کر آپ نے شیر علی خان جیسے کاغذی شیر کو کشت پر بٹھا دیا۔ قیصر اقبال کی کھول، اپنا نام مختصر کر کے مختصر بن کر کوئی جگہ یا کریں۔ ستر و ستر بار عباس کھاریاں، جب بیوی مگر بیو کا م کے ساتھ اس 18 کرنے کی عیاب ہم سے نکوہ از یہ یاد دہتی ہوتی ہے کسی کا قلم، مسعود تھی ہے۔ تصویر امین اللہ کا کاڑہ کیا آپ کو اور مسعود یہ قاری کو کتا حال اکارتہ ملا جو ہر جگہ کی جھکری، امیر غلام، ڈاکٹر ساجد صاحب، بیٹیز ترو کی جڑا لکھیں۔ سر پر اتر جانو لاتی کیم اور اڑ کے بدلے ماں کی حکیم جیت کے آخری دیار سے بھر دیا۔ کشتوں، آنکھوں کا کھڑ کیا۔ علاوہ کافی کہانیاں خوب ہیں، سکھڑ شاہ وادی نے پھر سے دانیس بی اورنگ زیب کا ناول لیاقت حسین اپنی ماں کی دعاؤں سے مئی کا کام نہ ہوگا۔ ملک صاحب انصاف و حسن گلاب خان کے کھڑو کھڑے کر دیتے اب کہانی کی موت کا لکھی دکھ۔ منشا اشوار شاہ عمران، نوربان سلطان اور صلیب احمد مہرین ناز اچھے اشعار۔ مسافر۔ چند کو سادش کے تحت ناز و وصفی نے بنام کر لیا، یاد مگر حیات کی موت، گرفت سے نکل چند کب میڈم شکیلہ کا روپ لگتی ہے؟ سرور حیدر سے خاص مسرکہ نہ ہوا۔ عارف کمال تھیں درو حافی سکون والی اچھی تحریر، اگر پڑی کہانیاں متاثر نہ کر سکیں۔ دولت کے پاؤں واقعی نہیں ہوتے۔ عبدالرشید کو بدگئی و حیات کی اچھی سزائی۔"

افشا خان لاہور سے چلی آ رہی ہیں۔ "بکہ عرصہ سے دل اور دماغ اس سوچ میں الجھے ہوئے تھے کہ ہم سسٹمز کی محفل میں حاضر ہوں یا نہیں۔ دل نے کہا سسٹمز ایسا ہے۔ کوئی ہم حاضر ہو گئے محفل میں۔ اس آگے اگلے نے جون کے سرورق پر ایک شکار تعلق کر کے سب کمال لیں کا مظاہرہ کیا۔ جون ایلیا کے انکشافیہ بیان میں اس بات سے 100 فیصد اتفاق کر لیا۔ وہاں کو باہر میں نہ سمجھو۔ شریلی صاحب، خطا سادہ مگر انعام زیادہ۔ بڑی گل اے مٹی، اور سب صاحب صرف کہا نہیں پر تبصرہ۔ بنگا لٹاٹ بنگا، ہمایوں سعید کاٹ، بند کرنے والے قیصر اقبال کچھ صاحب سب سے پہلے میں آپ کا تبصرہ پڑھتی ہوں۔ کیونکہ سب سے بہت ہوتا ہے تبصرہ آپ کی۔ آپ کو سب کے خطوط اچھے لگے، بڑی گل اسے جی۔ قدرت اللہ بھائی، مگر میں صنف نازک کے سامنے میاؤں میاؤں اور مگر سے باہر صنف نازک پر ہانڈ ہانڈی لگی اسے جی۔ رمضان پاشا بھائی، اب صاحب کی کہانی نے آپ پر خوب اثر کیا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے مشکول، اورنگ زیب اور سراغ کی مشکلات میں اضافہ کرنے والے شیخ حامد اب کو برائین کر بھی دئے والا ہے۔ مسافر میں دشمنوں کے ترغیب میں گھری چند کی روداد اور لٹو اور جانو کے کردہ عزائم پر اختتام ایک ماہ کا انتظار دے گیا۔ آخری کہانی دولت کے پاؤں میں عبدالرشید نے شہر بانو کے والد کے ساتھ برا کیا مگر شہر بانو بھی اسے فٹ پاچھ پرسلے آئی۔ محفل کہانی امیر غلام میں عادل شاہی خاندان کے ایک چراغ یوسف عادل شاہ کے واقعات پڑھے۔ انسان دشمن میں ملک صاحب کی سخت رنگ لائی اور رانی کا قاتل گلاب خان ملک صاحب کے آغوش شہینے میں آ گیا۔ سر پر اثر میں جان کو عرف جانوں کو سر پر دیکھنے کی حسرت میں انسان سے سر پر اثر نے بیخا۔ فرض میں ایک نے اپنے بیٹے کے کام کو انجام تک پہنچایا۔"

سید محی الدین اشفاق، شیخ پور، ایہ سے تشریف لاتے ہیں "ماہی بہت اداسیاں اور ٹھنکیاں دے گیا۔ 3 مئی بہت لذت ناک دن تھا میرے اور میری پوری ٹیلی کے لیے۔ ہمارے والد محترم سید عاشق حسین شاہ انتقال کر گئے۔ کیم کوئی جان کی بری مٹی انہیں اس دنیا سے گئے 12 سال ہو گئے ہیں تب میں بہت چھوٹا تھا اور اب 3 مئی کو ابوجان کی جدائی کا غم برداشت کرنا پڑا، کچھ عرصہ سے بستر علالت پر تھے میرا بہت سا غم ان کے کام کرنے میں ان کے قریب گزارتا۔ بہت عادت ہو گئی تھی ان کی۔ ان کے چلے جانے سے بالکل غائب ہو گیا ہوں، کسی کام میں دل نہیں لگتا۔ ایم اے بارٹ اسکے سچ شروع ہو رہے ہیں۔ ایسے میں مجھے سب کی دعا میں پائیں جبکہ دعا کرنے والے جانتے ہیں۔ (ہم سب کی دعا میں آپ کے ساتھ ہیں۔ اللہ آپ کو یہ عہد برداشت کرنے کی توفیق دے اور سرور میں کو بخیر و صحت میں جگہ عطا کرے) آمین (دعا میں دینے والے تو یقیناً چلے گئے لیکن ان کی دی ہوئی دعا میں ہمیشہ آپ کے ساتھ رہیں گی۔ اللہ آپ کو امتحان میں اچھے نمبروں سے کامیاب کرے، آمین) ادارہ اور تمام قارئین سے درخواست ہے کہ میرے ابوجان کی مغفرت کے لیے خصوصی دعا کریں اور یہ کہ خدا ہمیں صبر عطا کرے" (آمین)

رمضان پاشا گلشن اقبال، کراچی سے تبصرہ کر رہے ہیں "جون 2013ء کا سسٹمز وقت مقررہ پر ہی مل گیا۔ سرورق اچھا تھا، البتہ فہرست کی ترتیب کاری میں کوئی جدت نہیں تھی۔ انتہائی حسب معمول کھرا اور کڑوا تھا۔ کالم آپ کے خط میں اول نمبر آنے والے شریلی خان کو دوسری بار پالا مارنے پر دوبار مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ بار عباس صاحب، کسی خاتون کو طلاق میں بھی کچھ کہنے سے پہلے سوچ لیتا چاہیے کہ الفاظ کے دانت کھیں ہوتے ہیں یہ بات لیجئے ہیں (بہت خوب) تبصرہ برائین صاحب اب یہ لفظ کی نگرانی ختم کیجیے، بہت ہو گیا اب کوئی ناشوشا پھولے۔ حسب امر صاحب جی ہاں، میں بہت پرانا قاری ہوں۔ ری بات میری عمر کی تو کچھ لو جب سسٹمز کا پہلا شمارہ مارکیت میں آیا تو اس عاجز کی عمر 49 سال تھی، میں پہلے بارے ہی سے سسٹمز کا قاری چلا آ رہا ہوں، جب تک چنانچہ ساتھ دے گی سسٹمز پڑھتا رہوں گا (بہت شکریہ) تاریخی داستان امیر غلام میں چند قلمی اور غیر فطری واقعات بیان ہوئے ہیں۔ سر پر اثر کہانی زیر دست تھی، آخر امر اقبال صاحب کی تحریر سے کوئی مذاق ہے۔ مشکول اور مسافر میں ماہ بہ ماہ کرداروں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے، پچھلے کرداروں کو یا رکھنا مشکل ہوتا جا رہا ہے، مسافر میں چند ماقبلیوں سے نقلی کہانی میں جا کر۔ مشکول کا اختتام دینگ تھا۔ انسان دشمن اس بار بٹ صاحب کی کہانی بہت ہی زوردار تھی، شہر کے S.P. کا خدشہ ہے بنیادیت ہوا۔ پاس ورڈ میں مزہ نہیں آیا۔ بات میں کچھ دلچسپی تھی، ایسا کہانی تھی تو اچھی مگر اختتام بے نتیجہ۔ غیر ملکی کہانیوں میں سب سے اچھی جیت کی ہار تھی، دولت اس طرح بھی لگتی جاتی ہے یہ اب معلوم ہوا، ہارٹ انگریز باگل داہتر تھا۔ پھر ہم کو کسی سسٹمز سے بھر دے کہانی پڑنے کو کیسے لگتی اس دفعہ تک ولایت کو چرہ چوری کرنے کا کام ملا۔ مجرموں کو پکڑنے کے لیے تک کو کچھ بھی کرنا نہیں پڑا۔ رنگ لگی نہ چٹکری رنگ بھی پڑے گا آیا۔ دولت کے پاؤں محترمہ عائشہ قاسم کی کہانی کالی عرصہ یاد رہے گی، یہ محترمہ تو خواتین کے مطلب کی چیزیں تحریر کرتی ہیں، اس بار انہوں نے ہم مردوں کے لیے بھی ایک یادگار چیز تحریر کی ہے۔ واہ کیا بات ہے۔"

رضوان تنولی کریم پڑوی، اورنگی ناؤن، کراچی سے تشریف لاتے ہیں (ہم قارئین کے نمبر شائع کر دیا کرتے تھے جس سے کچھ مشکلات پیدا ہوئیں، اب نمبر شائع نہیں کیے جائیں گے) "16 تاریخ کو 42 سنی گریڈ کی گری میں سورج اپنی محفل آب و تاب سے خرمین لیشن پر گری برسا رہا تھا ایسے میں عاشق سسٹمز کو معشوق سسٹمز مل جانا محض ذی خوشگوار ہوا میں کے نصیب ہوا۔ انکیشن ہو چکے ہیں جو توڑو، دھرنے احتجاج جاری ہیں۔ سرورق کو نظر انداز کر کے جلد اشتہارات چلا ننگ کے مرحوم جون ایلیا کے انکشافیہ بیان کا مطالعہ کیا، لکھتے ہیں کج آخر کیا ہے؟ بیچان کرو لا ایلیا جی، شیطان محفل کے اپنی شیطانوں میں مصروف ہیں سچا جی آپ لکھتے ہیں اس ماہ محفل کا قاتل گون ہو گا تو جب کھڑے کی دس کا پتا میدان میں سپاہی کا ناز جنگ میں، پہلوان کا اکھاڑے میں اور قاتل محفل کا چ نظروں کی اس محفل میں ہو گا۔ صدر محفل شریلی کو کرسی صداوت اور شادی کی ڈمٹی مبارکباد، کستوری لگا کے۔ ابرار وارث سسٹمز کا ناکھل اب میں سا ہو یا شیخیں سا عاشقان سسٹمز کو سرورق سے نہیں صرف سسٹمز سے پیار ہے۔ حکیم سید محمد رضا شاہ جی، اللہ پاک آپ کی زبان مبارک کرے اور ہمیں قابل غر قیادت میرا آئے، آمین۔ روایا ہجرت محفل میں جب تک محفل کا رنگ نہ ہو جیسے قاری کو مزہ نہیں آتا۔ سعید عباسی اگر کسی ساقی کو سرورق حیدر پند نہ آئے تو اس کے لیے صرف 2 صفحے پلٹنے کے بعد دور لگی ہو ہو ہے کستوری لگا کے۔ بار عباس، آپ کی تشریف کے لیے اتنا کہوں گا آپ کی باتیں کرداروں کی اور دکان پکڑوں کی۔ ساجد راجا جانے اپنی

دھاک اور رعب و دبدبہ جانے کے لیے جی بکھاری کہ میری کہانی کو ایک ڈائجسٹ کے لیے پہلا انعام ملا۔ محترمہ اس ڈائجسٹ کا نام کیا ہے؟ کیا عالم روایت میں شائع ہوتا ہے؟ جی ہاں قیصر اقبال، ارے سچے تو ہوں کیا جنگل سے برآمد ہونے والی نرالی مخلوق ہے، ارے کچھ ہے یا اس لیے چکا ناخر میں کر جاتا ہے، پھوڑ دیکھتے بے چارے کو۔ باقی طاہرہ مگر ارہ مجھے آپ سے عمل اشفاق ہے اور سر جی کی کاٹ چھانٹ کی تیار چلائی تیار سے زیادہ مہلک اور خطرناک ہے اس لیے طاہرہ جی اپنے سر جی کی کو معاف نہیں کرتے کستوری لگا کے۔ فٹ کھٹ دوست ش حررا تیل اعجاز المعروف جگہ تبصرہ لکھا کرو فیئر۔ تبصرہ برائین آپ کے لیے ڈھیر ساری دعا میں، آپ بہت گریٹ ہیں۔ محترمہ قدرت اللہ نازی، آپ کی شاعر و جملہ انفرادی نے رضوان تنولی کو بہر شہر بنادیا۔ بھیا نعیم سلطان، ہم تو سرے کفن باندھ کے اس محفل میں کودے ہوئے ہیں۔ کہانیوں کی ابتدا ساجد بھگت کی امیر غلام سے کی تحریر، اگر صرف یہ نہ تھیں بلکہ درد رقی تو مزہ دیتی بہت سارے کرداروں نے داستان کو گول گنڈہ بنا ڈالا اس لیے نہ تو کچھ سمجھ آئی اور۔ لطف آیا۔ مسافر میں جب سے چند ماقبلی واقعات شروع ہوئے ہیں کہانی میں پہلے سے زیادہ کھار آتا جا رہا ہے۔ ناصر ملک سے درخواست کروں گا کہ استاد صوفی رضوان والا کردار کافی اچھا لگا اس لیے اس کردار کو کم نہیں کرنا آئے والی اقتضا میں اس کردار کو رول دیتے رہا کرنا۔ حیرت دہر اور راورانی کہانیوں پر قاضی مانے جانے والے انوار صدیقی کی مشکول توال کے بعد عروج کی جانب گامزن ہو چکی ہے، کہانی کافی اقتضا میں سست رہنے کے بعد اب چست ہوتی جا رہی ہے۔ آخری صفحات کا ناور و تاب یاب محمد عائشہ قاسم نے مضبوط پلاٹ پہنچی مٹی دولت کے پاؤں کے روپ میں دیا، کرائے کا ٹیکسی ڈرائیور عبدالرشید کہاں سے کہاں پہنچا اور پھر اپنی چوری چھاری والی شروع کی جانب والی ایک بے ایمانی سے واپس اس مقام ٹیکسی تک آیا۔ عبدالرشید کے لیے پنجابی کی مشہور و معروف کہاوت جیسے دی کھوتی اتھے آن کھوتی۔ محفل شعر و سخن میں مہربان ناز محمد حقیل چشمہ قدرت اللہ نازی کا انتخاب بہت عمدہ لگا۔ کتر تیں گز ارہ لائی رہیں۔"

امیر ار وارث، درآباد، سندھیلی نوالی سے حاضر ہوئے ہیں "کہنا تھا میرے نمبر پر دیکھ کر دل کا رڈن گا رڈن ہو گیا۔ جنگل کے بادشاہ شری محفل ہماری محفل کا بادشاہ بھی شری تھا بھی کرسی صدارت مبارک۔ پلیز آپ سب سے گزارش ہے کہ مجھے یہ میں میں تو تو نہیں کرنا آتی، پلیز مجھے بھی سکھا دیں۔ (کمال ہے) سب سے پہلے مسافر سے اسٹارٹ کیا، کہانی کا پتا ہی نہیں چلا کب ختم ہوئی۔ چند پرتو شاہی نظام کے ریکارڈ تو ڈیجیٹل والوں نے۔ چند کے لیے اچھے خدمات سے بچنے کا بھی طریقہ تھا کہ وہ رضوان سے ہی شادی کر لیتی۔ عائشہ قاسم کی دولت کے پاؤں پڑی، بڑی جاندار تحریر تھی۔ واقعی میں عبدالرشید کے پاس دولت شہر جتنی جلدی آئی تھی اس سے بھی جلد سب کچھ چمن گیا۔ عرمیم کے خان اور کاشف زہیر کی کہانیاں تو شمار کی جان تھیں۔ اشعار میں سب سے زیادہ محفل چشمہ کا شعر پسند آیا۔ باقی احمد حسن عرشی، مہربان ناز محمد بشارت، سلطان قائم خانی اور حسنین ہاشمی کے اشعار پسند آئے۔ بانی کہانیاں انہی زیر مطالعہ ہیں۔"

تفسیر عباس، بابر، اوکاڑہ سے اپنی محفل میں شریک ہیں "انکیشن میں سلیکشن کے۔ صبر آزما صرطلے کے بعد عمام کو ایک دفعہ پھر، امید کے کچے دھاکوں کا سہارا، منہ روت چہروں کو نہیں، نظام کو بد لے کی ہے۔ جون کا گہر نایاب 16 مئی کی سر مئی شام کے وحدہ لگے میں شہر دل کی سرحد تک۔ تفصیل جسم و جان سے گزرتے ہی سرورق نے کافی سے زیادہ مایوس کیا۔ آغاز بزم یادیں میں ادارے کا فکرا نگیز ادارہ۔ ریاست اور سیاست کی باتیں، لیکن اب ریاست یا سیاست کا نہیں۔ بلکہ وراثت کا مسئلہ ہے۔ پہلا خط خاتونال کے شریلی خان نے مجاہد عزائم کے ساتھ رقم کیا۔ آپ بھی جہاز ذرا فوج میں شامل ہو کر بیوی کو پیارے ہو رہے ہیں گویا۔ اللہ آپ کو کامیاب و سرخرو فرمائے۔ کراچی سے اور نہیں احمد خان کے شعر بلکہ۔ شیر نے دعوت فکر کا خصوصی اہتمام کیا۔ گویا آپ کب تک۔ عائشہ کا وہ زمانہ یاد ہے۔ 99 اور سے دیا اعجاز بھی و انت تیز کرنے میں مصروف محفل ہیں۔ گول سے قیصر اقبال گچے کے چلنے اور چلنے بھی زبردست رہے، آپ نے وضاحت نہیں فرمائی کہ پہلا کون ہے اور دلا کون؟ اور ماقبلی بے چاری کو مست چھیڑو۔ ان کے کوسے میں اب تیل و ستیاب نہیں ہے۔ کوسے سے شہزاد حبیب کی لالچی نے دعوت فکر دی، شہزاد مطہر رہے۔ دیر ہے اعدہ تو نہیں۔ کھاریاں سے بار عباس۔ بھٹیا کی دولت، یعنی اللہ کی رحمت کے نزول پر مبارکباد قبول فرمائیے اور عہد قدیم کی خطرناک ترین مخلوق قوم یا جوج یا جوج کو مت پکارتے۔ براہقت اور مصیبت پچھ کر نہیں آتی اور آپ جنہیں یاد کر رہے ہیں مثلاً ماہا ایمان، اریضہ وغیرہ تو اب تو ان کی خطر کے قدیم ترین چشمے بازار میں بھی دستیاب نہیں ہیں۔ سرگودھا سے ساجد راجا باوثوق ذرائع کے مین ملائیں آپ کو انعام دینے والے اپنے کے پرکائی شرمندہ ہیں۔ اوکاڑہ سے بہت براری تصویر انہیں، دل سے یاد رکھنے اور دل سے یاد کر کے کا از حد شکریہ۔ دیگر گندہ احباب میں اسے ایم یعنی آسہ مقبول چوہدری، ولشیں بلوچ اور آغا فرید احمد خان قسم سے، بہت یاد آتے ہیں۔ ابتدائی صفحات پر کتر شمس مصنف، حقیق دوراں ڈاکٹر ساجد بھگت نے۔ خزینہ کتب تواریخ سے ایک اور گوہر نایاب دریافت کیا۔ یہ تاریخی واقعات عہد حاضر کے حکمرانوں کے لیے درس عبرت ہیں۔ ناصر ملک کی تحریک تحریر، راہ لست کے لشیب و فراز پر۔ ایک مسافر بے نو کی سچ طویل مسافت۔ مسافر اپنی مثال آپ ہے، چند ماقبلی کی اثر انگیز روداد نے سکور کر کے دکھ دیا ہے۔ اب دیکھئے کہ چند سے مزید نکلیں گے۔ کے سفر کے دوران پردہ تقدیر سے کیا کچھ ظہور پڑے ہوئے ہے۔ انوار صدیقی کی مشکول ایک بھر اہتوال سلسلہ انمول ثابت ہو رہی ہے۔ آخری صفحات کا تو شہر خاص، عائشہ قاسم کی دولت کے پاؤں خواہشات کے تاج گل کی بنیادوں میں، خون ناحق شامل ہو تو یہی انجام ہوتا ہے۔ احمد اقبال کی استوری آف دی مینجھ سر پر اثر نے کالی المردہ کیا۔ بزم اشعار میں قارئین کے معیار و ذوق کی داد بخا ضروری ہے۔"

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔
مہربان ناز، حیدر آباد، احمد خان توحید، الطورانی، انسل، کراچی۔ ماریہ فاروق، جمن۔ چوہدری ماسم اقبال، خیال، ڈسٹرکٹ خیال سرگودھا۔ عامر ونگراں، پشاور۔ حافظ شاہد عمر، چوہدری سینٹرل خیال کوبرا نوال۔ ابن مقبول جاوید احمد مدنی، راولپنڈی۔ سوہانی، لاہور۔ حسب احمد چائے، والکڈی کرک۔

نختم گل

ڈاکٹر ساجد مجید

جب فرش کی خاک عرش پر چاند بن کر چمکتی ہے تو بہت سی آنکھوں میں حیرانی کی چمک آجاتی ہے... بالآخر دن رات کے الٹ پھیر سے تاریخ ان لمحات کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے۔ جس دنیا کا آسمان رنگ بدلتا ہو وہاں کی زمین پر رہنے والے ہل ہل روپ بدلتے ہیں۔ اس کا رنگ روپ بھی دیکھتے ہی دیکھتے بدلتا گیا حتیٰ کہ حضرت نظام الدین اولیا کی پیش گوئی درست ثابت ہو گئی اور وہ... جو کہ ایک غریب الوطن اور پریشان حال عام سنا آدمی تھا دکن کی بادشاہت نے اس کے دروازے پر دستک نہ ڈالی مگر تمام ترک ٹھٹھائیوں کے باوجود اس سارے سفر میں ایک دلربا چہرے نے اسے اپنی محبت کے حصار میں یوں قید کیے رکھا کہ کسی تکلیف کا احساس تک نہ ہو پایا اور وہ ایک عزم اور حوصلے سے اس طرح بڑھتا گیا کہ پھر اس نے پلٹ کر دیکھنے کی زحمت تک گوارا نہیں کی یہ اور بات کہ چاہت اس کے ہم قدم تو نہ چل سکی مگر تصور کی دنیا کو آخری سانس تک سجائے رکھا اور اس نے بھی محبت کے اس سفر میں جانے والی کی آخری نشانی گیندے کے پھولوں سے اپنی سلطنت کو مہکادیا... کہ کچھ تو حق ادا اسے بھی کرنا تھا، سو کر دیا۔ سچ ہے محبت بادشاہ یا فقیر نہیں دیکھتی بس دل دیکھتی ہے اور پھر اسیری کا یہ طوق بخوشی گلے میں ڈالے رکھتی ہے۔ یونہی تو کوئی تاریخ میں امر نہیں ہو جاتا۔



سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا کی خانقاہ مرجع خلائق کے سامنے فقیروں اور سپاہیوں کی بھیڑ جمع تھی۔ سپاہی اس لیے کھڑے تھے کہ ایک طرف شاہی ہاتھی کھڑا جھوم رہا تھا جو اس بات کی علامت تھا کہ شہزادہ محمد تغلق (الغ خاں) نیاز مندی کو حاضر ہوا ہے۔ یہ سپاہی شہزادے کی حفاظت کے لیے پہرہ دے رہے تھے۔ فقیروں کی معمول سے زیادہ بھیڑ اس لیے تھی کہ شہزادے کی فیاضی ضرب المثل تھی۔ وہ جب سوار ہوتا تھا تو اشرافیوں کے قہال لٹاتا ہوا چلتا تھا۔ یہ فقیر، غریب اور مساکین شہزادے کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔

ایک فقیر ان سب میں نہایت الوکھا تھا۔ کپڑے فقیروں کے چہرہ بادشاہوں کا۔ آنکھوں میں اطمینان، جوڑی پیشانی پر اقبال مندی کی تحریر البتہ وضع قطع سے گھبراہٹ طاری تھی۔ دوسرے فقیروں سے الگ تھلک ایک درخت کے نیچے کھڑا تھا۔ دوسرے فقیر بار بار خانقاہ کے دروازے کی طرف بڑھتے تھے جنہیں سپاہی پیچھے دھکیل دیتے تھے جبکہ اس شخص کو کسی سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ یہ غیاث الدین تغلق کا دور حکومت تھا اور شہزادہ محمد تغلق اس کا ولی عہد تھا لہذا اس کی شان و شوکت کسی طرح سلطان سے کم نہیں تھی۔

سلطان غیاث الدین، حضرت نظام الدین اولیا سے ولی رنج رکھتا تھا۔ کسی طور یہ نہیں چاہتا تھا کہ شہزادے اور اکابرین سلطنت حضرت نظام سے ربط ضبط رکھیں یا ان کی خانقاہ پر حاضری دیں لیکن اس کی ستادی کے باوجود اکابرین سلطنت پروانوں کی طرح کھینچے چلے آتے تھے۔ خصوصیت سے سلطان کے بھائی کا بیٹا فیروز شاہ تو سخت عقیدت مندوں میں تھا۔ شہزادہ محمد تغلق بھی بھی حاضری دیا کرتا تھا۔ اس وقت بھی وہ خانقاہ میں موجود تھا اور باہر بھیڑ جمع تھی۔

درخت کے نیچے کھڑا ہوا مسکین شخص اپنے دل میں سوچ رہا تھا کہ وہ غلط وقت پر آ گیا ہے۔ شہزادے کے ہوتے ہوئے اسے باریابی کا موقع کیسے مل سکتا ہے۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ واپس چلا جائے اور پھر کسی وقت آئے کہ بھیڑ میں الجھل ہوئی۔ معلوم ہوا شہزادہ خانقاہ سے باہر آ رہا ہے۔ پھر اس نے دیکھا کہ مزدوروں پر خوان اٹھائے چلے آ رہے ہیں۔ مزدوروں نے باہر نکلتے ہی زور جواہر لٹانے شروع کر دیے۔ فقیر اسے لوٹنے کے لیے ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے۔ اسی لوٹ مار میں شہزادے کی حفاظت کے لیے آئے ہوئے سپاہی بھی شامل تھے۔ ایک سپاہی نے اس سے بھی کہا۔

”غریب معلوم ہوتے ہو۔ ایک اشرافی بھی مل گئی تو دن بھر جائیں گے۔ لوٹتے کیوں نہیں؟“

”میں غریب ضرور ہوں لیکن خیرات پر زندگی گزارنے کے حق میں نہیں ہوں۔ میں تو شیخ سے ملنے آیا ہوں۔ جو کچھ وہ دیں گے اسے لے لوں گا۔“

”وہاں سے تو“ جو“ کی روٹی ملے گی۔“

”میرے لیے وہی بہت ہے۔“

کچھ دیر میں شہزادہ باہر آیا۔ اس کے ہاتھی نے سوڈا اٹھا کر اور ایک مخصوص آواز نکال کر اسے سلامی دی اور بیٹھ گیا۔ طلائی سیڑھی لگا دی گئی۔ شہزادہ اس سیڑھی کے ذریعے ہاتھی پر بیٹھ گیا۔

شہزادے کے اٹھ جانے کے بعد حضرت نظام الدین اولیا کچھ بے چین سے نظر آنے لگے تھے۔ بار بار نظر اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھ لیتے تھے۔ انہوں نے خادم کو بلایا۔

”ایک سلطان رخصت ہوا دوسرا سلطان دروازے پر کھڑا ہے۔ جاؤ اسے بلا کر لے آؤ۔“

خادم خانقاہ سے باہر آیا۔ ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ طبل و علم تھے، نہ مریض باہمی نہ جڑاؤ گھوڑے۔ نہ زمین نہ عمارت، زمین خالی تھی ساری۔ کسی سلطان کا نام نشان نہیں تھا۔ وہ مسکین شخص درخت کے نیچے اب بھی کھڑا تھا۔ غالباً سوچ رہا تھا، شہزادہ رخصت ہو گیا، جیڑ جھٹ گئی۔ اب وہ اپنی قسمت آگے مانے۔ دروازے پر چائے اور کسی خادم سے بات کرے۔

خادم ابھی طرح دیکھ بھال کے واپس چلا گیا۔ ”حضور، باہر تو کوئی سلطان نہیں ہے۔ ایک مسکین صورت مفلوک الحال شخص ضرور کھڑا ہے۔“

”ہاں، وہی تو ہے جسے تاجدار ہونا ہے۔ جلدی کرو اسے بلا کر لاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ مایوس ہو کر واپس ہو جائے۔ اس کی قسمت کا دروازہ کھلنے سے پہلے بند ہو جائے۔“

خادم دوبارہ باہر آیا۔ مسکین صورت شخص مایوس ہو کر درخت کی مخالف سمت چل پڑا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ کسی اور دن قسمت آزمائی کرے گا۔

کوئی شخص اسے بلا رہا تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ امید کی شمع پھر دل میں روشن ہو گئی۔ اس نے اٹے قدموں چلنا شروع کر دیا۔

”بھائی تم خوش قسمت ہو۔ حضرت شیخ نے تمہیں خود طلب کیا ہے۔“

”بھائی اگر وہ مصروف ہیں تو میں پھر کبھی آ جاؤں گا۔“

میری پریشانیوں تو چلتی ہی رہیں گی۔“

”تو کیا تم ان کی حکم عدولی کرو گے؟“

”یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔“

”تو پھر چلو۔ گھر آئی دولت کو کیوں لوٹاتے ہو۔“

وہ شخص اس خادم کے ہمراہ خانقاہ کے اندر آ گیا۔ حضرت شیخ نظام الدین اولیا مسند پر تشریف فرما تھے۔ اس وقت وہ تنہا تھے صرف دو فقیر ان سے کچھ فاصلے پر بیٹھے ذکر و اشغال میں مشغول تھے۔

اس شخص نے اندر داخل ہوتے ہی حضرت شیخ کے قدموں میں سر رکھ دیا۔ حضرت نے پاؤں سکڑ لیے۔

”مراٹھاؤ، یہ سر جھکنے کے لیے نہیں بنا ہے۔“

”میرا نام حسن ہے۔ دارالسلطنت میں نیا نیا داخل ہوا ہوں۔ تنگدستی سے پریشان ہوں۔“

کھانا ختم ہو چکا تھا۔ حضرت شیخ نے اپنے اظہار کے لیے جو کی روٹی رکھی تھی۔ اس میں سے تھوڑی سی روٹی اپنی انگلی کے سرے پر رکھ کر حسن کو دی۔

”یہ دکن کی حکمرانی کا تاج ہے جو بہت کمکش، محنت اور عرصہ دراز کے بعد تیرے سر پر رکھا جائے گا۔“

وہ کہتے کہتے رہ گیا کہ یہ تاج جب رکھا جائے گا تب رکھا جائے گا ابھی کی تنگدستی کیسے دور ہو۔ اس وقت تک بھوک سے بچوں کا توجان سر پر رکھوں گا۔

پاس ادب سے قوت کو یا کی چلی گئی تھی۔ کچھ بھی تو نہ کہہ سکا۔ یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ حضرت روشن ضمیر ہیں۔ میری پریشانیوں سے واقف ہوں گے۔ میرے حق میں ضرور دعا گو ہوں گے۔

وہ وہاں سے اٹھا تو کوئی واضح جواب نہ ملنے کے باوجود اس کا دل مطمئن تھا۔

خانقاہ سے نکل کر گھر کی طرف چل دیا۔ ابھی گھر میں داخل بھی نہیں ہوا تھا کہ گیندے کا ایک پھول اس کے قدموں میں آ کر گرا۔ اس نے گردن اٹھا کر اوپر کی طرف دیکھا۔ برابر کے گھر میں ایک در پچھلا ہوا تھا مگر اس وقت اس میں کوئی تھا نہیں۔ یہ سمجھنے میں اسے دیر نہیں لگی کہ در پچھنے میں کوئی لڑکی ہوگی جس نے یہ پھول اس کی طرف اچھالا ہے۔ اس کی عمر اور خوبصورتی یقیناً ایسی تھی کہ کوئی بھی لڑکی اس میں دلچسپی لے سکتی تھی لیکن اس وقت وہ جن حالات میں گھرا ہوا تھا، اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ کسی کی دلچسپی کا جواب دلچسپی سے دیتا۔ اس نے در پچھنے پر نظریں جمائے رکھنے کے بجائے اسی میں عافیت جانی کہ

گھر میں چلا جائے اور مستقبل کی فکر کرے۔

چند ہی روز ہوئے تھے کہ وہ ایران سے دہلی میں وارد ہوا تھا۔ وہ اچھے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ بہت کچھ جمع پونجی ساتھ لایا تھا جس سے اس نے یہ مکان خرید لیا تھا۔ اس کے پاس اب بھی کچھ رقم تھی لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ یہ رقم جلد ہی خرچ ہو جائے گی۔ کچھ ایسے حالات تھے کہ ایران واپس بھی نہیں جاسکتا تھا۔ اسے اسی شہر میں رہ کر کوئی مقام حاصل کرنا تھا۔ اس کے لیے وہ ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ وہ پیدل چل کر آیا تھا۔ تھک گیا تھا۔ تھکن اتارنے کے لیے بستر پر لیٹا تو اسے نہ جانے کیوں اس پھول کا خیال آیا جو اس کے قدموں میں آ کر گرا تھا۔ پھول سے زیادہ اسے یہ خیال پریشان کر رہا تھا کہ اس پھول کو پھینکنے والا یا پھینکنے والی کون ہے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کسی نے کتنی چاہت سے پھول پھینکا تھا اور میں اسے یونہی باہر پڑا چھوڑ آیا۔ وہ اٹھ کر دروازے پر گیا، پھول اب بھی زمین پر پڑا تھا۔ اس نے جھک کر پھول اٹھایا اور غیر ارادی طور پر در پچھنے کی طرف دیکھا۔ معاملہ ہو گیا۔ ایک لڑکی، نہایت خوب صورت اس کی طرف محویت سے دیکھ رہی تھی لیکن اس سے نظریں چار ہوتے ہی وہ در پچھنے سے ہٹ گئی۔ حسن کی نظریں انتظار کرتی رہیں کہ وہ در پچھنے پر پھر آئے گی لیکن وہ نہیں آئی۔ حسن مایوس ہو کر گھر میں آ گیا۔ پھول اب بھی اس کی منگی میں بند تھا۔ اس نے پھول کو تنکے کے نیچے رکھا اور آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ پھول کسی اور نے پھینکا ہو اور وہ لڑکی بعد میں وہاں آئی ہو۔ نہیں، وہ جس طرح شرمناک رہا ہے اسی سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ پھول اسی نے پھینکا تھا مگر کیوں؟ یہ سوچنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس نے آنکھیں بند کیں اور سو گیا۔

خواب میں بھی وہ اس لڑکی کو دیکھتا رہا تھا۔ کسی وقت آنکھ کھلی۔ شام کے وقت وہ بازار کی سیر کو ضرور جایا کرتا تھا۔ اس وقت بھی تیار ہوا اور نکلتے کے لیے گھر سے باہر قدم رکھا۔ اس مرتبہ دو پھول اس کے قدموں میں آ کر گرے۔ اس نے پھولوں کی طرف دیکھنے کے بجائے در پچھنے کی طرف دیکھا تا کہ چور پکڑا جائے۔ اس کی نظر پڑتے ہی لڑکی نے در پچھ چھوڑ دیا لیکن حسن اسے پہچان چکا تھا۔ اب اس میں کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ پھول پھینکنے والی وہی ہے کوئی اور نہیں۔ حسن کے ہونٹوں پر تبسم پھیل گیا لیکن اسے معلوم تھا کہ اب وہ نہیں آئے گی۔ وہ آگے بڑھ گیا۔ لوٹ کر آیا تو لا محالہ اس کی نظر در پچھنے کی طرف اٹھ گئی۔ در پچھ

کھلا تھا مگر سناں تھا کوئی پھول بھی آکر نہیں لگا تھا۔

وہ جب بازار سے آیا تھا تو گیندے کے چند پودے اس کے ہاتھ میں تھے۔ اس نے یہ پودے گھر کی ایک کیماری میں لگا دیے۔ اسے اچانک گیندے کے پھولوں سے مشتق ہو گیا تھا۔ وہ بہت دیر تک ان پودوں میں لگے پھپھ کر دیکھ رہا تھا کیونکہ جب وہ دوسرے دن صبح ہی صبح اٹھا اور ان پودوں کو پانی دینے لگا تو اس نے دروازے پر ہلکی سی دھک سنی۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا اور پتھر بن گیا۔ ایک لڑکی اس کے سامنے کھڑی تھی۔ یہ یقیناً وہی لڑکی تھی جسے وہ درجے میں دیکھ چکا تھا۔

”مجھے اندر آنے کو نہیں کہو گے۔ میں تمہارے گیندے کے پودے دیکھنے آئی ہوں۔“

”ہاں ہاں اندر آؤ۔ میں تو یوں حیران ہو رہا تھا کہ میں تمہیں جانتا نہیں۔“

”اندروں بلاؤ۔ میں یہ بھی بتا دوں گی کہ میں کون ہوں۔“

اس نے راستہ دے دیا اور وہ اندر آ گئی۔

”میرا نام جے ماما ہے۔ آپ کے پڑوس ہی میں تو رہتی ہوں۔“

”اچھا اچھا بڑی خوشی ہوئی تمہیں دیکھ کر۔“

”میں تمہارے پودے دیکھنے آئی ہوں۔“

”ہاں ہاں خوب دیکھو۔“

”تمہیں گیندے کے پھول اچھے لگتے ہیں؟“

”پہلے تو نہیں لگتے تھے۔ اب اچھے لگنے لگے ہیں۔“

”آپ کو زمین پر پڑے ہوئے پھول اچھے نہیں لگتے ہوں گے۔“

”زمین پر پڑے پھولوں ہی نے تو مجھے یہ ترغیب دی کہ میں پودے گھر میں لے آیا لیکن یہ مجھ میں نہیں آیا کہ اتنے حسین پھول زمین پر پھینکتا کون تھا۔“

”میں وہ پھول زمین پر پھینکنے کے لیے تو نہیں بھیجتی تھی۔“

”اچھا تو وہ پھول تم بھیجتی تھیں۔“

”آپ کی سندر تانے مجھے مجبور کر دیا تھا۔ اگر آپ کو برا لگا ہے تو معاف کر دیں۔“

”مجھے برا نہیں لگا لیکن میرے حالات ایسے ہیں کہ مجھے یہ سب اچھا نہیں لگا۔“

”آپ مرد ہو کر یہ بات کہہ رہے ہیں۔ مرد تو اپنے

حالات خود دیتا ہے۔“

”میں اس شہر میں نیا آیا ہوں۔ ابھی تو راستے حلال کر رہا ہوں۔“

”میں پوچھ سکتی ہوں مہاراج کہاں سے پدمارے ہیں؟“

”میرا وطن ایران ہے۔ ماں باپ ایک مقامی لڑائی میں مارے گئے۔ میری جان کو بھی خطرہ تھا لہذا میں تقدیر بنانے یہاں چلا آیا۔“

”میرے پتائی تعلق کے دربار میں ہیں۔ میں ان سے تمہارا ذکر بھیجوں گی۔ شاید تمہیں کوئی ملازمت مل جائے۔“

”ہاں ضرور کرنا۔ پھر آگے بڑھنا میرا کام ہے۔“

جے ماما اسے چند ہی روز میں پرستش کی حد تک چاہنے لگی تھی۔ اب پھول پیسٹک کر متوجہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ خود اس سے ملنے آ جاتی تھی۔ دونوں مل کر پودوں کو پانی دیتے اور خوب باتیں کرتے تھے۔

”آپ کو معلوم ہے میں آپ سے پریم کرنے لگی ہوں۔“ ایک دن جے ماما نے کہا۔

”میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میرے حالات ایسے ہیں کہ یہ سب مجھے اچھا نہیں لگتا۔ کیا خبر مجھے کہاں جانا پڑے اور تمہیں جدائی کا دکھ دے کر چلا جاؤں۔“

”جدائی تو میری قسمت ہے۔ ہم دونوں کا دھرم ہمارے حق ہے۔ تم مسلمان ہو اور میں ہندو۔ ہم دونوں ایک نہیں ہو سکتے۔ جب تک وہ وقت نہیں آتا میں تمہاری پوجا کرتی رہوں گی۔ بس ایک وعدہ کر دو۔ پھر ہم بھی جدا نہیں ہوں گے۔“

”کہو کس بات کا وعدہ لینا ہے؟“

”جب تک ہم زندہ ہیں دونوں میں سے کوئی شادی نہیں کرے گا، نہ تم، نہ میں۔ ہم میں سے کوئی مر جائے تو زندہ رہنے والا آزاد ہوگا۔“

جب وہ یہ عہد لے رہی تھی تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ حسن نے اس سے کئی مرتبہ کہا کہ وہ اس کا خیال چھوڑ دے۔ وہ پردہ کی ہے، کیا خبر کس طرف نکل جائے لیکن جے ماما تو جیسے اس پر ڈار تھی۔ چپکے چپکے یہ کوشش بھی کرتی رہی کہ کس طرح حسن کو کوئی ملازمت مل جائے تاکہ وہ حالات کا رونا بند کر دے لیکن اس کی قسمت کی سختی تھی کہ کم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔

ایک دن جے ماما اس کے گھر آئی تو بہت خوش تھی۔

”نکل تم کہیں مت جانا۔ میں کسی وقت بھی تمہیں

بلائے آؤں گی۔ تمہیں میرے ساتھ میرے گھر چلنا ہوگا۔“

”کیوں، کیا تمہارے پتائی کو مجھ پر رحم آ گیا؟“

”وہ تو ہمیشہ ہی تمہاری تعریف کرتے ہیں۔ مجھے تو تمہیں کسی اور سے ملوانا ہے۔“

”یہ کیا تم پہیلیاں بھجواتی رہتی ہو۔ صاف صاف کیوں نہیں بتائیں۔“

”میں بتانا تو نہیں چاہتی تھی مگر تم غما ہو رہے ہو تو بتائے دیتی ہوں۔ کل ہمارے گھر گنگو برہمن براہمن ہو رہے ہیں۔ تمہارا ان سے ملنا ضروری ہے۔“

”مجھے ان سے کیا دلچسپی۔ ہاں تمہارا گھر اندر سے دیکھنے ضرور آ جاؤں گا۔“

”ارے تمہیں نہیں معلوم۔ وہ بہت بڑے جوتی (منجم) ہیں۔ شہزادہ غفلت تمام کام انہی سے پوچھ کر کرتا ہے۔ ان سے میں تمہاری جنم کنڈلی نکھواؤں گی۔ معلوم تو ہو تمہارے حالات میں سدھار کیوں نہیں آ رہا ہے۔“

”یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ کوئی کسی کی قسمت کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تمہیں شاید معلوم نہیں میں حضرت نظام الدین اولیاء سے بھی ملا تھا۔ انہوں نے پتا ہے میرے بارے میں کیا کہا ہے؟“

”کیا کہا ہے۔“

”تم سنو گی تو ہنسو گی۔ انہوں نے مجھے خوش خبری سنائی ہے کہ میں دکن کا تاجدار بنوں گا۔“

”مجھے ذرا بھی ہنسی نہیں آتی۔ انہوں نے کہا ہے تو جج ہی کہا ہوگا۔ تم تو چاہتے ہو چٹ مگنی ہو اور پٹ بیوا ہو جائے۔“

”ہاں انہوں نے یہ کہا ضرور تھا کہ مجھے یہ مرتبہ بہت محنت اور عرصہ دراز کے بعد ملے گا۔“

”میں تو کہتی ہوں ان کی یہ بات پوری ہونے کو ہے۔“

”تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو؟“

”گنگو برہمن شہزادے کے بہت قریب ہے۔ شہزادہ ان کی کوئی بات نہیں مانا۔ ہو سکتا ہے وہ تمہیں شہزادے کی ملازمت و لوادے اور تم ترقی کرتے کرتے دکن کے بادشاہ بن جاؤ۔“ یہ کہتے کہتے وہ اداس ہو گئی۔

”تم خوش ہونے کے بجائے اداس کیوں ہو گئیں؟“

”تم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ تم دکن کے بادشاہ بن گئے تو مجھ سے دائمی دور چلے جاؤ گے۔“

”ارے اس وقت تو میں بادشاہ ہوں گا۔ تمہیں زبردستی اٹھا کر لے جاؤں گا۔ بادشاہوں کی تو ہندو رانیاں

بھی ہوتی ہیں۔“

”سچ کو حسن۔“ جے ماما نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ”تم اگر راجا بن گئے تو مجھے یہاں آؤ گے۔“

”میں اس وقت تک تخت پر قدم نہیں رکھوں گا جب تک تم سے شادی نہیں کر لیتا۔ اس وقت کس میں ہمت ہوگی جو انکار کرے۔“

”تب کی تب دیکھی جائے گی۔ کل گھر پہ رہنا۔ میں بلائے آؤں گی۔“

حسن کو گنگو برہمن سے ملنے کا کوئی شوق نہیں تھا لیکن قسمت کا حال جاننے کا شوق کسے نہیں ہوتا۔ اسے بھی تھا۔ وہ دوسرے دن گھر سے بالکل نہیں نکلا۔

دو پہر کا وقت تھا کہ جے ماما اسے بلائے آ گئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ جے ماما کے پتا سے اس کی ملاقات ہو رہی تھی۔ وہیں گنگو برہمن بھی بیٹھا تھا۔ جے ماما نے اس کا تعارف ایک اچھے ہمسائے کی حیثیت سے کرایا۔ اس سے پہلے کہ جے ماما جنم کنڈلی کا ذکر کرتی حسن نے اپنی تنگدستی کا ذکر بھیج دیا۔

”مجھے کوئی ایسی نوکری یا روزگار مل جائے جس سے میں اپنا کفیل ہو سکوں۔“

اپنے خاندان اور دہلی میں وارد ہونے کا ذکر وہ پہلے ہی کر چکا تھا۔ گنگو برہمن اس کے حالات سن کر بہت متاثر ہوا تھا اور اس کی دل سے مدد کرنا چاہتا تھا۔ اس نے حسن کے ساتھ یہ ہمدردی کی کہ اسے نواح دہلی میں شجر زمین کا ایک ٹکڑا ایک جوڑی نکل اور کام کرنے کے لیے دو مزدور دے دیے تاکہ اس زمین پر کھیتی باڑی کر کے اپنا پیٹ پال سکے۔

اس موقع پر جے ماما نے اس کی جنم کنڈلی کا ذکر بھیج دیا لیکن گنگو برہمن نے دلچسپی نہیں لی اور نالٹے ہوئے کہا کہ جنم کنڈلیاں تو بڑے لوگوں کی ہوتی ہیں حسن مہاراج تو مزدور ہیں۔ ان کی محنت ہی ان کی جنم کنڈلی ہے۔

”میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ حضرت نظام الدین نے ان کے بارے میں کہا ہے کہ ان کے سر پر دکن کی بادشاہت کا تاج رکھا جائے گا۔“

”اب تو جنم کنڈلی کی ضرورت ہی نہیں رہ گئی۔ وہ مہان ہیں۔ انہوں نے جو کہہ دیا وہ ضرور پورا ہوگا۔ اب میں ان کی قسمت کا حال کیا بتاؤں۔“

”ذرا یہ معلوم ہو جاتا کہ ایسا کب تک ہوگا؟“ جے ماما نے پھر اصرار کیا۔

”زیادہ چھانو گے تو کر کر ہی ہوگا۔ محنت کرتے رہو

جولائی 2013ء

پینس ڈائجسٹ

WWW.PAKSOCIETY.COM

اور وقت کا انتظار کرو۔ کسی وقت ہوا تو جہنم کھڑی نکال بھی لوں گا۔“

جے ماما نے زیادہ اصرار مناسب نہ سمجھا۔ گنگو برہمن کو جلدی بھی ہو رہی تھی۔ اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے حسن کو ہدایت کی کہ وہ اس کے گھر آ کر بیلوں کی جوڑی لے لے اور مزدوروں کو لے کر اپنی زمین پر چلا جائے۔

دوسرے دن حسن اس کے گھر گیا۔ بیلوں کی جوڑی اور مزدوروں کو لے کر زمین پر پہنچ گیا۔

مزدوروں نے زمین کو کاشت کے لیے کھودنا شروع کیا۔ ایک دن مزدور زمین میں مل چلا رہے تھے کہ ال کی نوک زمین کے اندر پھنس گئی۔ حسن کے کہنے پر مزدوروں نے بیلوں کو بھگانے کی کوشش کی لیکن ہزار کوشش کے باوجود ال کی نوک باہر نہ آ سکی۔ حسن نے مزدوروں سے کہا کہ گڑھا کھود کر دیکھیں، ال کس چیز میں پھنس گیا ہے۔ زمین کے اندر ایسی کیا چیز ہے جو ال کو باہر نہیں آنے دے رہی ہے۔

مزدوروں نے گڑھا کھودا تو معلوم ہوا کوئی زنجیر ہے جس میں ال کی نوک پھنس گئی ہے۔ اب تو اسے تھویش ہوئی کہ زمین میں زنجیر کیوں ہے۔

”یہاں کوئی خزانہ دفن ہے۔“ مزدوروں نے کہا۔
”خود اور کھودنا کہ معلوم ہو زنجیر کا دوسرا سرا کہاں ہے۔“
”اب تو آپ بالامال ہو جائیں گے۔ اس کا کچھ حصہ ہمیں بھی ملنا چاہیے۔“

”اگر یہاں خزانہ ہے تو نہ یہ میرا ہے نہ تمہارا۔ زمین کا مالک گنگو برہمن ہے۔ یہ خزانہ اسی کی ملکیت میں جانا چاہیے۔ میں اسے پہنچا دوں گا۔“

مزدوروں نے بے دلی سے کھودنا شروع کیا۔ ذرا سی کھدائی کے بعد ایک بڑا برتن نظر آنے لگا۔ زنجیر اس برتن کے منہ سے بندھی ہوئی تھی۔ برتن کھول کر دیکھا تو سب کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ سونے کے سے اور اشرفیاں لبالب بھری ہوئی تھیں۔

مزدوروں نے ایک مرتبہ پھر حسن کو مشورہ دیا کہ وہ نادانی نہ کرے اور اس خزانے کو اپنے قبضے میں لے لے لیکن حسن کی ایمانداری نے یہ قول نہیں کیا کہ آقا کی دی ہوئی زمین کے مال میں خیانت کرے۔

اس نے برتن کی تمام دولت ایک بڑی چادر میں باندھی اور گنگو برہمن کے مکان پر پہنچ گیا۔

”اس چادر میں کیا ہے حسن؟“
”یہ وہ خزانہ ہے جو مجھے آپ کی زمین سے ملا ہے۔“

حسن نے کہا اور پورا واقعہ بیان کر دیا۔
”یہ زمین اب تمہاری ہے۔ یہ خزانہ بھی تمہارا ہوا۔ جاؤ اور اپنی تنگدستی دور کرو۔“

”آپ نے مہربانی کر کے یہ زمین مجھے دی ہے۔ اس خزانے پر میرا کوئی حق نہیں۔“

گنگو برہمن اس کی ایمانداری سے بہت خوش ہوا اور دوسرے ہی دن وہ شہزادہ تغلق کے دربار میں حاضر ہوا اور شہزادے کو پورے واقعے سے آگاہ کیا۔ محمد تغلق کو بھی حسن کو یہ نادرہ کی پر حیرت ہوئی۔

”اس زمانے میں بھی ایسے لوگ ہو سکتے ہیں۔ مجھے یقین نہیں آتا۔ اتنی دولت دیکھ کر تو اچھے اچھوں کے ایمان خراب ہو جاتے ہیں۔ یہ کیسا شخص ہے؟“

”اگر آپ فرمائیں تو میں اسے آپ کے سامنے پیش کروں۔ آپ خود ملاحظہ فرما لیجئے گا۔“ گنگو برہمن نے کہا۔

”آپ نہ بھی کہتے تو میں اس سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کرتا۔“

حسن اپنے گھر میں بیٹھا تھا کہ گنگو برہمن اس سے ملنے آیا۔ یہ حیرت ہی کی بات تو تھی کہ تغلق کا مقرب خاص اس سے ملاقات کے لیے آیا تھا۔ وہ نہ صرف ملے آیا تھا بلکہ حسن سے اس طرح پیش آ رہا تھا جیسے حسن نہیں گنگو اس کا ملازم ہو۔

”آپ کیوں مجھے شرمندہ کرتے ہیں۔ آپ کی مہربانی سے میں زمین کا مالک بنا ہوں۔ آپ تو میرے آقا ہیں۔“

”کل تک میں بھی سمجھتا تھا لیکن آج معاملہ دوسرا ہے۔“
”آج کیا سورج مغرب سے نکل آیا ہے؟“

”کل جب میں نے آپ کی ایمانداری کو آنکھوں سے دیکھ لیا تو میں آپ کی جہنم کھڑی نکالنے پر مجبور ہو گیا کیونکہ میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ آپ معمولی آدمی نہیں ہو سکتے۔ آپ کی قسمت کا زانچہ بتاتا ہے کہ آپ کسی دن بلند اقبال اور باعزت ہوں گے اور کسی اونچے عہدے پر پہنچیں گے۔“

”اگر آپ کا حساب ٹھیک ہے تو شاید ایسا ہی ہو لیکن میں اپنے آپ کو اس وقت بھی آپ کا لو کر ہی تصور کروں گا۔“

”آپ مجھ سے ایک وعدہ کریں۔“
”میں وعدہ کرتا ہوں۔“

”اگر آپ کو کوئی باعزت عہدہ دنیا میں عطا ہو تو میرا نام بھی اپنے نام کا حصہ بنا کر لکھنا تاکہ میرا نام بھی حیات جاوداں حاصل کر لے۔“

زخمِ گل

”میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ ایسا ہی کروں گا۔“
”اپنے کس بچے پر مجھے اس لیے بھی نہیں ہے۔ آپ کا بچہ وہ خلق نے اپنے دربار میں طلب کیا ہے۔ شاید یہ بڑی کی رہیں آپ پر پھنسنے والی ہیں۔“

”مجھ میں کسی کی خاص بات ہے کہ شہر دے۔ مجھے اپنے دربار میں طلب کیا ہے۔ یہ بھی یقیناً آپ کی مہربانی سے ہو ہوگا۔ میں آپ کا احسان بھی نہیں بھولوں گا۔“

گنگو یہ کہہ کر چلا گیا اور جاتے جاتے کہا کہ وہ کل اس کے حریف بن جائے۔ وہ اسے لے کر تغلق کے دربار میں جائے گا۔

جے ماما اپنے درتجے سے دیکھ رہی تھی کہ گنگو برہمن اس کے گھر آیا ہے۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ حسن اب اتنا آدمی ہو گیا ہے کہ گنگو برہمن اس سے ملنے آیا ہے۔

گنگو برہمن کے رخصت ہوتے ہی وہ حسن کے گھر پہنچ گئی۔

”واہ بی! اب تم اتنے بڑے آدمی ہو گئے کہ درباری مجرم بننے لگے۔“

”دیکھ لو۔ اب میں کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں۔ شہزادہ تغلق نے مجھے اپنے دربار میں طلب کیا ہے۔ گنگو برہمن بھی بتا آیا تھا۔“

”یہ تو بڑی خوش کی بات ہے مگر بڑے آدمی بنتے ہی مجھے بھول مت جانا۔“

”میں تمہیں کیسے بھول سکتا ہوں۔ یہ رات مجھے تم ہی نے دکھایا تھا۔ گنگو برہمن سے مجھے تم ہی نے ملوایا تھا۔“

”مجھے سے پڑے پہن کر جانا۔ تم شہزادے سے ملنے جا رہے ہو۔“

”چھاتی، میں تمہاری سب دہایت پر بھی غل کروں گا۔“
”مجھے بتانا ضرور شہزادے سے کہ کیا کہا اور ہو سکے تو میرے ذکر بھی کرو دینا۔“

”شہزادے سے کہوں گا مجھے کوئی اچھی سی نوکری دو مجھے جے ماما سے شادی کرنی ہے۔“

جے ماما شرمنا کر بھاگ کھڑی ہوئی۔

حسن نے اپنی سب سے اچھی پوشاک نکالی اور حسن گنگو کے ہر و شہر وہ محمد تغلق کے دربار میں پہنچ گیا۔

شہزادے نے اپنی جہاں دیدہ نظریں اس پر ڈالیں اور پہلی ہی نظر میں اس سے متاثر ہو گیا۔ بہت دیر تک حسن سے اس کے حال احوال پوچھتا رہا اور یہ جان لیا کہ وہ صرف ایماندار ہی نہیں نہایت دہن بھی ہے۔

”اتنی دولت دیکھ کر تمہیں یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ اب جے ماما کے گھر سے جاؤ۔“

”شہزادہ سداست! میں جب گھر سے نکلا تھا تو میں نے یہ عزم کیا تھا کہ جو کچھ کہوں گا اپنے زور بازو سے کہوں گا۔ اس دولت پر میری کوئی محنت خرچ نہیں ہوئی تھی پھر میں اسے کیوں اپنے گھر لے جاتا۔ ہاں اگر مجھے آپ کوئی ملازمت دے دیں تو اپنی کمائی پر میرا حق ہوگا۔“

”میں تمہارے عزم اور ایمانداری سے بہت خوش ہوا ہوں۔ میں بادشاہ سے تمہاری سفارش ضرور کروں گا۔“

حسن دربار سے واپس آیا تو امید کی ایک کرن اس کے دل میں چمک رہی تھی لیکن اس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ کس مرتبہ پر فائز ہونے والا ہے۔

شہزادہ تغلق، حسن سے اتنا متاثر ہوا تھا کہ اس نے بادشاہ غیاث الدین تغلق سے اس کی ایمانداری کا ذکر کیا۔

یہ سفارش بھی کی کہ اسے کوئی اعلیٰ عہدہ دیا جائے۔

غیاث الدین تغلق اپنے بیٹے کی کوئی بات نہیں ٹال سکتا تھا۔ اس نے حسن کو شاہنواز زشات سے سرفراز کیا اور اسے ایک صدی، بیرون کے زمرے میں شامل کر دیا۔

حسن نے یہ منازل اتنی تیزی سے طے کر لی تھیں کہ اسے گنگو برہمن کے رائجے پر یقین آ گیا۔ ساتھ ہی حضرت نظام الدین اویسی کی پیش گوئی یاد آئی۔ دکن کی منزل تو ناممکن دکھائی دے رہی تھی لیکن یہ عہدہ اسے مل گیا تھا۔ اس نے اسی عہدے کو اپنی منزل سمجھ کر گنگو برہمن سے کیا ہو وعدہ پورا کیا۔ اس نے اپنے نام کے ساتھ گنگو بھٹی لکھنا شروع کیا اور اپنا نام حسن گنگو بھٹی لکھنے لگا۔

یہ عہدہ ملنے کے بعد جے ماما سے شادی کرنے کی راہیں کھل چکی تھیں۔ وہ اب ایسے عہدے پر متمکن تھا کہ اس کا مسلمان ہونا جے ماما سے شادی میں رکاوٹ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ کوئی مناسب وقت دیکھ کر وہ جے ماما کے باپ سے بات کرے گا۔

جے ماما بھی بہت خوش تھی اور اسے اپنے باپ سے بات کرنے کے لیے غی غی ترکیبیں سمجھاتی رہتی تھی۔ وہ رات غائب تھی۔ جے ماما اس کے پاس آئی تو بہت خوش تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اس نے اپنے باپ سے بات کر لی ہے اور اب حسن بلا کھٹکے اس سے بات کر سکتا ہے۔ وہ بہت دیر تک اس کے پاس رہی تھی اور مستقبل کے خواب دیکھتی رہی تھی۔

اس رات کی صبح ہوئی تو حسن کی آنکھ روٹنے کی آوازوں سے کھلی۔ یہ آوازیں جے ماما کے گھر سے آرہی

تھیں۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کیا ہو چکا ہے۔ وہ ایک اچھے پڑوسی کی طرح اس کے دروازے پر گیا کہ حقیقت حال دریافت کرے۔ پھر جو کچھ اسے معلوم ہوا اس نے اس کے ہوش اڑا دیے۔ بے ماتا کو سانپ نے ڈس لیا تھا اور وہ مر گئی تھی۔

باپ و کس سے کس کا تہہ منہ۔ بے ماتا اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی اسے یقین نہیں تھا کہ بے ماتا و سانپ نے ڈسا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ بے ماتا کو اس کے باپ نے راستے سے ہٹایا ہے۔ اسے یہ برداشت نہ ہو گا کہ وہ کسی مسلمان سے شادی کرے۔

یہ اس کا وہم ہی ہو سکتا تھا مگر کوئی ثبوت اس کے پاس نہیں تھا۔ کسی کارروائی کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ وہ اس کی چتا کے ساتھ کچھ دور تک گیا اور پھر لوٹ آیا۔

اب اپنے گھر میں رہنا اس کے لیے آسان نہیں تھا۔ ایک درپچہ تھا جو ہر وقت اس کے سامنے تھا۔ یہ خیال بھی ہر وقت اسے خون کے آنسو رلاتا رہتا تھا کہ بے ماتا کے قاتل ہی گھر میں رہ رہے ہیں۔ اس نے گھر تبدیل کر لیا۔ اس نے گھر میں بھی گیندے کے پودے بڑی تعداد میں لگ گئے۔

سلطان غیاث الدین نے دہلی سے کچھ فاصلے پر تغلق آباد کے نام سے شہر آباد کر کے اس کو اپنا دار الحکومت بنایا تھا۔ اس کے امراء ملوک وہاں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ تغلق آباد میں حاکم مقرر کر کے خود بادشاہ دہلی میں رہتا تھا۔

721 ہجری میں سلطان غیاث الدین نے شہزادہ تغلق کو چتر غٹ کیا اور ایک مستعد لشکر کے ساتھ ”ورنگل“ اور ”تلنگانہ“ کے خلاف مہم پر روانہ کیا۔

شہزادہ تغلق ورنگل پہنچ کر اس کے قریب خیمہ زن ہو گیا اور قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔

شہزادہ کو گئے ہوئے چار ماہ سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا تھا۔ خبریں پہنچ رہی تھیں کہ شہزادہ کو متواتر کامیابیاں مل رہی ہیں کہ لکھنوتی کے چند امراء حاکموں کی شکایت لے کر سلطان تغلق شاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے اپنی پریشانی اور بے بسی کی داستانیں اس اعدائے سے سنائیں کہ سلطان نے لکھنوتی کے مسلمانوں کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

مسئلہ یہ تھا کہ محمد تغلق ورنگل کی مہم پر گیا ہوا تھا۔ بادشاہ اس کی واپسی کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے محمد تغلق کو اپنی بروہی کی اطلاع بھیجی اور لشکر کے ساتھ لکھنوتی روانہ

ہو گیا۔

سلطان کی ہیبت ہندو مندھ کے تمام علاقوں میں پھیلی ہوئی تھی لہذا جیسے ہی اس کا پرہم سایہ انداز ہوا، لکھنوتی کا عالم سلطان ناصر الدین اس کی درگاہ میں اطاعت کا سر تیرا لے کر حاضر ہوا اور شرف خاک کو ہی حاصل کیا۔

ابھی سلطان کی کموار نیام سے باہر بھی نہیں آئی تھی۔ اس علاقے کے راؤں اور راجاؤں نے سلطان کی اطاعت قبول کر لی۔

سلطان نے ناصر الدین کو دوبارہ چتر غٹا کیا۔ ارد گرد کے علاقوں کے باغیوں کی سرکوبی کی اور واپسی کا طبل بجوا دیا۔

محمد تغلق ورنگل کو فتح کر چکا تھا اس تک خبر پہنچی کہ سلطان تغلق آباد کے دار الحکومت میں پہنچنے والا ہے تو اس نے حکم دیا کہ تغلق آباد سے تین چار کوس کے فاصلے پر افغان پور کے قریب ایک چھوٹا سا کوٹنگ (محل) تیار کیا جائے تاکہ سلطان رات کو وہاں قیام کرے۔

یہ محل صرف تین دن میں تیار ہو گیا۔ محمد تغلق بھی یلغار کرتا ہوا تغلق آباد پہنچ گیا، دربار کے استقبال کے لیے شہر کو روشنیوں سے آباد کر کے استقبال کے لیے باہر نکلا۔

غیاث الدین تغلق افغان پور کے قریب پہنچا اور محل کھڑا دیکھا تو حیران رہ گیا۔

”اس سے پہلے تو یہ محل یہاں موجود نہیں تھا۔“

”حضور کے قیام کے لیے یہ محل شہزادہ معظم نے تیار

کر دیا ہے۔ ان کی یہ بھی خواہش ہے کہ آپ یہاں شب

بسر فرمائیں۔ اس کے بعد دہلی تشریف لے جائیں۔“

”ہمیں دہلی پہنچنے کی جلدی تھی کیونکہ وہاں ہماری

غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر بعض لوگ سازشوں پر کمر بستہ

ہو گئے ہیں اور ہماری موت کی جھوٹی افواہیں پھیلانی جا رہی

ہیں لیکن ہم اپنے بیٹے کی خواہش ضرور پوری کریں گے اور

اس محل میں ایک رات گزاریں گے۔“

تغلق آباد میں شہزادے بجائے جا رہے تھے،

شہزادے کو سچ رہی تھیں کہ عصر کی نماز کے وقت سلطان تغلق

نے کوٹنگ کے قریب پہنچا اور اسی میں مقیم ہوا۔

سلطان محمد نے امراء ملوک اور دوسرے اکابر کے

ساتھ باپ کا استقبال کیا اور شرف قدم بوسی سے مشرف ہوا۔

اسی وقت سلطان نے کھانا طلب کیا۔

کھانے کے بعد چونکہ ہاتھیوں کی پرید ہونا تھی لہذا

ہاتھی بانوں نے ہاتھی دوڑانے شروع کر دیے تاکہ جب

سلطان ہامیوں کے ملاحظہ کے لیے آئے تو ہامی پوری طرح چاق و چوبند ہوں۔

سلطان ملوک و امرا کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھا تھا اور باہر ہاتھی دوڑ رہے تھے۔ ان کی دھمک گل کے اندر تک محسوس کی جا رہی تھی۔

جب لوگ کھانا کھا چکے تو ہاتھ دھونے کی غرض سے باہر آئے۔ محمد تغلق بھی گھوڑوں، ہاتھیوں اور دوسرے کوازمات شاہی کی ترتیب کے لیے باہر چلا آیا جنہیں وہ بادشاہ کے ملاحظہ اور خوشنودی کے لیے لایا تھا۔

یہ عمل صرف تین دن کی مدت میں تیار ہوا تھا۔ اس کی بنیادیں ابھی تک نہیں جو ہاتھیوں کے دوڑنے بھاگنے کی وجہ سے مل گئیں۔ جس چوڑے پر سلطان جھسکتے ہر روز کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اس کی چھت اچانک گر گئی۔ ایک شور مچ گیا، لوگ گل کے طبلے کی طرف دوڑے۔ جلدی جلدی پیچوں اور کدالوں کا انتظام کیا گیا۔ ملہاٹایا تو سلطان کی لاش نکلی۔

سلطان کی ناگہانی موت مورخین کے نزدیک اختلافی مسئلہ بن گئی ہے۔ بعض نے یہ کہا کہ شہزادہ تغلق نے جان بوجھ کر باپ کو قتل کیا۔ اتنی کم مدت میں عمل تعمیر کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس نے تصد باپ کی جان لی یعنی قتل کی بنیادیں کمزور رکھوائی گئی تھیں۔ بعض کہتے ہیں یہ اتفاقی حادثہ تھا۔ ہاتھیوں کے دوڑنے کی وجہ سے گل کی چھت گر گئی۔ بعض نے یہ بھی لکھا ہے کہ آسانی بنگلی کی بھی اور بعض ژربانی روایات یہ بھی ہیں کہ غیاث الدین تغلق نے حضرت نظام الدین اولیا کو کھلا بھیجا تھا کہ جب تک میں دہلی پہنچوں۔ آپ دہلی سے نکل جائیں۔ اس کے جواب میں حضرت نظام الدین اولیا نے یہ جملہ کہا تھا۔ ”ہوڑ دلی دور است“ (میں دلی دور ہوں)۔ میں دلی پہنچا نہیں ہی۔ وہاں۔ ان کا یہ قول صحیح ثابت ہوا اور سلطان دہلی پہنچنے سے قبل ہی گل کی چھت کے نیچے دب کر مر گیا۔

شہزادہ تغلق نے باپ کے سوگ میں تین دن گزارے اور چوتھے دن تغلق آیا دہلی میں تخت حکومت پر جگہ کر لیا اور خود کو محمد شاہ تغلق کے نام سے موسوم کیا۔ اس کا اصل نام لغ خان تھا۔

تخت حکومت پر بیٹھنے کے چالیس دن بعد وہ تغلق آباد سے شہر دہلی میں آیا اور برکت و نیک فال کی وجہ سے قدیم دولت خانے میں ملاطین باضیہ کے تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ دہلی میں بچہ بچہ خوشیاں منارہا تھا۔ قدم قدم پر آرائش

زیبا نے عجیب عالم پیدا کر دیا تھا۔ سلطان نے حکم دیا تھا کہ اس کے جلوس کے دوران شہر کے کوچوں اور گلوں میں روپیہ برسایا جائے، چنانچہ مٹھیاں بھر بھر کر سوتے اور چاندی کے جٹکے گلیوں اور مکائوں کی چھتوں پر پھینکے گئے اور دیکھنے والوں کی جھولیوں میں ڈالے گئے۔

جب محمد شاہ نے کچھ دن تخت پر گزارے تو امرا ملوک کو ملاقات کے لیے طلب کیا۔ امرا نے صدمہ میں حسن بھی تھا جو شہزادے سے ملاقات کے لیے گیا۔ اب وہ اتنا دولت مند ہو گیا تھا کہ بادشاہ کو نیز ریش کر سکتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آج تک کسی چمک تھی جو اس سے پہلے کسی نے نہ دیکھی ہوں۔ سلطان تغلق نے یہ چمک پوشیدہ نہ رہ سکی۔

”حسن، میں تمہاری آنکھوں میں کوئی نئی بات دیکھ رہا ہوں۔“

”حضور کو تخت نصیب ہوا ہے۔ اس کی خوشی میں میری آنکھوں کا رنگ تبدیل ہو گیا ہوگا۔“

حسن نے یہ خوب صورت جواب پیش تو کر دیا تھا لیکن وہ سلطان کی بصیرت سے خوف زدہ ہو گیا تھا۔ اس کے دل کا چور پڑا گیا تھا۔ وہ اس وقت سوچ رہا تھا کہ سلطان کو جتنا وہ جان سکا ہے، اس کا تقاضا ہے کہ قلعہ خدا کو وہ بہت جلد اپنا دشمن بنالے گا اور اسے (حسن کو) یہ موقع بہت جلد ملنے والا ہے کہ وہ دکن فتح کر لے۔ سلطان کی غلط حکمت عملی نے اپنے دکن میں انتشار پیدا ہو گا اور اس انتشار سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

سلطان نے جو سوال حسن سے کیا تھا اس پر سب بچہ بچہ تھے۔ گنگویر میں بھی دہلی موجود تھا۔ حسن سے اس کی اتنی سبب تعلق تھی کہ وہ اس سے کچھ بھی پوچھ سکتا تھا لہذا جب دربار پر خواست ہو گیا تو گنگویر میں اس نے اس سے پوچھ لیا۔

”تم اس وقت کیا سوچ رہے تھے جب سلطان نے تمہاری آنکھوں کی چمک دیکھی؟“

”جی بات یہ ہے کہ میں کچھ اچھا نہیں سوچ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ شہزادے کی اضطراری فطرت مملکت کے خلاف مخرپ کر دے گی۔“

”تمہارا اندازہ درست ہے۔ میرا حساب بھی یہی کہتا ہے لیکن ہر بات بادشاہوں کے سامنے بیان کرنے کی نہیں ہوتی دوسرے یہ کہ سلطان میں خوبیاں بے پناہ ہیں اس لیے ممکن ہے اس کے زوال کو طویل عرصہ لگ جائے۔ یہ اتنی جلدی نہیں ہوگا جتنا تم سمجھ رہے ہو۔“

”میں نے مدت کا اندازہ تو نہیں کیا تھا اور نہ کر سکتا ہوں۔“

”پھر تمہاری آنکھوں میں وہ چمک کیوں تھی جس کی طرف سلطان نے اشارہ کیا تھا؟“

”میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“

”کچھ نہیں حضرت نظام الدین اولیا کی اس پیش گوئی کا خیال تو نہیں آگیا تھا جو انہوں نے تمہارے دکن کے تاجدار رہونے کے بارے میں کی تھی۔“

”جی بات تو یہ ہے کہ یہ خیال آیا تھا۔ ملک میں انتشار ہو گا تو مجھے موقع ملے گا۔“

”میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا لیکن تمہارے تاجدار ہونے کی نشانیاں مجھے بھی تمہارے زائچے میں نظر آئی تھیں۔ اگر ایسا ہو گیا تو مجھ سے یک وعدہ اور کرو۔ خزانہ کے عہدے پر مجھے اور میرے بعد میری اولاد کے سوا کسی اور کو نہ رکھنا۔“

حسن اپنے نام میں تبدیلی پہلے ہی کر چکا تھا۔ اس نے اس وعدے پر بھی مہر تصدیق ثبت کر دی۔

”ایک عہدہ اور کرو۔ اپنی اس خواہش کا اظہار کسی اور کے سامنے مت کرنا۔ اور جو قدم اٹھانا میرے مشورے کے بعد نہ کرنا۔“

حسن نے وہ تخریبات اور خیالوں میں کر دی۔ اس نے اپنی اس خواہش کا اظہار کسی اور کے سامنے نہ کیا۔ اس نے اس وعدے پر بھی مہر تصدیق ثبت کر دی۔

حسن اس ”عرصہ دراز“ کا پے چلنے سے انتظار کرتے لگا۔ حسن کے اندازے درست ثابت ہو رہے تھے۔ محمد تغلق کی طبیعت میں اختراع و ترقی کی باتیں نہ ہوتی تھیں۔ ان کے فیصلے کر لیتا تھا اور پھر یہ بھی چاہتا تھا کہ ان فیصلوں پر عمل عمل بھی کیا جائے۔ جب وہ لوگ جو ان کو ملے تھے ان کے سامنے پڑے تھے ان کے لیے یہ ممکن نہ ہوتا تھا۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ وہ ان کی یہ ناکامی ان کے گل کا پھول بن جائے۔

اس ناکامی میں وہ تنہا آگے بڑھ گیا کہ کوئی دن وہ وقت یہ نہیں گزرتا تھا کہ بہت سے مسلمانوں کا خون نہ بہائے اور گل کے داخلی راستوں کے سامنے خون کی نہریں نہ بہتی۔

اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کے دلوں میں نفرت پیدا ہو گیا۔ شہزادہ خلی ہو گیا۔ در ہر طرف بتری اور درہمی پھیلی۔ ان غزوتوں نے بغاوتوں کو جنم دینا شروع کیا۔ یہ نئی نئی جلی تھی کہ وہ ان غزوتوں کو فخر کرتا رہا۔

یہاں تک پہنچے کہ دیوگیر اور گجرات کے علاقوں کے علاوہ اور کوئی علاقہ مضبوط و منضبط نہیں رہا۔ خاص دہلی حکومت دہلی کے علاقوں میں بھی بڑے پیمانے پر بغاوت اور سرکشی نے سر اٹھایا۔

ان بغاوتوں میں سب سے خطرناک بغاوت وہ تھی جو اس کے پچازاد بھائی کی طرف سے برہم کی گئی۔ اس بھائی کا نام گر شاپ تھا۔ وہ گجرات (دکن) کے قریب ایک مقام ساغر کا جاگیردار تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ رعایا محمد تغلق سے بے زار ہو گئی ہے۔ سلطنت کا ڈھانچا بالکل بگاڑ کر رہ گیا ہے تو اس کے دل میں ہوس ملک گیری کا خیال پیدا ہوا۔ اس نے قلعہ ساغر کو بہت مضبوط کر لیا اور لشکر کی تنظیم میں وقت صرف کرنے لگا۔ دکن کے دیگر امرا کو ہم خیال بنایا اور ملک کے بہت سے حصوں پر قبضہ کر لیا۔ جب محمد تغلق نے اس کی سرکشی کی خبر سنی تو دہلی کے تمام نامور امرا اور گجرات کے لشکر کو اس کی سرکوبی کے لیے بھیجا اور کئی مرتبہ کی خونریز جھڑپوں کے بعد اس بغاوت پر قابو پا لیا گیا۔

یہ بغاوت فرد ہو گئی لیکن تغلق کی آنکھیں کھل گئیں۔

اس سے پہلے کہ وہ اپنی اصلاح کرتا اس کو اچانک یہ خیال آیا کہ غالباً سارا ہندوستان دہلی کی شہنشاہیت سے منحرف اور باغی ہوتا جا رہا ہے۔ حدود مملکت چونکہ بہت بڑھ گئی تھیں اور خبریں پہنچنے میں دیر لگتی تھی لہذا اس نے سوچا پایہ تخت کے لیے کسی ایسے مقام کو منتخب کیا جائے جو ان ملکوں کے، جن پر قبضہ و تصرف ہے، نزدیک ہو اور ان ملکوں اور پایہ تخت میں وہی تعلق رہے جو دائرے کے خطوط کو اپنے مرکز سے ہر تے حادثے کی اطلاع بادشاہ کو فوراً ہو جائے۔

اس نے اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے امراے سلطنت کو طلب کیا کہ ان سے مشورہ کیا جائے۔ ان کے سامنے اپنا منصوبہ رکھا۔

ان امرا میں سے چند نے پایہ تخت کی تبدیلی کے فیصلے کی مخالفت کی تو وہ ان پر برس پڑا۔ ”میں نے یہ نہیں پوچھا کہ میرا فیصلہ صحیح ہے یا غلط۔ میں نے تو یہ پوچھا ہے کہ کس شہر کو پایہ تخت کا درجہ دوں۔“

بعض امرا نے اجین کو پایہ تخت منتخب کرنے کی صلاح دی۔

”شہر اجین طول و عرض کے لحاظ سے ہندوستان کے بالکل وسط میں واقع ہے اور ہند کے مشہور حکمران کھتری راجا بکرماجیت نے اسی خیال کو مد نظر رکھ کر اجین کو اپنا پایہ تخت بنایا تھا۔“

مشورہ معقول تھا۔ لیکن مضبوط تھی لیکن بعض مقرب

محمد تغلق کے وہ امرا جو محاصرہ کیے ہوئے تھے، حماد الملک کے قتل کی خبر سن کر بہت ہراساں تھے اور جب انہوں نے یہ سنا کہ حسن گنگو منتر لیس مارتا ہوا دولت آباد کی طرف چلا آیا ہے تو تاب مقبلہ نہ رہی۔ محاصرہ، ٹھہر کر کچھ دہلی چلے گئے کچھ گجرات کی طرف بھاگ گئے۔

حضرت نظام الدین اولیا کی پیش گوئی پوری ہونے کے دن قریب آگئے تھے۔ حسن کو مقبولیت بھی حاصل تھی اور اس کا رعب و دبدبہ بھی قائم ہو چکا تھا لہذا محل حج کے بعد جب امرا کے درمیان یہ بحث چھڑی کہ حکمران کسے بنایا جائے تو ہر طرف سے حسن کے نام کا شور برپا ہونے لگا۔ سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ چتر شہی حسن کے سر پر رکھا جائے۔

تخت نشینی کب ہو؟ مسلمان مجنوں اور ہندو پنڈتوں میں ایک طویل بحث چھڑ گئی۔ تخت نشینی میں تاخیر ہوتی جا رہی تھی۔ ہندو پنڈتوں کا سرخیل گنگو برہمن تھا اور ظاہر ہے حسن اس کی بات نہیں ٹال سکتا تھا۔ اس نے ہندو پنڈتوں کی رائے مان لی اور ان کی بتائی ہوئی تاریخ پر حسن کے سر پر دکن کی سلطنت کا تاج رکھ دیا گیا۔ اس نے اپنا لقب علاؤ الدین قرار دیا اور علاؤ الدین حسن گنگو (بعض نے گنگو لکھا ہے) بہمنی کے نام سے مشہور ہوا۔

جب حسن بہمنی نے ہندوؤں کی بتائی ہوئی ساعت پر تخت نشینی کی رسم ادا کر لی تو مسلمان مجنوں نے افسوس کا اظہار کیا اور اسے حسن کے حق میں نیک فال نہ سمجھا۔ میر محمد بخش جو غم اور ماہر ریاضی تھے، اس کے پاس تشریف لائے اور افسوس کا اظہار کیا۔

”اگر آپ نے ہماری رائے پر عمل کیا ہوتا اور ہماری تجویز کردہ گھڑی پر تخت چلوں فرماتے تو بہت اچھا ہوتا۔“

”آخر اس اظہار افسوس کا سبب کیا ہے؟“

”حضور، سیاروں کی شکل اور وضع سے یہ معلوم ہوا تھا کہ جس وقت بادشاہ نے تخت پر قدم رنجہ فرمایا اس وقت کی تاثیر یہ ہے کہ اس خاندان میں بادشاہوں کی تعداد بیس سے زیادہ نہ ہوگی اور حکومت کا زمانہ بھی دو سو سال سے کم ہی رہے گا۔ اس کے برخلاف جو وقت ہم نے تجویز کیا تھا اس حساب سے سات سو سال تک اس خاندان کی حکومت دکن میں رہتی اور آپ کے خاندان کے تقریباً ایک سو پچاس حکمران اس تخت پر بیٹھتے۔“

حسن بہمنی کو مدت حکومت کم ہو جانے کا افسوس ضرور ہوا لیکن دل سے یہ نظریہ جاتا رہا کہ حکومت کو فوری کوئی خطرہ ہے۔ اس علم نجوم کی فضیلت بعد میں اس وقت ظاہر ہو گئی

جب ایک سو ستر برس بعد آل بہمنی کی حکومت ختم ہوئی اور حکمران بن گئے۔ آئندہ مسلمان بہمنی قریب مان لیتا تو ممکن ہے حکومت کا دورانیہ سات سو سال رہتا۔

محمد بن تغلق غلطی کی بغاوت کا حال سن کر دولت آباد سے چلا گیا تھا۔ جب وہ بھرج پھنچا تو غلطی کنبایت چل گیا سلطان نے ملک یوسف بنرا کو ایک عظیم لشکر کے ہمراہ اس کے تعاقب میں روانہ کیا اور خود بھرج میں رکھا رہا۔

ملک یوسف بنرا جب کنبایت پھنچا تو غلطی مقابلے پہنچا۔ اس کی جنگ کی ٹیکنیکیں وہ اس جنگم تھے سے نکل گیا تھا۔ اس کی فوج و شکست ہوئی۔ اس کی فوج میں وہ آدمی جو گرفتار ہونے سے رہ گئے تھے، بھاگے اور سلطان پہنچنے آیا تھا۔ اب وہ تاجدار بنا بیٹھا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ کے پاس بھرج پھنچ گئے۔ سلطان انہیں دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ ان پر کیا گزری ہے۔ اس نے ان لوگوں سے کچھ پوچھنے میں اسے سخت پر نہیں رہنے دوں گا۔

اس کا مورخ ضیا الدین برنی اس وقت اس کے طرف روانہ ہوا۔ غلطی تک سلطان کی آمد کی خبر پہنچی تو اس نے فرم دیا کہ میں عافیت جانی اور ”اساول“ پہنچ کر دم لے رہا ہوں۔ اس نے تعاقب تیری راہ میں اس کا کیا علاج ہونا چاہیے؟

جاری رکھا۔ غلطی اس دل سے ”نہرو والا“ بھاگ گیا۔ بادشاہ کا موسم شروع ہو چکا تھا لیکن یہ ایسی مہم نہیں تھی کہ سلطان باہر رہا تھا، اس وقت موقع آیا کہ اسے بیان کر دے۔

”میں نے تاریخ کی کتابوں میں دیکھا ہے کہ اگر ہو گیا، راستے میں اسے معلوم ہوا کہ وہ نہرو والا کے بجائے بادشاہوں سے رعایا کو نفرت پیدا ہو جاتی تھی اور فتنے اٹھنے اور طرف نکل گیا ہے۔ سلطان نے نہرو والا جانے کا ارادہ لگتے تھے تو وہ اپنے لڑکے یا بھتی کو، جس کو سلطنت کے قابل ترک کیا اور اس دل کی طرف واپس ہونے لگا۔ اب یہ اتفاق ہی تھا کہ غلطی کے لشکر سے اس کا سامنا ہو گیا۔ سلطان کا لشکر اتنا قریب تھا کہ غلطی کے پاس بھاگنے کا راستہ بھی نہیں

بھی تھا۔ مجبور ہو کر غلطی کے فوجی سلطان کی فوج پر نوٹ پڑے لیکن ہاتھیوں کے سامنے ان کی ایک نہیں چلی۔ قریب ہی درختوں کے جھنڈ تھے۔ ایسا گھنا جھگڑا تھا کہ آدمی داخل ہوئے غائب ہو جائے۔ غلطی کا لشکر اس جنگل میں غائب ہوا اور تھرا والا پہنچ گیا۔

تین روز بعد سلطان نہرو والا آیا مگر اس عرصے میں غلطی غصہ کی طرف بھاگ چکا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اب گجرات پوری طرح سلطان کے قبضے میں تھا۔

تغلق غلطی کی بغاوت کے ختم و ضبط میں مشغول تھا کہ خبر چلی کہ حسن گنگو در دوسرے باغی جو اس سے پہلے شکست کھا کر منتشر ہو گئے تھے اب پھر ایک جگہ جمع ہو گئے ہیں۔ سلطان نے ملک یوسف بنرا کو ایک عظیم لشکر کے ہمراہ اس کے تعاقب میں روانہ کیا اور خود بھرج میں رکھا رہا۔

ملک یوسف بنرا جب کنبایت پھنچا تو غلطی مقابلے پہنچا۔ اس کی خاطر دہلی کو ویران کیا تھا اور اب وہ اس کے آگیا۔ یوسف نے اس سے جنگ کی ٹیکنیکیں وہ اس جنگم تھے سے نکل گیا تھا۔ اس کی فوج و شکست ہوئی۔ اس کی فوج میں وہ آدمی جو گرفتار ہونے سے رہ گئے تھے، بھاگے اور سلطان پہنچنے آیا تھا۔ اب وہ تاجدار بنا بیٹھا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ کے پاس بھرج پھنچ گئے۔ سلطان انہیں دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ ان پر کیا گزری ہے۔ اس نے ان لوگوں سے کچھ پوچھنے میں اسے سخت پر نہیں رہنے دوں گا۔

اس کا مورخ ضیا الدین برنی اس وقت اس کے قریب بیٹھا تھا۔ سلطان نے اختیار اس سے مخاطب ہوا۔

”میری مملکت میں متفاد امراض پیدا ہو گئے ہیں۔ سلطان بھی پیچھے چھوڑنے وال کب تھا۔ اس نے تعاقب تیری راہ میں اس کا کیا علاج ہونا چاہیے؟

جاری رکھا۔ غلطی اس دل سے ”نہرو والا“ بھاگ گیا۔ بادشاہ کا موسم شروع ہو چکا تھا لیکن یہ ایسی مہم نہیں تھی کہ سلطان باہر رہا تھا، اس وقت موقع آیا کہ اسے بیان کر دے۔

”میں نے تاریخ کی کتابوں میں دیکھا ہے کہ اگر ہو گیا، راستے میں اسے معلوم ہوا کہ وہ نہرو والا کے بجائے بادشاہوں سے رعایا کو نفرت پیدا ہو جاتی تھی اور فتنے اٹھنے اور طرف نکل گیا ہے۔ سلطان نے نہرو والا جانے کا ارادہ لگتے تھے تو وہ اپنے لڑکے یا بھتی کو، جس کو سلطنت کے قابل ترک کیا اور اس دل کی طرف واپس ہونے لگا۔ اب یہ اتفاق ہی تھا کہ غلطی کے لشکر سے اس کا سامنا ہو گیا۔ سلطان کا لشکر اتنا قریب تھا کہ غلطی کے پاس بھاگنے کا راستہ بھی نہیں

بھی تھا۔ مجبور ہو کر غلطی کے فوجی سلطان کی فوج پر نوٹ پڑے لیکن ہاتھیوں کے سامنے ان کی ایک نہیں چلی۔ قریب ہی درختوں کے جھنڈ تھے۔ ایسا گھنا جھگڑا تھا کہ آدمی داخل ہوئے غائب ہو جائے۔ غلطی کا لشکر اس جنگل میں غائب ہوا اور تھرا والا پہنچ گیا۔

تین روز بعد سلطان نہرو والا آیا مگر اس عرصے میں غلطی غصہ کی طرف بھاگ چکا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اب گجرات پوری طرح سلطان کے قبضے میں تھا۔

میں موجود مختلف امیروں ملک فیروز، احمد ایاز، ملک غزنوی، صدر جہاں وغیرہ کے نام الگ الگ فرمان ان کے حوالے کیے کہ اپنے اپنے لشکروں کے ہمراہ فوراً پہنچیں تاکہ حسن بہمنی کی تاویپ کے لیے کارروائی کی جائے۔

متواتر خبریں پہنچ رہی تھیں کہ حسن بہمنی کے پاس بے شمار فوج جمع ہو گئی ہے لہذا جب تک یہ لشکر پہنچے سلطان نے ارادہ بدل دیا اور ان لوگوں کو بھیجا موقوف کر دیا۔

”گجرات کی مہم اور غلطی کو کسی نتیجے پر پہنچانے کے بعد میں خود حسن بہمنی سے ٹھٹھنے کے لیے دولت آباد جاؤں گا۔“

سلطان محمد نے دیوگیر کی مہم سے ہاتھ کھینچ لیا اور گجرات کے معاملات درست کرنے میں مصروف رہا۔ اس نے تین برساتیں گجرات میں گزاریں در پھر وہ غلطی کا پیچھا کرتے ہوئے ٹھٹھہ کی جانب روانہ ہوا، وہاں اس کا انتقال ہو گیا۔

حسن بہمنی نے تخت دکن پر قدم رکھا تو وہ یادیں اس کا پیچھا کر رہی تھیں۔ ایک بے ماتا کی یاد بھی جسے وہ گیندے کے پھولوں میں تلاش کرتا رہتا تھا۔ دوسرا حضرت نظام الدین اولیا کا خیال جن کا اب وصال ہو چکا تھا۔ حسن نے سلطنت سنبھالتے ہی دو حکم ایک ساتھ جاری کیے۔ پہلا حکم یہ کہ تمام خاص و عام اپنے گھروں میں گیندے کے پودے لگائیں اور دوسرا حکم یہ کہ پانچ من سوٹا اور دس من چاندی حضرت نظام الدین اولیا کی روح کو ایصال ثواب پہنچانے کے لیے غریبوں، یتیموں اور مسکینوں میں تقسیم کیے جائیں۔

ان احکامات کے بعد اس نے حسن نظام پر توجہ دی۔ جن لوگوں نے اس کے ساتھ حسن سلوک کیا تھا ان کو بڑے بڑے مناصب عطا کیے۔ گلبرگ سے اسے بڑی محبت تھی۔ اس نے گلبرگ کو پایہ تخت بنایا اور اس کا نام حسن آباد رکھا۔

جب وہ ان انتظامات میں مشغول تھا تو اسے گنگو برہمن سے کیا ہوا وعدہ یاد آیا۔ گنگو نے اس سے عہد لیا تھا کہ جب وہ دکن کا تاجدار بن جائے تو خزانہ شاہی کا انصرام اس کے اور اس کی اولاد کے سوا کسی کے ہاتھ نہ دے۔ حسن نے یہ وعدہ پورا کیا اور گنگو برہمن کو دکن کے خزانہ شاہی کا مختار بنا دیا۔ یہ فرمان بھی جاری کیا کہ اس کے بعد یہ عہدہ اس کے خاندان کے افراد میں منتقل ہوتا رہے۔

تاریخ میں ایسے ہزاروں واقعات ہو گزرے ہیں کہ بہت چھوٹے سے مقام سے اٹھ کر کوئی بڑے مرتبے پر پہنچا ہے لیکن ایسا بہت کم ہوا ہے کہ کسی نے اپنے دور بازو سے

کوئی ملک فتح کیا ہو اور وہاں کا بادشاہ بنا ہو جبکہ کوئی دنیاوی اسباب اس کے پاس نہیں تھے۔ حسن ایک عام آدمی کی حیثیت سے دہلی میں داخل ہوا اور دکن فتح کر لیا۔

ایک زمانہ وہ تھا جب وہ بے پاتا سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی غربت آڑے آرہی تھی۔ اس نے اس سے کہا بھی تھا کہ جب وہ کسی عہدے پر پہنچ جائے گا تو اس سے شادی ضرور کرے گا لیکن جب دہلی میں اسے ایک صدی امرا میں شامل کیا گیا تو بے پاتا کا انتقال ہو گیا۔ اب تو اسے مرے ہوئے بھی برسوں گزر گئے تھے۔ اب وہ ہوتی بھی تو کیا۔ اب تو حسن کی نہیں حسن کے بیٹے کی شادی کے دن تھے۔ اب اس کی وہ شان و شوکت تھی کہ جس سے کہتا وہ اپنی بیٹی اس کے بیٹے کو دیتا بلکہ کتنے ہی ایسے تھے جو اس سے رشتہ قرابت قائم کرنا چاہتے تھے لیکن اس کے دیدار سے آگے خاموش تھے۔ انہی میں ملک سیف الدین، وکیل سلطنت بھی تھا۔

ملک سیف الدین نہایت ایماندار اور نیک اطوار تھا۔ اس نے حصول سلطنت میں حسن کا بہت ساتھ دیا تھا۔ اب جتنی تھا کہ اس کی بیٹی کی شادی حسن کے بیٹے سے ہو جائے لیکن اب مراتب میں فاصلہ اتنا بڑھ گیا تھا کہ وہ یہ بات اپنے منہ سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ عجیب بات یہ کہ خود حسن بھی یہی سوچ رہا تھا۔ میر محمد بدخشی اس کے پاس آئے بیٹھے تھے۔ وہ نہایت اعلیٰ پائے کے امیر اور مخم تھے۔ حسن نے نہایت ترکیب سے یہ ذکر ان کے سامنے چھیڑ دیا۔

”میر صاحب، ذرا حساب لگا کر یہ تو بتائیے کہ اگر ملک سیف الدین کی بیٹی سے میرے بیٹے کی شادی ہو جائے تو کیسی رہے گی؟“

”یہ تو میں حساب لگائے بغیر کہہ سکتا ہوں کہ اس سے بہتر رشتہ نہیں ہو سکتا۔“

”آنکھوں دیکھی بہت سی باتیں غلط بھی ہو جاتی ہیں۔ آپ حساب لگا کر بتائیے۔“

میر محمد بدخشی نے اسی وقت ذرا مچھ تیار کیا اور حسن کے سامنے رکھ دیا۔

”یہ رشتہ بہت مبارک ثابت ہوگا لیکن اس کے نتیجے میں ایک حاسد آپ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا لیکن یہ بھی قوی مکان سے کہ آپ محفوظ رہیں گے۔“

”میری پوری زندگی حاسدوں کے درمیان گزری ہے۔ مجھے ان کی پروا نہیں۔“

”آپ نے کیا یہ رشتہ طے کر دیا ہے؟“

”یہ کام بھی آپ ہی کو کرنا ہوگا۔ ملک سیف الدین بیٹی کا باپ ہے۔ اسے یہ پورا حق ہے کہ انکار کر دے۔ ممکن ہے وہ ہمارا لحاظ کر کے انکار نہ کر سکے۔ اس لیے بہتر ہے کہ آپ بات کریں۔“

”میری خوش بختی ہے کہ یہ اختیار آپ مجھے دے رہے ہیں۔“

میر محمد بدخشی نے اسی وقت ملک سیف الدین سے ملاقات کی۔

”سیف الدین، میں ایک بات کئی روز سے سوچ رہا ہوں۔ سلطان آپ پر بہت بھروسہ کرتے ہیں۔ اگر یہ رشتہ داری میں تبدیل ہو جائے تو کیا فائدہ اچھانہ ہوگا۔“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن حضور سلطان کو ضرور اعتراض ہوگا۔ جب تک وہ ہمارے سردار تھے، سلطان نہیں بنے تھے اس وقت میرے اور ان کے تعلقات برابری کے تھے لیکن اب معرکہ دوسرا ہے۔ وہ بادشاہ ہیں اور میں ان کا ملازم۔ اگر خفا ہوئے تو میں در بدر ہو جاؤں گا۔“

”آپ کا طرجمع رکھیں۔ اگر خفا ہوں گے تو مجھ پر ہوں گے آپ کا نام درمیان میں نہیں آئے گا۔ مجھے تو آپ کی رضامندی درکار تھی۔ اگر آپ کو اعتراض نہیں تو بات یہی سمجھوں۔“

میر محمد بدخشی نے حسن پہنچی کو خوش خبری سنا دی کہ ملک سیف اس تہائی پر تیار ہے۔

دونوں طرف سے شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ حسن کی بیوی ملکہ جہاں نے ایک روز حسن سے اپنی ایک خواہش کا اظہار کیا۔

”اگر اس خوشی کے موقع پر میری بہن بھی ہوتی تو میری خوشی دوگنا ہو جاتی۔ آپ کی تخت نشینی کے بعد یہ ہماری پہلی خوشی ہے اور میری بہن نہیں ہے۔“

”آپ کی کوئی بہن بھی ہے۔ آج تک آپ نے بتایا ہی نہیں۔“

”وہ میری سوتیلی بہن ہے۔ میرے والد نے دو شادیاں کی تھیں۔ وہ دوسری ماں سے ہے۔ بے چاری جوانی میں بیوہ ہو گئی ہے، کوئی اولاد بھی نہیں ہوئی۔“

”وہ ہے کہاں۔ میں اسے کہاں سے بلاؤں؟“

”وہ آج کل ملتان میں مقیم ہیں۔“

سلطان نے نہ انکار کیا نہ اقرار کہ وہ اسے بلا لے گا۔

نہیں۔ اس حاشی سے باہر چلا آیا۔ اس نے سوچا یہ تھا کہ وہ ملکہ جہاں کی تشریف کو مدد کرے گا۔ آخر وقت

ذخیرہ

تک، نہ خیریت۔ گا۔ اس کی بہن ملتان سے گئی ہے۔ اس نے کل سے باہر آتے ہی ملتان کی جانب آدمی روانہ کر دیا کہ وہ شہزادے کی خالہ کو لے کر آئیں۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وقت سے پہلے ملکہ جہاں کو خبر ہو۔ اہل نے تمام کارروائی نہایت خاموشی سے کی۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ کون ملتان گیا ہے اور کیوں گیا ہے۔

ملکہ جہاں کی آرزو یہ تھی کہ اس کی بہن شادی میں شریک ہو لہذا اس کے آنے سے پہلے شادی کیسے ہو سکتی تھی جبکہ تقریبات کا آغاز ہو چکا تھا۔ ملکہ جہاں کی بہن کا کہیں دور دور تک پتہ نہ تھا۔ حسن نے انتظام کرنے والوں کو حکم دیا کہ جن کو طول دیتے رہیں اور اس میں جتنا بھی روپیہ خرچ ہو اس کی مطلق پروا نہ کی جائے۔ جشن ہونا رہا۔ شادی نے بجتے رہے۔ ایک انوکھا اہتمام یہ کہ کیا تھا کہ جگہ جگہ بھینسیں لگا دی گئیں اور ان پر رکھ کر مٹھائی کی گولیاں شہر کے لوگوں پر بھائی جاتی تھیں۔ امراء، ملازمین اور منصب داروں میں ہر روز نئے نئے تحائف تقسیم کیے جاتے تھے۔ دن کا آغاز بھینسیوں کے رینگے گیتوں کے پھول برسا کر کیا جاتا تھا۔ جب تک جشن جاری رہا جی معمول رہا۔

چھ مہینے بعد جو لوگ ملتان گئے تھے ایک ڈولی کے ساتھ محل میں داخل ہوئے۔ حسن ڈول کو دیکھ کر بے حد خوش ہوا۔ جشن مسرت کے موقع پر سب لوگوں کو بیش قیمت تحفے دیے جا رہے تھے، ملکہ جہاں کے لیے یہ تحفہ تھا۔ اس نے ملکہ جہاں کی خدمت میں کھلوا لیا کہ ملک سیف الدین کی ہمشیرہ ملاقات کے لیے آرہی ہیں۔ انہیں نہایت عزت کے ساتھ ڈولی سے اتارا جائے اور خاطر مدارات میں کوئی کمی نہ ہونے پائے۔

ملکہ جہاں نے جیسے ہی ڈولی کا پردہ اٹھایا اور بہن کی صورت دیکھی تو حیران رہ گئی۔ سلطان کی مہربانی کی قائل ہوتے ہی اس نے سلطان کو بلا بھیجا۔ سلطان کو بھی یہ دیکھنے کی عذری ہو رہی تھی کہ بہن کو کچھ کر ملکہ جہاں پر کیا گزرتی ہے۔ اس نے تمام کام موقوف کیے اور حرم میں چلا آیا۔ اس نے ملکہ جہاں کو بڑی عزت سے بلایا۔ وہ کوئی اور نہیں تھی۔ ملکہ جہاں تو صرف حیران ہوئی تھی، وہ بے ہوش ہوتے ہوئے بھا۔

ایک زمانہ گزر گیا تھا۔ بے پاتا اگر ہوتی بھی تو بوڑھی ہو چکی ہوتی، پھر یہ کون ہے۔ وہی ناگ وہی نقشہ۔ باتیں کہ وہی انداز۔ کیا ہے مانتا ہے اس کی خاطر دوسرا جنم لے گیا ہے۔ اس نے اس وقت تو کچھ نہیں کہا لیکن بعد میں

اس نے ملکہ جہاں سے کچھ جاننے کی کوشش کی۔ ”تمہاری بہن تو تم سے بالکل ہی مختلف ہے۔ ذرا بھی تو نہیں ملتی۔“

”میں نے آپ کو بتایا تو تھا کہ یہ میری سوتیلی بہن ہے۔“

”پھر بھی باپ کے رشتے سے کچھ تو تم سے ملتی جلتی ہوتی۔“

”بالکل اپنی ماں پر مبنی ہے۔ اس کی ماں بالکل ایسی ہی تھی۔“

”بہت خوب صورت ہوں گی اس کی والدہ۔“

”بہت خوب صورت تھیں۔ ایک اور بات بتا دوں۔“

وہ مذہب کے اعتبار سے ہندو تھیں۔ میرے والد نے چپکے سے انہیں مسلمان کیا تھا، اس کے بعد شادی کی تھی۔“

”رہنے والی کہاں کی تھیں؟“

”دہلی کی۔ میری والدہ بتاتی تھیں کہ والد صاحب نے ان کے والدین کا گھر دولت سے بھر دیا تھا۔ تب وہ شادی کے لیے تیار ہوئے تھے۔“

”ان کا انتقال کیسے ہوا تھا؟“

”شاید وہ اپنی شادی سے خوش نہیں تھیں۔ دو سال بعد ہی انتقال ہو گیا۔ جانے کیا روگ لگا تھا کہ سوکھ کر کاٹا ہو گئی تھیں۔“

”اب تو مجھے بھی اس کہانی سے دلچسپی ہونے لگی۔؟“

حسن نے کہا۔ ”نام کیا تھا ان کا؟“

”بھلا سا نام تھا۔ ہاں یاد آیا، بے پاتا تھا ان کا۔ نام۔“

اس کے بعد کچھ اور پوچھنے کی سکت نہیں تھی۔ حسن اپنے آتسو چھپانے کے لیے وہاں سے اٹھ گیا۔ دیوان خانے میں پہنچ کر ملازموں کو حکم دیا کہ جب تک وہ نہ کہے کوئی اس کے پاس آنے کی جرأت نہ کرے۔ اس نے گیندے کے پھولوں سے بھرے ہوئے طلعت کو گود میں رکھا اور بے پاتا کے خیالوں میں کھو گیا۔ برسوں گزر گئے تھے لیکن کل کی بات معلوم ہو رہی تھی۔ بے پاتا کا سراپا اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ پھر وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ گیندے کے پھول اس کے قدموں میں بکھر گئے۔ اس کا مطلب ہے بے پاتا بھوکا کیا گیا تھا۔ بے پاتا مری نہیں تھی، اسے کسی بہانے سے یازدہتی ملتا تھا۔ کیا کیا تھا اور مجھے مطمئن کرنے کے لیے یہ خبر چھپائی گئی کہ اسے سب نے کاٹ دیا ہے۔ ایسا ان دنوں نے یہاں کیوں کیا؟

جب مسلمان سے بی شادی کرنی تھی تو مجھ میں کیا برائی تھی۔ شاید اسوں نے سوچا ہو کہ میں اسی دولت انہیں نہیں دے سکوں گا جو انہیں دوسری جگہ سے مل رہی تھی۔ پھر حال اب کیا ہو سکتا تھا۔ بے ماتا مجھے دیکھتے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ اپنی بیٹی کی شکل میں میرے پاس آگئی ہے، میں اسے جتنی خوشیاں پہنچا سکتا ہوں پہنچاؤں گا۔ اس نے جشن کی مدت میں اضافہ کر دیا تاکہ وہ بھی اس سے اچھی طرح لطف اندوز ہو سکے۔ عیش و عشرت کی محفلیں دوبارہ منعقد ہوئیں۔ مزید چھ مہینے اور گزر گئے۔

جشن کی مدت ختم ہوئی تو خطبہ نکاح پڑھا گیا۔ پھر دلہن رخصت ہو کر شہزادے کے گھر آئی۔

جشن شادی بہ خیر و خوبی اختتام کو پہنچا۔ اب پیش گوئی کا دوسرا حصہ سامنے آنے والا تھا۔ میرے بدحشی نے بتایا تھا کہ اس شادی کے نتیجے میں کوئی حاسد اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا۔

ملک سیف الدین اب تک محض رکن سلطنت تھا لیکن اب شاہی خاندان سے قربت داری ہو گئی تھی لہذا جب جشن نوروز کے موقع پر دربار منعقد ہوا اور تمام عالم، قاضی، مفتی اور ارکان دولت شاہی دربار میں جمع ہوئے تو ملک سیف الدین کو سب سے بلند جگہ پر بٹھایا گیا کیونکہ اب وہ صرف وکیل سلطنت نہیں جس جہتی کا سہمی بھی تھا۔ اب تک یہ مرتبہ امیر الامرا اسماعیل فتح خان کو حاصل تھا۔ اسے ملک سیف الدین کی یہ پذیرائی ایک آنکھ نہیں بھائی۔ اس وقت بھرے دربار میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا تھا لیکن ایک دن وہ تنہائی میں حسن بھٹی سے ملا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر سخت کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

”کیا میں اب اتنا گیا گزرا ہو گیا کہ ملک سیف الدین مجھ سے بھی بلند جگہ پر بیٹھے۔“

”وہ کسی بھی جگہ بیٹھے لیکن یہ بتائیے آپ کے مرتبے میں کوئی فرق آیا یا نہیں نے آپ کے عہدے میں کوئی کمی کی؟“

”درباروں میں مراتب کا فرق نشستوں کی ترتیب ہی سے ہوتا ہے۔ آپ دربار کے مالک ہیں جس کو جو جگہ عطا فرمائی لیکن میری جو بے عزتی ہوتی ہے وہ میں جانتا ہوں۔“

اب حسن کو اس پر رحم آ گیا۔ اسے اپنے اور قریب کر لیا۔

”دیکھو اسماعیل فتح خان، میں نے تمہیں سپہ سالار اور امیر الامرا بنایا ہے۔ ملک سیف الدین نائب السلطنت اور وکیل سلطنت ہے۔ دونوں مراتب میں جو فرق ہے اسے تم

خوب اچھی طرح جانتے ہو۔ جو قدر و منزلت تمہاری ہو سکتی ہے ملک سیف الدین کی نہیں ہوتی۔ یہ البتہ ہے کہ اب وہ میرا سہمی ہے۔ تم اپنا دل چھوڑنا نہ کرو۔ تمہاری اہمیت اپنی جگہ ہے۔“

بادشاہ کے پاس آئیں اور تخت پر اسماعیل خان کو بہ ظاہر مطمئن کر دیا۔ دربار میں خوش و خرمی سے آتا بھی رہا لیکن اس کے دل میں اندر ہی اندر بادشاہ کے خلاف مخالفت اور نفرت کی آگ بھڑکتی رہی۔ اس آگ نے ایسی شدت اختیار کی کہ اس نے سازشوں کے عمل کی بنیاد ڈالنی شروع کر دی۔ پہلے اپنے بیٹوں کو اپنے ارادوں سے آگاہ کیا۔ پھر بعض امرا کو سبز باغ دکھائے۔ یہ طے ہوا کہ سلطان جب شکار یا سواری کے لیے نکلے تو اسے قتل کر کے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لے۔ وہ امیر الامرا تھا اور سپہ سالار بھی۔ بہت سے امیر اس کے ساتھ ہو گئے۔ سلطان کی قسمت ابھی اس کا ہاتھ ڈے رہی تھی۔ اسے اس سازش کا حال معلوم ہو گیا۔ اس نے کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا کہ اسماعیل کی چوری پکڑی گئی ہے۔ معمول کا اجلاس طلب کیا۔ شہر کے تمام خاندان، امراء، علماء و مشائخ اس میں شریک تھے۔ سب بھی سمجھ رہے تھے کہ سلطان کو نہیں حملے کے لیے جانا ہے اور اس کے مشورے کے لیے سب کو بلایا ہے۔ اسماعیل فتح خان بھی اس اجلاس میں شریک ہوا۔ جب سب لوگ جمع ہو گئے تو اس نے مجمع کو مخاطب کیا۔

”میں نے اپنے دوستوں اور وفاداروں کو نوادہ نے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ خطابات اور جاگیروں سے نوازا رہا ہوں۔ کسی کا حق نہیں مارا۔ ہر ایک کو حسب حال عہدے اور مراتب عطا کیے۔ یہی وجہ ہے کہ میری مملکت میں ہر طرف خوشحالی اور امن ہے لیکن بعض لوگوں کو یہ خوش حالی اور میرا عروج ایک آنکھ نہیں بھار رہا ہے۔ وہ میرے خلاف سازشیں کرنے پر تے ہوئے ہیں۔“

یہاں تک کہنے کے بعد وہ رک گیا۔ سناٹے کی چڑیا ہر سر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس سازش کی بات کر رہا ہے۔ سلطان نے اچانک اسماعیل خان کو مخاطب کیا۔

”میں نے جب اس سازش کا کھوج کیا تو اسماعیل خان اس کے ہر صغے پر تمہارا نام لکھا ہوا نظر آیا۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ تم میری جان کے درے ہو اور مجھے قتل کرنے کی سازش کر رہے ہو۔ کیا تم اس سے انکار کر دے؟“

اسماعیل خان کے چہرے کا رنگ ڈھکیا تھا لیکن آدمی

ہو یا تھا۔ گرگٹ کی طرح رنگ بدل لیا۔

”سلطان دنی اختتام میں آپ کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا جبکہ آپ سے مجھے کوئی شکایت بھی نہیں۔ مجھے ایسا مہربان بادشاہ ملا ہے کہ میرا استقبال کھڑے ہو کر کرتا ہے۔ پہلے مجھے بیٹھنے کو کہتا ہے پھر اپنے تخت پر بیٹھتا ہے۔ پھر میں اس کے قتل کا ارادہ کیوں کروں گا۔“

”کیا تم اس بات سے ناخوش نہیں ہوئے تھے کہ میں نے ملک سیف الدین کو تم سے بلند جگہ پر بٹھایا۔“

”بے شک! مجھے شکایت ہوئی تھی لیکن آپ کی وضاحت کے بعد میرا دل صاف ہو گیا تھا۔ میں قسم کھانے کو تیار ہوں کہ میرے دل میں شکایت کا ایک حرف بھی باقی نہیں رہا تھا اور نہ ہے۔ سیف الدین میرے بھائیوں سے بڑھ کر ہیں اور آپ سے تو میں اپنے والدین سے زیادہ محبت کرتا ہوں۔ میری اولاد آپ پر فریاد ہو، میں کسی سازش کا حصہ نہیں۔“

”سوچ لو اسماعیل خان، اگر اب بھی اپنا جرم قبول کر لو تو میں تمہیں معاف کر سکتا ہوں۔“

”آپ حکم فرمایں۔ میں اپنی گردن اپنی گوار سے نکالت کر قدموں میں رکھ دوں لیکن خدارا مجھے کسی سازش میں شامل نہ سمجھیں۔ میرا دامن غداری کے ہر وجہ سے پاک ہے۔“

”تم اتنا کہتے ہو تو یقین نہ کرنے کی کوئی محجبات نہیں لیکن دوسرے لوگوں سے بھی تو سنتوں۔ وہ تمہارے بارے میں کیا کہتے ہیں۔“

”حضور، میں آپ کا وفادار ہوں اس لیے بہت سے لوگ میرے دشمن ہو گئے ہیں۔ وہ تو جھوٹ سچ کچھ بھی کہہ سکتے ہیں تاکہ آپ کو بدگمان کیا جائے۔“

”یہ فیصد کرنا ہمارا کام ہے کہ کون سچ بول رہا ہے، کون جھوٹا ہے۔“

سلطان نے اہل مجلس کو مخاطب کیا۔

”مجھے معلوم ہے آپ میں سے بہت سے لوگ اسماعیل فتح خان کی باتوں میں آکر مجھ سے منحرف ہو گئے ہیں۔ میں ایسے لوگوں کو ایک موقع دیتا چاہتا ہوں۔ اگر وہ اپنے بد اعمالی سے باز رہ کر میرے ساتھ وفادار رہنا چاہتے ہیں تو نہایت اجماع داری سے اسماعیل فتح کی سازش کا انکشاف میرے سامنے کر دیں۔ صاف گوشتام سے کسی طرح کی باز پرس نہ کی جائے گی اور نہ کوئی مزاحیہ جواب دے گا۔“

یہ سنتے ہی اسماعیل کے وہ تمام ساتھی جو خفیہ طور پر

اس کے ساتھ ہو گئے تھے، اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور اسماعیل کے مدافعوں کی دینے لگے۔ اب تک اس سازش میں جو جو باتیں طے ہوئی تھیں سب ایک ایک کر کے بتا دیں۔

”اسماعیل خاں، اب کیا کہتے ہو؟“

”حضور، میں اب بھی یہی کہتا ہوں کہ یہ سب میرے خلاف ہو گئے ہیں۔ آپ کی خوشنودی کے لیے مجھے قصور وار قرار دے رہے ہیں۔“

”ان لوگوں میں تیرے بیٹے بھی شامل ہیں۔ کیا وہ بھی تجھے زندہ دیکھنا نہیں چاہتے؟“

”یہ کسی کی باتوں میں آگئے ہوں گے۔“

”صاف صاف کیوں نہیں کہتا کہ تو نے سازش تیار کی تھی اور اس کے لیے ان سے بیعت لی تھی۔“

”یہ سب جھوٹے ہیں۔“

”میں نے شرعی حجت پوری کر لی ہے۔“

علامہ مشائخ موجود تھے۔ گواہوں کے بیانات سننے کے بعد اسماعیل فتح خاں کے قتل کا فتویٰ جاری کر دیا۔ حسن نے اتنا انتظار بھی نہیں کیا کہ اسماعیل خاں کو قتل میں لے جایا جاتا۔ سرمخف اسے قتل کر دیا۔

اس کے ساتھ جو دوسرے لوگ شریک تھے ان کا قصور معاف کیا اور کسی سے کسی قسم کی باز پرس نہیں کی گئی۔ ایک شاہی فرمان کے ذریعے اسماعیل فتح کا عہدہ اس کے بیٹے کو دے دیا گیا اور تمام امرا کو شاہی مراعات عطا کی گئیں۔

اسماعیل کے قتل اور پھر اس کے بیٹے کو وہی عہدہ دینے اور گنہ گاروں کو معاف کر دینے سے حسن گنگو کی بہت شہرت ہوئی اور عوام کے دلوں پر اس نے پوری طرح غلبہ پالیا۔

اور گرد کے راجاؤں پر بھی حسن کی قیامی اور برتاؤ کا بہت اچھا اثر ہوا۔ خاص طور پر رائے تلکانہ پر تو بہت ہی مثبت اثر ہوا۔ وہ جو روپیہ دہلی کے خزانہ شاہی میں بھیج کر تھا اب ہر سال خزانہ بھٹی میں داخل کرنے لگا۔

حسن کے بہترین حسن انتظام نے دولت آباد کو اس کا گہوارہ بنا دیا۔ اس کی آمدنی میں بھی قابل قدر اضافہ ہونے لگا۔ تعلق کا کٹاؤ درمیان سے نکل گیا تھا لہذا اب وہ مطمئن تھا۔ جب اسے اطمینان ہو گیا کہ عوام میں اس کی مقبولیت ہے۔ دور دور تک کوئی مخالف نہیں ہے تو اس کے سر میں جہاں کشائی کا سودا ساما۔ خزانے کی کثرت نے ایک بڑا انگڑاس کے گرد جمع کر دیا تھا۔ جان دینے والے امرا موجود تھے۔ رعایا کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ اگر میں اس

تمام لشکر کو جواب میرے قبضے میں ہے لے کر نکلوں تو فتح و نصرت میرے قدم چمے گی۔ اس نے ارادہ کیا کہ ادھونی سے بچا کر اور بیت بن راہ سے کالا بارنگ کا سارا علاقہ اپنے قبضے میں کر لوں بعد ازاں گوالیار کی طرف بڑھوں اور پھر مالوہ اور گجرات بھی اپنے قبضے میں کر لوں۔

اس کی عادت تھی کہ وہ جو ارادہ کرتا اس پر خود اچھی طرح غور کرتا، اس کے بعد اجلاس طلب کر کے مشورہ کرتا تھا۔ وہ اس رات کسی نتیجے پر پہنچ گیا تھا لہذا اطمینان کی نیند سویا۔ نیند گہری ہوئی تو کمراسی خوشبو سے بس گیا۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ اس کی فوجیں صف بستہ کھڑی ہیں۔ جنگ کا ماحول ہے لیکن خود اس کا یہ حال ہے کہ میدان جنگ سے دور ایک پلنگ پر لیٹا ہوا ہے۔ اس کے امرا اسے گھیرے ہوئے ہیں۔ شاہی اطبا سر ہانے کھڑے ہیں۔ اچھی دیر میں امرا ایک طرف ہٹ گئے اور سفید ساڑی میں ملبوس ایک عورت اس کے قریب آئی۔ یہ سبجہ مانتا تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور پریشان نظر آرہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی حسن نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن نقاہت نے اٹھنے نہیں دیا۔

”حسن، مبارک ہو۔ میں نے فتح کے شادیاں سنے ہیں۔ تمہاری فوجیں فتح یاب ہوئی ہیں۔“

”اللہ کا شکر ہے۔ اب مجھے امید ہے میری بیماری رخصت ہو جائے گی۔“

”تمہیں ہوا کیا ہے؟“

”اطبا کہتے ہیں مجھے ہیضہ ہوا ہے مگر تم اتنی پریشان کیوں ہو؟“

”تمہیں ہیضہ ہو جائے اور میں پریشان نہ ہوں۔ میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ کثرت شراب نوشی سے بچنا مگر تم نہیں مانتے۔“

”ہاں، لیکن اب کیا ہوگا؟“

”یہ سفید ساڑی دیکھ رہے ہو۔ میری ماتنگ میں سیندر بھی نہیں ہے۔ میں آج بیوہ ہوئی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے سبجہ مانتا غائب ہو گئی۔

اس کے کانوں میں دور سے آوازیں آرہی تھیں۔ بہت سے لوگ ایک ساتھ چلا رہے تھے۔ سلطان کا انتقال ہو گیا۔ سلطان اب اس دنیا میں نہیں رہے۔

اتنا شور مچا کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا بدن پسینے میں شرابور تھا۔ جب سے وہ سبجہ مانتا سے جدا ہوا تھا یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس کے خواب میں آئی تھی۔

وہ بہت دیر تک اس خواب پر غور کرتا رہا۔ خواب کا

پہلا حصہ تو بالکل واضح تھا۔ وہ جہاں کشائی کا فیصلہ کر چکا تھا۔ خواب سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے فتح نصیب ہوگی لیکن دوسرے حصے نے اسے الجھا دیا۔ کیا فتح کے فوراً بعد اس کا انتقال ہو جائے گا؟ تاکہ مجھے خبردار کرنے کی تھی کہ میں شراب نوشی سے گریز کروں؟ مجھے ہیضہ کیوں ہو گیا تھا، خواب میں کوئی اور بیماری بھی ظاہر ہو سکتی تھی۔

اسی ادھیڑ بن میں صبح ہو گئی۔ اس نے اپنے سدھی ملک سیف الدین کو طلب کیا۔ اسے خواب کے بارے میں کچھ نہیں بتایا لیکن اپنے عزائم ضرور ہر اسے۔ اس کے عزائم سننے کے بعد ملک سیف الدین نے اسے ادب و احترام سے جواب دیا۔

”آپ کے عزائم مجھے اختلاف نہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آپ ایک بڑے لشکر کے مالک ہیں لیکن یہ عرض نہ در کروں گا کہ آپ جس حد تک تھکتے ہیں۔ آپ کو لڑنا تک کا علاقہ۔ یہ پورا علاقہ نہروں اور درختوں سے بھرا ہوا ہے۔ آپ وہاں مرطوب ہے۔ ہمارے جانور انہی آب و ہوا کے عادی نہیں ہیں۔ جانور زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکیں گے۔“

”کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ لشکر کشی کا خیال دل سے نکال دوں گیونکہ جانوروں کے بغیر تو کوئی جنگ لڑی نہیں جاسکتی۔“

”طہر ایہ مقصد نہیں، میری عرض تو یہ ہے کہ بادشاہ خود پہل نہ فرمائیں بلکہ پہلے ایک جمعیت کرنا تک کی سرحدوں کی حفاظت کے لیے جائے اور ان باقی راجاؤں کی سرکوبی کی جائے جنہوں نے اب تک تجھے اپنے اور ہدیے و ہار میں نہیں بھیجے ہیں اور نہ اپنی فرماں برداری کا اظہار کیا ہے۔“

سلطنت دہلی آج کل انتشار کا شکار ہے۔ اس لیے موقع ہے کہ آپ خود گوالیار اور مالوہ کا سفر کریں اور اپنے چنڈے کو بلند کر کے فتح و نصرت کے شادیاں بجا دیں۔“

حسن بہمن کو اپنا خواب یاد آیا تو اسے ملک سیف الدین کا مشورہ صائب نظر آیا۔ خواب میں جس فتح کی نوید سنائی گئی تھی وہ ہی فتح ہوگی۔

اس وقت اسے خواب کے دوسرے حصے کا خیال تک نہیں آیا تھا۔

دوسرے دن اس نے اجلاس طلب کیا اور امرائے سلطنت کے سامنے اپنا فیصلہ رکھ دیا۔

”ی دالک تا شقدی“

”جی سلطان محترم؟“

”آپ ایک جمعیت لے کر کرنا تک کی مہم پر تشریف

لے جائیں گے۔“

”بدمعہ نہ رہے۔“

مبارک خاں اُدھی آپ کے ہمراہ ہوں گے۔ ان راجاؤں کے دماغ پر دیریں دیریں اس کے جنہوں نے اچھی نگاہ سے دیکھا تو تسلیم نہیں کیا ہے۔

”ایہ بی بیگا۔“

دونوں امرا اپنی اپنی جمعیتوں کو لے کر بلائے بے دریاں کی طرح کرنا تک پہنچ گئے۔ چھوٹے چھوٹے راجاؤں کی کیا مجال تھی کہ ان دلاوروں پر غلبہ پاتے۔ اس لشکر نے ہندوؤں کی راجدھانی کو جی بھر کر لوٹا۔ بستیاں اجاڑتے، گدوں کو لوٹتے رہے۔ دو سو لاکھ سونا، بیش بہا ہیرے، جوہر، موتی، نقد مال دریا بہا تھا۔ دو سو ہزار ایک ہزار طوائفیں اور سائندے تھے جو خراج کے طور پر وصول کیے گئے۔ ان راجاؤں سے عہد لیا کہ ہر سال خراج ادا کریں گے۔

موسم برسات شروع ہو چکا تھا لہذا یہ جمعیت قاتحانہ شان سے غلبہ نہ میں داخل ہوئی۔ سیکڑوں ہاتھی، گھوڑے، بیلے، بڑے سڑکوں سے گزرتے تو شہریوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ حسن بہمنی کے رعب و دبدبے کا ایسا چچا ہوا جو

۲۰ میں نہیں ہوتا تھا۔ جب یہ لشکر بخیر و خوبی اپنے مشن سے واپس آ گیا تو حسن نے ملک سیف الدین سے ایک سرحد پر مشورہ کیا۔ سیف الدین کا مشورہ یہی تھا کہ اب حسن و مالوہ اور گجرات کی فتح کے لیے کل جا نا چاہیے۔ جس بھی تیار بیٹھا تھا۔ سفر کی تیاریاں شروع کر دیں۔ کرنا تک کی مہم کا یانی نے اس کے دماغ سے بہت بڑھاپہ ہے تھے۔ وہ حسن آپا کلپر کے روادار ہو کر دولت آباد پہنچ گیا۔ دوسرے دن اپنے لشکر کے مدد کے لیے گھاٹ پر پہنچا۔ پچاس ہزار سوار اسے سلامی دینے کے لیے موجود تھے۔

اس نے سیاہیوں کا جائزہ لیا۔ طاقت کا اندازہ کیا اور مطمئن ہو گیا کہ اگر اس لشکر کے ساتھ اس نے گجرات اور مالوہ پر چڑھائی کی تو یقیناً کامیابی ہوگی۔

وہ اپنی قیام گاہ پر پہنچا اور مشیروں کے ساتھ بیٹھ کر اس راستے کا تعین کرنے کا جس سے گزر کر اسے ”مالوہ“ پہنچتا تھا۔ اس وقت دربار میں وہ افراد بھی موجود تھے جنہیں حاکم نے اپنے لیے مامور بھیجا تھا۔ وہ سلطان کو وہاں کی آب و ہوا، در لوگوں کے بارے میں بتا رہے تھے۔ یہی حالات اور بیری سے بھی آگاہ کر رہے تھے، اسی وقت

سلطان کو اطلاع دی گئی کہ راجا رائے ہرن کا قاصد اس سے ملاقات کا خواہاں ہے۔ سلطان کو تعجب ضرور ہوا تھا کہ راجا نے اپنا قاصد کیوں بھیجا ہے لیکن قاصد کو واپس بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس نے دربار پر خاست کیا اور قاصد بارگاہ سلطانی میں حاضر ہو گیا۔

اس قاصد نے اپنے راجا کی طرف سے بادشاہ کی خدمت میں درخواست کی کہ گجرات کے حکمرانوں اور لوگوں کے بادشاہوں میں ہمیشہ میل ملاپ رہا ہے لہذا بادشاہ سب سے پہلے گجرات پر حملہ کرے تاکہ راجا کو ان جاگیرداروں سے نجات ملے جو راجا کی حکمرانی کے لیے خطرہ بنے ہوئے ہیں۔

”تمہارا راجا اس وقت کہاں ہے؟“ سلطان نے دریافت کیا۔

”گجرات میں فساد برپا ہے۔ رعایا جاگیرداروں سے تنگ آ چکی ہے اور ارادہ کی فتنہ ہے۔ راجا کوئی فوج کے ذریعے ”بکلاش“ میں ٹھہرا ہوا ہے۔ اپنے موروثی ملک میں جانے کی ہمت نہیں ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ آپ گجرات میں اپنی فوجیں لے جائیں۔ سرکش جاگیرداروں کا خاتمہ کریں اور راجا کو اپنا بھی خواہ سمجھیں اور پھر اطمینان سے رہیں۔“

”یہ ایسا معاملہ ہے کہ میں اپنے امرا اور اراکین سلطنت سے مشورہ کیے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا جب تک کوئی فیصلہ نہیں ہو جائے تاہم میرے مہمان رہو گے۔“

سلطان نے ایک مرتبہ پھر امرا کو طلب کیا اور قاصد سے ہونے والی گفتگو ان کے سامنے رکھ دی۔ اراکین کو یہ شک ضرور ہوا تھا کہ راجا اپنے ہی ملک پر حملہ کرنے کی ترغیب کیوں دے رہا ہے۔

”راجا کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ ابھی وہ بادشاہ دہلی فیروز شاہ کا باج گزار ہے۔ ہم نے گجرات فتح کر لیا تو وہ ہمارا باج گزار بن کر حکومت کرے گا۔“

”وہ ہم سے مقابلہ بھی تو کر سکتا تھا۔“

”مقابلے کی صورت میں یہ ہماری صوابدید تھی کہ اسے حکمران رہنے دیں یا نہیں۔ ہمیں خوش کر کے وہ اپنی حکمرانی کچی کرنا چاہتا ہے۔“

”ایسا تو نہیں ہے کہ اس نے فیروز شاہ کو اپنی مدد کے لیے بلالیا ہو اور ہمیں باتوں میں الجھا رہا ہو۔“

”ایسا اس لیے نہیں ہو سکتا کہ اس وقت گجرات میں عملاً جاگیرداروں کی حکومت ہے۔ اور اگر فیروز شاہ کی فوج

مقابل آئی تو ہم اس سے بھی مقابلہ کر لیں گے۔“



زہرباد

نامید سلطان اختر

سیدھی سی بات ہے کہ انسان غلط رستے پر چلے تو منزل سے بھٹک جاتا ہے۔ چیزیں اپنی جگہ نہ رکھی جائیں تو گھربکھر جاتا ہے اور اگر رشتوں کا استعمال غلط ہو تو زندگی کے معنی ہی بدل جاتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جب سائبان خود تہتی دھوپ میں جلانے پر کمر بستہ ہو تو کوئی سایہ ٹھنڈک نہیں پہنچاتا۔۔۔ وہ معصوم رشتے بھی ایک ایسے ہی تہتے صحرا میں اپنی منزل کا نشان گم کر بیٹھے تھے۔

گھر کو گھر بنانے اور رشتوں کی اس طرح لڑائی ایک شاہکار کہانی

نولادوی بکل والی چری بیٹ ہاتھ میں لیے ابامحن میں بچھی چار پائی پر بیٹھے انتہائی تسلسل کے ساتھ ڈیشان کو غائبانہ بکھان رہے تھے۔ امی، بیچہ اور مصوبہ گھر کے ایک کمرے میں اپنی سانسوں کی رفتار دھیمی کیے بیٹھی تھیں۔ سلمان ابا کے علم پر ڈیشان کو تلاش کر کے باہر سے گھر لانے کو نکلا ہوا تھا۔ آثار بتاتے تھے کہ آج ڈیشان کی کچھ زیادہ ہی شامت تھی۔ اس کی اکثر ہی شامت آجایا کرتی تھی۔

اور انہیں ملک سیف الدین، اس کے بیٹے اور اپنے بھتیجے میں تقسیم کر دیا۔

اس کا بستر علالت ایک ایسی جگہ پر تھا جس کا رخ کلی کی طرف تھا۔ اس نے وردانہ کھول دیا اور حکم دیا کہ جو جس وقت آنا چاہے اسے آنے دیا جائے۔ لوگ اس کی مزاح پر ہی کے لیے آنے لگے۔ وہ ان کے حالات کی پوچھ بچھ کرتا، مظلوموں کی دادرسی۔

اس نے یہ حکم بھی دیا کہ تمام قیدی علاوہ ان قیدیوں کے جو ملک کے لیے آزار کا باعث ہوں، رہا کر دیے جائیں۔ بڑے بڑے مجرم یا بہ زنجیر دار السلطنت میں جمع ہونے لگے اور بادشاہ نے ان کے قصور معاف کیے۔

اسے بستر علالت پر لیٹے چھ مہینے ہو گئے تھے۔ کسی دوا سے کوئی افادہ نہیں ہوا تو اس نے معالیموں کو اپنے پاس آنے سے روک دیا۔

”موت اب میرے قریب پہنچ گئی ہے اور موت کا علاج آپ لوگوں کے پاس نہیں۔ اب میں آپ کا نہیں، موت کا انتظار کروں گا۔“

اس کے بعد اپنے چھوٹے بیٹے محمود کو یاد کیا۔ اسے بتایا گیا کہ شہزادہ مکتب میں اپنا سبق یاد کر رہا ہے۔ کہا اسے بلاؤ۔

”کل کیا پڑھ رہے ہو؟“

”حضرت شیخ سعدی کی بوستان پڑھ رہا ہوں۔“

”کس حکایت پر پہنچے اور اس حکایت میں کیا ہے؟“

”شیخ نے دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ کھینچا ہے اور فرمایا ہے

کہ ہر ایک نے اپنی بہادری سے تمام دنیا کو فتح کر لیا مگر جب

دنیا سے گیا تو خالی ہاتھ تھا۔ اپنی قبر میں کچھ ساتھ نہ لے گیا۔“

یہ سنتا تھا کہ حسن گنگو کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش

ہونے لگی۔ بچکیوں کے درمیان خزاہی کو بلوایا اور تمام خزاہ

شادی منگوا کر بیٹوں کو دیا۔

”یہ تمام خزانہ جامع مسجد میں علا کے درمیان تقسیم کر دو۔“

سارا مال تقسیم کرنے کے بعد بادشاہ کو اطلاع کر دی

گئی۔ بادشاہ نے یہ سن کر اطمینان کا سانس لیا اور اس کے

بعد راعی ملک عدم ہوا۔

وہ ایک عام آدمی تھا۔ دکن کا تاجدار بنا اور گیارہ سال

حکومت کرنے کے بعد سترھ سال کی عمر میں (759 ہجری)

انتقال کیا۔

”جب دہلی کے حکمران فیروز شاہ ہی سے مقابلہ کرنا ہے تو پھر مالوہ اور گجرات دونوں برابر ہیں۔ خاص طور پر ان حالات میں کہ گجرات کے عوام خود بھی ہمیں بلانے کے متمنی ہیں۔“

قاصدوں کو مطمئن کر کے واپس بھیج دیا گیا اور

گجرات کی طرف روانگی کی تیاریاں ہونے لگیں۔

شہزادہ محمد کو یہ طور پر اول میں ہزار سواروں کے ہمراہ

روانہ کیا۔ شہزادہ نہایت تیزی سے روانہ ہوا۔ ”نوساری“

تک پہنچا تھا کہ اس علاقے میں شکاری چانوروں کی بہتات

دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ باپ کی طرح وہ بھی شکار کا شوقین تھا۔

اس نے ”نوساری“ میں قیام کا ارادہ کر لیا۔ سلطان کو اس

علاقے کی تمام کیفیت لکھ بھیجی۔

سلطان شکار کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا

تھا۔ جس وقت شہزادے کا پیغام ملا وہ دولت آباد سے روانہ

ہو چکا تھا لہذا بہت جلد نوساری پہنچ گیا۔

اس علاقے کی آب و ہوا مرطوب تھی۔ آتے ہی اثر

ہوا اور بخار نے گھیر لیا۔ شکار کی افراط بھی اور وہ شکار کا

شیدائی۔ نامناسب آب و ہوا کے باوجود وہ ”نوساری“ میں

ٹھہرا رہا اور شکار میں مشغول ہو گیا۔ شراب و کیا ب کا سلسلہ

بھی جاری رہا۔

یہ سلسلہ ایک مہینے تک چلا رہا۔ بادشاہ کو ہیضہ ہو گیا۔

گجرات قریب تھا لیکن وہ صحت سے دور تھا۔ جب بستر سے

لگ گیا تو مایوسی نے پاؤں و راز کیے۔ ہم ادھوری چھوڑی

اور حسن آباد گلبرگ کی طرف واپسی کا حکم دے دیا۔

گلبرگ پہنچ کر اپنے دیکھے ہوئے خواب کا دوسرا حصہ یاد

آ گیا۔ اسے یاد آیا کہ جب خواب میں بے ماتا اس سے ملنے

آئی تھی تو کسی نے آواز دے کر بتایا تھا کہ بادشاہ کو ہیضہ ہو گیا

ہے۔ بے ماتا اسی لیے پریشان تھی۔ اس کے بال بکھرے

ہوئے تھے کہ اسے میری موت نظر آ رہی تھی۔ میرا خواب کتنا

سچا تھا۔ اس نے فتح کے شادیاں سننے تھے۔ یہ میری فتح ہے کہ

راجا خود مجھے گجرات پر حملے کی دعوت دے رہا ہے۔ فتح کے

شادیاں سننے بچتے میں کتنی دیر تھی بلکہ فتح ہو ہی گئی تھی لیکن مجھے

ہیضہ ہو گیا جیسا کہ میں نے خواب میں سنا تھا۔

اسے یقین ہو گیا کہ اب وہ مرنے والا ہے۔

اس نے صدر الشریف سرفردی کو طلب کر کے ان

کے ہاتھ پر توبہ کی اور اپنی مملکت کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا

تاریخ فرشتہ، محمد قاسم فرشتہ، تاریخ فیروز شاہی ضیا الدین بدایونی

طبقات اکبری حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمہ

"آجئے آج گندی نسل سارے کی چڑی نہ
ادھڑدوں.....الو کا پٹھا.....کتے کا بچہ.....سور کی اولاد کو تنی
دفتر کہا ہے غصہ نہ دے کر گمراہی مل تھوڑی ہے کہ ایک دفعہ کی
بات سن لے۔" ابا کی بلند آہنگی امی اور دونوں بیٹیوں کو
خوفزدہ کیے دے رہی تھی۔

"آج پھر دورہ پڑا ہے انہیں۔" علیہ دھیرے سے
بڑبڑائی۔

"زبان بند رکھو اپنی۔" امی بولیں۔
"شان کو سمجھا میں نا کیوں گھر میں نہیں رہتا وہ باکے
آنے کے وقت۔" معصومہ نے دبی دبی توڑ میں امی سے کہا۔
"گھر ہی میں تو مر رہتا ہے۔" ابا کا ہے، ابھی کل بھی
جائے تو ابا کے آنے کے وقت گھر میں رہنا کوئی وظیفہ تو نہیں کہ
نوٹ جانے سے گنہ ہوگا۔" امی نے ہنسی گھٹی آواز میں ڈیٹن
عرف شان کا بھرپور دفاع کرتے ہوئے معصومہ کو گھورا۔

"اور کیا۔" علیہ نے امی کی تائید کی۔
"آج بری طرح پٹے گا۔۔۔۔۔ بہت غصے میں ہیں۔"
امی بولیں۔

"بے چارہ!" علیہ نے شان سے غائبانہ اظہار
اُمدادی کیا۔

مکھن میں بے تابی سے ٹپکتے ابا اب مرکب سے مفرو
گایوں پر آگئے تھے۔ مرکب گایاں دینے میں ابا کو یہ
خیال ہی نہ رہتا کہ ان کے منہ سے نکلنے والی بہت سی
مفلات خود نیک پڑتی تھیں۔ اپنی اولاد کو وہ بھی کتے سے
منسوب کر دیتے، بھی گدھے سے، بھی سور سے تو کبھی الو
سے۔۔۔۔۔ بھی اپنی پچھلی سات پشتوں کو تو بھی ان کی تخیال کو
برا بھلا کہنے لگتے۔ خود پر پڑنے والی گالیوں میں تو ابا پھر بھی
اُقدار سے شستہ ہو جاتے، دوسروں کو دی جانے والی گالیاں تو
لوک قلم پر آنے اور ضابطہ تحریر میں لانے کے لائق ہی نہ
ہوتیں۔ ایسی ایسی بوالعجب اور نادر روزگار کہ سننے والوں کا
مزاج گھٹنوں جیسی دونوں مکدر رہتا۔

دشام طرازی کو بھی اگر فنون لطیفہ کی ایک شاخ تصور
کر لیا جاتا، اس فن میں غیر معمولی دسترس پر حسن کارکردگی
ابو ارڈ عطا کیے جانے کی کوئی روایت ہوئی تو ابا اس فن میں
نیک قرار پاتے۔۔۔۔۔ ایسی ایسی نادر روزگار گالیاں اور اس
قدر روایتی، تسلسل اور تنوع کے ساتھ کہ سننے والے یہ سوچتے
پر مجبور ہو جاتے کہ ایسی گالیاں ابا نے کیسی کہاں سے کہیں
آخرا!

با کو غصہ بہت آتا تھا۔ صبح سے شام تک ان کی

تواریاں تنی رہتیں۔ غصہ کرنے اور گالیاں کہنے کے سوائے
ڈھونڈتے۔ علی الصبح اٹھ جینٹے اور جب خلق خدا یاد بند
میں مصروف ہوتی اپنا شام طرازی شروع کر دیتے تھیں اچند
درجہ اول گالیاں بٹتے پھر کہتے "سارے ایٹھ رہے ہیں
پڑے۔۔۔۔۔ نماز نہ قرآن۔" جوش جذبات میں کبھی بھی ابا
مسلمان جسے پیر سے مان پارا جاتا تھا یا شان کی بیٹھ اٹھ
اتے اور شانہ تاک کراتی زور سے رسید کرتے کہ سردی کے
موسم میں تو زیر کلاف ہونے کے باعث پڑنے والوں کو پھر
بھی پٹھ بچت مل جاتی، گرمیوں میں گمراہتے زور کی پڑتی کہ
زیر عتاب ہڑا کر اٹھ بیٹھتے۔

غیر بھی کیا قیامت کی آیا کرتی تھی چاروں کو! اپنی خبر
کی اذان ہوتے ہی پیار سے چکانا شروع کرتی تھیں۔
"مان، اٹھ جا بیٹا۔۔۔۔۔ شان، اٹھو میری جان! علیہ نماز کا وقت
ہو رہا ہے۔ معصومہ، اٹھ جاؤ میرا بچہ۔" چاروں کروٹ پہ
کروٹ بدلتے رہتے۔ کبھی۔۔۔۔۔ ہسٹکی سے کبھی ناگوارائی سے
"بھائی۔۔۔۔۔ سن یا ہے۔" کہہ کر دوبارہ بے خبر گوش کے
مزے بوٹنے لگتے۔

"یہ سارے لاتوں کے بھوت ہیں۔ بیٹا، بچہ ان کی
سمجھ میں کب آتا ہے۔۔۔۔۔ انہیں ڈنڈا لے کر دکایا کرو،
ڈنڈا۔۔۔۔۔ ابا، ان سے کہتے۔

ابا ان ایک بیٹھ پڑتے ہی بیٹھ کی ضرب کھانے
والے تو کلمہ پڑھتے ہوئے اٹھنے کے بجائے۔ "اٹھ گئے ابا، اٹھ
گئے۔" کہتے بستر چھوڑ الف کی طرح سیدھے کھڑے ہوتے
جاتے ہاتھوں کی غینہ بھی خطا ہو جاتی۔ غصہ واری تھیلوں
سکول کاٹ کی تھیلوات کے دوران لمبی تار۔۔۔۔۔ بوسہ د
خوبش سرت ہی بنی رہتی۔ ابا کے غصے اور مختلفات سے ڈر کر
بچے نماز کے لیے کھڑے بھی ہوتے تو نہایت بے دلی سے۔

جب تک ابا گھر میں رہتے گھر کی نفس مزاج و مسومہ
رہتی۔ امی ہر قدم پھٹک پھٹک کر رکتیں۔ بچوں کو ڈر۔۔۔۔۔
جاتیں۔ "ذرا ہوش سے۔ ذرا سنبھل کے، ابا گھر میں
ہیں۔" ابا نہ ہوئے ہوا ہو گئے۔ ابا کی موجودگی میں
چاروں بچے امی کے خوف دلائے بن خود بھی محتاط رہتے۔
بہ ضرورت امی سے یا آپس میں ایک دوسرے سے بھی بات
چیت کرنا ہوتی تو سرگرمیوں میں کرتے۔ کوشش کرتے کہ ابا
کا سامنا کم سے کم ہو۔ سامنا ہوتے ہی ابا کی زبان کسی نہ کسی
بہانے آتش فشاں شروع کر دیتی۔ غصہ کرنے اور گالیاں
کہنے کے لیے ابا کو عموماً کسی بڑے اور بھاری بھر کم بہانے کی
ضرورت نہ ہوتی۔ چائے کی خان بچوں یا سات کی جھولی

رہ لی کا میز پر پڑا رہ جاتا۔ کسی بچے کا چیل یہاں وہاں اتار
دیتا۔ جرتے کا الٹا ہو جاتا۔ تنک میں نیلے برتنوں پر نظر
پڑتا۔ تنک یا واش ٹین میں پانی کی اچار تیز کھول
لیتا۔ پائے اسٹرنگ بنانے کے لیے پتی کا ذرا سا زیادہ
استعمال۔ بستر کی چادر کا کونا کسی ایک طرف زیادہ لٹکا
ہوتا۔۔۔۔۔ یا معصومہ کے سر سے دوپٹا غریب جاتا۔

یہ اور اس طرح کے بے شمار چھوٹے چھوٹے۔ یعنی
جو ابا تو کہنے جھکنے کا بہانہ فراہم کرتے۔

شان ناشتا، دو رات کا کھانا حکم حاکم مرگ منجات
کے مصداق ایک ہی دسترخوان پر اکٹھے بیٹھ کر کھا یا جاتا۔ یا
عقابی نگاہوں سے ایک ایک کی کارگزاری کا جائزہ لیتے
رہتے۔ امی فق رہتیں۔ بچے کن انکھیوں سے بھی انہیں، کبھی
ان کے اشروں کو اور کبھی ایک دوسرے کو دیکھے جاتے۔
اکثر بھوکے ہی ٹھہ جاتے۔ ہاں دوپہر کے کھانے پر، سا
چھٹی والے دن جب ابا موجود نہ ہوتے دسترخوان پر
چاروں کی موع مستی، چھیٹا چھیٹا اور ہا ہو دیدنی ہوتی
مان، شان کی پلیٹ سے بولی اڑا لیتا تو شان، معصومہ کے
سارے دھڑکے گھاس پر چھچھ سے جلتنگ شروع کر دیتا۔

"امی، مان بھائی کو دیکھیں۔"
"امی، شان کو سمجھ لیں۔"

کبھی بیخبری کو غصہ کے لیے پکارتی کبھی معصومہ سراپا
احتجاج بن جاتی۔ کبھی ایک بھائی دوسرے کے مقابل صف
آر تو کبھی دونوں مل کر بہنوں کو اپنی حرکتوں سے
آزار کرتے۔ ابا کی عدم موجودگی میں دونوں بھائیوں
میں وہ پاؤں ہوتی کہ خدا کہ پناہ! بہنوں کو بھی۔۔۔۔۔ بچتے
بہنیں بھی جوش میں آ جاتیں۔ اس کا تکیہ اس پر۔ اس کا
ہنگ ہوا، نص یہاں سے وہاں تک ابا کی غیر موجودگی میں
بستر پر گڈ تھیلوں کے سہارے ٹیک لگا کر بیٹھ دیکھا جاتا،
بند پور ایف ایم سنا جاتا، ٹیپ ریکارڈ پر گانے لگاتے
جاتے۔ لوڈ اور کیرم کی بازیاں بھیتیں، دوستوں کو لمبی فون
کاڑ کی چاتیں امی سے بیٹھ بنانے کی فرمائش ہوتی، دودھ
پتی پی جاتی، مان اور شان کرکٹ میچ کھیلنے جاتے۔ ابا گھر پر
نہ ہوتے تو یہ روں مل کر کبھی بھی تو اتنا ہلچا جاتے کہ امی عاجز
آ جاتیں۔ "تم لوگ اپنے باپ ہی سے سیدھے رہتے ہو۔"
امی کہہ پڑتا۔

مان کا قول کو ہاتھ لگاتا "ایسا باپ اللہ۔"
"ایک کو۔۔۔۔۔" شان اس کا جملہ درمیان سے
ہٹ کر خوشی سے گرہ لگاتا۔

"ویسے یار امی۔" مان امی کے گلے میں بائیں ڈال
کر لاڈ سے کہتا۔ "آپ کے شوہر کو تخلیق کر کے اللہ میاں
بہت بچھڑائے ہوں گے۔"

"ہیں! ہیں! کیا بکواس کر رہے ہو۔۔۔۔۔ جھٹھکارو اور
اللہ سے معافی مانگو۔" امی مان کو گھورتیں۔

"مان بھائی یا لکل معافی مت مانگنا۔۔۔۔۔ زندگی خراب
کر رکھی ہے ان محترمہ کے شوہر نے ہماری۔" شان کہتا۔
"اوکے!" مان بڑا ہونے کے باوجود شان کی بات پر
آصا صدقا کہتا اور شان مسکرا کر کن انکھیوں سے امی کو دیکھتے
ہوئے خود ساختہ انگریزی میں لطم لہک لہک کر گالے لگاتا۔

تھینک یو گاڈ یو میڈ مائی مدر
تھینک یو گاڈ یو میڈ مائی برادر
تھینک یو گاڈ یو میڈ مائی سسٹرز
تھینک یو گاڈ یو میڈ مائی سسٹرز
سوری گاڈ یو میڈ مائی قادر
ہی گس لائک اسے مین
ان ٹیکٹ اڑاے جن!

امی آنکھیں دکھاتیں۔ "سن لیا نا کسی روز تمہارے
باپ نے تو وہ جو لگائیں گے کہ یاد رکھو گے۔۔۔۔۔ شرم نہیں
آئی۔۔۔۔۔ مان، بھائی اور بہنوں کے بتاتے پر تو اللہ کا شکر ادا
کیا جا رہا ہے اور باپ کے لیے کہتے ہو گناہ تو انسان ہے مگر
حقیقت میں ہے جن۔۔۔۔۔ شرم کرو۔۔۔۔۔ آنے دو، بتاؤں گی۔"
انہیں۔ "امی کی دھمکی محض دھمکی ہی رہتی۔ کبھی بتانے کی
ہمت ہی نہ کر پائیں وہ ابا کو کہ ان کی درشت مزاجی کی وجہ
سے بچے ان کے بارے میں کس انداز سے سوچتے تھے۔
گھر میں ابا کے آتے ہی بچوں کی ساری چوچھائی
کا فور ہو جاتی۔ ایک دم سا ہو کار بن جاتے۔ تین سو ساٹھ
ڈگری پر کھلے طلق کا زاویہ صرف پندرہ ڈگری تک آ جاتا۔
زندگی ٹھنڈ کر پڑ جاتی۔۔۔۔۔ اور مردنی اس کا جانشین بن جاتی۔
مگر ابا کے جاتے ہی ان کے خوف سے بھل مارے پڑی
زندگی یک یک بیک پوری توانائی کے ساتھ انگڑائی توڑتی اٹھ
کھڑی ہوتی۔

ابا کے غصے سے سب سے زیادہ امی کی جان جاتی اور
وہ اس لیے کہ صرف اپنی ذات ہی نہیں چاروں بچوں میں
سے کسی ایک کو بھی زبان یا ہاتھ سے پہنچنے والی تکلیف کا اثر وہ
براہ راست اپنے دس پر محسوس کرتی تھیں۔ ابا کی تریب
زندگی ہونے کے باوجود امی کی بھی ان سے بس داغی سی
بات جیت رہتی وہ وہی غصہ ورتا۔

”کھانا کھا میں مگر؟“

”جائے بنا دوں؟“

”کھانگ آکل ختم ہو گیا ہے۔“

”مسلمان کی فیس جاتی ہے۔“

”موصوفہ کو تین دن سے بخار ہے۔۔۔۔۔ اسے ڈاکٹر کو کھانا ہے۔“

”بچوں کی بیماری آزماری کی اطلاع بھی امی، ابا کو اس وقت دیتیں جب گھر پلے ٹوگول یا گھر میں رکھی پرانی دوا دارو سے تکلیف رفع ہوتی نظر نہ آتی۔ امی کی عیاذ گزارش ابا اکثر ان سنی کر دیتے۔۔۔۔۔ اور سنتے تو ان کا رد عمل کچھ اس طرح ہوتا۔

”سالہ آکل استعمال تھوڑی کرتے ہوتے لوگ، پانی کی طرح بہا جاتے ہو۔“

”فیس دینے کا فائدہ کیا ہے۔۔۔۔۔ مردود و مضبوطوں میں تو فیل ہو گیا۔“

”پیرا ساسول کی گولی دے دو ٹھیک ہو جائے گی۔ ڈاکٹر میرا باپ نہیں ہے جو فیس کے بغیر دیکھ لے گا۔۔۔۔۔ یہاں تو۔۔۔۔۔“ ابا ایک لمحہ تو توقف کر کے مولیٰ ہی گالی دیتے پھر کہتے ”ہر دوسرے دن ہی کوئی نہ کوئی بستر پر پڑا ہوتا ہے۔“

امی چوری بن جاتیں۔ ابا بیمار پڑی اولاد کو ڈاکٹر کے ہاں لے تو جاتے مگر نہایت بکتے جھکتے ہوئے۔ ”اور کھاد سالے مالے۔۔۔۔۔ کھانے پر تو ایسے کرتے ہیں گندی نسل جیسے کبھی جڑا ہی نہ ہو۔۔۔۔۔ خبیث ہاتھ پاؤں پھیلا کر پڑ جاتے ہیں کہ ہے نا ایک الو کا پٹھا اس کا تو باپ بھی لے جائے گا ڈاکٹر کے ہاں۔“

ڈاکٹر کے ہاں سے واپسی پر بھی ابا راستہ بھر بکتے جھکتے رہتے۔ کیمسٹ سے مجوزہ نسخہ کی دوائیں خریدتے تو نہایت کفایت کے ساتھ، مہنگی دوا تو گول ہی کر جاتے۔ ”یہ سالے ڈاکٹر تو اپنا کمیشن بنانے کو دواؤں کی فہرست لکھ دیتے ہیں۔ اپنی باپونک کی ضرورت کیا ہے۔ خشکی کبڑی ہیں۔ آدی ڈھیر ہو جاتا ہے ان سے۔ گرم پانی سے غرارے کرو۔۔۔۔۔ ٹھیک ہو جائے گا کھانا۔“

”ڈاکٹر نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی لکھی ہوگی دوا۔“ بیمار بچے کی خیر خواہی میں امی دلی زبان سے کہتیں۔

”ڈاکٹر سالہم سے زیادہ عقل رکھتا ہے کیا۔“ ابا آنکھیں نکالتے۔ امی چپ ہو جاتیں۔ ابا سے بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ مرنے کی ایک ہی ٹانگ رہتی۔

ابا کے سامنے بچوں کے مسئلہ جاتے۔۔۔۔۔ دنوں،

ہفتوں میں کوئی ایک آدھ جملہ اور بس!

مسلمان، ذیشان اور ملیح گویا کے خداف ڈھیروں ڈھیر لگے رہتے۔

باپ کوئی ایسے ہوتے ہیں۔ فلاں کے ابا کو دیکھو۔۔۔۔۔ کتنی محبت سے بات کرتے ہیں اپنے ہی نہیں دوسروں کے بچوں سے بھی!

ہمارے ابا!

اللہ تو بہ!

خدا کسی کو ایسا باپ نہ دے!

مجال ہے جو بھی محبت سے بات کر لیں۔

ہر وقت تیوری چڑھی رہتی ہے۔

اور گالیاں۔۔۔۔۔ باپ رہے!

دیکھیں گے تو جیسے کوئی جلا وطن دیکھ رہا ہے۔

چاروں بہن بھائیوں میں بس ایک موصوفہ ہی تھی جسے ابا سے کچھ بھی کم ہوتے اور جودل ہی دل میں ابا کو بے تحاشا پیار بھی کرتی۔ ان کے کمرے کی صفائی، کپڑوں کی دھلائی اور الماری میں رکھی چیزوں کی ترتیب میں وہ امی کا خاطر خواہ ہاتھ بھی بٹاتی، ابا کی چیزوں کو گھینے گراں مایہ کی طرح سنسنال سنسنال کر رکھتی۔ ابا اپنی تمام برائیوں، خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود اسے اچھے لگتے تھے۔ اچھے ہی نہیں بہت اچھے۔ اپنی جان سے بڑھ کر اچھے۔ اتنے اچھے کہ ان کی گالیاں کھا کر بھی وہ انہیں برا کہنے، برا بھجنے کے بجائے دل ہی دل میں اللہ میاں سے گفتگو شروع کر دیتی۔ ”اللہ میوں! ابا کو اچھا بنا دیں نا۔۔۔۔۔ گالیاں دینا کیوں نہیں چھوڑ دیتے وہ! آپ اگر چاہیں نا تو ان کا قصہ بھی کم ہو سکتا ہے۔“

پھر کہتی ہیں نا اللہ میاں جس کام کا ہونا چاہتے ہیں کہتے ہیں کن اور وہ کام ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔ فیکو!۔۔۔۔۔ ابا کا قصہ کم کر دیں اللہ میاں۔۔۔۔۔ غصہ بھی اور گالیاں بھی

اور ہاں شان بے چارے کو مار پڑنا بھی۔

ابا کی گالیوں اور غصے کی تان شان پر آکر ٹوٹی۔ چاروں بہن بھائیوں میں سب سے زیادہ گالیاں بھی وہی کھاتا اور مار بھی سب سے زیادہ اسی کو پڑتی۔۔۔۔۔ اسے بچانے کی کوشش میں دو چار ہاتھ امی کو بھی پڑ جاتے۔ شان تھا بھی تو بلا کا شرارتی اور فساد پرور۔۔۔۔۔ بھائی اور بہنوں کے ساتھ تو چہ نہیں لڑاتا ہی، باہر والوں سے بھی جتنے لیتا پھرتا۔۔۔۔۔ روزانہ اس کی کوئی نہ کوئی شکایت گھر پہنچتی ہوتی۔ آج شان نے یہ کر دیا آج وہ کر دیا۔ کبھی کرکٹ کھیلتے ہوئے کسی کے بلے کا دست تو ڈکرا آ جتا بھی رہہ چلتے کسی

دوست کو مذاق ہی مذاق میں ننگری دے کر گرا آتا۔ کبھی اپنے کسی دوست کی حمایت میں اس کے کسی حریف کا سر بھاڑ آتا تو کبھی مکا، کرکسی کی آنکھ پر نسل ڈال آتا۔ شکایت گھر آنے پر امی بوسائی بولتی پھرتیں۔ ”ابا کو بتا چل کر تو قیامت آجائے گی۔“

چھپانے کی ہر رکوششوں کے باوجود ابا کو کہیں نہ کہیں سے پتا چل ہی جاتا اور ایسی قیامت آتی کہ خدا کی پناہ ا دھائی دھول سے پڑوسی تک کانوں کو ہاتھ لگاتے اور گھر کے قریب واقع قبرستان میں اپنی اپنی قبروں میں سوئے مردے بھی جاگ اٹھتے۔ شان کو بھی مرغا بنا کر، س کی پیٹ پر بس دھردی جاتی۔ کبھی تاہ توڑ ابا کے جھانپڑ پڑے بھی شکایت کنندہ کے اطمینان کی خاطر یہ اسے گھر کے باہر ہی لگک پر لگک لگاتے اور مٹھے گئے بچے بڑے پہلے تو خاموش تماشا کی بن کر شان کی قلت و رسوائی کا تماشا دیکھتے پھر کوئی ہمدرد آگے بڑھ کر ابا کو ظلم سے باز رکھنے اور شان کو ان تشدد سے بچانے کی جرأت دکھاتا تو ابا سے لڑکھاتا۔ ”جاؤ جاؤ، ہنا کام کرو۔ زیادہ ہمدردی دکھانے کی ضرورت نہیں۔ یہ کمینہ تو اس لائق ہے کہ اسے چوراہے پر مار کر اس کے اوپر ہنتر برسا دئے جائیں۔“

شان بھی بدانت تھا، ابا کو بار بار موقع دیتا۔ اکثر زیر عتاب رہتا مگر اپنی حرکتوں سے باز نہ آتا۔ شامت کبھی کبھی مان کی بھی آجاتی مگر شان کی نسبت بہت کم۔ مان کو کرکٹ سے دیوانگی کی حد تک لگاؤ تھا۔ مگر می، سردی، خزاں، بہار حتیٰ کہ ابا کی ماری پر داکے بغیر بھی وہ بلا اٹھا کر کرکٹ کھیلنے نکل جاتا۔ اکثر تو وہ ابا کی واپسی سے پہلے ہی گھر آ جاتا لیکن اگر کبھی دیر ہو جاتی تو امی نے اس کا تریاق ڈھونڈ لیا تھا۔ ابا کی گھر واپسی کا وقت ہوتے ہی امی اس کی کتابیں میز پر پھیلا دیتیں اور گرم پانی میں چائے کا گڈ ڈبو کر رکھتیں۔ خدا نخواستہ ابا، مان کے آنے سے پہلے گھر آ جاتے تو امی جھٹ پٹ گڈ گرم پانی سے نکالتیں اور پہلے سے بنی رکھی چائے تھوڑی سی گڈ میں پکا کر گڈ میز پر رکھ دیتیں۔ ابا مان سے بارے میں پوچھتے تو امی بڑے اعتماد سے کہتیں۔ ”بیٹھا پڑھ رہا تھا، بھی اچھی چائے پی کر نکلا ہے نا تمہیں سیدھی کرے کو۔“

”مردہ کی نانگیں ایسی سیدھی کروں گا کہ سیدھی ہی رو جاوے گی۔“

”کبھی تو نکلا ہے بے چارا۔“ امی دلی زبان سے کہتیں۔

”ابا کی کوٹنگ سے دیکھتے۔“

”ابھی ابھی کیا ہے۔۔۔۔۔ بس ابھی۔۔۔۔۔ جائے کی پیالی تک تو گرم ہے اس کی۔“ امی ان کے اطمینان کو گتھیں۔

”آجائے آج۔“ ابا تھوڑا بگاڑ لیتے۔

امی کو ہول شروع ہو جاتی۔ مان بھی بچ جاتا کبھی ابا کے ہاتھوں اسے بھی پڑ جاتی۔

ملیجہ اور موصوفہ کو بھی ابا سے اکثر چھوٹی چھوٹی باتوں پر ڈانٹ، جھڑکیاں اور گالیاں پڑتی رہتیں۔ بھی جوش جذبات میں ابا ایک آدھ ہاتھ بھی جڑ دیتے۔ ملیجہ، ابا کو متہ بھر بھر کے کوئی۔

”اللہ کرے مر جائیں۔“

”اللہ کرے فوج پڑ جائے ان کے ہاتھوں پر۔“

”ہوں! ہوں! باپ کو ایسا کہتی ہو۔“ امی ملیجہ کو آنکھیں دکھاتیں۔ ملیجہ پروا نہ کرتی۔

”اسنے لوگوں کے ابا مرتے ہیں۔۔۔۔۔ ہمارے ابا کیوں نہیں مر جاتے۔“ ملیجہ کہتی۔

”ملیجہ!۔۔۔۔۔“ امی کا ملیجہ تپتھپی ہوتا۔

”رہنے دیں امی آپ زیادہ حمایت نہ کیا کریں ان کی۔“ ملیجہ نہ بٹاتی۔

”اسکی باتیں کیوں کرتی ہوتی۔“

”کیونکہ مجھے ابا سے نفرت ہے۔“

”انہی سے سہارا ہے ہم سب کو۔۔۔۔۔ اللہ نہ کرے جس دن نہ ہوئے تو مجھ سمیت تم سب کو بھی پتا چل جائے گا۔“

امی ایک مشرقی عورت ہونے کا ثبوت دیتیں۔

”کیا پتا چل جائے گا۔“

”یہ تو اللہ نہ کرے ایسا ویسا وقت بتائے گا تمہیں۔“

”باپ کوئی ایسے ہوتے ہیں۔“ ملیجہ احتجاج کرتی۔

”ایسے بھی ہوتے ہیں۔“ امی کہتیں۔

”ہونہ!۔“ ملیجہ چلے بھنے انداز میں سر کو جھکتی۔ ”کبھی میری دوستوں کے اباؤں کو تو دیکھیں آپ۔۔۔۔۔ شاز یہ کے ابو چھٹی سے آدھے گھنٹے پہلے ہی آکر کالج گیٹ پر کھڑے ہو جاتے ہیں اسے لینے کے لیے۔۔۔۔۔ اور ایک ہمارے ابا ہیں، کبھی آگے بھی تو میں تو اس ڈر سے کالج ہی سے نہ نکلوں کہ وہاں بھی وہ گالیاں بکنا شروع کر دیں گے۔۔۔۔۔ مجھے تو ابا سخت برے لگتے ہیں۔“

”تمہارا بس چلے تو تم شاید کسی دن ابا کو قتل ہی کر دو۔“ ایک روز مسلمان نے مذاق کہا۔

”ہاں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ”میرا بس چلے تو میں واقعی ایسا کروں۔۔۔۔۔ وہ ہمارے ساتھ اچھا بھی کیا کرتے ہیں۔ جب وہ شان کو گھر کے باہر مٹکے والوں کے

سائے فیل کر رہے ہوتے ہیں تو ”میرا“ نے اپنے
 جڑے بچھ لیے۔
 ”تو؟“ مان نے اس کی بات کی جھیل چائی۔
 ”میرا جی چاہتا ہے کہ بتائیں کیا کروں، ابا کو شوٹ
 کر دوں۔“
 ”شرم نہیں آتی باپ کے لیے ایسی باتیں کرتے۔“
 ”ابئی نے دونوں کو گھڑکا۔“
 ”انہیں شرم نہیں آتی ہمیں گالیاں دیتے۔“ لیجھ نے
 سنی سے کہا۔
 ”اور مارتے ہوئے بھی۔“ مان نے گرہ لگائی۔
 ”ہاں..... مارنے میں بھی کون سا دریغ کر جاتے
 ہیں اہ۔“ شان بے چارہ کو پکا ہو گیا ہے پٹ پٹ کر۔
 ”باپ ہیں..... حق ہے انہیں غلط بات پر اولاد کو
 بھیجہ کرتے کا۔“ امی نے ابا کی دکالت کی۔
 ”سچیجہ اور ذلت میں فرق ہوتا ہے اماں۔“ مان بولا۔
 ”وہ جو چاہیں کر سکتے ہیں..... باپ ہیں تمہارے۔“
 ”کبھی انہیں بھی سمجھ دیں کہ ہم بھی دو تین ن
 کی۔“ لیجھ نے امی کو شاکی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”ی گھائل نظروں سے دیکھنے لگیں پھر پولیس۔“ میری بھی
 وہی بات بنا لی گئی تمہارے۔“ باجوہ شان کی بناتے ہیں۔“
 ”یار اماں..... آپ کو ہم لوگوں کے لیے ہمت تو کرنی
 چاہیے تھی نا کبھی۔“ مان ہاتھ جھٹکتے ہوئے جارحانہ انداز میں بولا۔
 ”امی اس کے روبرو جا کھڑی ہوئیں اور بہت پیار سے
 اس کے رخسار پر اپنے داغیں ہاتھ کی انگلیاں پھیرتے
 ہوئے پولیس۔“ بہت مشکل تھا بیٹے۔“
 ”روز روز ادھر اصرار کرنے سے ایک بار پورا مر جانا ہی
 بہتر۔“ لیجھ بولی۔ اس کا یہ احتجاج گزشتہ روز ابا کے ہاتھوں
 شاکی کی بہنہ درگت کا رد عمل تھا۔ مشکل یہ بھی کہ باسوچے
 سمجھے نایک ایک غصے میں جاتے تھے۔ گزشتہ روز بھی جس
 بات پر انہوں نے شان کی ہڈی پہلی ایک کر ڈالی، نہایت
 معمولی تھی۔ اسکول میں شان کے ہم جماعت سہیل نے اس کی
 کتاب پھاڑ ڈالی۔ شان نے اپنی پگنی ہوئی کتاب اس کے
 ڈیسک پر ڈالی اور اس کی کتاب لے کر گھرا گیا۔ شام کو میں
 اس وقت جب ابا گھر لوٹے ہی تھے، سہیل اپنے باپ کے
 ساتھ شکایت لے کر گھرا گیا۔ میں پھر کیا تھا اللہ سے اور بندہ
 ہلے۔ ابا نے گھر کے باہر ہی سہیل اور اس کے باپ کے
 سائے شان کی گدی پر پہلائی ہاتھ ایسا بھر پور مارا کہ وہ ہائے
 اللہ! ہائے اللہ کہتا ڈھرا ہو گیا۔ آنکھیں سرخ اور منہ سے

لہجہ نکلتے جا امی، میرا اور مصومہ جو گھر کی کھڑکی سے لگی مار
 حملہ تک رہی ہیں بار بار کہہ سکیں امی کے تو جیسے۔ یہ ضرر
 تکی، بھینا تھا۔ کر رہے ہیں۔ مان کھڑکی سے ہاتھ سے بائیں ہاتھ
 کی انگلیاں مروڑتا رہا۔ ابا کی کولتیں رسید کرتے ہوئے گھر
 میں لائے۔ زبان سے اسے جو کچھ کہا سنا استغفر اللہ!
 آفریں بھی امی پر کہ لہجہ سب کچھ دیکھ کر بھی چپ
 رہیں اور شاہباش شان کو جو انتہائی مستقل مزاجی سے ابا کی
 گالیاں سننا تھا، مار پڑا کھاتا تھا۔ اس سے تو جیسے ابا کو خدا
 واسطے کا پیر تھا۔ ایسے دیکھتے ہی ان کی جبین شکن آلود
 ہو جاتی، تیور بدل جاتے۔ بلاوجہ گالیاں دیتے لگتے۔ ابا کی
 موجودگی میں سب کی جان پر ہی رہتی۔ صبح و شام چٹنا چلاتا
 ان کا روزمرہ کا معمول تھا۔ صبح کے جھکے بغیر گھر سے نکلتے ہی
 نہ تھے۔ شام کو گھر آتے تو اپنے اس معمول کی انجام دہی کے
 لیے کوئی بہانہ ہاتھ لگتے کو آدم بوا آدم بوا کی تفسیر بنے بھی
 کمرے میں تو بھی پٹن میں جھانکتے کبھی غسل خانے کا پوسٹ
 مان مانتے تو بھی محسن کا معائنہ کرنے لگتے۔ امی کے بچے وہ
 سادھے رہتے۔
 گھر کے ماحول کا بچوں کی نفسیاتی ہی جیس جیسانی
 صحت پر بھی نمایاں اثر پڑا تھا۔ یوں تو چاروں ہی اپنی اصل
 عمر سے چھوٹے نظر آتے تھے گھر میں۔ تو جیسے بالکل نیا دب
 کر رہ گئی تھی۔ رستہ قلمت، لاغر جسامت، آنکھوں
 میں خوف، چہرے پر گھبراہٹ..... ذرا سی بات پر اس کے
 ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ جاتے۔ ابا گھر میں ہوتے تو وہ امی
 کے آس پاس چھپی رہتی۔ جو کبھی ابا کسی ضرورت کے تحت بھی
 اسے پکار لیتے تو ترس کر کانٹھ لگتی۔
 ”بی ابا۔“ خوف کے مارے اس کی آواز بھی نہ لگتی۔
 ”مجھے یہ رومال نہیں پڑا دکھائی دے رہا..... اٹھا
 اسے۔“ ابا کر جتے۔
 وہ غم جان سی دوبارہ امی کے پاس اپنے سچ عافیت
 میں بنا لگتی۔ شان اسے دیکھ کر دلی دلی ہنستا اور اسے
 چھیننے کی خاطر کہتا۔ ”ماسی ماں!“
 ”امی! بھائی کو دیکھیں۔“ مصومہ منتناتی۔
 شان اس کی غل اتارتا۔ ”امی! بھائی کو دیکھیں۔“
 دونوں بھائیوں نے شرارتا بہنوں کے نام بگاڑ رکھے
 تھے۔ لیجھ کو پہلی ہے اور مصومہ کو ماسی ماں کہتے۔
 مصومہ کو ابا کی ڈانٹ سے خائف دیکھ کر شان
 ڈھنکی سے کہتا۔ ”ہم تو شاہ پر دھوکے ہو گئے ہیں۔ ابا کچھ
 بھی کہیں اثر ہی نہیں ہوتا..... ایک کان سے سن کر دوسرے

نکال دیتے ہیں۔“
 ”ابھی کوئی بات نہیں۔“ شہ کہتی۔
 ”آوازیں تو کالج تک بچھا کرتی ہیں میرا۔“
 ”میں تو خواب میں بھی یہی دیکھتا ہوں کہ ابا ہاتھ میں
 بیٹ سے دنات شان پر بے سارے ہیں۔“ مان کی نظر میں
 شان پر ہوتی۔
 ”بچہ کو شان سے ہمدردی محسوس ہوتی۔“
 ”یہ یار، گنتی بڑے زور کی ہے۔ یہ تو یک دو
 میں ہی کام ہو جاتا ہے تو قتی کیسے برداشت کریتا ہے۔“
 مان پوچھتا۔
 ”مجھے تو مزہ آتا ہے۔“ شان ڈھنکی سے مسکراتا۔
 ”ب شرمو اسی لیے تو میں تم لوگوں کی بیٹھیں چھپاتی
 ہوتی ہوں۔“ کی کہتیں۔
 ”نہ چھپا کر میں یار۔“ ب تو اتنی عادت ہو گئی ہے
 بیٹ سے مار کھانے کی کہ یک دو دن نہ پڑے تو یہ دانت
 نکلتے ہیں۔“ شان ہنستا۔
 ”ور اس کے چھپاتے سے فرق بھی کیا پڑتا ہے.....
 با کو بیٹ نہیں کرتا آتی ہے۔ اور کسی کی شہ طے تو اپنی
 مانی سے نکال دیتے ہیں۔“ مان جھٹاتا۔
 ”اللہ کرے۔“ زو کا سبب آئے اور ابا کی لہری
 سے سرری بیٹھیں ہائے جا۔ ”میرا بڑے یہ درد اندر
 میں بدما کرتی۔“
 ”میرے بچا، انہیں تو میں نہیں سمجھا سکتی مگر تمہاری
 ماں ہونے کے ناتے تمہیں یہ سمجھنا میرا فرض ہے کہ زبان
 گناہوں کا پرخطر دروازہ ہے۔ اس دروازے کی حفاظت
 یہی ہے کہ اس پر پورا قابو رکھا جائے۔ غلط بات اس
 دروازے سے نکلتے ہی نہ دی جائے۔ ایک مرتبہ حضرت
 معاذؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یہ
 رسول اللہ کو کون سا عمل ہے جس سے بندہ جنت میں داخل
 ہو اور جہنم سے بچ جائے؟ آپؐ نے خاص خاص باتیں
 بتانے کے بعد فرمایا کہ میں تمہیں ان تمام پر حاوی چیز نہ
 بتاؤں؟ حضرت معاذؓ نے عرض کیا کیوں نہیں ضرور
 بتائیں۔ آپؐ نے اپنی زبان اپنی انگلیوں سے پکڑی اور
 فرمایا اسے اپنے قابو میں رکھو۔“
 ”اس کی کبھی یہ باتیں آپ اپنے میاں کو بھی
 سمجھا دیں۔“
 ”ان سے یہ تو میں بس دعا ہی کر سکتی ہوں بیٹا۔“
 ”گھر میں نہ ہوتے تو گھر کی فضا ہی بدل جاتی۔ امی

ٹپ ریکارڈ رآن کر دیتیں اور گھر کے کام کاج کرتے ہوئے
 ہاتھ سے قیادت لے لیتیں۔ یہ اتنے گانے بھی
 میں سننے لگتیں۔
 ”لہجہ کے گانے سننا امی کے لیے دنیا کی سب سے بڑی
 ”لکھوری“ تھی۔ امی اسکول کے زمانے سے ہی آواز کی
 شیدائی تھیں۔ لہجہ کے گانے سننا امی کا پہلا عشق تھا۔ اپنے
 اسکول کے زمانے میں وہ چھوٹا سا ٹپ ریکارڈر جو بڑے مہار
 نے انہیں دینی سے لاکر دیا تھا، اپنے سر ہانے رکھ کر بڑے
 شوق سے لہجہ کے گانے سنتیں۔ لہجہ کے گانے سننے سننے ان کے
 دل میں ان کی زندگی کے دوسرے عشق نے گھر کر لیا تھا۔
 ”ظہیر! ان کی سبکی عافیہ کا چچا زاد تھا۔ لہجہ، چمریرا اور
 قدرتی طور پر ٹھنکھریا لے بالوں والا۔ اچھی لوکری کی تلاش
 میں انک سے چنڈی آیا تھا اور اپنے چچا کے ہاں مقیم ہوا تھا۔
 عافیہ امی کی محلہ دار بھی تھی اور اسکول میں ان کی ہم جماعت
 بھی۔ جس دنوں ظہیر، عافیہ کے ہاں مہمان ہوئی اور عافیہ
 دوسری جماعت کی طالبات تھیں۔
 ”ظہیر کے آتے ہی محلہ کی لڑکیوں میں کھلبلی مچ
 گئی۔ عافیہ کو، جس کے گھر کا وہ مہمان ہوا تھا، رشک سے دیکھا
 جانے لگا۔ ظہیر کی فکر کا محم میں اس سے پہلے کبھی کوئی نوجوان
 دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ فنی یہ دنگ تھا۔ عافیہ دو بھائیوں کی
 اکلوتی بہن تھی۔ خالہ نے اپنے بیٹے سے اس کا رشتہ مانگ رکھا
 تھا لہذا ظہیر کے آنے سے سے بڑھ فرق نہیں پڑا۔ دو سے وی
 تین ہوئی ہو گئے گھر میں۔ امی کو آج بھی پتا تھا وہ رکھ کی
 ایک شام تھی جب وہ عافیہ سے اس کی ریاضی کی نوٹ بک
 لینے اس کے گھر گئی تھیں۔ ظہیر کو انہوں نے تے جاتے دیکھ
 رکھا تھا۔ راہبہ نہ تھیں۔ محلہ کی دوسری لڑکیوں کی طرح ظہیر
 کے بارے میں ان کے بھی دلی جذبات کم و بیش وہی تھے جو
 اس عمر کی لڑکیوں کے ہوا کرتے ہیں۔ کچھ باتیں ”عین
 فطرت“ ہوتی ہیں سواری بھی اور نہ رہتیں۔
 دو دن بعد ایک روز اسکول جاتے ہوئے عافیہ نے
 امی سے بڑی زرداری سے کہا۔ ”مجھے ایک بات بتاؤں
 عافیہ۔ ظہیر جہاں تجھ سے پیار کرے لگے ہیں۔“
 ”امی جو، ان دنوں اپنی نین اتچ میں تھیں وہ ساتھ
 ٹھنک گئیں۔“ بدتمیز! انہوں نے عافیہ کو آنکھیں دکھائیں۔
 ”بچہ کہہ رہی ہوں۔“ عافیہ نے سسرلی۔
 ”امی ٹھنکی کھڑی اسے دیکھتی رہیں۔“
 ”ایمان سے!“ عافیہ کی مسکراہٹ گہری پڑ گئی۔
 ”چپ کر۔“ امی نے اسے گھڑکا۔

”تیری جان کی قسم۔“
”یوں سست کر۔“

”ہائے قسم سے..... اچھا رک کیوں مٹی ہے۔۔۔۔۔
چلے گا۔۔۔۔۔ دیر ہو جائے گی۔“ عافیہ نے ای کو ٹھوکا
دیا۔ دونوں ساتھ ساتھ چلتے گئیں اور عافیہ نے دھیمے
صوتوں میں ای کو بتایا۔ ”جانتا ہے کیا..... کل اظہر بھائی مجھ
سے کہنے لگے۔“ عافیہ! وہ جو اس دن تمہاری کوئی دوست
تہہری کا پی لینے آئی تھی اس کا کیا نام ہے۔۔۔۔۔“ میں نے
پوچھا کیوں؟ کہنے لگے یوں ہی پوچھ رہا ہوں۔ میری ہنسی
نکل گئی۔ میں نے کہا اچھی لگی ہے کیا ادھر ادھر دیکھا پھر
آہستہ سے بولے ”ابھی کسی سے کہنا مت۔ تمہیں اس
لیے بتا رہا ہوں کہ تم میری اچھی بہن ہو۔“

”ہائے اللہ!“ ای نے ہم کراپے بنے پر ہاتھ رکھ لیا۔
عافیہ ہنس پڑی۔ ”بھئی! ہائے اللہ کی کیا بات۔۔۔۔۔
جب سے اظہر بھائی ہمارے گھر آئے ہیں محلہ کی لڑکیاں
بہانے بہانے ہمارے گھر آنے چاہنے لگی ہیں۔ تو پہلی لڑکی
ہے جس کے بارے میں اظہر بھائی نے پوچھا ہے۔ تجھ سے
پہلے محلہ کی کسی لڑکی کو لغت نہیں کرائی انہوں نے۔“
”میں کون سا مری جارہی تھی ان کے لغت کرائے
بغیر۔“ ای جو دسویں جماعت کی ایک الہ لڑکی تھیں، بولیں۔
”اب تو تجھے مرنا پڑے گا۔“ عافیہ نے کہا۔
”کیوں!“ ای نے یہ ظاہر بڑی بے نیازی کا
مظاہرہ کیا۔

”کیونکہ اظہر بھائی نے بی کام کی ڈگری لے رکھی ہے۔
اسے پینڈسم ہیں۔ کوئی اچھی جاب بھی مل ہی جائے گی۔“
”جیسے کیا!“ ای نے وہی بے نیازی دکھائی۔
”جانتا ہے چار بہنوں کے اکلوتے بھائی ہیں۔ چچا ان
کی کوئی بات نہ لیتے نہیں۔ چچا، ایک بات بتا سچ سچ
شادی کرے گی ان سے؟“

ای کو اپنے دل میں گدگدی محسوس ہوئی۔
”بول۔۔۔۔۔ کرے گی؟“ عافیہ نے ای کے بازو کو
اپنی کتلی سے ٹھوکا دیتے ہوئے پوچھا۔
”جانتیں۔“

اس رات ٹیپ ریکارڈر پر لٹا کی کیسٹ اگائے لٹا کی
میٹھی، مدھر آواز سننے ہوئے ای کا دھیان بار بار عافیہ کے
کڑن اظہر کی طرف جاتا رہا اور انہیں اپنے من میں گدگدی
محسوس ہوتی رہی۔
اسکول آتے جاتے اظہر انٹرنگ میں دکھائی دینے

لگا۔ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں ای کی بات اپنی پسندیدی
ظاہر کرتا۔ ای سسٹی سنائی، کتا نہیں سینے گئے لگائے، نظریں
چرائے اس کے قریب سے گزر جاتیں پھر ایک روز عافیہ کی
ربانی پتا چلا۔ اظہر کو ایک سرکاری محکمہ میں نوکری بھی مل گئی تھی
اور اس نوکری کی وجہ سے اس نے پنڈی کو اپنا مستقل مسکن
بنانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ ای، ایک گوت خوشی ہوئی
”میں نے اظہر بھائی کو بتایا کہ عالیہ لٹا متھیشکر کے
گاہ۔ بہت شوق سے سکتی ہے۔ پتا ہے کیا، چار کیسٹیں
خرید لائے اور اب رات کو اظہر بھائی بھی لٹا کے گاتے سنتے
ہیں۔“ دسویں کے امتحانات کے دوران ایک روز عافیہ نے
ای کو بتایا۔

”پاگل ہیں۔“ ای نے پھر اسی بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔
”ہاں۔۔۔۔۔ ہیں تو۔“ عافیہ نے کہا۔
”کیا مطلب!“ ای چوکیں۔
”جن بر لوگ مرتے ہیں وہ تجھ سے پیار کرتے ہیں
اور۔۔۔۔۔ انہیں نظر اٹھ کر بھی نہیں دیکھتی۔“ عافیہ نے ان سے
عشق کرنا چاہے عشق۔“
”اماں کتنی ہیں۔۔۔۔۔ لڑکیوں کو عشق، شادی کے بعد
کرنا چاہے۔۔۔۔۔ صرف اپنے شوہر سے۔“ ای نے کہا۔
”عشق ہوگا تو شوہر بنے گا باوہ۔“ عافیہ نے بے چالائی پر
اتر آئی۔

”نہیں نہیں۔۔۔۔۔ میں تو ابھی سے عشق کروں گی جس
سے میری شادی ہوگی۔“ ای بولیں۔
”مردل کے اندر کہیں ای کو اظہر سے عشق ہو چکا تھا۔
دسویں کا نتیجہ بھی نہ آیا تھا کہ ای کے لیے ابا کے ایک
جاننے والے کے توسط سے رشتہ آ گیا۔ لڑکا لی اے پاس
تھا۔ نیم سرکاری ادارے میں ملازم۔ اپنے گھر کی چھت میسر
تھی۔ عزت سے گزر رہا تھا۔

اماں نے ابا سے کہا۔ ”لڑکے کے چال چلن کے
بارے میں اطمینان کر لیں، اطمینان ہو جائے تو بسم اللہ۔“
امتحانات کے بعد عافیہ نے سلائی کڑھائی اسکول میں
داخلہ لے لیا تھا۔ ای کا اب اس سے کم ملنا ہوتا تھا۔ ای کے
لیے رشتہ آیا تو ای عافیہ سے ملنے کے بہانے اسے اور اس کے
توسط سے اظہر کو یہ خبر سنانے کے لیے عافیہ کے گھر گئیں۔

”اظہر بھائی کا نگینہ کاویز الگ کیا ہے۔ وہ نگینہ
چھپے چھپے کے۔“ عافیہ نے بتایا۔ ”اب ان کی شادی بھی
دیں ہوگی۔“ چچا کے ایک دوست کی بیٹی سے۔“
”نو نوکری؟“ ای کو اپنی آواز بہت دور سے آتی

محسوس ہوئی۔

”نو نوکری چھوڑ دیں گے۔ نو نوکری کا کیا ہے یار۔۔۔۔۔
نگینہ کاویز اور باہری لڑکی کون چھوڑتا ہے۔“
ای کو یوں لگا جیسے کالج کے کسی پیالے کو زوردار
مضبوط گتے سے اس پر تار ٹھیکوت بن گیا ہو۔
شادی کے بعد ای اپنے شئے گھر آ گئیں۔ لڑکی آواز کی
وہ آج بھی ویسی ہی عیدائی تھیں۔ اظہر ان کے لیے یاد رہے بن
چکا تھا۔ ابا ان کا پہلا اور آخری عشق قرار پا چکے تھے۔

دل میں تمہیں بسا کے
کروں گی میں بند آنکھیں
پوچھا کروں گی تیری
بو کے دھوں گی تیری

”یار اماں اب تو توبہ کر لیں۔“ مان ای کو ایسے گاتے
سننے دیکھ کر چیخڑتا۔ ”اب بھی آپ انہی کی بن کر رہنا چاہتی
ہیں۔ اب تو اپنا پیچھا چھڑائیں ان سے اور ہمارا بھی۔“
”ہیں ہیں۔ کیا ایک رہے ہو۔“ ای انہیں
دکھاتیں۔

”طلاق ہے میں۔ آپ بھی سکون سے رہیں گی ہم
بھی مزے ہیں۔“
”وہ جو تے لگاؤں گی تمہارے کہ یاد کرو گے۔۔۔۔۔
میری اور تمہاری عزت انہی کے دم سے ہے۔۔۔۔۔ سمجھے۔“
ای اگلا گانا سننے ہوئے خود بھی گنگنائے لگتیں۔

آنکھوں کے جھروکوں سے
میں نے دیکھا جو ساتوڑے
جیسے تم نظر آئے
بڑی دور نظر آئے

”اوہو ہوا ماں جی بہت دور تہ نکل جانا کہیں۔“ شان
کی سنگت میں گنگنائی اماں کے انہماک میں گھس رہا تھا اور
چیخڑنے کی خاطر کہتا۔ ”آپ کو کوئی ڈھنگ کا تہی نہیں مل
تھا شادی کرنے کے لیے۔“

”ہمارے ہاں شادی کے لیے ماں باپ لڑکا دیکھتے
ہیں لڑکی خود پسند نہیں کرتی۔“ ای کہتیں۔
”آپ کے اماں ابا کو آپ سے کوئی دشمنی تھی کیا جو
اسا توئی ایہا آپ کے لیے۔“

”یار بھائی تہ دیکھنے میں اچھے ہیں۔ شریف
تہ پڑے تہ تہ۔“
اس دور زبان کے شس ڈھیلے ہیں اور ہاتھ بے
کار۔ مان مسکرتا

12 واں کھلاڑی

☆ ڈاکٹر نے کرکٹ کھیلنے سے منع کر دیا ہے۔
○ اچھا اس نے تمہیں کرکٹ کھیلنے دیکھ لیا ہوگا۔
☆ بیوی نے دھمکی دی ہے میں نے کرکٹ نہ
چھوڑی تو وہ مجھے چھوڑ دے گی۔
○ یقین کرو یار میں بیوی کو بہت مس کروں گا۔
☆ خود فریبی کا عادی نا امل بے باز کریم پر موجود
تھا۔ وکٹ کپر سے بولا۔ تمہارے خیال میں اس وقت
دنیا میں کتنے عظیم کھلاڑی ہیں۔
○ وکٹ کپر نے چونک کر جواب دیا۔ تمہارے
انداز سے ایک کم۔

مرسلہ: مومش، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

کسی روز جب ای کا دل شان کی دھناتی پر کچھ لایا وہ
ہی پر ملال ہوتا تو کیسٹ بدل جاتی۔

تہ کوئی سنگ ہے
نہ کوئی ترک ہے
میری زندگی ہے کیا
اک کئی پنک ہے
ملیج کا دل دیکھنے لگتا۔

”ای جی بس میری تعلیم مکمل ہو جائے۔ میں چاہ
کروں گی۔۔۔۔۔ ہم ابا سے الگ رہیں گے۔“ وہ ای کا دل
ہاتھ میں لینے کی کوشش کرتی۔
”نہیں بیٹا۔“ ای ملیج کا خیال فوری رد کر دیتیں۔
”عورت مرد سے بھاری ہوتی ہے۔۔۔۔۔ تمہارے ابا جیسے بھی
ہیں ان کے بنا میری حیثیت کچھ بھی نہیں۔“

”ف اللہ ای۔ اب بچی دو تا زمانہ نہیں رہا ہے
جب عورت سے جاری کو مرد کی جتا کے ساتھ ہی رندو جل جانا
ہوتا تھا۔ عورت کی اپنی ایک حیثیت ہے۔“ ای۔ کوئی کی کم
جہی پر افسوس ہوتا۔

”کوئی حیثیت نہیں۔ آج تمہارے ابا اللہ تہ
کرے مجھ سے الگ ہو جائیں تو اپنے پرانے سو سو طرح
انگلیاں اٹھائیں گے مجھ پر اور جو عیب نہیں بھی ہوگا مجھ میں
وہ بھی لگا دیں گے۔۔۔۔۔ اکیلی عورت کی کوئی حیثیت نہیں
ہوتی۔“

”میں آپ کو اکیلی رہ کر اور اپنی حیثیت متوا کر
دکھائوں گی۔“ ای اس کے بے نیازی کی یاد رکھی

حکمہ میں کرواؤں گی۔۔۔۔۔ پھر دیکھیے گا آپ۔۔۔۔۔
 ”پاکل ہوتی۔۔۔۔۔ عورت کتنی ہی جڑی افسر کیوں نہ لگ جائے عورت ہی رہتی ہے اور۔۔۔۔۔ ایکلی بھائی کیوں رہو گی تم!“
 ”میں شادی نہیں کروں گی۔۔۔۔۔“
 ”بدقال منہ سے کیوں نکالتی ہو۔۔۔۔۔ امی ملیجے تو آنکھیں دکھائیں۔۔۔۔۔“

”بدقال کیوں۔۔۔۔۔ ابا جیسے آدمی سے شادی کرنے سے بہتر ہے شادی کی ہی نہ جائے۔۔۔۔۔“
 ”ابا میں کیا برائی ہے آخر۔۔۔۔۔ بس گالیاں ہی تو دیتے ہیں۔۔۔۔۔ تم میں سے جس کو بھی پڑتی ہے اپنی غلطی کی وجہ سے۔۔۔۔۔“
 ”ہاں بھی ہم سب غلط ہیں۔۔۔۔۔ بس آپ اور آپ کی لاڈلوسی ماں ٹھیک ہیں۔۔۔۔۔ آپ کو اپنے میوں اور اسے اپنے با۔۔۔۔۔ جیسے تپ چہاں ہیں کی بنیاد پر نہ صرف قبول بلکہ بہت پیارے ہیں۔۔۔۔۔“

”کیوں نہ ہوں بھلا!“ امی مسکراتیں۔
 ”چھا بھئی اچھا۔۔۔۔۔ کیجیے خوب عشق کیجیے آپ اپنے میاں کی سے اور ماسی ماں اپنے ابا کی سے۔۔۔۔۔ بھائیوں کی نقل میں ملیجے بھی مصومہ کو ماسی ماں بہتی۔۔۔۔۔“
 ”نہیں کیا۔۔۔۔۔ مجھے تو اپنے ابا بہت اچھے لگتے ہیں۔۔۔۔۔“ مصومہ بہن کی بات پر منہ بناتے ہوئے کہتی۔ اسے اب اپنی تمام تر کفنگی کے باوجود، سمجھتے لگتے تھے۔ جب اس سے بڑے ننوں بہن بھائی مل بیٹھ کر ابا کی برائی شروع کرتے تو وہ ان سے بارہ ہتھر پرے بیٹھی رہتی اور اپنی پارک سی آواز میں کہتی۔ ”آئے دو ابا کو بتاؤں گی میں تم لوگوں کی باتیں۔۔۔۔۔“

”ابا کو بتاؤں گی۔۔۔۔۔“ شان اس کی نقل اتارتا۔
 ”ایک لڑکی ابا سے بھی تیرے معیار کا پڑ جائے تا تو یہ کیا اس کے فرشتے بھی کبھی ابا کو بتانے کی بات نہ کریں۔۔۔۔۔“ مان کہتا۔

”آپ لوگ ابا کی اتنی برائیوں کیوں کرتے ہو؟“
 ”کبھی ابا سے بھی پوچھو کہ وہ ہمیں کبھی کتے کا بچہ، کبھی گدھے کی نسل کیوں بنادیتے ہیں۔۔۔۔۔“
 ”وہ ابا ہیں۔۔۔۔۔“ مصومہ وکالت کرتی۔ ”انہیں غصا آتا ہوگا تا تم لوگوں کی حرکتوں پر۔۔۔۔۔“
 ”انہیں اگر غصا آتا ہے تو ہمیں کیوں نہیں آسکتا۔۔۔۔۔“
 ”مجھے تو ابا اچھے لگتے ہیں۔۔۔۔۔“

”تمہارے بچ ڈھیلے ہیں۔۔۔۔۔“ مان اپنی حرکات و سکنات سے مصومہ کے دماغ میں خلل ہونا ظاہر کرتا۔

مصومہ پروا نہ کرتی۔ ابا سے اپنی محبت کے معاملے میں اس کے اور امی کے ستارے ملتے جلتے تھے۔ دونوں کی محبت غیر مشروط تھی۔ دونوں کے نزدیک ابا جہاں تھے جیسے تھے، اچھے تھے۔

ابا ایسے کیوں تھے یہ کسی نے کبھی جاننے کی کوشش ہی نہ کی تھی۔ خود پانے بھی نہیں، جو گھر والوں سے کالم گلوچ اور مار پیٹ کے بعد بہ باطن خود کو اکثر ملامت کرتے تھے۔ مان اور با۔۔۔۔۔ خصوصاً شان و مار نے بیٹے کے بعد وہ دل ہی دل میں از حد طول ہوتے۔ تخلیق میں وہ اپنے مار پیٹ کرنے والے ان ہاتھوں کو ان کے جرم کی پاداش میں اکثر ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کی انگلیوں کو اس بری طرح مروڑتے جیسے توڑی ہوئی توڑالیں گے۔ بال بچوں کو برا بھلا کہتے اور گالیاں بکتے والی زبان کو وہ ناقابل برداشت حد تک اپنے دانتوں سے دبا بیٹے۔ امی اور بچوں کو برا بھلا کہہ کر یا مار پیٹ کر گھر سے نکلتے ہی اور کبھی کبھی گھر میں بھی انہیں احساس ندامت آن گھیرتا۔ گالیاں۔ کھا کر مان کے شرمندہ ہونے اور مار کھا کر شان کے بلبلا اٹھنے کی بازگشت انہیں دل گرفتہ کر دیتی۔ گھر سے باہر ہوتے تو شان کی بلبلاہٹ کا یاد آنا انہیں مضطرب رکھتا۔ گھر واپس لوٹتے ہوئے وہ بظور زخم دوز گھر والوں کے لیے پھل فرود، مٹھائی، نمکو غرض کچھ نہ کچھ لے کر آتے۔ دل میں تپ کر لیتے کہ آئندہ نہ کر، بوگانی دیں گے، نہ بچوں میں کسی کو با۔۔۔۔۔ نہیں گے۔ لیکن اپنے عہد پر قائم نہ رہ پاتے۔ کوئی بات نہ بھی ہوتی تو بھی ان کی زبان دشنام طرازی کو بچھلے لگتی۔ ہاتھوں میں چل سی ہونے لگتی۔ کسی مان کے بال ہاتھوں میں آجاتے، کبھی شان پر ان کی لاتیں برسنے لگتیں۔

ان کے اپنے ابا تو ایسے نہ تھے۔ وہ تو نہایت ٹھنڈے مزاج کے اور پیار کرنے والے آدمی تھے۔ شاید یہ ابا کے حالات کا رد عمل تھا۔ صبح آٹھ بجے سے شام چھ بجے تک مسلسل کام کر کے بھی ابا کے ہاتھ میں وہ نہ آتا جس سے وہ اپنی اور اپنے اہل خانہ کی ضرورتیں کا حقد پوری کر سکتے، کبھی آتا مہینا ختم ہونے سے پہلے ختم ہو جاتا، کبھی چادر کا کنسٹرکشن ہی دینے لگتا۔ کبھی کتک آئل کا خان ڈبا منہ چڑانے لگتا تو کبھی چائے کی پتی وقت سے پہلے دغا دے جاتی۔ کبھی مان کی فیس تو کبھی ملیجے کی مسٹر فیس۔ کبھی شان کی یونیفارم چھوٹی ہو جاتی تو کبھی مصومہ کو پریٹیکل جرنلز خریدنا ہوتے۔ کبھی ابا کا جوتا اتنا ٹھس جاتا کہ تلے میں سودا خ

ہو جاتے، کبھی امی کے جسم کے جوڑا جتنے دکھتے لگتے کڑا کڑو کہتا ضروری ٹھہرتا۔ ایک تھوڑی ہزار خرچے تھے اور ہر خرچہ اپنی جگہ انتہائی ضروری! اس پر مشر اور روز افزوں نہ رہا، مگر۔۔۔۔۔ مہینا کے آخر میں تو ابا اپنی الماری میں پتھر پتھر پتلی پتلونوں اور قمیصوں کی جھینٹیں ہی چپے چپکے ٹٹولتے۔ بچے کشید کوئی معجزہ ہو جائے۔ کسی جیب سے زیادہ نہیں تو چند روپے ہی نکل آئیں۔ کبھی کبھی تو بیچے کی یہ تمنا نکلتے لگتے سسوں تک آنٹھرتی۔ کچھ ریزکاری مل جائے تو اگلے دو دن کام پر پہنچنے کا آسرا تو ہو جائے۔ تیس دن تو اپنی تاریخ گئی ہی۔

کئی تاریخ کا انتظار بھی عجب جاں مسل انتظار ہوتا۔ مہینے کی ابتدائی تاریخوں میں ناشتے میں ڈبل روٹی بھی ہوتی، آدھٹی بھی۔ ابا پہلی تاریخ کو گھر کے سانسف کے ساتھ حمام یا جس کی شیشی اور مکھن کی گھبراہٹ دے دیتے۔ ابا کے غصے اور گلوچ میں بھی قدرے فائدہ رہتا۔ پھر جام پتلی کی شیشی اور مکھن کی گھبراہٹ ہو جاتی۔ ابا کہتے ”بیٹو میں سانسے، بندھ بھی نہیں آتا، آج رات کبھی ختم نہیں ہوگی پڑپ۔“ گویا جام کی شیشی حمام سے بھر کر جان گئی اور مکھن کی گھبراہٹ برابر تو وہ جسے مہینا بھر میں ختم ہونا چاہیے تھا۔ مہینے کی درمیانی تاریخوں تک ناشتے میں ڈبل روٹی اور آدھٹا کا گائینہ ملتا دو انڈوں میں امی کم سے کم آدھٹا اور ایک ٹماٹر رچا رہتا۔ مہینا تھا۔ دو پیر اور رات کے کھانے میں ہفتہ میں ایک دو مرتبہ بڑے کا گوشت اور سبزی کا سالن یا چائے بھی نصیب ہو جاتی۔ پھر مہینو بدل جاتا۔ مہینے پہنچتے پہنچتے ناشتے میں ڈبل روٹی کے سادہ سلائس رہ جاتے۔ حائینہ میں غائب ہو جاتا، ناشتا میں ڈبل روٹی کا استعمال با کو نہ ملتا۔ سب دارے میں لگتا کہ بصورت دیگر پرائیڈوں میں نیل یا کئی صرف ہوتا۔ مہینے کے بعد گوشت اور چمن وٹل اسٹاپ ہو جاتا۔ سبزی یا چر دال۔ ابا کا غصہ درگاہوں کی رفتاری بھی بڑھ جاتی۔ با پھونک پھونک کر جیب میں ہاتھ ڈالتے۔ مہینے کے آخری دن تو عجیب سی مٹی میں ڈرتے۔ ایک ایک کا منہ دھینچتے ہوئے۔ ناشتا سے ڈبل روٹی غائب ہو جاتی۔ تو بے وٹیل کی چھری کی گارڈا کی ہاسی روٹی کو پانی کا لہکا سا چھینٹا دے دیتے۔ پھر گرم مہینا جاتا۔ رات کی پتی دال سبزی ہوتی تو نہ دے دیتے۔ گرم کی ہوئی روٹی چائے سے کھالی جاتی۔۔۔۔۔ مہینے میں پتلی پتلونوں اور قمیصوں کی جھینٹیں ٹٹولتے کھگالتے ابا ہر گز۔۔۔۔۔ کی رفتار انتہائی حدوں کو چھونے لگتی۔ امی اپنی کھچھکائی سے۔۔۔۔۔ سا پیر چار پانچ دن پرے پہلی تاریخ کا حساب نہ لگا سکتی جیسے صدیاں گن رہی ہوں۔ ”آج چھینٹیں ہو گئی کل

ستائیس پھر اٹھائیس، اٹیس، تیس۔“ انگلیوں کی پوروں پر تاریخیں گن لینے کے بعد امی دنوں کا حساب لگاتیں۔
 ”آج جمعرات ہے۔۔۔۔۔ کل جمعہ۔۔۔۔۔ پھر ہفتہ، اتوار، پیر۔۔۔۔۔ منگل کو پہلی۔“ اور جو خدا خواست پہلی تاریخ کسی چھٹی والے دن پڑتی تو امی کو دسمبر، جنوری اور جولائی اگست کی طرح سخت کھلتا۔ ”لو یہ مہینا بھی اٹیس کا ہو گیا۔“ سال میں دو مرتبہ بینک ہائیڈ سے جو، کی اور جنوری کے مہینوں کو تیس دن کا بنا دیتا۔ ابا کبھی دل ہی دل میں کبھی منہ ہی منہ میں کبھی بینک والوں کو کبھی پالیسی سازوں کو برا بھلا کہنے لگتے۔ ”پہلے ہی کچھ کم چھٹیاں ہوتی ہیں جو سا، یہ بینک ہائیڈ سے۔۔۔۔۔ یہ بینک والے کلوزنگ کر کے ہم عوام کی تو جیسے سات تسلوں پر احسان کرتے ہیں تا۔۔۔۔۔ بونس نہیں ملتا ہے کیا۔۔۔۔۔“ جھینٹیں بھر بھر کے تھوڑا لے جاتے ہیں۔۔۔۔۔ پتلی پتلی۔۔۔۔۔ وہ ایڈوائس۔۔۔۔۔ فلاں بونس۔۔۔۔۔ فلاں بونس۔۔۔۔۔ بچوں کی پڑھائی کا خرچہ تو باپ کے مرنے کا خرچہ۔۔۔۔۔ ان کے تو سانسے ڈرا یوروں اور ناب قاصدوں کی بھی پانچوں کھی میں ہوتی ہیں۔“ ابا کی گالیاں سنتے سنتے پہلی آجاتی اور چند دنوں کے لیے ابا کے غصہ اور گالوں میں کچھ فرقہ ہو جاتا۔

موتی مسائل کے علاوہ ابا کو در بہت سے مسائل کا بھی سامنا رہتا۔ گھر سے باہر زندگی گھر کے اندر سے بھی زیادہ مشکل تھی۔ ہر طرف غصہ مٹی، درافر تفری۔۔۔۔۔ ہر شخص دوسرے کو گرا کر آگے بڑھنے کے لیے تیار۔۔۔۔۔ وقت سے پہلے ہی حشر کا سماں گویا! دکانوں میں جاؤ تو ہوشربا گرائی۔۔۔۔۔ سڑکوں پر لنگو تو وحشت کا رقص۔۔۔۔۔ نہ دوسرے کی عزت اور حقوق کا پاس نہ اپنی اور دوسروں کی جانی حفاظت اور ٹریفک قوانین کا احساس۔۔۔۔۔ دفتر جانے اور گھر واپس آنے کے لیے ابا کو روزانہ عوامی بسوں میں سفر کرنا جسمانی اور روحانی اذیت سے دوچار کرتا۔ مٹی بسوں میں سردھڑ کو ایک سو میں کے زاویہ پر رکھے رکھے کر تختہ ہو جاتی، وقت سے پہلے گھر سے نکلتے کے باوجود دفتر پہنچنے میں آئے دن دیر ہوتی۔ غامیوں اور کوتاہیوں والا افسر بھی ابا کو آئینہ دکھانے کھڑا ہو جاتا۔ ”صابر صاحب! آج پھر سات منٹ لیٹ پہنچے ہیں آپ۔“ ابا دل ہی دل میں اسے ایک غلیظ گالی دیتے اور زبان سے کہتے۔ ”سوری سر! ٹرانسپورٹ کا مسئلہ تھا۔“
 ”ایک آپ ہی کا نہیں یہ تو سب کا مسئلہ ہے۔“ افسر کہتا۔
 ”سر! میرے روٹ پر پبلک ٹرانسپورٹ کی قلت ہے۔“
 ”جلدی نکلا کریں گھر سے۔۔۔۔۔ دو گرم پرائیڈے کھا کر

لکھنا تو ضروری نہیں۔

”حیری ماں کی۔۔۔“ ابا دل ہی دل میں پشکارہے۔

”مرا وہ سب کے سامنے ذلیل کرتا ہے۔“

”وقت پایا کریں۔“ افسر تنبیہ کرتا۔

ابا اسے دل ہی دل میں برا بھلا کہتے اپنی سیٹ پر جا بیٹھتے۔ صبح سے شام تک انتہائی ایجنداری اور جانفشانی سے اپنے کام میں مصروف رہتے اور چھٹی کے بعد دفتر سے نکلنے وقت اپنے افسر کے کمرے کا دروازہ بند اور اس کے باہر بیٹھے چڑا سی کو دیکھ کر سوچتے آج اس نے نہ جانے کتنے لوگوں سے کہا ہو گا صاحب مینٹگ میں ہیں۔ دل ہی دل میں ابا اپنے بے ایمان افسر کو کبھنا شروع کر دیتے۔ ”ضبیٹا دوسروں کے پانچ سات منٹ سیٹ ہونے پر ان کے گرم پرانے کفنے کھڑا ہو جاتا ہے اور خود اس کے کا بچہ دس بجتے ہی گاڑی دبا کر بچوں کے پوڑے دھونے گھر پہنچ جاتا ہے

اور وہ اس کا چچہ سرور خان مراد ہر فون کا۔۔۔ صاحب مینٹگ میں ہیں۔۔۔ اور ہر وزیٹر کو ایک ہی گولی۔۔۔ صاحب ابھی دفتر کے کام سے باہر نکلے ہیں۔“

دفتر پہنچنے میں بھی بھڑلیٹ ہو جانے سے قطع نظر ابا اپنے فرائض منصبی کی انجام دہی نہایت دیانت اور جانفشانی سے کرتے۔ اسی لیے بددیانت اور تامل پسند لوگوں سے نہیں جڑتھی۔ ایسے لوگوں کو ابا کبھی دل ہی دل میں اور کبھی علی الامان بھی گایاں دینے سے گریز نہ کرتے۔ اپنے افسر کی طرح کے خوراک نصیحت دیگران نصیحت قسم کے بوگ ابا کا میٹر گھا کر رکھ دیتے۔ ”کہیں اپنے گریبان میں منہ ڈال کر نہیں دیکھتے۔“

یا کی صحیح قدر، مئی کو بھی۔“ شکر کرور ورق حلال ڈالتے ہیں تمہارے باپ تمہارے بیٹوں میں۔“ وہ بچوں سے کہتیں۔

”یار اماں کسی امیر آدمی سے شادی کرتیں ناں۔“

مان کو حسب عادت شوخی سوجھتی۔

”ہاں۔۔۔ ہم بھی کے ایف سی اور میکڈونلڈ تو جاتے۔“ ملیجہ کہتی۔

”مسائن بورڈ پر ہی زنگر دیکھ کر دل لپاٹے لگتا ہے۔“

شان زور کا چٹکارہ بھرتا۔

”نندیدے!“ ای تینوں کو تنبیہ نظروں سے دیکھتے ہو۔۔۔ بڑا نہیں۔

”مان! میکڈونلڈ کا برگر کتنے کاٹتا ہو گا۔“ شان امی سے بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مان کو آنکھ مارتا۔

”مجھے کیا پتا۔۔۔ بھی جائیں تو پتا چلے۔“

”پہلے جان کر یا۔۔۔ نہیں گے کسی۔“ ملیجہ کو مزہ آتی۔

”میں بھی!“ معصومہ منمناتی۔

ای اسے گھورتیں۔ ”لی میڈ کی کو بھی زکام ہو۔“

معصومہ کی نقل اتارتیں ”میں بھی۔“

”ساری دنیا جاتی ہے امی۔ مان کا بھجہ جا۔“

”ہاں اور کیا۔“ میرا اس کی ہاں میں ہاں ملاتی۔

ایک ہم ہی سارا وقت گھر میں مرے رہتے ہیں۔“

”کون کہتا ہے مرے رہو۔ جاؤ۔ پیسے ہیں جیب میں؟“ امی دھتکی رگ پر ہاتھ رکھ دیتیں۔

”پیسے تو خیر جمع ہو ہی جائیں گے مگر۔۔۔“ وہ آپ جھڑوس میاں جو ہیں ناں آدمی آدمی کر کے ہمیں دانا کرنے وہاں بھی پہنچ جائیں گے۔“ ملیجہ کہتی۔

”شرم نہیں آتی باپ کو جھڑوس کہتے ہوئے۔“

”آپ کے میاں کو یاد۔“ ملیجہ اترا کر امی کے

میں بائیں حمل کر دیتی

”میرا میاں تمہارا تو جیسے کچھ گت ہی نہیں۔“ امی کی بائیں جھٹنے کی کوشش کرتیں۔

”یار اماں! آج آپ بتا ہی دیں ان سے بہتر نہیں مل سکتے تھے آپ کو ہمارے لیے۔“ مان پھوٹے سے کہتا۔

”شکر کرو کہ یہ بھی مل گئے۔“ امی مان کو گھورتیں۔

”ہیں! کیا اباؤں کا اتنا کال تھا۔“ ملیجہ آنکھ دبا کر ہوئے شان کو مسخرے پن سے دیکھتی۔

ابا کی عدم موجودگی میں مان اور شان کی خرمستی

امی کو آواز آرہی تھیں۔ لی دی قل دایوم پر آن رہتا۔ ڈائل

دونوں کے لیے اکھاڑا بنا رہتا، معصومہ ریفری بنی گنتی

رہی ہوتی۔ ”سیون۔۔۔ ایٹ۔۔۔ نان۔۔۔ ٹین۔“

ایسے میں اگر کہیں امی موقع واردات پر پہنچ جاتیں

معصومہ کا کان اپنے ہاتھ میں دبوچ کر کہتیں۔ ”ٹین کی پٹی“

معصومہ منہ بسورنے لگتی۔ ”مان بھائی نے کہا ریفری ہو۔“

”شکل دیکھی ہے اپنی۔“

”شکل تو پوری ریفریوں والی ہی ہے امی۔“

”اچھل کر شان کو بیک اپ کرنی ملیجہ مسکرتی۔“

”اپنی شکل دیکھی ہے تم نے۔“ امی ملیجہ کو گھورتیں۔

”پاشا بسو۔“ چاروں شانے چت پڑ شان

کاتا۔

”ہیں ابی پاشا تو کالی کھوٹی حیدر آبادی تھی، میرے
بچپن میں وہاں سے پڑوس لگے۔“

نام کس نے بتایا؟ ”میں حیران ہوئیں۔
شان قہقہہ لگاتا۔ ”یار ماں، یہ آپ کے بچپن کی
حیدر آبادی پڑوس کی نہیں پڑوسی ملک کی فلم، سٹار پاشا کی
بات کر رہا ہے۔“

”ہاں پڑوسی ملک کے فلم سٹاروں کی تو، اسے پوری
بجھتا رہا ہے۔“ اسی شان، گھوڑیں۔ ”ہمارا ہوا پہلا اینڈ اکیلا
چاروں شاہے چست پڑا ہے۔ چل اٹھ۔“ نا اسی
کا۔

”بھائی سے کہیں میرے سینے پر سے ہٹا پڑوس
بٹائیں۔“ شان منہ مانتا۔

”اتنا بڑا دم ڈھینگ“ اسی اب مان تو جھکیں
آکھتیں۔ ”نرم تو نہیں اتنی، چھوٹے بھائی کے سینے پر پاؤں
رکھے کھڑے ہو۔“ بہت اچھا کرتے ہیں تمہارے ابا
جبہارے ساتھ۔ اتنی جتنی نہ تھیں تم لوگوں پر تو تم لوگ
آسمان سے نازل ہو جاتے۔

محبت مجھے ان دونوں سے ہے، ستاروں پہ چڑھ
ڈالتے ہیں کند۔ اپنا پاؤں شان کے سینے سے ہٹاتے
ہو۔ مان خاصے تھوڑی انداز میں کلام قبول داکرتا اور
اسی کے گھوڑے پر کھی جی کرتے گتے۔ شان، عینہ اور معصومہ
بھی اپنا اپنا منہ دیا کر ہنسنے لگتے۔ اسی بڑبڑاتی ہوئی دایس
پلٹ جاتیں۔

یہ ساری شرارتیں ابا کی عدم موجودگی ہی میں کی
جاتیں۔ ابا کی موجودگی میں تو گھر سے آوازیں، روتی،
زندگی کا فور ہو جاتی۔ آس پڑوس میں بسنے والے بچے
بڑے مان اور شان کو ذرا اسی بات پر بس ایک ہی دھمکی
دیتے۔ ”تمہارے با سے کہہ دیں گے۔“ اور بعض بد بخت
کبھی کبھی جھوٹی شکایتیں کر بھی دیتے۔ پھر جو شکایت
بہندہ کی شامت آتی تو تندہ دے اور بندہ لے۔ جب شان
کی دھناتی مٹی اور وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر ”اے بندہ ابی ب
نہیں۔“ اب نہیں میرے پیارے ابا جی اب نہیں۔ اب
نہیں۔“ کہتے ہوئے بھی ادھر کبھی ادھر مگرتے پڑتے
ہوے تڑپتا، ہلکتا تو میر کا ذہن با کے خلاف استقامتی
کارروائیوں پر غور فرماتے لگتے۔ معصومہ اپنے موقعوں پر
اسی کے آگے پیچھے دینے کی کوشش کرتی۔ اسی جی اسے پناہ
دے دیتیں بھی جی اسی سے پرے دھکیلتے ہوئے کہتیں۔
”وٹھ ہو جا۔“ میں خود اپنی جان سے بیزار ہوں۔“

معصومہ گھر کے کسی کونے کھد سے بیٹھ جاتی۔ بڑا بے
حسب سداوت کی تڑپیں چا جھکتے۔ اس کے مدنی چپے چپے
کبھی چوٹ کی ٹکڑا کرتیں کبھی زخموں پر برتاؤ یا دل نہیں
لگاتیں۔ مار کھانے کے بعد شان، دو تین گھنٹے ان کی پی بنا
رہتا۔ عینہ سے اپنی جمع شدہ پونجی سے بسکٹ بنگوا کرتی۔
معصومہ اپنے اسکول بیگ سے تانی، کینڈی، بیل گم یا بھنی
مرغ، اس کی مڑی تانی کی تھیلی میں بچی بھکی بھر مرغ اس
سے پیش کرتی۔ مان مثالی حسن سلوک کا مظاہرہ کرتے
ہوئے اسے بید پر کھل سیٹ۔ نئے کو جھہ پتا یا پھر اپنی کوئی
استعمار شدہ چیز اتار بیٹھنے میں اجازت نہیں کرتا۔
”دونوں بھئی یونہی کر رہا کر تو یہ کینٹ اتنی مانہ
کھائے۔“ اسی دھمکی سے بچتے ہیں کہیں۔

”یہ بھئی اتنی ہی مار کھائے گا۔“ اسی کی بات
لکھتے ہیں۔ ”مان بھین سے کہتا۔“

”اب“ جب تم دونوں بھائی میں مل کر
رو گے۔ تم چھوٹے بھائی کو اچھا بر بھجھتے رہو گے و
کہوں گے ”یار۔“ اسی شان کا ہمد پوروں کرتیں۔
”جی جی“ یہ پیر ہی مار کھانے کے لیے ہوا ہے۔
مان کی آنکھوں میں شرارت تاج رہی ہوئی۔

”خدا کا خوف کرو۔“ اس ب چا۔ ”و تو ہڈی
ہڈی دکھتی ہوگی۔“ اسی تان سے سر سے پاؤں تک ہست کچ
کچ اپنا ہاتھ پھیرتیں

مار کھانے کے بعد شان دو تین گھنٹے بڑے ٹھٹ سے
بستر پر پڑا رہتا۔ ایک ”دھون با فقہ کالیوں پر آئندہ گرتے
پھر کوئی نہ کوئی ایسی بات، ایب وقہ ہو جا تا ہوشان کو با کے
تھپڑوں، مکوں اور بیٹ کی چٹا چٹا پناخ کے سا سے چک
پھیر پاؤں کھانے پر مجبور کر دیتا۔ کبھی مان کی شامت بھی
آ جاتی۔ رو روئی میں اسی کو بھی ہاتھ لگ جاتے۔ عینہ اور
معصومہ جب تک چھوٹی رہیں بھتی رہتی تھیں مگر ان کے
بڑے سونے پر ابانے ان پر ہاتھ تو اٹھاتا چھوڑ دیا تھا تاہم
غصے میں گایاں اب بھی پڑ جاتی تھیں نہیں۔

با کے غصے اور بدکلامی ٹایوں تو پوری ہی فیملی شرتیں
تھی لیکن معصومہ سب سے زیادہ متاثر ہوتی تھی تینتی بڑے
بچن بھائیوں کے مقابلے میں وہ جسمانی طور پر بھی ناتواں
تھی اور جذباتی اعتبار سے بھی کمزور۔ پڑھائی میں بھی کمزور
تھی۔ کمرائے جماعت میں بھی وہ گھر کی طرح سی۔
کھد سے میں ایک کر بیٹنے کی کوشش کرتی۔ پڑھائی سے

دور رہی اس کی نظریں کتاب پر رہتیں مگر ذہن ادھر ادھر جھکا
رہتا۔ کبھی ابا کی گایاں کی بات نشست تو کبھی شان کی مار پڑنے
پر اس کی آہ و بکا کی یاد، کبھی ابا کی بات بے بات مان کو
سرزنش تو کبھی اسی پر چٹ پٹا۔ ”نچرے کی سول پچھتیں تو وہ کم
حسب ہی کھادی ہو جاتی۔ امتحان ہوتے تو کبھی مار جن پر اور کبھی
جتنی مہربان سے پاس ہوتی۔ ابا کو مان در پٹ۔“ سے مانوں
صفوں سے ترمیم شدہ رپورٹ اکھائی پڑتی۔ عقل نشستوں پر
اپنے سے بڑی عمر کی لڑکیوں کے ساتھ بیٹنے سے معصومہ کو
ان سے محبت سے ورون راز معاملات کی خبر رہتی۔ بڑی
لڑکیوں کے ساتھ معصومہ کی نشست و برخاست کو اس کی
بعض سم رعایت لڑکیاں رشک سے دیکھتیں تو بعض شک
سے۔ وقت کے دوران معصومہ کی بڑی ام جماعتیں سے
پنے ساتھ ہی بٹھالیتیں اور اسی باتیں کرتیں جن سے
معصومہ کو مدگدگی کی ہوتی تھی۔

معصومہ کو نویں جماعت میں پہنچے چند ہی ہفتے
تزارے تھے۔ اس کے ساتھ بیٹھنے والی بڑی لڑکیوں میں
سے ایک نیوفا یوب نانی لڑکی کا اپنے ہی ایک مددگار
ڈریک سے فیڑپیں رہا تھا جبکہ دوسری نیدفرمان کا صدر میں
وٹھ ریڈی میڈ گارمنٹس کی ایک بڑی دکان پر ملازم
نوجوان سیزمین سے شش عروں پر تھا۔ انیل اپنے والدین
کے ہمراہ شاہ پگ سے اس دکان میں گئی تھی، بس وہیں
اس سیزمین نے انیل سے انکھیں لڑا کیں اور دکان کے ایک
کارڈ پر فون نمبر لکھ کر چپ سے اس تھپے میں ڈال دیا جس
میں انیل کے چھوٹے بھائی۔ لیے خرید ہوا سوٹ ڈالا گیا
تھا۔ کارڈ پر لکھے گئے فون نمبر پر انیل نے موقع پاتے ہی فون
کیا اور اس نوجوان سیزمین سے رابطہ کیا یوں دونوں کا عشق
چل پڑا۔ نیوفا اور نید روزانہ ایک دوسرے کو اپنے اپنے
عشق کے قصے سناتیں۔ دونوں کے پاس موبائل فون بھی
تھے، وقتے میں دونوں ایک دوسرے کو اپنے اپنے عشاق
کے بیچا، ت پڑھواتیں۔ ہنستیں، مسکراتیں، قہقہے لگاتیں اور
اپنے ساتھ بیٹھی معصومہ اور ام کو بھی اپنی باتوں میں شریک
رکھیں۔ دونوں کو ان کے عاشقوں کی جانب سے محبت نامے
بھی ملتے تھے، چھوٹے مومے تھے غف بھی۔ انیل کا دوست تو
بے پروا است اسکول آتے وقت رستے ہی سے ڈیٹ پر
کھنکے لے جایا تھا اور اس کے ساتھ ترارے ہوئے وقت کا
قصہ بیدنے مزے لے لے کر نیوفا کو بطور خاص سنایا تھا۔
”معصومہ بھی مان لگا۔ سنی رہیں۔ دونوں کے محبوب
بے پروا معصومہ سے بھی واقف تھے۔ جب وہ ان سے ملنے

کے لیے اسکول کے باہر گھات لگاتے تو دونوں نے انہیں
ہڈی آئینہ، ستوں کی چوڑی، مٹی کی گھڑی تھی چٹا پٹ کھی
یوں بھی ہوتا کہ اپنی اپنی محبوباؤں کے نام محبت نامے اور ہ
گزرتی معصومہ یا ام کو چپکے سے تھما جاتے۔

ایک روز نیوفا کی انگریزی کی کاپی میں رکھ اس کے
نام س کے عاشق کا محبت نامہ پکڑا گیا۔ کاپی پڑتال کے
سے انگریزی کی پتھر کے پاس گئی تھی اور نیوفا اس میں ”مکرم
”لو لیر“ رکھ کر نکالنا بھول گئی تھی۔ خط کیا پکڑا گیا۔ کلاس
میں تو جیسے جو پھول گیا۔ ہیڈ مسٹریس نے ہنگامی بیادوں پر
تفصیلی انکوائری شروع کروا دی۔ کلاس کی لڑکیوں نے
معصومہ اور ام کے خلاف بھی گواہی دی۔ انکوائری مینی نے
معصومہ سے چچہ کچھ کی تو اس نے قدرے روکد کے بعد
قرار کر لیا کہ وہ نیوفا کے قصہ عشق سے نہ صرف آگاہ تھی
بلکہ ایک دوسرے نیوفا کے عاشق نے سے اسکول ہیٹ کے
باہر ناف بھی دیا تھا نیوفا کو پتہ چلنے کے لیے۔ بات کھتے کھتے
انیل کا قصہ بھی کھل گیا اور معصومہ اس میں بھی قاسدہ ہ پالی
گئی۔ انکوائری کمیٹی کی یہ پڑ ہیڈ مسٹریس نے نہ صرف نیوفا
اور انیل ہند ام اور معصومہ کے والدین، بھی سکول طلب
کر لیا۔ انکوائری کمیٹی نے سفارش کی کہ چاروں لڑکیوں کی
ماؤں ہی نہیں باپوں کو بھی بلایا جائے۔ انکوائری مینی کا خیال
تھا کہ مانیں اکثر اپنی اہل کی غلطیوں پر پردے ڈال دیتی
ہیں اور باپ سے چھپا جاتی ہیں لہذا لڑکیوں کی صلاح کے
لیے ماؤں کے ساتھ باپوں کو بھی بلانا ضروری تھا۔
ہیڈ مسٹریس نے اسکول ریکارڈ سے چاروں لڑکیوں کے
گھروں اور ان کے باپوں کی جائے کار کے فون نمبرز
نکوائے اور خود بات کی۔ اسکول ریکارڈ میں معصومہ کے نام
کے سامنے ایک ہی فون نمبر لکھا تھا اور وہ با کے دفتر کا تھا۔ ابا
کو معصومہ کے اسکول سے فون آیا تو ان کا ماتھا فٹک گیا۔
”پہلی فرصت میں آپ اور معصومہ کی امی اسکول آئیں۔۔۔۔۔
ہو سکے تو آج ہی۔“ ہیڈ مسٹریس نے کہا تھا۔ ابا کو دغدغہ لگ
گیا۔ ایسی کیا بات تھی جو ہیڈ مسٹریس نے انہیں طلب کیا تھا۔
دفتر سے چھٹی سے کر وہ اسی دن اسکول جا پہنچے اور
ہیڈ مسٹریس سے معذرتا کہا۔ ”میں دفتر سے آ رہا ہوں اس
لیے جتنی وعدہ کوسا تھا نہ سکا۔“
”کوئی بات نہیں۔“ آپ سے بات کرنا زیادہ
ضروری ہے ہمارے لیے۔“ ہیڈ مسٹریس نے کہا اور
انکوائری مینی کی سربراہ کو اپنے دفتر میں طلب کرنے کے
لیے سرکار پر بار بار ہدایت دیں۔

”جاؤ۔۔۔ ورنہ وہ اور زیادہ شور مچائیں گے۔“ امی نے کہا۔

ہمارا قاعمان ہی شکا ہو گیا۔ اخبارات نے خوب سرخیاں

—

ان کے وطن میں خیرات اور انفاق جوئی رہا۔

2013, 2014

تعلیم کے ساتھ ہی انسان حیوان ہی ہے..... آپ

ی آئینہ میں انہیں مصومہ بھی دکھائی دیتی.... لڑتی،

یہ ہے۔ آخری دن جسے ہانے غمے میں اسے پکار تو ہا
ہی اس سے میرا توجہ نہیں تھی۔ یہیں سے ٹھہ کر برقی گاڑی ہا

اسرايت گر چکا تھا۔

کشکول

نہ سہ قتل

مدرسی سی اسماں بھی کتنی عجیب ہے۔۔۔ جو کہیں احساسات کا یہ تو کہیں حادثات کا مجموعہ... کسی کو ستوارنا کسی کو بک اور گنگ کا شعلہ یوں کہیں گلشن گرے۔۔۔ اور اس دنیا سیرا۔۔۔ کئی کو برقی و لائے اسماں۔۔۔ کسی کو بھی بددعا کی طرح گام بک سلا جو کہیں بوس ماحسوسہ طلسم۔۔۔ اور تو کہیں بیابانوں کی سرکوسینوں میں تم۔۔۔ اور تجربات احساس اور حادثات کے ریزاں اس کی شخصیت معمور، بحریب ہے مراد گزرتے ہوئے سنورتی یا بکھرتی رہتی ہے۔۔۔ کبھی محبت کی شبنم اس کے دل میں گل و گلزار کھلاتی ہے تو کبھی نفرت کی زہریلی آگ میں خود بھسم ہو کے بھی پشیمان نہیں ہوتا ایسے میں مخالف ہوائیں اس کو یہ وزن پتوں کی طرح اپنی مرضی کی سمت میں اڑا لے جاتی ہیں جہاں جو اتم کے یہ تاج بادشاہی بسی کو پیروں تلے روند کر جو رہیں ہیں، جہاں روپ ہیروپ کی اس دنیا میں بھکاری بھی ہیں اور کچھ بھی... محیر العیول واقعات اور ذہنی کوششیں سازپوں سے۔۔۔ ایک منور اور لحداگانہ اسلوب کی صورت سسپنس کے لیے صرف آپ کے لیے۔

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

کشکول کی داستان لیاقت حسین کے گرد گھومتی ہے جس کا طاق نوشہرہ کے شہر جاگیر ہے۔۔۔ اس کے باپ سردار فرخاں نے بڑی پابندی دی تھی، شادی کے معاملے میں بھی اس نے لیاقت حسین کا رشتہ اس لڑکی سے کرنا چاہا جہاں اس سے اس سے رگوں کی لیاقت حسین نے وہ کے دیر سے آراستہ تھاپ کے سامنے زان نہیں کھولیں مگر اس نے فرحان لڑکی کو رہا دے دی تھی۔ لیاقت حسین کی ماں کو بھی فرحان کا یہ نہ چنانچہ لیاقت حسین نے ماں کی دعا میں فرحان سے شادی کے بعد شہر آ گیا جہاں اس نے اپنے دوست گل خان کی بیٹی سنی راہا پسند کیا۔۔۔ لیاقت حسین نے فرحان سے ایک رات قبرستان میں ایک سیاہ فام درخت میں پر تاب محوش کو رہنمائی کی کوئی پر اسرار عمل کرتے دیکھا تو وہ درخت دوسرے دن لیاقت حسین کو فرحان کی نشاندہی والی قبر سے ایک نیچے علاقے میں منتقلی کے گندے عمل والی حالت میں سوئیاں بچست تھیں۔ لیاقت حسین نے صبح کرنے کے بعد خود اکانام سے کریمپور سے سوئیاں نکال کر چھپک دیں۔ گل خان لیاقت حسین کو ایک برادری کے پاس لے جاتا ہے۔ ان کی رسائی سن ہوئی۔ گل خان واپسی کے لیے رکش لینے جاتا ہے تو پیچھے ایک نازنا گل سے لیاقت حسین کی ملاقات ہوئی ہے۔ نازنا کے ہاتھ میں گل جب وہاں پر برگ لی چھو لداہری کی سمت جاتا ہے تو نہ کوئی ان دونوں کو دیکھتا ہے۔۔۔ نازنا خود چھو لداہری کے باہر نکلتی ہے اور رات کو کہتا ہے جہاں ایک بزرگ ہستی آنکھیں بند کیے استغراق میں تھی۔ بزرگ ہاتھ سے اشارے سے لیاقت حسین کو بلا تا ہے۔ ایک بنگلہ لیاقت حسین کے منہ میں ڈال دیتا ہے۔ بعد میں نازنا لیاقت حسین کو سخت تاکید کرتا ہے کہ وہ خاک کی اس چٹکی کا در بھی رہاں پر اسے یہ بیت نازنا نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ خاک کی وہ چٹکی مدد کریم کا کرشمہ ثابت ہوتی ہے۔ لیاقت حسین کو برائے دماغ خطرے کا احساس شعہ ہوا تا ہے۔ اسی بیت میں وہ اس کا توڑ بھی تلاش کر لیتا ہے نیکی شعوری طور پر وہ بات سے یاد دہش رہتی۔ لیاقت حسین جس بستی میں رہتا تھا وہ۔۔۔ نازنا گل میں آگ کے شعلے بھرتے ہیں۔ وہی آگ چاہے کی ہمت میں کرتا چوں ایک صلیب عورت کو جو لگی اس کے قریب عزیز و رشتہ جی ہوتے سے اوچاڑتے جب لیاقت حسین اس بنگلہ کا نام لے کر اتر رہا تھا ہے اور یو جی عورت کو زندہ و سلامت نکال دیتا ہے۔ اسی عورت کے بچے لیاقت حسین کی رسائی کی مدد کرتا ہے جہاں سے بطور ڈراما ڈرامہ لکھا جاتا ہے۔ سیدہ گل خان کی اہلیہ حیدر بیگم ملے ہوئے تھیں۔ سیدہ گل خان کا وارن میں تھا۔ کا واری میدان میں فتح حامد نے خبر سب کا دوست تھا لیکن وہ مدد کوئی طور پر پایا کا مٹی سرخو اور نڈرورلہ کا پتہ نہ تھا۔ پائیس کو مطلوب خط ہاک خرموں کی پشت پناہی کر کے اس واپس اشاروں پر چلا تھا۔ فتح حامد کا حامی آدمی "بلیک ٹائیگر" تھا۔ وہ بھی کی

کشکول

[illegible]

ایک ایک کے ذرا رنگ روم میں تہہ سینہ سنجیدگی سے لپی کی
تہہ ہر سر جن زینب حسن کی تھی

آویزاں دکھ کر اس کے ہونٹوں پر جو مسکراہٹ ابھری تھی
وہ بھی معنی خیز تھی۔ گیٹ کے چوکیدہ نے اس کا کارڈ دیکھ کر
اتر کام پر نذر طلعہ کر دی۔ جس کے بعد اسے ذرا رنگ

ہر حکم کی تعمیل کرتا تھا لیکن یہ وہ ایک شیخ حاد کی صحبت سے ہوا تھا۔ شیخ حاد کے کانٹھیں میں سرسبز ستیہ میں سرسبز تھی جو اس سے اپنے شہر سے
 ایک کی مدت کا تھا۔ ستیہ میں تھی۔ یہ وہ ایک شیخ حاد کے کانٹھیں میں سرسبز ستیہ میں سرسبز تھی جو اس سے اپنے شہر سے
 حاصل کر رہی تھیں۔ ان فریب کو سبب انکار کے پاس دروازے سے انکشاف دیے جاتے تھے۔ اصل میں شیخ حاد کا نام اور خاص آدمی تھا جو ہر مہر میں
 آگے بڑھتا تھا۔ وہ اپنے ہتھ کی ایک ساقی شکر کو پسند کرتا تھا۔ یہ ساقی جتنا کہ شکر میں مدد ملی ہو پر شیخ حاد اپنی سے کچھ جڑ بڑھکی سے وہ شیخ حاد سے
 اپنی مرحوم ماں کا قرض چکانے کی خاطر مویشی کی تلاش میں تھی۔ شیخ حاد اپنے کارندوں کے ذریعہ میڈم روٹی کو انکار کر کے اس کی خرید و فروخت
 حاصل کر کے کی چابک کرتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی بیوی فریب کو بھی غور کرتا تھا مگر یہاں تک کہ اس کی بیوی فریب کو بھی غور کرتا تھا مگر یہاں تک کہ اس کی بیوی
 ہی ریشہ و دیوں میں انھیں صاحب بھی یہ صاحب تھا ہے۔ شیخ حاد کے شہر پر اپنے لیتے۔ لے آتی ہے۔ بعد میں وہ شہر کے کچھ پر ایک
 دے تاجر رحم علی آغا ماں اور اس کی بیوی کی قابل اعتراض تصاویر پر پوری کی ہو کر پر حائل کر دیتا ہے۔ یہ دہرائی کی عظیم حد کے رہا ہونے سے
 اس کی جگہ آغا مسطور احمد یا آئی جی مقرر ہوتا ہے۔ وہ بھی شیخ حاد کے یہاں تعلقات ہونے کے سبب سبکارستان کی حمایت نہیں کرتا۔ ایک ڈیڑھ
 لی مرٹ ہے جو شیخ حاد کو خوش بھی کا شکار ہونے کا موقع دینے کی خاطر کچھ دیر کے بعد اپنے رہائے جاتے ہیں۔ غور و خوض کی ہی عظیم حد کے حوالے کر
 ہے۔ سراج احمد اور اس شاکس آفیسر ہے۔ ایک نئے میں بیوی اور شہر کے رہنے کے بعد میں۔ ہاتھ اور مہیو ہوتا ہے۔ چنگ و گنگ
 رہنے کے بھی کچھ تعلقات مگر سے ہے اس سے وہ کسی کے یہاں نہیں آتا۔ کی بنا پر اس کی و شیخ حاد کی غم خانی ہے۔ اسی دوران شیخ حاد کی بیوی
 بیگم حوشو کی عیاشیوں سے تنگ آجلی بھی خواہش کرتی ہے۔ وہ شیخ حاد کے بارے میں بہت ساری باتوں کو قیاسی شکل دے کر اپنے ان آخری باتوں
 کرتی ہے تاکہ وہ اس کی خرید و فروخت سے سراج و تو خیر حاصل کرے جس کا سبب ہوتا ہے لیکن شیخ حاد کو یہ دلی سے سوال ہے اس بات پر
 ہوتا ہے کہ اس نے میرے سے پیشتر آخری کال سراج کو کی تھی۔ سراج کو قہر کرنے کی خاطر وہ اس کی بیوی کا کھانا لیتا ہے مگر یہاں تک کہ اس کی
 قوت بروقت سراج ہی کے درمیان کو رسوا کی سے بچا لیتی ہے۔ اس کی بیوی دنگ نہ سبب تھیں خود بھی کی تعیش شروع جاتا ہے۔ اپنے ان شہر
 پاس صاحب تھیں، یہ قابل بھی وہ سراج کو بھی اس سے آگاہ کر دیتا ہے۔ مگر شیخ حاد کو اس کی حد سے ہر خرید و فروخت کی اس کی لوگوں سے ملتی ہے۔ وہ اس پر
 تھا کہ کو دانش سبب تنگ لگو دیتا ہے۔ لوگوں معمولی بھی ہونے سے ہوا جو اپنا میں داخل ہوتا ہے۔ سبب میں حالات ہے در و درمیان رہنے کا
 اپنی انکشاف کے قریب دوسری بھی خرید کر اپنا ہیڈ آفس بناتا ہے۔ اس کی بیوی اس میں رہتی ہے۔ اس میں شیخ حاد کی بیوی بھی رہتی ہے۔ شیخ حاد کے
 مویشی پر یہاں تک کہ اس کو بھی دیتا ہے۔ اس مویشی پر یہاں تک کہ اس کو بھی دیتا ہے۔ اس مویشی پر یہاں تک کہ اس کو بھی دیتا ہے۔ اس مویشی پر یہاں تک کہ اس کو بھی دیتا ہے۔
 شیخ حاد۔ ہاتھ اپنے بیوہ کے ملنے کی ناکامی کے بعد یہاں تک کہ اس کو بھی دیتا ہے۔ اس مویشی پر یہاں تک کہ اس کو بھی دیتا ہے۔ اس مویشی پر یہاں تک کہ اس کو بھی دیتا ہے۔
 نہیں ہوئے اس کی بیوی دوسری آگاہ نہیں ہوتا۔ وہ اس کا نام نہ مری بیویوں میں اس سے پاس وراثت سے یہ وہی مہر و مہر درجہ تھیں مگر شیخ حاد کا
 رہائش گاہ پر حاد کرنے کا سبب تھی جس سے شیخ حاد اور چارٹ ہو جاتا ہے۔ اس دوران اپنی ذاتی سیکرٹریوں سے شادی کر کے اس کو پیش کرنے
 کے ایک نئے میں رکھتا ہے۔ بعد میں شیخ حاد کو بچے در پے دو مہینے گتے ہیں۔ ایک طرف میں بیوی اور ایک یہ تھا ہے میں ایک نئے کی روت میں ملوث
 پا کر بھی کو معطل کر دیتا ہے۔ دوسری جانب میڈم روٹی کے بجٹ ہاشم و دو شیخ حاد سے اس کے تری آئی ایک ناخبر کو کھیر کر مت لگاتے اتار دینے
 ہیں۔ سراج جو یہاں تک کہ اس کی بیوی قوتوں کا بذات خود شادی کچھ چکا تھا، کچھ دنوں کے یہ سبب میں اس کے سراج کا کلاس بیوگی رو دیتا تھا اسے
 خدمات حاصل کر لیتا ہے، اب اور ایک رہبر سراج اور یہاں تک کہ اس کی بیوی قوتوں کا بذات خود شادی کچھ چکا تھا، کچھ دنوں کے یہ سبب میں اس کے سراج کا کلاس بیوگی رو دیتا تھا اسے
 اپنے سابق پردہ اور پولیس کے رہنما آغا ہیز کا شیل ادا اعلیٰ سے ملاقات کرتا ہے جس نے جگا کو کسی جرم کی سزا سننے کے بعد عظیم راستہ اختیار کرنے سے
 بجائے فریبچہ کا کاروبار کر کے کی خاطر رقم فراہم کی تھی۔ یہ وہ قلم ہاشم کو سبب انکار کی جا سے سبب پاس کو ختم کرنے کی اجازت مل جاتی ہے لیکن یہ بھی
 کی وجہ سے سے خواہش کرتی پڑتی ہے۔ اس دوران رحم علی آغا خانی کو فون پر دھمکی ملتی ہے جسے اس کا بڑا راس لیتا ہے۔ دار اپنے دوست سراج
 مخالف کو حالات سے باخبر کر دیتا ہے۔ اور ایک رہبر اور سراج اپنا ہال سے ملازمہ گا بوی خواہش کی تعیش کر کے وہیں وٹ رہے تھے جب یہاں تک کہ
 اچانک گاڑی کا رخ پھیر دیتا ہے۔ وہ یہاں کرتا تو سب موت کے منہ میں چلے جاتے۔ یہاں تک کہ اس کی بیوی قوتوں کا بذات خود شادی کچھ چکا تھا، کچھ دنوں کے یہ سبب میں اس کے سراج کا کلاس بیوگی رو دیتا تھا اسے
 یہ سبب میں سراج معمولی بھی ہوا۔ دوسری جانب شیخ حاد کی کنوں سے شادی کی سہاگ رات کی ساری کارروائی سووی کمرے کے ذریعے چھٹا لائی
 تھی۔ یہاں تک کہ اس کی بیوی قوتوں کا بذات خود شادی کچھ چکا تھا، کچھ دنوں کے یہ سبب میں اس کے سراج کا کلاس بیوگی رو دیتا تھا اسے
 صورت حال سے آگاہ کرتا ہے اور اعلیٰ اسے لی ایس مہر کی تعین کرتا ہے۔ ششم وراثت میں اس کے قلیت سے ششم کو احوال پر پتا جاتا ہے۔ شیخ حاد کی کوئی
 ہوتا ہے جس پر وہ چرٹا ہوتا ہے اور پولیس کے سربراہ کو سخت ست سنا جاتا ہے اور کچھ عرصہ کو گرفتار کر کے سخت پرچہ چکا کرتا ہے جس کے نتیجے میں
 انکشافات سامنے آتے ہیں خاص طور پر یہ کہ وہ جگا کا آدمی ہے اور اس نے یہ کارروائی کسی بیوہ کے کہنے پر کی تھی۔ جبکہ سراج کی بیوی اس کے
 کوشش ناکام بنانے کی کوشش میں پیش یہاں تک کہ اس کی بیوی قوتوں کا بذات خود شادی کچھ چکا تھا، کچھ دنوں کے یہ سبب میں اس کے سراج کا کلاس بیوگی رو دیتا تھا اسے
 کرتی ہے، ششم کے انکار کا۔ ہاشم اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا اور کچھ عرصہ میں ششم سے مل کر اسے عفو میں لیا اور وہ اس کا ساتھ دینے پر رضی ہو گئی۔ دوسری
 جانب شیخ حاد کے بھٹ سے سے ماس کے انھیں یہاں تک کہ اس کی بیوی قوتوں کا بذات خود شادی کچھ چکا تھا، کچھ دنوں کے یہ سبب میں اس کے سراج کا کلاس بیوگی رو دیتا تھا اسے
 جوں میں بیوی اور کچھ عرصہ میں ششم سے مل کر اسے عفو میں لیا اور وہ اس کا ساتھ دینے پر رضی ہو گئی۔ دوسری
 در پے اسے معلوم ہوا ہے کہ یہاں تک کہ اس کی بیوی قوتوں کا بذات خود شادی کچھ چکا تھا، کچھ دنوں کے یہ سبب میں اس کے سراج کا کلاس بیوگی رو دیتا تھا اسے
 اس سے مل کر اپنی صحبت خد کر کے ہونے لگے شک سے در را دیے۔ وہ اس کی یہاں تک کہ اس کی بیوی قوتوں کا بذات خود شادی کچھ چکا تھا، کچھ دنوں کے یہ سبب میں اس کے سراج کا کلاس بیوگی رو دیتا تھا اسے
 میں سے کہتا ہے۔ کارروائی پر اپنے قابل اعتماد شکر کو ہدایت میں حاد آد سے حاصل ہونے والی مصروفیت کے مطابق ایک ناخبر کے بعد میرٹو کے کوا سے کا
 کرنے والے۔ ایک کی مہر کی حیثیت میں حاد وراثت میں اس کا کلاس بیوگی رو دیتا تھا اسے

روم تک پہنچا دیا گیا تھا۔

”نہیں اس صفت کے اعتبار سے حد ہی لگائی جا سکے۔“
سرجن زیب حسن اس کے سامنے موجود تھی۔ ”یہ رحمت کی آفیسر“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”رنگ زیب سے دریافت کیا۔“ کیا کوئی آفیشل معاملہ ہے؟“

”نہیں اور نہیں بھی۔“ جواب میں ”رنگ زیب نے بھی مسکرا کر کہا۔“ ہو سکتا ہے کہ آپ میری آمد کا مقصد جان کر زیادہ خوش نہ ہوں لیکن اس کے باوجود۔“

”تم آئی آفیسر۔“ ”رنگ زیب حسن نے بات کاٹ کر کہا۔“ جس پروفیشن سے ہم وابستہ ہیں اس میں اس قسم کے تکلفات کا دخل نہیں ہوتا۔“

”میں۔۔۔۔۔ اس وقت آپ کی صاحبزادی کس مینا کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہوں گا۔“

”اوہ۔۔۔۔۔“ ”سرجن زیب بے تکلف تنجید ہو گئی۔“ ”میں سے آپ کو کیا کام پڑ گیا؟“

”تکلف برطرف۔۔۔۔۔“ ”اورنگ زیب نے تنجیدگی سے بات کا آغاز کیا۔“ ”میں یہ جانا چاہتا ہوں کہ وہ کس بیوی پارلر کو پسند کرتی ہیں اور آخری بار وہاں کب گئی تھیں؟“

”کیا آپ یہ باتیں آفیشل طور پر معلوم کرنا چاہتے ہیں؟“

”جی نہیں۔“ ”فی الحال میں اس بات کو ان آفیشل ہی رکن پسند کروں گا۔ اس لیے کہ مجھے آپ کے اسٹیشن اور مینا کے مستقبل کا بھی خیال ہے۔“

”میں سمجھتی نہیں۔“ ”سرجن زیب نے کڑوے انداز میں کھری بات کی۔“ ”آپ کی باتیں۔۔۔۔۔“

”پیز سرجن۔“ ”اورنگ زیب نے اسے سمجھانے کی کوشش کی پھر پہلو بدل کر پوچھا۔“ ”کیا آپ کے علم ہے کہ تین روز قبل مینا اپنی ضرورت کے پیش نظر ہی مون بیوی پارلر گئی تھیں؟“

”جی ہاں۔۔۔۔۔ مگر اس میں قانون درمیان میں کیسے آگیا؟ کیا بیوی پارلر جانا کوئی جرم ہے؟“

”آئی سی۔۔۔۔۔ گویا مینا نے آپ کو کچھ نہیں بتایا۔“

”اورنگ زیب کا جواب سن کر سرجن زیب کے چہرے پر کچھ ناگوار سلوٹھیں ابھرنا شروع ہوئی تھیں جب سترہ سال کی ایک مصوم لڑکی مسکراتی ہوئی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ ماں کو کئی عرصے کے ساتھ مصروف دیکھ کر اس نے مہذب انداز میں اورنگ زیب کو سلام کیا پھر

ماں سے ملی۔

”میں اسٹیڈی کے لیے۔“

”میں وہاں۔“ ”سرجن زیب نے مام سے کہا پھر کے بیٹھے کے بعد۔ سہراتے ہوئے بچے میں سوال کیا۔ ”تین روز قبل تیری پارلر گئی تھیں لیکن واپس آنے کے بعد نے مجھ سے کس بات کا ذکر نہیں کیا تھا؟“

”میں نے چہرے کی رنگت بدل بھر میں از گنی جسے سرجن زیب نے بھی محسوس کیا۔“ ”میں نے ماں کا سوال سن کر اورنگ زیب کی سمت دیکھا پھر۔۔۔۔۔ ماں نے جب اورنگ زیب کا تعارف کر دیا تو مینا کی نظریں بھی جھٹکیں۔“

”تم آئی آفیسر۔“ ”اورنگ زیب نے کسی مشق بزرگ کی طرح اسے مخاطب کیا۔“ ”اس وقت میں ایک دوست کی حیثیت سے تم سے کچھ مصوم کرنا چاہتا ہوں۔“

”پیز سرجن۔“ ”اورنگ زیب نے پوچھا تو سرجن نے اسے کرخت لہجے میں مخاطب کیا۔“

”تم جانتی ہو کہ مجھے خاموشی سے نفرت ہے۔“ ”بات ہے اسے کھل کے بیان کرنے میں تم کیوں ہچکچاتی ہو؟“

”پیز سرجن۔“ ”اورنگ زیب نے مینا کی کیفیت محسوس کرتے ہوئے سمجھنے والے انداز میں ٹوکا پھر رک۔“ ”کر پوری تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا۔“ ”کرل ہتھام کے سسے میں بھی آپ ممکن رہیں۔“

”پھر ماں کے اصرار پر مینا نے پوری تفصیل سے تمام باتیں بیان کر دیں۔“

”کون تھے وہ باسٹرز؟“ ”سرجن زیب نے اورنگ زیب سے پوچھا۔“ ”اس وقت وہ کہاں ہیں؟“

”تفصیل سن کر سرجن زیب کا آپ سے باہر ہو جانا قدر بات تھی۔“

”پیز سرجن۔“ ”آپ پریشان نہ ہوں۔“ ”اورنگ زیب نے کہا۔“ ”وہ دونوں پولیس کی تحویل میں ہیں مینا جو چھ ہو چکا اس میں براہ راست ان کے ارد گرد بھی داخل نہیں تھے۔ کسی اور نے قیمت چکا کر ان کی خدمات حاصل کی تھیں۔ کرل ہتھام نے ذاتی طور پر پولیس پوسٹ کے حوالے کیا ہے۔“ ”میں مینا کا نام نہیں لگائی۔“

ککشول

پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کر دی گئی ہیں۔ اب آپ کی تلاش ہو رہی ہے۔ مجھ سے بھی دریافت کیا گیا تھا۔“

”تم نے کیا کہا؟“

”میں نے لائیکس کا اظہار کیا تھا لیکن میرا خیال ہے کہ محترم آئی جی کو میری بات پر یقین نہیں آیا۔“

”ڈونٹ وری۔“ ”اورنگ زیب نے سلسلہ منقطع کر کے سرجن زیب سے کہا۔“ ”آپ کے لیے ایک خوش خبری ہے۔ جو دو آدمی پولیس کی حراست میں تھے انہوں نے آئی جی کے کمرے میں خودکشی کر لی ہے۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ لیکن تمہوں نے ایسا کیوں کیا؟“

”میں اب اجازت چاہوں گا۔“ ”اورنگ زیب نے ٹھٹھے ہوئے تنجیدگی سے کہا۔“ ”میرا مشورہ ہے کہ اگر مینا دس پندرہ روز گھر تک ہی محدود رہیں تو من سب ہوگا۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ کے لیکن کیا آپ مجھے خدمت کا۔“

”اس وقت میں جلدی میں ہوں۔“ ”اورنگ زیب نے مینا کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔“ ”پھر کسی وقت آپ سے کلینک میں ملاقات کرنے کی کوشش کروں گا۔“

”اورنگ زیب کے جانے کے بعد سرجن زیب نے مینا کی طرف دیکھا جو صوفے پر کسی ایسی مصوم ہرنی کی طرح سہمی بیٹھی تھی جو کسی بھوکے درندے کے چنگل سے بچ جانے کے بعد دل کی بے ترتیب دھڑکنیں سنجال رہی ہو۔“

”شیراز! دریا اس وقت اپنی خواب گاہ میں کسی بھوکی شیرنی کی طرح ٹہل رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بار بار ابھرنے والا جھس اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ وہ کسی الجھن کا شکار ہے۔“

”حسب معمول اس نے اس وقت بھی شب خوانی کا لباس پہن رکھا تھا لیکن خواب گاہ کی تنہائی اسے کسی زہریلے ناگ کی طرح ڈس رہی تھی۔ اس کی الجھن کا سبب جو بیوی تھا جو دور سے کہیں چھو منتر ہو گیا تھا، ان دونوں میں شیراز دمانے اس کے موبائل فون پر ان گنت کالز کی تھیں لیکن دوسری طرف سے ہر بار اسے پاور ڈس کف کار یا رڈ ڈسٹ کی ملا تھا۔“

”میں نے۔“ ”اورنگ زیب نے سرجن زیب کا سوال طر انداز کر کے براہ راست مینا کو مخاطب کیا۔“ ”کیا تیری پارلر مینا کے ڈرائیور نے تم سے کوئی بات کی تھی؟“

”جی نہیں۔“

”پیز سرجن۔“ ”اورنگ زیب نے پوچھا تو سرجن نے اس کی درخواست میں نے کی تھی۔“

”میں نے۔“ ”اورنگ زیب نے پوچھا تو سرجن نے اس کی درخواست میں نے کی تھی۔“

”میں نے۔“ ”اورنگ زیب نے پوچھا تو سرجن نے اس کی درخواست میں نے کی تھی۔“

”میں نے۔“ ”اورنگ زیب نے پوچھا تو سرجن نے اس کی درخواست میں نے کی تھی۔“

”میں نے۔“ ”اورنگ زیب نے پوچھا تو سرجن نے اس کی درخواست میں نے کی تھی۔“

”میں نے۔“ ”اورنگ زیب نے پوچھا تو سرجن نے اس کی درخواست میں نے کی تھی۔“

”میں نے۔“ ”اورنگ زیب نے پوچھا تو سرجن نے اس کی درخواست میں نے کی تھی۔“

”میں نے۔“ ”اورنگ زیب نے پوچھا تو سرجن نے اس کی درخواست میں نے کی تھی۔“

اولاد نہیں ہو سکتی

آج بھی لاکھوں گھرانے اور دی نعمت سے محروم خست پریشان ہیں۔ مایوسی گناہ ہے۔ انشاء اللہ اولاد ہوگی۔ خاقان میں کوئی اندرونی پرہیز ہو یا مرد نہ جراثیم کا مسد۔ ہم نے دیکھی یہی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا باب اولاد کی ورس تیار کیا ہے۔ جو آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھلا سکتا ہے۔ آپ گھر میں بھی خوبصورت مینا پیدا ہو سکتا ہے۔ آج ہی گھر ٹیٹے فوں پر تمام حالات سے آگاہ کرنے بذریعہ ای وی پی VP باب اولاد کی کورس منگوائیں۔

المسلم دارالحکمت ریسٹا (دوانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد۔ پاکستان

0300-6526061

0547-521787

صبح 9 بجے سے رات 11 بجے تک

سے بھی ہو شمار رہنا چاہیے۔ جونی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”آج ان دونوں کی خودکشی کی اطلاع کے بعد میں نے سکوت کا سرفس لیا ہے لیکن تمہارے لیے یہاں اطلاع بھی ہے۔“

”جوڑی شکار ہونے سے نی گئی اس کی ماں مری حیات مالک ہے اور تیری انیس ہی اور لگے ہیں ابھی اس سے ملنے آیا تھا۔ ہمیں پچھانوں بہت چھٹک پچھٹک کر قدم اٹھانا ہوگا۔“

”اس وقت نہیں جونی۔ اس بارے میں آج بھی سوچا جا سکتا ہے۔“ شیار ومانے ہیں تو میں جواب دیا۔ ”میرا نے جونی کی گردن میں بائیں ڈاٹھ سے پہلے جواب گھاہ کی روشنی بھی گل کر دی تھی۔“

تھرپیا کو پیش آنے والے حادثے یہ بعد میڈم دہلی نے آپ گھر کی سیوریٹی مزید بڑھا دی تھی۔ اب وہ خوش گھٹے سے یاد تھا تو کوئی تھی۔

تھرپیا لی، جیسی سے شہر حال است ہی تھی وہ اس وقت بھی اس سہ ڈن میں پڑے گا کی بھی شب ناشتہ سے بعد وہ اخبار سے صحت لٹ پٹ کی تھی۔ تھرپیا بھی اس کے قریب بیٹھی اس سے چہرے کے تاثرات سے تا چہرہ بڑھ رہی تھی۔

خوار کے دہانے سے اس وقت اس کے حوالہ دیا تھا اس وقت بھی تھی۔ تھرپیا نے کہا۔ ”یہاں خود بھی کھلی ٹیک سے وامنٹ نہیں رہی تھی۔ جن لوگوں نے سے میڈم کی اس نام سے کئی سوچیاں سے جو کیا تھا کہ گھر سے وامنٹ کے چوہہ ارواں جو بھی اس کا علم نہیں ہوگا۔“ وہ سے جی کہیں گاہ تک سے جانے کے بعد مل بات سے آگے بڑھنے کے لیے بھی قدم اٹھاتے تھے لیکن میڈم سے لیا ایک مطالبہ متوانے کے بعد انہوں نے اسے با حمت طور پر واپس کر دیا تھا۔

تھرپیا کے انگوٹھ میں گھر کی ایک طرز شامل تھی جو یہاں بھی میڈم نے اس کی کھوج گانے کی ضرورت بھی نہیں محسوس کی۔ وہ اس حادثے کو شہرت نہیں دینا چاہتی تھی میں اس سے سنا تھا کہ اس بات کا احساس بھی ہو گیا تھا کہ تھرپیا کو اس متعدد خاطر اٹھایا تھا کہ کوئی اس سے ایسی بات نہ کہے کہ اسے یہ محسوس ہو کہ اسے نہ ہی بات نہ کہیں تاکہ اس سے روکریہ شکار کی خبر کا تھرپیا

ہوں اس کے عہدہ میرے یا گل تمہارے سلسلے میں۔ تھرپیا نے کہا۔ ”کیا بات ہے شیار۔“ ”تھیں نے بات کاٹ کر تھیں سے دریافت کیا۔ تم اس وقت کچھ اجنبی ابھی تھے۔“

”میں اپنے اتنی معاملات صرف خود تک محدود کی ہادی ہوں۔“ شیار ومانے پر دستور پٹ سنبھلا۔ ”جو اب دیکھ پچھ سوچ کر یوں۔“ ”کیا تم بتا سکو گی۔“ ”وقت جونی کہاں ہوگا؟“

”سب سب جونی کو بتا ہو گیا؟“ ”وہ دونوں سے کیا ہے۔“

”موصوم مت غور۔“ شیار نے تھل کر جواب دیا۔ ”میں تمہارے دور میں کے ماسم سے بھی نا، نفی ہوں، ہو سکتا ہے کہ اس نے تمہاری طرح اور بھی ہانڈوں میں منہ مارنا شروع کر دیا ہو لیکن وہ غیر جانبداری جونی کو بھی مستحق پڑے گی۔ موت اور گھر میں ہر قسم کے اٹھیا استعمال کرنے کی چھوٹ ملتی ہے۔“ ”جانتی ہوں لیکن مجھے نہیں معلوم۔“ جونی نے کہا۔

”آپ سوچاں سے رابطہ قائم کر کے کہیں۔“ ”تمہارے پاس۔“ ”کوئی خاص مہر ہو۔“

”یہاں سب شیار۔“ ”میری بات کا تھیں کر۔“ ”تھیں سب میں میری مداریت کا نہیں رہا۔“ ”جیت دلتے۔“ ”تمہارے میروں کی دہان میں تھیں۔“ ”تمہارے برداشت نہیں کروں گی۔“ ”گھڑ پائی۔“ ”تمہارے جملہ کھل کر رہ جلی بھی تم کرو یا پھر وہ نیا گلاس تیار کے رائے سے کر رہی پر تھیں کی تھی کہ دروازے پر دہلی مخصوص دنگ کی آواز سن کر وہ تیزی سے اٹھ اٹھو کتے ہوئے دہان کے ساتھ اس نے خواب گاہ ۵۵ دروازہ کھول لیا۔“

”تم۔“ ”تم۔“ ”شیار نے اس کی نظروں میں اور تھیں جھانکتے ہوئے شکار کیا۔“ ”تم دور دراز سے کہاں گم تھے۔“ ”میرا اسٹور سے اٹھیلی جانے والی لڑکی جہاں تھیں تھی اس کے بعد احتیاط شرط تھی۔“ ”تمہارے کمرے پر تو کر سکتے تھے۔“ ”جانتی ہوں۔“ ”تمہارے اسات کو اسنی پر جانتی

سب یقیناً پتا ہی تھی جو شکار یوں کے چاں میں پھنس جانے کے بعد خود ہی طرح غور کرنے والے دونوں افراد کے ساتھ مٹری بیکھنی کے دفتر تک پہنچ گئی تھی۔ وہاں سے پتا کو جانے کی اجازت مل گئی تھی۔ دونوں افراد کو پولیس کی تحویل میں لینے کی اطلاع۔ پھر آئی جی کے روبرو ان کی خودکشی کی پوری تفصیل بھی شیار ومانوس کے معتبر ذرائع سے مل گئی تھیں جونی کے بارے میں وہ ابھی تک قطعی مطمئن تھیں۔ پریشانی اس وقت کی تھی کہ جونی نے خلاف توقع اسے اپنے بارے میں کوئی اطلاع بھی نہیں دی تھی۔

”تھیں تھیلے اس نے درمیان میں رکھی تھیں۔“ ”میز کے قریب جا کر گلاس میں پکی شرب بھی اٹھائی، ایک ہی سانس میں اسے حلق کے نیچے اتارنے کے بعد اس نے دوبارہ دہلی گھڑی کی طرف دیکھا پھر وہ دل ہی دل میں جونی کو مغالطہ سنا کر اپنے غصے کو ٹھنڈا کر رہی تھی جب اس نے موبائل نے ڈائبرٹ کرنا شروع کیا۔ شیار ومانے نہ دیکھتے بغیر بڑی جھلٹ میں کال ریسپونڈ کی لیکن دوسری جانب سے غصہ کی آواز سن کر اس کی جھنجھلاہٹ دوچند ہوئی۔

”اس وقت کس مقصد سے کال کیا ہے؟“ اس نے تھل کر دریافت کیا۔

”مجھے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔“ ”دوسری جانب سے گھینڈی سر ہاتی آواز بھری۔“ ”لیکن دشمن نے سکندر علی شاہ سے کات ہمارے خلاف بھڑکیا ہے۔“ ”تھیں تھیں۔“ ”میں تمہارے یہاں کی طرف بھڑکیا ہے۔“ ”رخ نہ کروں۔“

”تمہارے شہر پر سے۔“ ”میں تھیں سے پچھ نہیں کہہ سکتی۔“ ”گھینڈے سے مدد لےجے میں جواب دیا۔“

”تھیں ہے۔“ ”شیار ومانے روکھے انداز میں اپنا فیصلہ بھی سنایا۔“ ”تمہارے نہ آنے سے پارک کے کاروبار پر کوئی اثر نہیں پڑے گا لیکن جو کام تمہارے ذمے ہے اس کی طرف سے غافل نہ ہونا۔“

”کوشش کروں گی لیکن میرا خیال ہے کہ سکندر علی شاہ کے پاؤ شکاری کے سب مجھے پیسے کی طرح سراوی سے کہیں نے جانے کا موقع نہیں دیں گے۔“

”یہ سوچنا تمہارا ذاتی مسئلہ ہے لیکن نئی کاروبار کے لیے لڑکیوں کی تلاش تمہیں ہر قیمت پر جاری رکھنی ہوگی۔“ ”تمہارے تمہارے سے پتہ اس حیثیت کی جانب نہیں۔“ ”میں تھیں اس کا حق نہیں دے سکتی۔“ ”تمہارے

”ہوگا۔ کنول کے اتھو کا خیال بھی نہ ہے، میں پتھر سے
تھا۔ اورنگ زیب کے لکڑی اپارٹمنٹ کی بربادی کا حال
بھی اسے سراج نے فون پر بتایا تھا اور یہ تاکید بھی خاص طور
پر کی تھی کہ وہ اپنے گروپش پر نظر رکھے۔
میڈم بہ دستور وقت کی اس گردش پر غور کر رہی تھی جو
”لیکھت تیز ہوتی جا رہی تھی جب قریب رکھے فون کی کھٹی
لگی۔ کال تحریر سائے وصول کی پھر اسے میڈم کی طرف
بڑھاتے ہوئے کہا۔

”میڈم الماس کی کال ہے۔“
”اس وقت کیسے یاد کیا؟“ میڈم نے بے تکلفی سے
دریافت کیا۔ ”سب خیریت تو ہے؟“
”تھریا نے کچھ بتایا کہ اسے کن لوگوں نے اغوا کیا
تھا؟“

”نہیں۔۔۔۔۔“ میڈم نے تھریا کی موجودگی کی وجہ
سے بات گھما کر جواب دیا۔ ”آج کل کوئی چیز بھی اپنی
اصل شکل میں نظر نہیں آتی۔ ظاہر و باطن میں زمین و آسمان کا
فرق ہوتا ہے۔“
”سمجھ گئی۔۔۔۔۔ شاید وہ اس وقت بھی تمہارے قریب
ہی موجود ہے۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔“ میڈم نے موضوع
بدلتے کی کوشش کی۔ ”سراج صاحب کا کیا حال ہے؟“
”نئے آئی جی کی وجہ سے سراج کے علاوہ اورنگ
زیب صاحب بھی الجھے ہوئے ہیں۔“
”کوئی نئی اطلاع؟“

جواب میں الماس نے پینا کے اغوا اور اس کے اغوا
کرنے والوں کی خودکشی کی تفصیل سنائی تو میڈم نے سنجیدگی
سے دریافت کیا۔ ”پینا کو تو کچھ نہیں ہوا۔۔۔۔۔؟“
”نہیں۔۔۔۔۔ اسے کرنل احتشام نے خاموشی سے گھر
بھیج دیا تھا لیکن اس کو اغوا کرنے والوں نے آئی جی کے
سامنے خود کو موت کی خیز سلاخیں جس کی وجہ سے وہ خود بھی
بوکھا گیا ہے۔“

”مجھ بتاؤ کہ اغوا کرنے والے کون تھے۔۔۔۔۔؟“
”ان کے پاس سے کوئی ایسی شے برآمد نہیں ہوئی
جس سے کچھ پتا چلتا۔ کسے کے خندے رہے ہوں۔۔۔۔۔“
”سراج بھائی اور اورنگ زیب صاحب کی انجمن کا
کیا سبب ہے۔۔۔۔۔؟“
”میں یقین سے نہیں کہہ سکتی لیکن سراج کی کچھ باتوں
سے یہ اندازہ ضرور ہوا ہے کہ کچھ ایسے نا حلوم افراد ہیں جو

آئی جی کو بھی اس کی کنوینشنل کے سبب بلیک میل کر
رہے ہیں۔“ الماس نے تھوڑے توقف سے کہا۔ ”اورنگ
زیب صاحب کے تھوڑے لے کے پیچھے بھی اسی بلیک میل کا ہاتھ
نظر آتا ہے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے؟“ میڈم روٹی نے سرسراتے
انداز میں پوچھا۔ ”کون ہو سکتا ہے وہ بلیک میلر؟“
”اس کا علم شاید آئی جی کو بھی نہیں ہے۔“
”مجھے تم سے اس جواب کی توقع نہیں تھی۔۔۔۔۔“
”میں سمجھی نہیں۔۔۔۔۔“ الماس نے کھوجتے والے انداز
میں کہا۔ ”تمہارے ذہن میں کیا ہے؟“

”تم فرحین اور لیاقت حسین کو پیش آنے والے
حادثات کو کیوں فراموش کر رہی ہو۔“ میڈم روٹی نے غجلا
ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ”ان تمام وارداتوں کے پیچھے
ایک ہی ہاتھ ہے۔۔۔۔۔ آنکھیں! میڈم نے بات جاری
رکھی۔ ”لیاقت حسین کی پراسرار غیبی قوتیں لگی ہار اس کا
راستہ کھول کر چکی ہیں، باقی کسر اورنگ زیب صاحب پوری
کر رہے ہیں جنہیں ایک لمحے کے لیے بھی اس کی موت کا
یقین نہیں آیا تھا۔ کنوں کے اغوا اور اس کی اس کی موت میں
بھی یقیناً اسی موڈی کے ہاتھ ہوگا۔“

”تمہاری بات میں وزن ہے۔۔۔۔۔ اس کی روشنی میں
تھریا کے اغوا کو بھی اسی کے خانے میں ڈالا جاسکتا ہے۔“
”میں نے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا ہے۔۔۔۔۔“ دوسری
طرف سے الماس نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔
”تمہیں شاید ابھی ایک تازہ واردات کی اطلاع نہیں
ملی۔“

”اگر تمہارا اشارہ اورنگ زیب صاحب کے لکڑی
اپارٹمنٹ کی طرف ہے تو یہ اطلاع تمہارے سراج صاحب
مجھے دے چکے ہیں۔“ میڈم نے مسکرا کر کہا۔ ”انہوں نے یہ
تاکید بھی کی تھی کہ یہ اطلاع اپنی ذات تک محدود رکھوں۔“
”اس کی مطلب یہ ہوا کہ ہم عورتیں مفت میں بدنام
ہیں۔“ دوسری جانب سے الماس کی کھنٹی ہوئی آواز
ابھری۔ ”یہ مرد حضرات ہم سے زیادہ پیٹ کے ہلکے ہوتے
ہیں۔ ایک طرف مجھے بھی زبان بند رکھنے کو کہا تھا اور دوسری
طرف خود تمہیں بتا دیا۔“

”سوری الماس! میڈم روٹی نے مسکرا کر
جواب دیا۔ ”میں سراج بھائی کے خلاف کوئی بات سننے
کو تیار نہیں ہوں۔“
”آج شام کا تھریا پناہ گاہ سے۔۔۔۔۔“

ککشکول

”اگر فارغ ہو تو میری طرف آ جاؤ۔ شام کی چائے بھی
پیتے رہا ان بھائی کے ساتھ بی لیتا۔

”وہ۔۔۔۔۔“ میڈم نے ہائی بھرتے ہوئے جواب
دیا۔ ”مجھے بھی اورنگ زیب صاحب اور سراج بھائی سے
بہتر باتیں کرنی ہیں۔۔۔۔۔ خاص طور پر سمندر کے موڈی
جانور۔۔۔۔۔“

”یار دے تیر۔۔۔۔۔“
”یہ بات کا جواب اگر پتھر سے نہ دیا جائے تو پتھر، شمن
اور شیر بن جاتے ہیں۔“ میڈم نے اس بار ہونٹ چباتے
ہوئے کہا پھر شام کی چائے کا پروگرام پکا کرنے کے بعد
ریسیور کریدل پر رکھ دیا۔
تھریا بہ دستور اس کے چہرے کے اثرات کا جا رہ
لے میں مشغول تھی۔

مارٹل سے ایک کنٹینٹ کو چہ زراں کہنی کے
لے کر۔۔۔۔۔ کے بعد یہ قوت میں ذہل کہیں پک اپ میں
میں اس موڈ سے گزر رہا تھا جہاں اس وقت زیادہ ٹریفک
میں تھا، عام طور پر اس سڑک کو صرف بندرگاہ جانے آنے
کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ سڑک کے دونوں جانب یا تو
کھلمیدان تھا یا پھر کہیں کہیں کچی آبادی کے کچھ شکت اور
میلے چمپے مکانات ان لوگوں کی غربت کی داستان سناتے نظر
آتے تھے جن کے لیے سرچھپانے کے لیے کوئی یا قاعدہ
ٹھکانا نہیں تھا، بہر حال اس راستے کی خوب صورتی کی خاطر
سڑک کے دونوں جانب کچھ مخصوص فلاصلوں سے ایسے
درخت بھی لگا دیے گئے تھے جو اپنا پانی خود زمین کی تہ سے
شید کرتے تھے۔ سینے میں ایک دوبار کار پوریشن والے
ائر فینک بھی ان درختوں کی مزاج پر سی کے لیے آجاتے
تھے۔ کسی بھانے وہ کچی آبادی کے خانہ برباد لوگوں کو
دست پڑنے پانی بھی فروخت کر دیتے تھے۔

سب معمول لیاقت حسین اس وقت بھی ان لوگوں
کے بار۔۔۔۔۔ میں سوچ رہا تھا جنہوں نے اس کی انجمنی میں
داخل ہو کر فرحین کو اغوا کرنے کی جسارت کی تھی۔ انجمنی کے
چوہے اس کو تو اس نے ٹھکانے لگا دیا تھا۔ بہت حسین
نے بھی یہ سب میں ان نے پانچ افراد کو موت کی خیز سلاخ دیا
تھا۔ یہ وہ آدمی تھا جس نے گئے تھے۔ لیاقت حسین پر ایک ذرا
تجربہ تھا۔ اس نے فرحین عثمان کے علاوہ اورنگ زیب اور سراج
سب کی دست پختگی دوسری کی ہوا بھی نہیں سننے دی تھی

اظہار محبت

مرد مختلف طبیعت کے مالک ہوتے ہیں۔
ضروری نہیں کہ مرد اظہار محبت کے لیے دنیا بھر میں
معروف ان تین انگریزی الفاظ کا سہارا لے۔ محبت
جنانے یا اس کے اظہار کی اور بھی بہت سی علامات ہوتی
ہیں۔ جن میں چند علامات یہ ہیں۔۔۔۔۔

☆ وہ آپ سے ملنے کی پہلی تاریخ کو یاد
رکھے۔
☆ وہ آپ سے ہونے والی پہلی ملاقات پر
آپ کے پہنے لباس کو یاد رکھے۔

☆ وہ آپ سے وابستہ ہر شے اور ہر شے کو قدر
کی نگاہ سے دیکھے۔

☆ وہ کسی پسندیدہ کھیل کے ٹکٹ چھوڑ کر آپ کی
سائیکل کو ترجیح دے۔

☆ وہ کوئی اچھا سا خند دے۔
☆ کوئی حراہیہ یا اجنبی صورت حال کا سامنا
اسے کرنا پڑے اور وہ فوراً آپ کے ساتھ شہر کرنے
کے لیے ٹکٹ بھج دے۔

☆ کوئی ایسا کام جو آپ کرنا نہ چاہیں اور اس کی
طرف سے کوئی دباؤ نہ ہو تو سمجھ لیں اسے آپ سے محبت
ہے۔

☆ وہ یہ کہے کہ آپ کے ہاتھ پاؤں بہت خوب
صورت ہیں باوجود اس کے کہ حقیقت اس کے برعکس ہو۔

☆ بعض وجوہات کی بنا پر وہ سمجھے کہ وہ آپ کو
کھو دے گا اور اس سوچ کے باعث وہ خود کو جسمانی
طور پر زخمی کر بیٹھے اور یہ بتانے میں اسے کوئی شرمندگی
نہ ہو۔

☆ وہ خوب صورت لڑکی سے بات کر رہا ہو اور
اسے بتائے کہ وہ آپ سے جڑا ہوا ہے۔

☆ آپ کے آئی لو پو کہنے سے قبل ہی وہ یہ الفاظ
کہہ دے۔

☆ وہ آپ کے بارے میں اتنا سوچتا ہو کہ جب
آپ اس کے ارد گرد نہ ہوں اور اس کے ساتھی شور مچا
رہے ہوں اور وہ آپ کا ذکر کر کے موضوع تبدیل
کر دے۔

مرسلہ: سلطان خاص، ضلع بونیر

یہ وقت حسینؑ کی وقت میں میل نرس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ تھوڑے عرصے کا تھا، اپنی ساری زندگی میں نہ فرحین کو رہا۔ یہ شخص لگا جاتا تھا۔ قدرت کی جیسی ہمداد نے اس کی نشاندہی کر دی تھی مگر یہ وقت حسینؑ کو سب بھی اس بات کا قیاس تھا کہ اس نے میل نرس کے سسے میں بیس بیس ورنگ ریب کو طاراً دے کر مٹائی کی تھی۔ اگر وہ خود اس کے ہاتھ پر تو زکرو دشمنوں کے لیے نشان مہر ت بنا دیتا تو شاید انہیں بھی اندازہ ہو جاتا کہ یہ وقت حسینؑ کی زندگی میں فحش ان کے لیے ترنوالہ نہیں بن سکتی تھی۔

اسپتال سے واپسی کے بعد راجید بیگم نے فرحین کو کچھ دنوں مکمل آرام کی خاطر اپنے پاس روک رکھا تھا، انہیں کے لیے دوسرے چوکیدار گل خان کی دساعت سے رکھ گیا تھا، اس لیے اس پر اعتبار کیا جاسکتا تھا۔ مگر ان نے بھی اسے اپنی زبان میں اشارہ دیا تھا کہ مٹری ایسی صحت کے چوسا دہا جس والے بھی اس کی رہائش پر تحیات کر دیے گئے ہیں۔ ان تمام احتیاطی تدابیر کے باوجود یہ وقت حسینؑ کی بات کا غم تھا کہ اس نے دشمنوں کو وہ جتن سیں دیا جو یہ چاہیے تھا۔ باپ کی طرح وہ بھی اس بات کا قائل تھا کہ بچان پر بیٹہ کر شکار کرنے والوں کو اصل شکاری نہیں کہا جاسکتا۔ مرد شکاری وہ ہوتا ہے جو شکار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تیرے پسپا ہونے پر مجبور کر دے۔

لیاقت حسینؑ نے اپنے باپ کی حویلی میں بھی شیر کی کھانا چار پر لگی دیکھی تھی، شیر کا بھی تھا جس میں اس کی آنکھوں کی ساری زندگی بھی ہو جو بھی نہیں سردار سرفراز خان نے اس درندے کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر موت کی نیند سدا دیا تھا جس کی تصویر بھی الیم میں محفوظ تھی۔ تصویر میں سرفراز خان اس جنگل کے بادشاہ کے سر پر ایک جیر جھانے سینہ تانے کھڑا نظر آ رہا تھا۔ وہی تصویر اس وقت لیاقت حسینؑ کے ذہن میں بار بار ابھر رہی تھی جب اس کی نظریں کچھ دیر بعد معموں کے مطابق تقبی شیخ کی طرف اٹھیں۔ ایک فاصلے سے آنے والے لوڈ ٹرک، دیکھ کر اس نے کوئی خاص نوٹس نہیں دیا لیکن جب اس نے اس کی دی ہوئی آنکھوں کے گھینے پر نظر ڈالی تو چونک اٹھا۔ کسی خطرے کے سامنے اس نے نہ ہی ہار شکاری کی طرح نہ ہٹا۔

اس نے اپنی رفتار کم نہیں کی لیکن یہ بات ہی نوٹ کر تار ہا کہ ٹرک آہستہ آہستہ اس کے قریب آنے کی خاطر رفتار بڑھا رہا تھا، سڑک کا وہ حصہ دونوں طرف سے ویران تھا، ٹرک کے پیچھے بھی سڑک پر کوئی دوسری گاڑی نظر نہیں

آ رہی تھی۔

یہ وقت حسینؑ کی طرح سبیل کر بیٹہ کی سیدھے ہاتھ سے اس نے اس کا دیا ہوا آؤٹینک ریو الور نکال کر گود میں رکھ لیا پھر وہ اپنی اپنی رفتار اس اندر میں کمر بستہ ہو روڈ کے کنارے ہونے لگا جیسے کسی نسائی ضرورت نے اسے مجبور کر دیا ہو گاڑی روک کر اس نے کشیش سے چابی بھی مان لی۔ آؤٹینک ریو اب کہ بیٹے میں اس کو وہ گاڑی سے تر روڈ علان سے گزر کر کب جہاڑی کی سڑک میں چل گیا۔ آٹروں بیٹھ کر اس نے گردن جھکا دیکھا اس کا اندازہ خط نہیں لگا۔

تعب میں تھے وہ ان ٹرک کی گاڑی کے مقب میں آکر رک گیا۔ یکے بعد دیگرے تین فراوک کر پینے آگئے۔ ایک کے ہاتھ میں رعل تھی۔ چوتھا شخص جو گاڑی چل رہا تھا وہ بھی نیچے اترتا۔ اس نے فوراً طور پر لیاقت حسینؑ کی گاڑی کے قریب جا کر اندر جھپٹا پھٹ کر ساتھیوں و ریلنگس بھی اسے دیا۔ لیاقت حسینؑ کے اس حوالہ میں چھپا دلیر شکاری پیدا ہوئے گا، اس نے بیٹھے ہی بیٹھے راسل والے کو نشانہ بنایا پھر سی آدم خور جیسے کی طرح انھیں کر سارے آگیا۔ رعل والے بھی پکا تھا۔ باقی تینوں افراد ابھی صورت حال کا پوری سمجھنا نہ پا رہے تھے اس لیے تھے جب یہ وقت حسینؑ نے گرت کر کہا۔

”خبردار۔ کوئی غلطی نہ کرنا ورنہ تمہارا انجام بھی ایسا ہی ہوگا۔ ہے ہاتھ میں کھلاؤ رند۔“

ٹرک کے کنارے سڑک کے تینوں فرار کے ہاتھ نصف میں بند ہو گئے۔ اپنے ساتھی کا انجام دیکھنے سے علاوہ حسینؑ لیاقت حسینؑ کے ہاتھ میں دبا آؤٹینک ریو الور بھی نظر آ رہا تھا۔ ایک ساتھی کے جہنم رسید ہوجانے کے بعد نہیں اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ اس کی ایک ذرا سی غفلت ان کے لیے بھی موت بن کر سامنے آسکتی ہے۔

”تم غلط سمجھ رہے ہو دوست۔“ تینوں میں سے ایک نے کہا۔ ”ہم بھی تمہاری طرح قارغ ہونے کے ارادے سے رکے تھے۔ تم نے ہمارے ایک ساتھی کو گولی مار کر جلد بازی کا ثبوت دیا ہے۔“

”سرفراز خون سوار ہو تو پھر قائل بھی اندھا ہو جاتا ہے۔ تم نے اگر سیدھی طرح میرے سوال کا جواب نہ دیا تو تم تینوں کا انجام زیادہ عبرت ناک ہوگا۔“ لیاقت حسینؑ نے ہتھارت سے جواب دیا۔

یہ تمہارے دوسرے وقت ہوئی۔ دوسرے سے

کشکول

قدرد۔ محلا کر کہا۔

مرات سے اگلے دو دنوں میں اس کے شکار کے لیے لیاقت حسینؑ کے چور خمر ناک ہونے لگے۔ اس وقت کے انجام پر غور مت کرنا۔ میں تم تینوں کو مار دیتا ہوں۔ اس طرح زندہ چھوڑاں گا۔ تم خود اپنے ہاتھ سے چٹا لگا گھوٹے پر مجبور ہو جاؤ گے۔ ایک مات دوسرے وقت کم ہے۔ اس سے پہلے کہ کوئی دوسری گاڑی اسے یہ جگہ جمع ہوں، اپنا قوت کی طرح میرے اشارے پر ہارنا شروع کر دو۔ تم کس سے آدمی ہو؟

”ہمارے بارے میں تمہارا اندازہ۔“ دوسرے شخص نے لیاقت حسینؑ کو گھورتے ہوئے چوکنا چہرہ بیان پھر ابھی صحت چوڑ کر چیخا ہوا سڑک پر ہونٹ ہٹا ہوا تھا۔ لیاقت حسینؑ کا نشانہ خط نہیں گیا تھا، دوسرے شخص کے داہنی گھٹنے کی ہڈی نوٹ کر ریزہ ریزہ ہوئی تھی۔

”خبردار۔“ لیاقت حسینؑ کی قہر آلود، ریزہ ریزہ میں بند ہوئی۔ ”تم کس کے آدمی ہو؟ کون ہے وہ نامزد جو اس کو دوسرے نہیں آتا۔“

”تم اس کا نام نہیں جانتے۔“ دو آدمی جو کسی نوٹ چھوٹ کا شکار میں آئے تھے ایک ساتھ ہی بول پڑے۔ ”میں فون پر تمہیں قید کر کے ایک مقام پر پہنچانے کا حکم دے رہا تھا۔“

”فون کرنے والا کون تھا۔“ لیاقت حسینؑ کی نگاہوں میں خون اٹنے لگا۔ ”کوئی نہ کوئی تو ضرور ہوگا جس ولد الحرام سے تم واقف ہو گے۔“

”ہاں۔“ لیکن ہم نے زبان کھول دی تو وہ بھی ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔

”پھر میرا انتہائی تم کوں کے لیے زیادہ نفع بخش ہے، میں تمہیں جان سے نہیں ماروں گا۔“ لیاقت حسینؑ نے زور خند لہجے میں کہا۔ پھر اس کے آؤٹینک ریو الور سے تیسرا قارغ اس بار ایک شخص چیتا ہو رہا تھا۔ گھٹنے کی ہڈی چوڑا ہونے کے بعد وہ بھی مایہ آبی کی طرح تڑپا ہوا تھا۔ لیاقت حسینؑ کی نگاہوں کا زاویہ تبدیل ہوا تو تیسرا قارغ خوف سے ہٹ گیا۔

”تم تینوں میں سے چھوٹا۔“ لیکن وہ جس حیثیت کا صاحب تھا، اس پر شہ تی نہیں کر سکتے۔

”تم تینوں میں سے چھوٹا۔“ لیکن وہ جس حیثیت کا صاحب تھا، اس پر شہ تی نہیں کر سکتے۔ آخری شخص

نے آخری حربہ استعمال کرتے ہوئے اس پر چھلانگ لگا دی۔ یہ تمہیں کوں کی توقع نہیں تھی، ایک سے وہ بھی چھلانگ لگانے والے کے ساتھ ہی گود میں لوٹ پڑا ہو گیا لیکن پھر وہ سے بھی قہر کر کے اس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا۔ کچل فرصت میں اس نے ہتھوں سے ہاتھ لٹکا کر کے پستول کے اسٹاکس کے سر پر پوری قوت سے مارا۔ اس نے اپنے ہتھوں سے اس کے مقابل کو بھی بے ہوش کر دیا۔ یہ وقت حسینؑ تیزی سے سنبھل کر پوزیشن سنبھالی پھر اس نے بے ہوش ہونے والے شخص کے گھٹنے پر بھی ایک گولی داغ دی۔ بے ہوشی کے باوجود اس کا جسم پھڑپھڑ کر رہ گیا تھا۔

سڑک پر، دور دور ٹریک کا کوئی نشان نہیں تھا۔ لیاقت حسینؑ چاہتا تو اپنی گاڑی پر بیٹھ کر وہاں سے چل جاتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ سڑک کے کنارے سڑک کے تینوں زخموں کو بھی گھسیٹ گھسٹ کر اپنی ڈبل تینوں کے پیچھے جسے میں ڈال لیا۔ اسے گھٹے بعد وہ علاقے کے پورے اسٹیشن تک اپنی تینوں افراد بے ہوشی کی حالت میں لے گئے۔ لیاقت حسینؑ کی گاڑی میں چھوڑ کر وہ پھول واسے اس ایچ کے کمرے میں داخل ہوا۔

”تم۔“ اس سچا دن سے غور سے دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔ ”تم یہ وقت حسینؑ آتا۔“

”آپ سے جانتے، صاحب۔“ لیاقت حسینؑ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”جس میں یاد نہیں لیکن میں تمہیں ایک بار اس پی۔ اورنگ زیب صاحب کے دفتر میں دیکھ چکا ہوں۔“ اس سچا دن نے مائے رکھی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نرم لہجے میں سوال کیا۔ ”اس وقت یہاں کیسے آتا ہوا۔“

”میں آپ سے ایک درخواست کروں گا۔“ لیاقت حسینؑ نے کرن پر بیٹھے غیر سنجیدگی سے درخواست کی۔ ”اس وقت آپ میرے ساتھ کوئی رعایت نہ کرنا۔“ اور۔۔۔ اور میں کسی اورنگ زیب یا سراج صاحب کو نہیں جانتا۔۔۔ وہ معزز افسران ہیں صاحب اور میں۔۔۔

”تمہارا تم لیاقت حسینؑ نہیں ہو؟“ اس ایچ اے نے اسے غور سے گھورتے ہوئے دوبارہ دریافت کیا۔ ”میرا نام لیاقت حسینؑ ہی ہے صاحب لیکن اس وقت میں مجرم کی حیثیت سے یہاں آیا ہوں۔“ ”کیا مطلب؟“ اس ایچ اے نے بغیر نہ روکا۔

غرق تھا جب نیل فون کی گھنٹی بجی، آئی جی نے اس کی لاش
 بیدنی سیکرٹری کی طرف کر دی۔ ایک منٹ بعد ہی بیدی
 سیکرٹری نے اندر داخل ہو کر کہا تھا۔
 ”سرسر۔۔ کوئی ضروری کال ہے لیکن فون کرنے
 والے نے نام نہیں بتایا۔“

جیلے کے اختتام کے ساتھ ہی رابطہ بھی منقطع
 گیا۔ آئی جی س ہونٹ چماتے ہوئے ریسورسورس
 رکھ کے بجائے غنا میں اچھا دیا۔

”تمہاری دلربا.....“ دوسری جانب سے مدغم لہجے میں ایک مہم آواز ابھری۔

میرے کاروبارے جانتے ہیں کہ میرے کسی حکم کے خلاف پلکیں جھپکانے کی سزا بھی موت ہوتی ہے۔ تم جو خیال ظاہر کر رہی ہو اس کے بارے میں سوچنے کی جرات بھی نہیں کر سکتا۔“

SOLE DISTRIBUTOR
OF U.A.E

اس وقت بھی وہ سوچ میں گم تھا جب اس نے آئی جی کے دفتر سے نکلنے کے بعد سراج کو اس کے دفتر سے پک کیا تھا۔ گاڑی کے دوبارہ حرکت میں آنے کے بعد سراج نے اورنگ زیب کے چہرے پر سنجیدگی و غور و فکر کے گہرے تاثرات دیکھتے ہوئے دلی زبان میں کہا۔
”معاذ کچر سلیس معلوم ہوتا ہے؟“

اورنگ زیب نے جواب نہیں دیا وہ بہ دستور لیاقت حسین کے بچہ کے سہیلے میں مختلف پہلوؤں پر غور کر رہا تھا۔
”ہم اس وقت کہاں چل رہے ہیں؟“ اس بار سراج نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”جو در پشتر بندرگاہ کے علاقے کے ایس ایچ ایس کے پاس ہے۔“ سراج نے کہا ایک شخص نے شخص امتحان کی بنا پر ایک شخص کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور تین افراد کو اس گھر میں گولی مار دی ہے۔ وہ تہ سرنڈی پانچ ہیں۔“

”پھر ہم وہاں کس مقصد سے جا رہے ہیں؟“ سراج نے سوال کیا۔ ”ہمارا اس معاملے سے کیا افیشل تعلق ہے؟“

”ایس ایچ او ہم دونوں کا وقت ہے۔ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”اس کا خیال ہے کہ جس نے یہ واردات کی ہے وہ بے گناہ ہے۔“

”اور اب ہم شخص اس کے خیال کو قوت چنپانے کی خاطر وہاں جا رہے ہیں۔“ سراج نے بھڑکایا۔ ”میرے خیال ہے کہ ہمارے وہاں جتنا منہ سب نہیں ہوگا۔ ہمیں اس معاملے سے زیادہ ہم کام نہیں لے رہے۔“

”تم نے اس شخص کا نام نہیں پوچھا جس نے یہ جرم کیا ہے؟“

”ایس ایچ او کا واقف کار ہوگا۔“ سراج نے ہوشیار چہرے سے بے پردائی سے کہا۔

”محرم نے ایس ایچ او کو تمہارے نام کا حوالہ بھی دیا ہے۔“ اورنگ زیب نے سراج کی جانب دیکھا۔ ”اب کیا ہو گئے؟“

”آپ کا اشارہ کیا لیاقت حسین کی طرف ہے؟“

سراج نے اورنگ زیب کے جواب اور بندرگاہ جانے والی روڈ کے حوالے سے چونک کر لیاقت حسین کا نام لیا تو اورنگ زیب مسکرا دیا۔ پھر اس نے ایس ایچ او کی جانب سے ملنے والی سببت سراج کو بھی سن دی۔ تفصیل سے یہ حد تک سنائی دے رہی تھی کہ اس سے غوری صاحب کی کوئی جواب نہیں دیا۔

”چپ کیوں ہو گئے؟“

”مجھے یقین ہے کہ اگر معاملہ لیاقت حسین کا ہے تو اسے پھر بھی قوتوں کی طرف سے کوئی نہ کوئی شمار ضرور ہوگا۔“ سراج نے سنجیدگی سے اورنگ زیب کی طرف دیکھا۔ ”آپ کا بیان ہے؟“ کیا ایس ایچ او ہماری نذر پڑتی سببت واردات کے سلسلے میں لپٹا پوٹی پر آمادہ ہوا ہے؟“

”نہیں۔“ سراج نے کہنے پر اس نے پرچہ کاٹ دیا تھا۔ لاش اور تین زخمیوں کو بھی پولیس سرجن کے آفس روانہ کیا جا چکا ہوگا لیکن۔ لیاقت حسین ایس ایچ او کے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔

”کیا مطلب؟“ سراج نے پوچھا۔ ”صورت حال کا اندازہ تمہارے ذہن سے بچ رہا ہے؟“

”سراج کسمسا کر رہ گیا۔ اورنگ زیب کی ذہانی تفصیل سننے کے بعد وہ بھی گھبرا گیا۔ پندرہ منٹ بعد وائس ایچ او کے کمرے میں موجود تھے۔ سراج کے اصرار پر اس نے اپنی بی بی پر پھر تمام رام کہانی تفصیل سے دہرا دی۔ یہ بھی بتا دیا کہ اس نے لیاقت حسین کی ضد کے خلاف اسے ایک اپ میں بند کیا ہے۔“

”تم نے بتو حال کیا ہے میں دلی طور پر اس کا شکر گزار ہوں۔“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔

”آپ شرمندہ کر رہے ہیں۔“ سراج نے اپنی زبان سے آج سببت پر ہوں۔

”رہی باتوں کے بعد لیاقت حسین کو سنا ہے۔ یا یہ اس نے ایک نظر اورنگ زیب اور سراج پر ڈال کر پھر نظریں جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ سراج اپنی جگہ سے اٹھ کر لیاقت حسین کے پاس گیا، اوتار اندر میں پوچھا۔

”لیاقت حسین۔“ میں نے تمہیں ہمیشہ اپنا حال آدمی سمجھا ہے، اس کے حوالے سے تب ر ایک احساس میرے اپر بھی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم نے شخص کو سنا ہے کہ یہاں نہیں چھوٹی ہو گی۔ کوئی نہ کوئی بات تو ضرور ہوگی۔“

”مجھے پتہ نہیں معلوم صاحب۔“ انیس میں نے کچھ کیا میں اس کا قریب رہتا ہوں۔ لیاقت حسین سے عجیب انداز میں جواب دیا۔ چاہتا تو ہوں کہ میں اس میں بڑا دل نہیں ہوں صاحب۔ میرا اصل جس جگہ ہے وہاں عزت کی حفاظت کی خاطر رہتا ہوں۔“

کشتکول

چھوٹی جاتی تھیں۔ جن لوگوں نے فرحین پر ہاتھ ڈالنے کی غلطی کی ہے ان کے پورے خاندان کو بھی تباہ کرنے سے بچ سکیں۔ روں کا۔ جس پر شبہ ہوگا اس کو دی سانس دینا۔“

”جو شخص مار گیا۔ تین افراد جو زخمی ہوئے۔ ان پر نہیں پڑا ہے۔“

”اس نہیں جانتا صاحب۔“ لیاقت حسین نے زور سے کہنا۔ ”میں میرے دل میں ایک خیال رکھتا ہوں۔ کسی کے اشارے پر میرے سینے پر ہاتھ نہیں چھو کر جو کچھ ہوا میں نے مردوں کی طرح اس کا قریب بھی کر لیا ہے۔“

”تم میری ایک بات مانو گے۔“ سراج نے اس کی ذہنی کیفیت و محسوس کرتے ہوئے نرمی سے کہا۔

”تعم دو صاحب۔“ آپ میرے محسن ہو آپ کے حکم پر اپنی گردن کاٹ کر آپ کے قدموں پر بھی کھڑا ہوں۔“

”قانون اندھا ہوتا ہے لیاقت حسین۔“ اس کا پیٹ میرے دل کا خطرہ نہ کہ وقت اور حالات کی نزاکتوں کا خیال بھی رکھتا ہوتا ہے۔ تم بھی اسی دنیا میں رہتے ہو اس لیے تم بھی نئی اصولوں پر قدم اٹھانا ہوگا۔“

”قانون کی باتیں آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں صاحب۔“ مجھے کیا کرنا ہوگا؟“ لیاقت حسین نے سراج کو سواہ نظر دوں سے دیکھا۔

”میں جانتا ہوں کہ تم نے جو قدم اٹھائے وہ کسی مصلحت کی بنا پر نہیں ہوگا لیکن اب۔“ اب قانون کا پیٹ بھرنے کی خاطر تمہیں میرے مشورے پر اپنا بیان بدلنا ہوگا۔“

”میں سمجھتا ہوں صاحب۔“ میں نے کیا غلط بیان دیا ہے جسے بے بدلتا ہوگا؟“

”تم شاید بھول رہے ہو۔“ جس شخص کو تم نے پہلے گولی مار دی اس کے ہاتھ میں رغل بھی تھی۔“

”ٹھیک ہے صاحب۔“ وہ رائفل بھی میں نے ادھر تھامنے میں جمع کرادی ہے۔“

”انسانوں لیکن۔“ سراج نے اس بار روشنی کی۔ ”میں نے پہلے تم پر یقین کیا تھا۔ تم نے اپنی جان سے بڑی جراتی کارروائی کی تھی جس کے نتیجے میں۔“

”لیاقت حسین صاحب۔“ لیاقت حسین نے جواب دیا۔ ”میں نے اس کو کرنے کی صحت ہی نہیں دئی تھی۔“

”میں قانون کا پیٹ بھرنے کی بات کر رہا ہوں۔“ سراج نے وضاحت کی۔ ”اگر راضی سے میرے ذہن میں ہو تو اب یہ جاسکتا ہے۔“ میں نے نہ بچھو تو جو زخمی کرنا ہوگا۔ م صرف میرے کہنے پر اپنا سابقہ بیان تبدیل کر دو۔ اس کے بعد قانونی معاملات و محسوس میں۔“

”میں اپنا بیان تبدیل نہیں کروں گا صاحب۔“ لیاقت حسین نے ٹوٹ چہرے سے نظر اٹھ کر کہا۔ ”آپ اور میں بی صاحب دونوں میرے محسن ہو۔ میں اپنی وجہ سے آپ لوگوں کو کسی امتحان میں نہیں ڈال سکتا۔ یہاں تک حرامی ہوگی۔“

”دوسری شکل میں جانتے ہو کیا ہوگا۔“ سراج نے جھلا کر لیاقت حسین کو گھورا۔

”پھانسی۔“ لیاقت حسین نے نظریں اٹھا کر بے پروائی سے جواب دیا پھر اس نے سراج کا ہاتھ تھام کر کہا۔

”ہونٹ کاٹتے ہوئے ایک ماہر اندر خوش قسمت بھی کر ڈلی۔“ مجھے پھانسی ہونے کے بعد آپ میری فرحین کو عزت سے اس کے گھر چھوڑ آنا صاحب۔“ بابا سے بھی کہی کہنا،

”کہ اس کا لیاقت حسین بڑا دل نہیں تھا۔“ اس نے خود کو بچانے کی خاطر کسی دھوکے یا فریب کا سہارا بھی نہیں لیا۔ یہ بات سن کر بابا کا سر بھی اونچا ہونے لگا۔ فرحین بھی مجھ پر فخر کر رہی تھیں۔ ہمارے علاقے میں ایسا ہی ہوتا ہے صاحب۔“

”تم پر کس قسم کا اورہ پڑا ہے لیاقت حسین؟“ اس سے پیشتر تمہاری کیفیت کبھی نہیں ہوئی۔“

”اس سے پہلے کسی نے فرحین کے بدن کو ہاتھ گانے کی غلطی بھی نہیں کی تھی۔“ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو صاحب۔“ لیاقت حسین نے سر ہلچے میں کہا پھر قدم اٹھانا دوبارہ حوالات کی طرف چلا گیا۔

اورنگ زیب اس، ایچ او کے ساتھ بیٹھا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ لیاقت حسین کا طرز عمل اس کے لیے عجیب نہیں تھا۔ سراج قریب آیا تو اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ اب مسز عثمان یا فرحین لیاقت حسین کی گرم کھوپڑی کو ٹھنڈا کرنے کے کام آسکتی ہیں۔“

”آپ فکر نہ کریں سر۔“ ایس ایچ او نے کہا۔ ”جو کچھ ممکن ہو میں اس سے انکار نہیں کروں گا لیکن لیاقت حسین کو بہر حال ہمارا ساتھ دینا پڑے گا، اگر عدالت میں بھی اس نے وہی کہا جو اس وقت کہہ رہا ہے تو پھر۔“

قون کی گھنٹی بجی تو ایس ایچ او نے معذرت کر کے

ریسورٹ میں یہ کچھ دیر نہیں رہیں گے۔ اس کے بعد وہ دوسری طرف سے بٹے والے کو اب بھی لے کر آئے۔ اب یہ سب سے پہلے ہے۔

”آپ ہاں کھڑے ہیں؟“

”ہم کوشش کریں گے کہ پولیس سرجن کی رپورٹ اور زخمیوں کے بیان دینے سے جیستریاقت حسین کو قاتل کی تصدیق سے پوری طرح آگاہ کر سکیں۔“ اورنگ زیب کے بجائے سراج نے ایس ایچ او سے کہا۔ ”میں صرف ایک درخواست کروں گا۔ آپ یہ وقت حسین کا خیال رکھیں۔ اسے دوسرے قیدیوں سے الگ رکھیں۔ میں ضمانت دیتا ہوں کہ وہ فرار نہیں ہوگا۔ اگر جھڑپی کھول دی جائے تو بھی وہ تھانے سے باہر نہیں چلے گا۔“

”میں جانتا ہوں سر.....“ ایس ایچ او نے کسمسا کر جواب دیا۔ ”اگر اسے فرار ہی ہونا ہوتا تو یہاں آتے کی جرات ہی نہ کرتا۔“ میں جھڑپی کھولنے اور اسے طعنے کھانے میں رکھیں گا۔“

”اوہ“ اورنگ زیب نے جوفون ریسیو کرنے کے بعد سے ایس ایچ او کی کیفیت کا جائزہ لے رہا تھا، بے حد سنجیدگی سے اسے غصہ کیا۔ ”میں تمہاری مجبوری سمجھ رہا ہوں۔“ تھانے کے عملے میں بھی کالی بھیڑیں ضرور ہوتی ہیں جو ایک ایک لمبے کی خیر ادر سے ادھر پہنچاتی رہتی ہیں۔

”آپ میرے دشمن بھی ہیں سر..... اور تجربے کار بھی، میری مجبوری کو ضرور سمجھ رہے ہوں گے۔“

”اس لیے میں تم سے یہی کہوں گا کہ یہ وقت حسین کے ساتھ کوئی ایسی رعایت نہ کرنا جو تمہارے لیے یہ بھی مشکل پیدا کر دے۔“ اپنی بات کہتے وقت اورنگ زیب نے اپنے ہاتھ پر ہاتھ پٹن سے کچھ لکھ کر ایس ایچ او کے سامنے کر دیا۔ اس ایچ او نے، ثبات میں سر کو جنبش دی پھر معنی خیز انداز میں بولا۔

”جو صورت حال ہے اس کے پیش نظر مجھے امید تھی کہ آپ مجھے یہی مشورہ دیں گے۔“

سراج تھمکا کر رہ گیا وہ براہ راست ایس ایچ او سے کچھ کہنا چاہتا تھا جب اورنگ زیب نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا پھر دوبارہ ایس ایچ او سے قدروں انداز میں بولا۔ ”مجھے یہ نہیں سرجن کی رپورٹ اور زخمیوں کے بیان کی عمل درآمد کرنی ہے۔ یہ گزارش میں یہ بات اس کے ایک وقت کار کی حیثیت سے کر رہا ہوں۔“

”اس ایچ او نے جواب دینے سے جیستریاقت

سراج کا ہاتھ تھم کر ہارنگل گیا۔ اس کے چہرے کی تبدیلی سراج نے بھی محسوس کی تھی۔ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد اس نے کہا۔ ”آپ نے بچاؤ کی پوزیشن میں اس کی اور دریافت کر سکتا ہوں۔“

”ایس ایچ او کو وپر سے جو ہدایت ملی ہے اس سے بعد وہ مجھ کو کیا ہے۔“ اورنگ زیب نے جواب دیا۔ ”شاید نوٹ نہیں کیا کہ کسی کا فون آجانے کے بعد وہ تھوٹا ہو گیا تھا۔“

”آپ۔۔۔ ہاتھ پر کیا لکھا ہے اس کو دکھایا تھا۔“

”آئی۔ جی۔“

”اوہ“ سراج نے نوٹ چبانے۔ ”یہ تو یہاں حسین کو گھیرنے والے آکٹوپس ہی کے ہونے کا اشارہ ہے؟“

”نہیں۔ آکٹوپس کی جگہ جس نے بھی لی ہے۔ آئی جی اس کا حکم لانے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ تم میرے ہاتھ کی بات کیوں فراموش کر رہے ہو؟“

”پھر۔۔۔ اب آپ نے کیا سوچا ہے۔“ سراج نے پوچھا۔

”سوچنا کہ سنجیدگی سے کہا۔“ ہم یہ وقت حسین کو موجودہ صورت حال میں بے یار و مددگار بھی نہیں چھوڑ سکتے۔“

”اورنگ زیب نے اس کی کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات قوی کر رہے تھے کہ وہ بھی کسی ذہنی کشش میں مبتلا ہے، سراج اس کی کیفیت کا اندازہ لگا رہا تھا جب اورنگ زیب نے موبائل نکال کر کسی کے سرچ کیے۔ دوسری طرف سے رابطہ قائم ہونے کے بعد اس نے بغیر کسی تمہید کے سرسرات سچے میں کہا تھا۔

”اب وقت آگیا ہے کہ ہمیں جی اینٹ کا جواب پتھر سے دینا ہوگا۔“

”کوئی نئی پوزیشن“ دوسری جانب سے کرنل احتشام کی آواز ابھری۔ جواب میں اورنگ زیب نے یہ بات حسین کی پوری کہانی دہراتے ہوئے کہا۔

”اس بار بھی کسی نے اوپر سے ہمارے جبک اس کے اپنے اشاروں پر چلانے کی کوشش کی ہے۔“

”ڈونٹ وری“ میں یہ وقت حسین کے کیس کو اس طرح پر بھی ہینڈل کرنے کی پوزیشن میں ہوں۔“ کرنل احتشام نے کھروڑے لہجے میں جواب دیا۔ ”آپ نے کہا ہے کہ آڈیو ریکارڈنگ پنڈت میں تبدیل کر دوں گا۔“

”نہیں۔ یہ من سب نہیں رہے گا۔“ اورنگ زیب نے تیزی سے جواب دیا۔ ”جو چاہے کتاب میں بیٹھتا

میں سامنے لانے کی خاطر ہمیں دور اندیشی سے کوئی پلان مرتب کرنا ہوگا۔“

”پولیس اور ہمارے کام کرنے کے انداز میں بھی فرق ہے۔ اس حشمت نے لکھ کر کہا۔“ جتنے سامنے سو تو ہم پہلے وقت میں اسے موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ اس کی صورت میں، رکی اکثر پس جاتی ہے۔“

”ایئر کی ویس۔“ لیکن اس وقت ہم یہ نہیں دیکھ رہے ہیں۔“ اورنگ زیب نے کہا۔ ”دشمن بھی پر اسے میں سامنے سامنے لانے کی خاطر مجھے آپ سے کہہ رہا ہوں۔“

”نورانی کیس“ دوسری جانب سے پوچھا۔

”یہ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟“

”جو میرا آپ کی تحویل میں ہے آپ اس کی اس کھولنے کی کوشش کریں۔ جو سب سامنے نہیں ہے۔ اب سامنے لانے کی خاطر ہمیں بھی حالات کے پیش نظر پتھر سے ہدایت کرنے کی ضرورت ہے۔“

”کرنل۔ میں بھی آپ کو یہی مشورہ دوں گا۔ کوئی ذرا دیر بیٹھ آئے تو آپ بہ جھجک میرا حوالہ دے سکتے ہیں۔ یہ صورت حال ہوئی میں اسے سنبھال رہا ہوں۔“

”سینکس۔“ اورنگ زیب نے موبائل بند کیا۔

”سراج نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”کیا آپ کو امید ہے۔“ دشمن آسانی سے ہاتھ کھول دے گا؟“

”اس کا جواب مجھے کرنل سے بعد میں معلوم ہوگا۔“

”جو شخص آئی جی کو اشارے پر چلے کر مجھ پر رہا ہے اس کے بارے میں بھی ہمارے پاس کوئی ٹیکہ نہیں ہے۔“

”اب ہمیں دو اور دوپانچ کے فارمولے پر عمل کرنا پڑے گا۔“ اورنگ زیب نے سڑک پر نظریں جمائے۔

”جہاں جواب دیا۔“

”کیا مطلب؟“

”ابھی ہوئی ڈور کو سلجھانے میں کچھ وقت ضرور ضائع ہوتا ہے مائی ڈیر۔“ اورنگ زیب نے کچھ توقف سے کہا۔ ”یہ جگہ کے فرنچیز مارٹ کی تباہی۔ رستم علی آغا خانی کو میٹ میں کرنے کی کوشش۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ لودھی کی موت۔ آکٹوپس کی رہائش گاہ کی کھنڈر میں تبدیلی۔ میرے گزری فیت پر حملہ اور توڑ پھوڑ۔ اپنی مومن جان پریشان ہونے والے تڑکیوں کے مذموم کاروبار کی کھنڈر میں شاہ کی مداخلت جسے سرکار نے

سبق آموز واقعات

☆ بیگم نے خوب صورت نوکرائی کو فارغ کرتے ہوئے کہا۔

”صاحب کو تمہارے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا بہت پسند تھا۔ میں سوچ رہی ہوں کہ اب ان کا کیا بنے گا؟“

”آپ ان کی فکر نہ کریں۔“ نوکرائی نے جواب دیا۔ ”وہ بھی میرے ساتھ ہی جا رہے ہیں۔“

☆☆☆

☆ صاحب دفتر سے گھر آئے تو بیگم نے شکایت لگاتے ہوئے کہا۔ ”اس ڈرائیور کو فوری طور پر نکال دیں۔ آج پھر میرا ایکسٹنٹ ہوتے ہوئے بچا ہے۔“

”میرا خیال ہے۔“ میاں نے کہا۔ ”اسے ایک موقع اور دینا چاہیے۔“

☆☆☆

ایک شخص کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ جب قبرستان لے جا رہے تھے تو جنازے کی چارپائی گلی کی ٹکڑ والے کھمبے سے ٹکرائی اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ چنانچہ اسے گھر واپس لے آئے۔ چند ماہ بعد واقعی اس کا انتقال ہو گیا اور اس کا جنازہ لے جاتے ہوئے جب گلی کی ٹکڑ کے قریب پہنچے تو عقب سے خاوند پکار کر بول۔

”کھمبہ بچا کے۔“

☆☆☆

میاں حسب معمول رات کو دیر سے گھر آئے۔ چپکے سے کھانا کھانے کے لیے ہاتھ دھو رہے تھے کہ بیوی کی آنکھ کل گئی۔ اس نے پوچھا۔

”کیا کر رہے ہو۔“

”ہاتھ دھو رہا ہوں۔“ میاں نے دھیرے سے جواب دیا۔

”خمس لیے؟“ بیوی نے غصے سے پوچھا۔

”سوئے کے لیے۔“ میاں نے جواب دیا۔

مرسد: اکثر مرزا انتقار نذیر مغل جسو داں کھوکھرا ان

حوالے کر دیا گیا تھا۔ اب یہ باتیں میرے حق سے نیچے نہیں اتر رہیں۔ ان تمام وردواتوں کے ڈنڈے کہیں نہ کہیں ایک دوسرے سے منہ ملتے ہیں۔

”ہو سکتا ہے لیکن آپ نے کرٹل سے کسی غیر قانونی عمل کی بات کی تھی۔“

”ہاں۔۔۔۔۔“ اورنگ زیب نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔ ”سر جن بھی جانتا ہے کہ ہر آپریشن کامیاب نہیں ہوتا لیکن اس کے باوجود وہ سر جری کرتا ہے۔۔۔۔۔ اب ہمیں بھی اسی فارموسے پر عمل کرنا ہوگا۔“

”آپ کے ذہن میں کیا پلان ہے؟“

”سب سے بیشتر ہنی مون یونی پارلر میں معمولی نوعیت کی توڑ پھوڑ اور ہنگامہ۔“

”آئی سی۔۔۔۔۔“ سراج چونکا۔ ”کیا آپ شیلا ورا اور جونی۔۔۔۔۔“

”نہیں۔۔۔۔۔“ اورنگ زیب نے سراج کا جملہ کاٹ کر کہا۔ ”یہ دونوں مہرے ہیں لیکن ایک نام میرے ذہن میں چبھ رہا ہے۔ سکندر علی شاہ کی دوسری بیوی گلینہ۔۔۔۔۔ میری اطلاع کے مطابق شیلا ورا سے میل جول کے علاوہ جونی سے بھی اس کے تعلقات تھے مگر کچھ دنوں سے اس نے بھی یونی پارلر آنا چانا ترک کر دیا ہے۔۔۔۔۔ کسی وجہ سے جونی بھی دو دنوں تک انڈر گراؤنڈ رہنے کے بعد سامنے آ گیا ہے۔“

”یہ اطلاعات مجھے کئی جگہ ہیں مگر میرا خیال ہے کہ آرہم گلینہ کو ہیبت دینے کے بجائے براہ راست سکندر علی شاہ کا پوسٹ مارٹم کریں تو نتائج مفید افزا بھی ہو سکتے ہیں۔“

”میں تمہارے خیال کی تردید نہیں کروں گا۔“

میرے پلان میں سکندر علی شاہ کا ذمہ ہاؤس بھی ہے جہاں ہمارے بڑے بڑے افسران اور حکومت کے ذمے دار عہدے داروں کو بھی داد عیش کے مواقع فراہم کیے جاتے ہیں لیکن جب تک ڈور کا ایک سراہا تھتا جائے ہم جلد بازی میں کئی قدم نہیں اٹھائیں گے۔“

”آپ کا کیا خیال ہے۔۔۔۔۔؟“ سراج نے پوچھا۔

”کیا میڈم کی لیڈی سیکریٹری کا اغوا بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے؟“

”ہو بھی سکتی ہے۔“

”یونی پارلر پر گامے لے لے۔۔۔۔۔ کس کا انتخاب کیا ہے؟“ افضل خان اس کا موہتر طور پر سنا۔

”مجھے تم سے اس جواب کی امید نہیں تھی۔“ اورنگ زیب نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ”تم یہ کیوں فراموش

کر رہے ہو کہ دشمن کی دوبارہ گرفتاری میں افضل خان نے کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ اسی صورت میں دشمن کی ہمت سب پر بھی وہ سرفہرست ہوگا۔ اس کی حفاظت کی ذمہ داری سے منقل نہ ہونا۔“

”آئی جی کے لیے آپ نے کیا سوچا ہے؟“

”کچھ بھی نہیں۔۔۔۔۔“ اورنگ زیب نے شانے اچکا کر بے پردائی سے جواب دیا۔ ”حالات کی بساط پر اس کی حیثیت زیادہ اہم نہیں ہے۔۔۔۔۔ کسی دھمکی رگ کے سبب وہ خود بھی بے بس ہے۔“

پھر گفتگو کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔۔۔۔۔ موبائل پر کسی کان کے آگے آنے کے سبب اورنگ زیب نے دشمن اسکرین پر غبر دیکھ کر اسے فوراً ہی آن کر لیا تھا۔

دوسری جانب سے بولنے والا خام مخبر ”مختصر“ کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ سراج کی نظریں بدستور اورنگ زیب کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

دشمن اس وقت بھی ملٹری انٹیلی جنس ہیڈ کوارٹر کے ایک کمرے میں نیگے فرش پر بیٹھا خلا میں گھور رہا تھا۔ اس کے ذہن میں صرف ایک نام رہ رہ کر گونج رہا تھا۔۔۔۔۔

”افضل خان۔“

پچاس فٹ کی بلندی سے پھانگ لگا کر وہ لوچن کی نظروں میں بھی دھول جھونک کر نکل گیا تھا، کرٹل احتشام کے سادہ لباس والے بھی اس کی ہوا نہیں پاسکے تھے۔ بعد میں اس کے فرار کی اطلاع نے سب کو مستحضر کر دیا ہوگا۔

دشمن اسی خوش فہمی میں مبتلا تھا، ہنری براؤن کا میک اپ کرنے کے بعد اسے پورا دشمن تھا کہ اب اسے تلاش کرنے والے ٹاپے رہ جائیں گے۔ اس نے اپنے کیا تھا کہ بگ باس سے رنجہ ہونے کے بعد وہ پہلی فرصت میں کسی اور زیادہ مجموعہ مقدم پر منتقل ہو جائے گا لیکن افضل خان نے درمیان میں آ کر اس کے سارے خوب صورت بیچوں کو مہر میٹ کر دیا تھا۔

دشمن کو یقین تھا کہ افضل خان بھی ذاتی طور پر اس کی نگرانی ضرور کرتا رہا ہوگا۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ اس کے ہونٹ تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ آمنت من ہونے کے بعد خود دشمن بھی پہلی نظر میں افضل خان کو نہیں پہچان سکا تھا۔ جب پہچانا اس وقت دیر ہو چکی تھی پھر وہ افضل خان کے پھانسنے ہوئے جاں میں پھنس کر دوبارہ کرٹل احتشام کے چنگل میں آ گیا تھا۔

افضل خان کے حوالے سے دشمن کے ذہن میں ایس

ای اورنگ زیب کا نام بھی گونج رہا تھا۔ اپنے تجربے کی روشنی میں زرنے اورنگ زیب کو دوسرے پوئیس افسروں سے بہت مختلف پایا تھا۔ یقیناً اسی کے اشارے پر افضل خان بھی پوری طرح متحرک تھا جس کی وجہ سے دشمن ایک با۔ پھر پھنس گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس بار کرٹل نے بھی ٹرائی کا سخت لہجہ لگایا ہوگا۔ اس کے تجربے کا رکمانڈوز پوری طرح محتاط ہوں گے۔ اس کے حصار کو توڑ کر نکل جانا آسان نہیں ہوگا۔ دشمن کا شطرنج ذہن اس وقت بھی ناممکن و ممکن بنا دینے کے امکانات پر غور کر رہا تھا جب کمرے کے بد دروازے پر ایک ذرا سی آہٹ سن کر وہ پوری طرح قحط ہو گیا۔ دراب وہ خود کو تنہا مطمئن غہر کرنے لگا جیسے کسی بات کی قطعی پروا نہ ہو۔

کمرے میں داخل ہونے والا ایک مخبر تھا، دشمن نے ڈی ہار کرٹل احتشام کے ساتھ دیکھ چکا تھا، اس کا تعلق دشمن کے خیال کے مطابق ملٹری کے کسی ایسے شعبے سے تھا جہاں زمان کے بجائے ذہن اور تجربے کا نظروں سے دوسرے کو پرکھا جاتا ہے۔ بعد میں اس کی تحریری رپورٹ تیار کی جاتی ہوگی۔ اسی کی روشنی میں کوئی حتمی فیصلہ لیا گیا جاتا ہوگا۔

میرے سامنے آنے کے بعد دو مسلح سپاہی بھی کمرے میں داخل ہوئے۔ ایک کے ہاتھ میں فولڈنگ چیئر تھی۔ مخبر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ اس کی مدثن اور چمکدار نظریں اپنے تجربے کی روشنی میں دشمن کے تاثرات کو پرکھنے لگیں۔ ایک سے ایک دشمن خاموش رہا پھر اس نے مخبر کو اپنی فین ریڈنگ کا موقع نہیں دیا۔ مسکرا کر بولا۔

”میں اس وقت میک اپ میں نہیں ہوں۔“

نہاں سے آدمیوں نے میرا اصل روپ دیکھنے کے کارن جو فوٹو احتشام کیا تھا اس نے میرے سارے روپ بہرہ پر دھرا ہے۔ ابھی تک اس کی جگہ میرے چہرے پر دشمن کی طرح ڈبل دہرائی ہے۔“

مخبر نے وہی جواب نہیں دیا۔ البتہ اس کے ہونٹوں پر ایک بکا سا ہنسم بھی بھرا تھا۔

تم ہنا اور میرا سے برہد مت کرو۔“ فیئر۔“ دشمن نے ان نظروں کا تاڑ کر کرنے کی خاطر پھر اس کی توجہ میں نہ لے کر دوش کی۔ ”جو من چاہے سوال کرو۔۔۔۔۔ میں سے کوئی بات غلط نہیں کہوں گا۔ دو کوڑی کے ملازموں سے تیارات بھانسنے کے بعد جو مخبر مفر فرہوئے لگتے ہیں میرا خیال اس میں نہ رہا۔“

جب تک تمہاری قید میں ہوں۔۔۔۔۔ تم

مالک ہو اور میں مجبور۔۔۔۔۔ جس دن یہاں سے چھوڑا ہو گیا۔۔۔۔۔ میں مالک ہوں گا اور تم مجبور۔۔۔۔۔ چور سپاہی کا مالک اسی طرح چلا رہا ہے۔“

مخبر بہ دستور مہر بہ لب رہا البتہ ساتھ میں کھڑے دونوں کمانڈوز کے تیور بدلنے لگے۔

”دشمن کو قتل کر کے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔“

دشمن نے مخبر کو مسکرا کر بے پردائی سے مشورہ دیا۔ ”کوئی زہریلا انجکشن۔۔۔۔۔ پھر نہ رہے گا بانس نہ باجے گی بانس۔ اس کے علاوہ در کوئی طریقہ کام نہیں کرے گا۔“

”بولتے رہو۔۔۔۔۔“ مخبر نے پہلی بار زبان کھولی۔

”تمہاری باتیں بھی میرے لیے کارآمد ہوں گی۔“

”تمہاری مرضی۔۔۔۔۔“ دشمن نے شانے اچکائے پھر بے نیازی سے آنکھیں موند لیں۔

دس پندرہ منٹ تک کمرے میں عمل خاموشی رہی پھر دروازہ دوبارہ کھلنے کے ساتھ ہی کسی کے قدموں کی آہٹ ابھری تو دشمن نے دوبارہ آنکھیں کھول دیں۔ آنے والا کرٹل احتشام تھا جسے دیکھ کر مخبر بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

”کیا رہا۔۔۔۔۔؟“ کرٹل احتشام نے مخبر سے دریافت کیا لیکن اس کی قبر آلود نظریں دشمن پر ہی مرکوز تھیں۔

”سیکسی مم ڈوز (MAXIMUM DOSE)“

مخبر نے مختصر جواب دیا۔

”تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟“ کرٹل نے دشمن کو تیز نظروں سے گھورا۔ ”کیا تم شرافت سے زبان نہیں کھود گے؟“

”تھوڑی بہت ٹوٹی پھوٹی گت پٹ میں بھی کر لیتا ہوں۔“ دشمن نے سنبھل کر کہا۔ ”آپ اپنا آخری ارمان بھی پورا کر لیں میرا جواب وہی ہوگا۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ کو جس کی تلاش ہے وہ کہاں ملے گا۔ میری اس کی بات صرف موبائل پر ہوتی ہے۔ ہر بار دو نئے نمبر سے کال کرتا ہے۔ وہ سب میں اگل چکا ہوں۔“

معلوم کرنا ہے۔“

”آخری بار تم اس سے کہاں ملے تھے۔۔۔۔۔؟“

”ملنے ہی کے کارن موت کے کنوئیں سے چلا نک

لگا کر گیا تھا مگر ایک چھوٹی سی بھول ہو گئی جو پھر تمہارے سامنے موجود ہوں۔“ دشمن نے بل کھا کر جواب دیا۔

”پہلی فرصت میں ایک گولی اس کی کھوپڑی میں داغ کر دو گیارہ ہو جاتا تو۔۔۔۔۔“

”شت اپ۔۔۔۔۔“ کرٹل گرج اٹھا۔ ”یہ کہانی میں پہلے ہی سن چکا ہوں۔۔۔۔۔ زندگی چاہتے ہو تو اس کا پتا بتا

وہ کہتا ہے تمہارے ساتھ اب جو ہوگا۔۔۔۔۔ اچھا نہیں

میں بھی اس شخص سے مل چکا ہوں۔ " آئی جی نے اپنے سر میں میل زس اور زہریلے انگلیشن کی تفصیل دہراتے ہوئے حسمت دیا۔ "میرے یہ دو سیکچر جوتے انگلیتہ کرتے ہیں اس بار لیاقت حسین نامی شخص نے مختصر شبیہ بنیاد ایک آدمی کو ہلاک کرتے ہوئے شدید زخمی کر دیا ہے۔ عدالت اس کی کہانی تو سنا لی ہے ہضم نہیں کرے گی۔ "

خوب صورتی سے بات بنائی پھر دو چار سی باتیں کرنے کے
بعد ابلہ ختم کر دیا۔ اس کے ہونٹوں پر پھر مسخ خیر قسم
پر لگے گا۔ اور ایک زیب کی بات یہ بات معلوم ہو جائے
کے بعد یہ آئی جی کی تمام فوں کا زکس سنی جاتی ہیں۔ اس
ساتھ ساتھ کرس وقت ایسی باتیں کی کہیں جو ہاں سننے
وہ وہ مدافعی میں مبتلا کر سکیں یہ جاننا بھی مقصود تھا کہ
آئی جی اور ایک زیب کے سہ سے میں کون قانونی قدم لے
سکتا ہوں۔

”ہم بھی جانتے ہیں مگر..... یہ بھی مت بھولو کہ انسان کی ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی بھی اس کے لیے کبھی کبھی نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔“ اندھیرے سے چھپ کر چلائی جاتے والی گولی..... روشنی میں رہنے والوں کا لحاظ بھی نہیں کرتی۔۔۔۔۔ پلک جھپکتے میں آتی جاتی ساتس کا سلسلہ بھی ٹوٹ جاتا ہے۔“ سراج نے اس بار قدم دے تھما نہ انداز ل میں کہا۔“ جو کچھ کہا گیا ہے اس کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کی غلطی نہ کرتا۔“

”جبرو“ فضل خان نے سرسریتہ سچے میں جواب دیا۔ ”میں نے بھی یہی درخواست کی تھی۔ یہ دو موقوف نہ کرنا۔ تمہیں پناہ سے پیسے میں اسے اتنی دیت تاکہ موت ماروں گا کہ پھر کوئی تمہاری طرف میلی ٹھنڈا سے کی ہوا بھی نہ کر سکے۔“

”اپنا خیال بھی رکھنا، فضل“ حسین نے اس کا ہاتھ تھام کر جذباتی انداز میں درخواست کی۔ ”تمہیں پتہ ہو گیا تو میں یا اٹل تمہارے جواب کی۔“

جواب میں فضل خان نے شہم کوشاںوں سے حاتم۔ اس کی پیشانی کا بوسہ لیا تو شہنشاہ نے بھی بے اختیار ان کے کشادہ سینے میں سر چھپالیا۔

محمد مجتبیٰ

لیاقت حسین کے اقبالی بیان کے بعد پولیس کی درخواست پر عدالت نے اسے ایک ہفتے کے لیے پولیس کسٹڈی میں دے دیا تھا۔ ریہانہ گرفت کرنے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ابھی تک کسی شخص نے میں مرنے والے کے لواحقین کی جانب سے کوئی فیفا آئی آر درج کرنے کی گئی تھی۔ یہی تینوں زخمی اس پوزیشن میں تھے کہ عدالت کے روپرو پیش ہو کر کوئی بیان دے سکتے۔

متعلقہ تھانے کا ایس ایچ او چکی کے دو ہاتھوں کے درمیان سینڈ ویچ بن گیا تھا۔ نہ وہ آئی جی کے حکم کی خلاف ورزی کر سکتا تھا نہ ہی اورنگ زیب کی ساجد مہربانیوں کو نظر انداز کر دینا اس کے ضمیر کو گوارا تھا۔ ریہانہ حاصل کرنے کے بعد ہی اس نے پہلی فرصت میں اورنگ زیب کو اس کی اطلاع بھی دے دی تھی۔

اس وقت لیاقت حسین پھر اس کے سامنے موجود تھا۔ حسب معمول وہ پوری طرح مطمئن نظر آ رہا تھا لیکن آنکھوں کے تاثرات اس بات کی چٹکی کھڑے تھے کہ اس کے وجود کے نہیں خانوں میں کہیں کچھ ٹوٹ پھوٹ بھی ہو رہی ہے۔

”میری بات توجہ سے سنو لیاقت حسین۔“ ایس ایچ او نے سنجیدگی سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”تمہیں یہ جو ایک ہفتے کی مہلت ملی ہے، اسے بھی خیریت چاہو، اس کے بعد اگر زخمیوں نے تمہارے خلاف زہرا لگا تو تمہارے بچاؤ کے سارے راستے بند ہو جائیں گے۔“

”جاسا ہوں“ لیاقت حسین نے ہاتھ کاٹتے ہوئے جواب دیا۔

”پھر بھی تمہاری بات سمجھنے کی کوشش نہیں

کمر ہے۔۔۔ ہمارا نہیں تو اپنے عزیزوں کا خیال کرو۔ کوئی نہ کوئی تو ایسا ضرور ہوگا جو تمہیں سزا ہو جانے کے بعد قصور کی ویرانی شدت سے محسوس کرے گا۔“

”تم صرف قانون کی بات کرو صاحب۔“ لیاقت حسین نے پہلی بار جھڑپ کر جواب دیا۔ ”رشتہ تانے کے یہ میں مت پڑو۔ جو سرحدات اسے ابھی وگ روڈیٹ کر رہے ہیں۔“

”متمہ میں کیا کھا رہے ہو کوئی نہیں جانتا۔“ پھر سوچا۔ ”یہ رہا نہ ختم ہونے کے بعد تمہیں اسے بچھڑاؤں سے اور کچھ حاصل نہیں ہوگا۔“

لیاقت حسین جواب میں مسرادیہ دے سمجھ رہا تھا کہ پولیس کی یہ تمام ریا۔ تیس اسے اورنگ زیب اور سران کی وجہ سے مل رہی تھیں ورنہ پولیس تو ان لوگوں سے بھی ڈنڈے کے زور پر اقبال جرم کر سکتی ہے جو مطلق ہے۔ ہوتے ہیں۔ اس وقت کسی بے قصور کو بھی یہ سوچنے کی بہت تھیں ملتی کہ کس جرم کی پاش میں اس کی ہڈیاں بچی جا رہی ہیں۔ پھر اس کے لیے صرف یہی مناسب ہوتا ہے کہ رات سے روپرو بھی پولیس کا زبردستی یا دکر رہا ہو اسبق فر فر دے۔ باقی فیملی اندھا قانون سنا دیتا ہے، بے قصور یہ دشمنیت جھٹکنے کے لیے جیل چد جاتا ہے۔ اصل مجرم کھلی ہو میں اندھا بنا پھرتا ہے۔

”تم چپ کیوں رہو؟“ ایس ایچ او نے سوال کیا۔

لیاقت حسین کھر جو ب دینے کی خاطر پتوں رہا تھا جب ایک سپاہی نے اندر داخل ہو کر ایس ایچ او سے جو سرگوشی کی۔ ”ان لوگوں کو بھانڈا میں آتا ہوں۔“

سپاہی اسے قدموں چڑھ گیا تو ایس ایچ او بھی اپنی زبانی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے لیاقت حسین سے کہا۔ ”جہ وقت کا تم سے ملاقات کے لیے آئے ہیں۔ میرے ساتھ چلو۔“

لیاقت حسین نے ایک لمحے کو کچھ سوچا پھر ہونٹ چپا ہوا اند قالی کمرے میں آ گیا جہاں سینڈ عثمان اور راحیل نام اس کے منتظر تھے۔ لیاقت حسین نے کچھ کہنے کے بجائے نظریں جھٹالیں۔ ”کچھ تے سچے میں آہستہ سے ہو۔“

”آپ عزت دار لوگ ہیں۔ میرے محسن بھی ہیں ایک آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔“

”تم بات نہیں کرنا چاہتے تو ہم بھی خالی ہاتھ واپس جا رہے ہیں۔“

راحیل بیگم کی بھائی ہولی آواز لیاقت حسین کے کانوں میں گونجی تو وہ تڑپ اٹھا، اس نے دوبارہ نظریں

کر لی، سینڈ عثمان خاموش کھڑے تھے لیکن ان کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ حالات نے ان کو بھی بھڑک دیا ہے۔ راحیل بیگم اس طرح بے چین اور مستطرب تھیں جیسے ان کا کوئی اہل حیل میں ہتھکڑیاں پہنے ہو۔

”آپ۔ آپ کیا حکم دیں گی بیگم صاحب۔“ رات حسین نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”میں نے آج تک آپ کے کسی حکم کو نہیں سنا، آج آج ہی فیملی ہلاؤں گا۔“

”کوئی اور بھی ہمارے ساتھ آنے کو بچا رہا تھا لیکن ہمارے اس کا یہاں آنا پسند نہیں کیا۔“ راحیل بیگم نے لیاقت حسین کے قریب آ کر مدھم لہجے میں کہا۔

”آپ نے اچھا کیا۔ یہ۔ یہ جلد آپ لوگوں کے بھی قابل نہیں ہے۔“

”پھر تم یہاں رہنے کی ضد کیوں کر رہے؟“

”میں نے کیا کیا۔“ لیاقت حسین پھر جذباتی ہونے لگا۔ ”جو سچ ہے وہی بار بار رہ رہا ہوں۔ اس کے علاوہ کیا کہوں؟“

سراج بھٹی نے تمہیں حوشورہ دیا تھا وہ اب بھی اس کے ”راحیل بیگم نے سرگوشی کی۔“ ”مجھ کو کیا اور جو لوگ رنجی ہیں ان کا ساتھ رکھنا بھی نہیں کیا ہے۔ سب افراد مجرم ہیں۔ اب ان مجرموں کو قانون کے جال میں پھنسانے کی خاطر ”میرم بھی مصمت سے کام آتو یہ بھی سبلی ہوگی۔“

”راحیل بیگم کہہ رہی ہیں لیاقت حسین۔“ سینڈ عثمان نے لیاقت حسین کی ذہنی کشمکش کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”دروہوں کو بھی قابو کرنے کی خاطر ان کی راہ میں خدقین کھودی جاتی ہیں۔ مضبوط حال بن جاتے ہیں۔“

”میں نے بھی یہاں ہی کیا تھا صاحب۔“ لیاقت حسین نے مصمیت سے جواب دیا۔ ”اگر وہ مر جاتے تو یہاں پر نا حساب کتاب میرے حق میں گواہی دیتا۔۔۔ وہ زندہ ہیں۔ میں مجرم کیسے بن گیا؟“

”تمہارا حق اگر پولیس کے محکمے یا قانون نافذ کرنے والوں کی ایجنسی سے ہوتا تو اور بات تھی لیکن محض شہر کے شہریت کی بنیاد پر اگر م آدمیوں کو یہ حق دے دیا جائے تو پھر ساداتوں کے لیے ایسے مقدموں کو منٹا بھی سکتا نہیں ہوگا۔“

”اس سر فرار خان صاحب کا بھی فون آیا تھا۔“ لیاقت حسین کے کوئی جواب دینے سے پیشتر، حیل بیگم نے اسے دیکھا تو کھڑے تھے لیکن سم نے یہ بہہ کر ایک

لکھ کتب

میرا بیوی کمرے میں خاموش بیٹھے تھے، بیوی کی سوج یہ تھی۔

- (1) یہ مجھ سے بات کیوں نہیں کر رہا؟
- (2) کیا میں مہنی ہوئی ہوں؟
- (3) کیا اس نے میرے چہرے پر کیل دیکھ کر یہ بوجھ لگا دیا تھا؟
- (4) کیا یہ کسی اور کو چاہتا تھا؟
- (5) کیا یہ دوسری شادی کے بارے میں سوچ رہا ہے؟

شوہر کی سوچ۔

”گل کیتی تے کتھے پیسے ای نہ منگ لیوے چپ ہی رہنا چاہی والے۔“

(2013)

سوچ اور بیوی میں کیا مشابہت ہے؟

Very Simple آپ اس کی طرف گھور کر نہیں دیکھ سکتے۔

(2013)

نیچر، سردار سے۔ ”فوکس کی تعریف سناؤ۔“

سردار۔ ”سر پروری یا نہیں آخر سے تھوڑی یاد ہے۔“

نیچر۔ ”او۔ کے سناؤ۔“

سردار۔ ”and this is called physics“

(2013)

مشہور اداکارہ ”میرا“ اپنا زلٹ دیکھ کر ”کیا؟ میں لیل ہوئی وہ بھی انگلش میں

”Dispossible“

مرسلہ محمد قدرت اللہ نیازی، خانیواں

دیا کہ ہم بھی تمہارے لیے کوئی غیر نہیں ہیں۔
 ”بابا نے مجھے برا بھلا تو نہیں کہا۔۔۔؟“ لیاقت حسین نے سوال کیا۔
 ”نہیں“ سیٹھ عثمان نے مدح میں لہجہ میں جواب دیا۔ ”وہ بھی یہی کہہ رہے تھے کہ تم نے جو کیا۔ یہی مردوں کا شیوہ ہے۔ جس کی پشت پر گولی لگے اسے مرد میدان نہیں کہتے۔“
 ”بابا نے سچ کہا ہے صاحب۔“ لیاقت حسین کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ”ہمارے علاقے کا یہی دستور ہے۔“

”جانتا ہوں لیکن تم اس وقت شہر میں رہا جہاں ہر طریقے مختلف ہوتے ہیں۔“ ٹھنڈی یہی ہے نہ جیسا کہ یہاں کے فارمولے پر عمل کیا جائے۔“
 ”فرحین نے میرے بارے میں کیا کہا ہے؟“ لیاقت حسین نے نظریں جھکا کر راحیلہ بیگم سے دریافت کیا۔
 ”وہ جن حالات سے گزر چکی ہے اس کے بعد تمہاری بات کے احساس نے اسے بھی گم سم کر دیا ہے۔“ راحیلہ بیگم نے بڑی اہمیت سے کہا۔ ”اور کسی کا نہ سہی فرحین کا نو نہیں کہ لیاقت حسین سہارے چھن جائیں تو اچھا چھ آئی جی ٹرکسز پاتا ہے۔“
 ”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں بیگم صاحب۔“ لیاقت حسین اندر ہی اندر گھٹ کر رہ گیا۔

”پھر تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟“ سیٹھ عثمان نے دریافت کیا۔
 ”ابھی ایک ہفتہ سے صاحب زخیوں کا بیان ہونا ہے دیں پھر میں بھی اس کی روشنی میں کوئی فیصلہ کروں گا۔ ہوسکتا ہے وہ بدذات اپنی زبان سے ہانا جرم قبول کر لیں اور بدلے کے ہاں بھی دیر ہے اندھیر نہیں ہے۔“

”میں تمہاری بات مانتی ہوں لیکن اب ایک آخری فیصلہ میرا بھی من لو۔“ راحیلہ بیگم نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”اگر زخیوں نے اس بات کا قرار نہ کیا کہ وہ تمہارے لہجہ میں تھے یا ان کا مقصد تمہیں نقصان پہنچانا تھا تو پھر تم وہی کرو گے جو میں کہوں گی۔ تم نے پھر بھی اپنی عمدہ نہ چھوڑی تو میں یہی سمجھوں گی کہ تمہاری نظروں میں میری کوئی۔“

”آگے کچھ نہ کہنا بیگم صاحب۔“ لیاقت حسین نے جھجھکاؤ سے کہا۔ ”میں نے آپ کا منہ کھلیا ہے۔ یہ کسی حکم نامہ کے تحت حرامی کا ثبوت نہیں دوں گا۔“

”مجھے یقین تھا ساقی حسین کہ تم میرا نہیں دے گے۔“ راحیلہ بیگم نے پرسکون سیٹھ سے لے کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”پھر کچھ اور بعد۔۔۔ ایسا جلی نہیں تہا ایسا نہیں۔“
 اس سچ او کے کمرے میں آگیا جو کسی سے فون پر بات کرنے میں مصروف تھا لیکن اب اس کی نظریں لیاقت حسین کے چہرے کا جائزہ بھی لے لے میں مصروف ہو گئی تھیں۔
 ”سیٹھ عثمان اور اس کی بیگم سے ملاقات کے بعد تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟“ کال ختم ہونے کے بعد اس نے لیاقت حسین سے دریافت کیا۔

”زخیوں کا بیان ہو جائے پھر فیصلہ ہی ہو جائے گا۔“
 ”میں نے اس وقت پوچھا تھا۔ پتا ہے وہ کیسی اہمیت کا تھا۔ عمل کا اندازہ ہے کہ ایک گھنٹوں میں وہ بھی جوش میں آجائیں گے۔ مگر تمہیں ان کے بیان سے لیا مرد کار ہے؟“ ایسا سچ او نے وضاحت طلب نظروں سے لیاقت حسین کو گھورا۔

”اوپر والے سب سے بڑا کار سا ہے۔ اس کا ج فیصلہ ہو گا اسے ہم مل کر بھی نہیں ہال سکیں گے۔“ لیاقت حسین نے سپاٹ لیٹی میں جواب دیا۔ پھر سر پر عینت سیاہی کے ساتھ باہر نکل آیا۔ اس ایجنسی کے شانے اچکائے۔ کچھ سوچ کر وہ ایس بی اورنگ زیب کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔

سکندر علی شاہ اس وقت اپنی اسٹڈی میں تہہ سوچ رہا تھا۔ وہاں اس کے سوا کسی اور کو آنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر غور و فکر کے گہرے تاثرات دھوپ چھوڑنے کی طرح بدل رہے تھے۔ کئی سال ابھر ابھر کر آپس میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔

”فارم ہاؤس میں جوڑی اس کے لیے لائی گئی تھی اس پر ہاتھ صرف کرنے کی جرأت کس نے کی تھی؟“ لڑکیاں فراہم کرنے والی درہا پائی لڑکی نے جو اطلاع اسے دی تھی وہ سچ تھی یا نہیں۔ اگر نہیں تو اس نے اس قدر سنجیدگی سے جھوٹ بونے کی جرأت کیوں کی؟ ذرا ہاؤس کے تمام معاملات کی نگرانی گوگلے کے ذریعے تھی۔ اسے عمارتوں پر سختی یا نرمی کرنے کے پورے اختیار بھی حاصل تھے۔ پھر وہ کون تھا جس نے گوگلے کی سخت گیر طبیعت کو نظر انداز کر کے شیر کے شکار پر منہ ہارنے کی فطرت کی تھی؟

سکندر علی شاہ گوگلے کی فطرت سے پوری طرح آگاہ تھا۔ وہ شروع ہی سے عورت ذات سے نفرت کرنے کا

ی تھا۔ انکی ہی ایک ہم وجہ سے وہ خود بھی ادارت ہو گیا تھا۔ پھر ایک عورت ہی نے سبب اپنی نفرت کا ظہار کر کے کے بعد اسے سکندر علی شاہ کے عتاب کا شکار ہونا پڑا۔
 سکندر علی شاہ نے اس کو اپنے پاس لے لیا۔ اسے ہاؤس سے ہٹا کر فارم ہاؤس بھیج دیا تھا۔ اس موقع پر اس کو لڑکی کی پیشانی شکن آلود ہو گئی تھی۔ اس سے کہات یہ ایک عورت کی وجہ سے شہر کے ہنگاموں سے دور کرنا صرف فارم ہاؤس تک محدود کر دیا گیا تھا اور جب سکندر علی شاہ نے کچھ دیر پہلے پھر ایک لڑکی کی ہی خاطر سے ذمے دار قرار دے کر اس کے گھٹنے پر ہتھ کر مار دی تھی تو گوگلے نے لڑکھڑا کر گرتے گرتے خود کو سنبھال لیا تھا۔ اس کی نگاہوں میں احتجاج کے ساتھ ساتھ نفرت کے شعلے بھی لپکتے تھے مگر اپنی مجبوریوں کی خاطر اس نے پھر سکندر علی شاہ کے قدموں میں پناہ لی تھی۔ یہ تمام باتیں سکندر علی شاہ نے لپٹی نہیں تھیں لیکن گوگلے کی حمایت میں ”شکرہ“ نے ان اور جسمی آمیز گھٹکوں نے سکندر علی شاہ کو انجھن میں دیا تھا۔ اس کی بجھ میں یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ ”شکرہ“ وہ ایک نیک گوگلے سے کیا ہمدرداں بد ہو گئی؟ اس نے گڑھے میں اٹھ کھڑے والی بات کہہ کر بھی سکندر علی شاہ کو چوکا کر دیا تھا۔ یہ ایسی ہی اہم بات تھی جو سکندر علی شاہ کے خیال میں اس کے علاوہ کسی اور کے علم میں نہیں تھی۔ پھر ”شکرہ“ کا کوڈ ورڈ استعمال کرے وہ اس کا علم کس طرح ہو گیا؟ وہ کس طرح واقف ہو گیا تھا کہ لڑکی اس نے روٹا تھا؟ گوگلے کی حمایت اس نے جسمی آمیز انداز میں کیوں کی تھی؟ کیا ہمدردی تھی اسے گوگلے سے؟ اور اس نے چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر لڑکی کی عزت لوٹنے والے کی دھان کی اطلاع دینے کا دعویٰ کس بنیاد پر کیا تھا؟ کیا وہ گھر کا کوئی بھیدی تھا جو سکندر علی شاہ کی ایک ایک اہم حرکت سے واقف تھا یا کوئی بد روٹ تھی جس نے سکندر علی شاہ کو فرش سے اٹھا کر عرش تک پہنچانے میں مدد کی تھی اور اس کے بدلے وہ اسے اپنے اشاروں پر چلنے پر مجبور کر رہی تھی۔۔۔؟

چوبیس گھنٹے کے دعوے کی مدت ختم ہونے میں ابھی بڑا گھٹا باتی تھا جب فون کی گھنٹی کی آواز نے سکندر علی شاہ کو چوکا دیا۔ ایک لمبے تک وہ فون کو گھورتا رہا پھر ہاتھ بڑھا کر بیرونی دنیا۔

”سکندر علی شاہ بول رہا ہوں۔“ اس نے حسب معمول بھاری آواز میں کہا۔



مرگودھا کی سرزمین سے ادب کا پرچم بلند رکھنے والی ایک اہم شخصیت کا زندگی نامہ

کراچی کے اس مصور کا تذکرہ جو بیوی کو پالنے کی جستجو میں جرنی جاپنی

زندگی کی آس کی خاطر کیا کیا جتن کیے

ایک عجب انداز کی سچی بیانی

ولچپ سرکہانی ”ترکی می دانم“، لہورنگ سرگزشت ”سراب“ فلم نگری کی ان کی روداد ”قلی الفیلیہ“ اور بھی بہت کچھ جواب پڑھنا چاہتے ہیں

بس ایک بار پڑھنے کی دیر ہے آپ خود سرگزشت کے گرویدہ ہو جائیں گے

آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر اپنا شمارہ مختص کرالیں

بسم الله الرحمن الرحيم

دوسری بار زور سے پوچھا۔ "میں تمہاری کیا دوسرے ہوں؟"
 تب وہ چونکا۔ "مجھے اظہارِ محاشی کا کٹ دینا۔"
 کلنگی نے اسے کٹ دیا کہہ دیا اور اس نے صحت، رقم
 نکال کر ٹیک کے حوالے کر دی۔ وہ بد دستور اور دردِ دیکھ رہا
 تھا۔ کچھ دیر بعد وہ سس میں دخل ہو تو سیہ مختصر باؤں وار
 ٹوکا اس کے برابر ولی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے مسٹر اک
 سنہری بالوں والے کی طرف دیکھا اور یہ ٹھٹھکی سے
 بولا۔ "ہائے، میں سام ہوں۔"
 "کر سٹن۔" سنہری بالوں والے نے اپنا حریف
 کر لیا۔ اس نے اپنا نانا کی تار نہیں تیا تھا۔
 "تم کو حاشی پار ہے۔"
 کر سٹن نے سر جھپکا، وہ اپنا بیگ سامان دے خاے
 میں رکھ رہا تھا۔ "اور تم؟"

بیڑے لطف اندوز ہوتے ڈرائیو کر رہے تھے۔ اچانک
کار کا پیس برسٹ ہوا اور کار لہرائے لگی لیکن کرشن نے یہ
مشاورت سے اسے سٹاپ کیا اور روک کر کہا
"یہ وہ کس وقت ایک دہلی سڑک سے گزر رہے تھے
یہاں دور دور تک کسی آبادی کا نام و نشان نہیں تھا۔
نیچے ترے برسٹ مارا معاملہ کیا۔ سام نے ہانکی کھنکھار
اٹھائی وہاں نکالنے لگا۔ کرشن نے معذرت کی کہ اسے
پہننے کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ سام خود ہی اس کام میں
آگیا۔ اس نے کار تبدیل کیا اور ابھی وہ اس کے ساتھ ہوا
تھا کہ اس نے کہا کہ اس نے یہاں وہ ہولی
رواں میں یہاں سے یہاں سے یہاں سے بہرہ رکھا تھا۔
"اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟"
وہ کرشن نے اس کے مستقبل کے بارے میں پوچھا
تھا اور یہ خبر تھا کہ کرشن کا اس وقت یہ ارادہ ہے۔
یہاں قریب سٹی کرشن نے اس کی طرف دیکھ کر
کہا ہے۔"

ہیں، انھیں تھا۔ وہ اچھا پڑھیں مگر تھوڑی اپنی محنت سے اس
 قدر تھک چکا تھا۔ اس نے ماتحت جان بیچ اور رستہ راہ کی
 بددعا دے دیتے تھے۔ بنائے پڑے پٹ میں جا کر نہیں تھا یہ یہ
 تھا کہ اس کے چنگے، ان کی تھی۔ بیٹن، کاجیہا تھا کہ یہ کس
 تھا اس طرح کی کڑی تھی جس میں ایک یہ میں طر دو گوں کو دھڑ
 براں و شہادت کی ناریہ بگاڑ دیتا تھا ان دیکھتے
 تھے۔ ہم کہی۔

اس پر ضرب لگا کر موت کے گھاٹ اتار گیا اور
 مرنے کے بعد اس کا چہرہ بگاڑ گیا، وہ ہاتھ کاٹے گئے۔“

”یہ یہ بھی کسی کیس کی ایک کڑی ہے“ رستہ نے
 کہا۔

”ہاں، اس کی لیے یہ کیس ہمارے لیے دیا ہے۔“

غشمرے ہوئے تھے میں کہنا۔ "ابا، تم ہی میں نہیں سو دیکھ رہے ہو، میرا شمار ہر ایک کی طرف ہے۔"

"پولیس نے مدد کی کوئی درخواست نہیں کی۔"

"ایف بی آئی ہمیشہ بغیر درخواست کے مدد کے لیے آتی ہے۔" وہ مسکرائی۔ "مجھے اس کیس پر تمہاری معاونت کے لیے بھیجا گیا ہے۔ اگر تم مل کر کام نہیں کرنا چاہتے تو میں اسکیلے کام کروں گی۔ اس صورت میں تمہارا ایک آدمی درکار ہوگا۔"

جان نا پسندیدہ نظروں سے اٹلیں کو دیکھ رہا تھا۔ اسے ویسے ہی ایف بی آئی سے چڑھتی۔ اس کا خیال تھا کہ یہ محکمہ صرف پولیس کے کاموں میں مدد دیتا ہے۔ لیکن یہ سچ نہیں ہے۔ اس وقت نے سوچا اور اسے اپنے دفتر میں لے آیا۔ اس نے اس کے لیے کافی نکالی۔ "تم جوں کے پس چھو ہے۔"

"شاید اتنی ہی جتنا پولیس کے پاس ہے۔"

"تب تم کی مدد کر سکتی۔"

نہیں لگا سکتے، اس کے لئے کہ یہ راجہ ہے۔
 "جی نہیں ہے ریو آرٹ گیلری وے اسے جانتے ہیں، یہ ان کے لیے ہی کام کر رہا ہے۔" جان نے کہا۔
 "تمہارے خیال میں؟" ال درتھ نے ایش کی طرف دیکھا۔
 "میں اس سے بات کرنا چاہوں گی۔"
 ال درتھ نے شانے اچکائے۔ "کر کے دیکھ لو۔"
 "پوسٹ مارٹم رپورٹ کب تک آئے گی؟"
 "شاید دو گھنٹے میں۔" ال درتھ نے کہا۔ "ویسے
 مقتول کی شناخت ہو گئی ہے۔ اس کے پاس سے دستاویزات
 نکلی ہیں۔ اسٹیوڈنٹس ایک مقامی کارڈنگر ہے اور ٹیوٹورل
 رہتا تھا۔ وہ جاگنگ کے لیے نکلتا تھا کہ پارک میں قاتل کے
 پتے چڑھ گیا۔"
 "اس صورت میں یہ پہلا واقعہ ہو گا جب مقتول کی
 شناخت ہو گئی۔"
 "اس کی وجہ شاید یہ شخص ہے۔" ال درتھ نے رچی کی
 طرف دیکھا۔ "قاتل نے اسے دیکھا اور فرار میں عافیت سمجھی۔"
 اس کا امکان تھا کیونکہ قاتل کو آج تک کسی نے نہیں دیکھا
 تھا اور اگر وہ مقتول اسٹیو کا روپ دھارتا یا اس کی دستاویزات
 اور کریڈٹ کارڈ استعمال کرتا تو پکڑا جاتا۔ ایش کا خیال تھا کہ
 کرشن ایک جنونی سیریل کٹر تھا۔ اس کا شکار ایسے آدمی ہوتے
 تھے جو اکیلے ہوں اور جن کے بارے میں زیادہ لوگ نہ جانتے
 ہوں اور اگر وہ اچانک کم ہو جائیں تو ان کی پروا نہ کی جائے،
 سب سے بڑھ کر کوئی ان کی کم شدگی کی رپورٹ درج نہ
 کرائے۔ اس کے بعد کرشن آرام سے ان کی شخصیت اختیار کر
 لیتا تھا۔ ریٹائرڈ نے اپنے بیٹے کے بارے میں جو بتایا تھا اس
 سے وہ ایک نہایت چالاک اور موقع سے فائدہ اٹھانے والا
 متناک شخص لگتا تھا جو اپنے مفاد کے لیے کسی کو بھی قتل کر سکتا
 تھا۔ کرشن نفسیاتی مریض تھا مگر ساتھ ہی وہ اپنا دفاع کرنا بھی
 جانتا تھا۔ وہ ہر نل خوب سوچ سمجھ کر اور دیکھ بھال کر کرتا تھا۔ قتل
 کے بعد وہ لاش چھپا دیتا تھا، ساتھ ہی اس کی شناخت ختم کر دیتا
 تھا۔ یقیناً وہ شکار دیکھ بھال رننگ کرتا ہو گا جس کا روپ آسانی
 سے دھار سکے۔
 ایش کمرے میں آئی تو رچی اسے دیکھ کر چونکا تھا۔
 اس کی آنکھوں میں سنسنش چمکی تھی جس فوراً ہی ٹکڑے قبضہ کر
 لیا۔ ایش نے ڈرائنگ شیٹ اور فائل اس کے سامنے
 رکھی۔ "میں ایف بی آئی ایجنٹ ایش ہوں۔ تم مبینہ قاتل کا
 حلیہ بیان کر سکتے ہو؟"
 جین نے سر ہلایا۔ "میں نے تھی بار اس کا حلیہ بیان

کیا ہے کہ اب مجھے ارہر سو گیا ہے اور میں نکلیں۔
 اسے دیکھ سکتا ہوں۔" اس نے ڈرائنگ شیٹ ایش کی
 ہسٹری اور پوسٹ مارٹم رپورٹ کے ساتھ ساتھ ہی وہ ریٹائرڈ
 بھی رہا تھا۔ "کسی قدر لمبا چہرہ مگر بھر ہوا، ستار
 ناک، چھٹی آنکھیں لیکن منہ سے دور سے میں نے صبر
 سے نہ دیکھ ہو وروہ آنکھیں پیچے ہوئے ہو، بھر۔
 ہونٹ، قدر کسی قدر طویل اور جسم نہ تو دبلا اور نہ بھرا ہوا تھا۔
 کے بال سر سے کسی قدر اڑے ہوئے اور نہ ہی بال
 سفید تھے۔"
 ایش ٹوٹ کر اسی تھی کہ یہ حلیہ اس پر بھی پورا آتا ہے
 اس پر فرق تھا۔ اس کا چہرہ بھرا ہوا نہیں تھا۔ اور نہ
 تھا مگر اسے کمزور نہیں کہا جاسکتا تھا۔ وہ ڈرا ہوا نہیں تھا۔
 خوف تھا کہ پولیس اسے کی تلاش نہ سمجھ لے۔ اس نے
 منٹ میں کاغذ پر ایک اسکیچ تیار کر دیا تھا۔ یہ مبینہ قاتل کا
 تھا۔ ایش نے اسکیچ دیکھا اور بولی۔ "یہ قاتل سے کسی حد تک
 ملتا ہے؟"
 "میں یقین سے نہیں کہہ سکتا، بنیادی طور پر میں مصو
 ہوں اور خدو وخال سے زیادہ چہرے کے تاثرات کو اہمیت
 دیتا ہوں۔ ممکن ہے میں نے اس کے تاثرات کو اسکیچ کیا ہو۔
 ایش نے دیکھا اسکیچ کے تاثرات سخت تھے
 آنکھیں، ہونٹ اور ماتھے کی بناوٹ سے بے رحمی جھلک رہی
 تھی۔ اسے لگا جیسے یہ رچی کا خیال تھا، قاتل کی بجائے ایک
 تھا۔ رچی نے اس کی طرف دیکھا۔ "اب کیا کرو گے؟"
 مجھے روکیں گے یا جانے کی اجازت ہو گی؟"
 "اس کا فیصلہ ال درتھ کرنے کا وہی اس کیس
 انچارج ہے۔" ایش نے کہا اور کمرے سے باہر آ گئی جہاں
 ال درتھ اپنے ماتحتوں سے الجھ رہا تھا۔ جان اور رسٹ کا خیال
 تھا کہ اس شخص کو باقاعدہ گرفتار کر لیا جائے لیکن ال درتھ
 کے حق میں نہیں تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔
 "اس صورت میں ہمیں اسے عدالت میں پیش کرنا
 پڑے گا اور عدالت میں پیش کرنے کے لیے ہمارے پاس
 چھ نہیں ہے۔"
 "میرا بھی ایسا خیال ہے۔" ایش نے کہا تو جان گڑ
 ہو گیا۔
 "تم اپنا خیال اپنے پاس رکھو۔ تمہارا اس کیس
 کوئی حق نہیں ہے۔"
 ایش نے طرہ انداز میں کہا۔ "لگتا ہے تم ہی
 تحقیق کے قائل ہو۔ حیرت ہے کہ اب تک قاتل نہیں پکڑا

جان۔" ال درتھ نے سخت لہجے میں کہا۔ "ابھی
 پاس کچھ نہیں ہے اور اسے راکر کے ہم اس کی گمرانی
 کے لئے اگر یہ قاتل ہے تو غلطی ضرور کرے گا۔"
 "اس غلطی کو پڑے گا کون؟" ایش نے مصو
 میں تھا تو جان بتا کر وہاں سے چلا گیا۔ کچھ دیر میں ال
 رچی کیس کو طلب کیا اور اسے خبردار کرتے ہوئے
 جانے کی اجازت دیدی کہ وہ فی الحال نیو پارک کی حدود سے
 ہر گز نہیں پڑے گا۔ شام کے وقت ایش ہونٹ جانے کے لیے
 ال درتھ نے اسے لفٹ پیش کی۔ ایش کے پاس فی
 ال کا رزی نہیں تھی۔ اس نے ال درتھ سے کہا۔ "میرے
 بیٹ پر کار منگو ادو۔"
 "میں کہہ دوں گا کار کل صبح تک تمہارے ہونٹ
 سب سے زیادہ پارک کے نزدیک کا برائے ہونٹ پرانی طرز کا
 رہتا ہے۔" ایش نے کہا۔ "ایس کا کراؤ دوسرے فلوور پر تھا۔ ایش
 نے ال درتھ کو کافی کے لیے روک لیا۔ وہ م سروں کو کافی کا کہہ
 کر ہونٹ پر چڑھا۔ "تمہارا کیا خیال ہے رچی سب کچھ سچ
 ہے؟"
 ال درتھ نے سر ہلایا۔ "میں نے رسٹ سے کہا ہے وہ
 فرانسکو میں اس کے بارے میں چھان بین کرے۔
 "جین کل ریو آرٹ گیلری میں ہونے والی ناش میں
 اس کی تصاویر بھی شامل ہیں۔"
 "جینے میں موجود کیمروں سے مدد لی گئی ہے؟"
 یہ کام جان کر رہا ہے۔" ال درتھ نے جواب
 دیا۔ "یہ کراؤ کھڑا ہو گیا۔" میری کسی مدد کی ضرورت ہو تو
 مجھے دے دو۔"
 "میرا خیال ہے فی الحال میں نے سب حاصل کر لیا
 ہے۔ میں نے گتے کے ڈبے کی طرف دیکھا جس میں وہ
 ایک نامور ریٹائرڈ لے کر آئی تھی۔ ال درتھ کے جانے
 کے بعد اس نے شام لیا اور ڈنر طلب کیا، کھانے کے بعد وہ
 رچی کی دیکھ دیکھنے لگی۔ ہر کیس کی الگ فائل تھی۔ ان میں
 سے کچھ بھی نہیں اور انہیں دیکھنا مام آدمی کے لیے بھی آسان
 نہیں تھا۔ اس کے لیے یہ معمول کی بات تھی۔ اس نے تمام
 تصاویر میں درپے بیڈ کے اوپر بنے کھڑی کے چھپر
 سے منظر سے گزرا دیں۔ جب وہ کھینچی تو یہ تصویریں اس
 کے سامنے آئیں۔ وہ چنے لگی کہ انسانوں کے ساتھ یہ سلوک
 اس کی عظمت کا آدمی تھا۔ اس نے بنا کسی غصے کے
 منظر سے منظر کا رخ کر لیا۔ لوگوں کو موت کے گھاٹ

دیا جواسے جانتے بھی نہیں تھے۔ مسز ریف کے دعوے کے
 بعد صورت حال بدل گئی تھی اس نے فیصلہ کیا کہ وہ کل صبح سب
 سے پہلے مسز ریف سے ملے گی اور اس سے کرشن ریف کے
 بارے میں معلومات حاصل کرے گی۔
 صبح وہ ناشا کر کے نیچے آئی تو ایک نئے ماڈل کی کار
 باہر کھڑی تھی اس کی چابیاں ہونٹ استقبال پر دیدی گئی
 تھیں۔ وہ پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچی۔ ال درتھ اور اس کے آدمی
 ڈیوٹی پر آ گئے تھے۔ کیونکہ انہیں دور جانا تھا اس لیے وہ روانہ
 ہو گئے۔ ال درتھ نے کہا کہ وہ راستے میں اسے بتائے
 گا۔ جان اور رسٹ دوسری کار میں تھے۔ ال درتھ نے اسے
 پوسٹ مارٹم کی رپورٹ دی، اس کے مطابق پارک کے مقتول
 کی موت دماغ پر ضرب لگنے سے واقع ہوئی تھی۔ اگرچہ اس
 کے فنگر پرنٹس اور ڈنٹیل اسٹرکچر ضائع ہو گئے تھے لیکن ڈی
 این اے سے تصدیق ہو گئی کہ وہ اسٹیوڈنٹس ہی ہے۔ پارک
 میں نصب کیمروں سے کوئی مدد نہیں ملی سوائے ایک مشکوک
 شخص کے جو اوپر پہنچے ہوئے تھا۔ مگر اس کی جھلک ایک
 کمرے میں صرف ایک لمبے کے لیے دکھائی دی تھی۔
 وہ شخص اس سے پہلے کیمروں میں نہیں آیا تھا جو پاتھ
 دے پر سرگز تھے اس کا مطلب تھا کہ وہ شخص کیمروں سے بچ
 کر پارک میں آیا اور گیا تھا اس اتفاق سے ایک کمرے کی
 درمیان آ گیا مگر سوائے ایک اوپر کے اور کچھ نظر نہیں آیا تھا
 ڈھیلے اوپر کی وجہ سے آدمی کی جسامت کا بھی پتا نہیں چل رہا
 تھا۔ ایش تصویریں دیکھ رہی تھی۔ وقت صبح دس بج کر سات
 منٹ کا تھا جب کہ رچی نے پولیس کو دس بج کر دو منٹ پر کال
 کی تھی۔ یعنی اوپر پوش مشکوک شخص اس وقت پارک سے باہر جا
 رہا تھا۔ سان فرانسکو سے رپورٹ آ گئی تھی۔ وہاں رچی
 نیلسن کا کوئی کرسٹل ریکارڈ نہیں تھا اور نہ ہی کبھی پولیس یا کسی
 تحقیقاتی ادارے نے اسے کسی کیس میں ملوث پایا تھا۔ حد یہ
 کہ اس کا ٹریفک خد ف ورزی پر چھان بھی نہیں ہوا تھا۔
 "یہ تو بہت صاف ستھرا آدمی ہے۔" ایش نے کہا۔
 "وہ یقیناً محتاط زندگی گزارتا ہے۔" ال درتھ نے کہا۔
 "لیکن سیریل کٹر بھی محتاط زندگی گزارتا ہے بھی وہ آج تک
 پولیس کے قابو میں نہیں آیا۔"
 مسز ریف کا گھر ریف ہاؤس نیو جرسی کے ایک خوب
 صورت نواحی علاقے میں ایک بلند ہوتی پہاڑی کے اامن
 میں تھا۔ یہ پہاڑی بھی ریف ہاؤس کا حصہ تھی۔ لکڑی، پتھر
 اور شیٹلے سے بنا ریف ہاؤس قدیم اور جدید جرمین عمارتوں کا
 نمونہ تھا۔ ریف خاندان ایک صدی پہلے جرمنی سے آکر یہاں

آباد ہوا تھا۔ وہ پورچ میں رکے اور ال ورچھ نے ایلیس کی طرف دیکھا۔ "میرا خیال ہے تم اندر جا کر مسز ریف سے بات کرو۔ اس دن بھی وہ تم سے مل کر بات کر رہی تھی۔" جان نے یہ سن کر برا سامانہ بنایا کہ صرف ایلیس اندر جائے گی۔ نہ جانے اسے ایلیس سے کیا خاتمی۔ "تو ہم بلا وجہ یہاں آئے ہیں؟"

"ہمیں محتاط رہنا ہو گا۔" ال ورچھ نے سرو لہجہ میں کہا۔ "تم بھول رہے ہو یہ ایک مینڈیئرل کلر کا گھر بھی ہے۔" ایلیس کا رے سے اتری، مرکزی دروازے کے ساتھ ایک چھوٹی سی گھنٹی لگی تھی۔ ایلیس نے گھنٹی بجائی تو ایک خادمہ نے دروازہ کھولا۔ اس نے مخصوص ایپرن باندھ رکھا تھا۔ مسز ریف لاؤنج میں اس کی منتظر تھی۔ اس نے گرم جوش سے ایلیس سے ہاتھ ملایا۔ "تم یقیناً کرشن کے بارے میں پوچھنے آئی ہو؟"

"یہ ضروری ہے۔ اگر ان وارداتوں کے پیچھے وہی ہے تو اسے گرفتار کرنے کے لیے ہمیں آپ کی مدد کی اشد ضرورت ہوگی۔"

"میں تمہاری اس سے زیادہ مدد نہیں کر سکتی کہ تمہیں اس کے بارے میں بتاؤں۔"

"اس کی کوئی تصویر؟" ایلیس نے پوچھا۔ "میرا مطلب ہے جب وہ یہاں سے گیا تھا؟"

مسز ریف نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ اس وقت نہیں برس کا تھا لیکن وہ جاتے ہوئے اپنی تمام تصاویر ساتھ لے گیا تھا۔ میرے پاس رہنے والی تصاویر بارہ سال تک کی ہیں۔" مسز ریف اپنا خامدانی الیم لے آئی۔ ایلیس نے دیکھا کہ کرشن خوب صورت نقوش اور شہری بالوں والا لڑکا تھا، اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ اس کے تاثرات سے شوقی عیاں تھیں۔ جب کہ اس کا بڑا بھائی ایلیسن کسی قدر کھردرے نقوش والا سنجیدہ لڑکا تھا۔ وہ کرشن سے دو برس بڑا تھا۔ ایلیس نے ایلیسن کے بارے میں پوچھا تو مسز ریف کے چہرے پر غم چھا گیا تھا۔ "وہ سترہ برس کا تھا کہ ہینٹنگ کے دوران کسی دوسرے شکاری کی گولی کا نشانہ بن گیا۔"

ایلیس چونکی۔ "یہ حادثہ... کہاں پیش آیا تھا؟"

"میں نے جرسی میں... ایللی پائن ہینٹنگ ریزروٹ میں۔"

ایلیس نے نظریں جھکا کر مسز ریف کو دیکھا۔ "کیا کرشن بھی اس کے ساتھ تھا؟"

مسز ریف نے سر ہلایا۔ "مجھے اس وقت شبہ نہیں ہوا تھا کیونکہ کرشن ہتھیار چلانا نہیں جانتا تھا۔ مگر بعد میں، میں نے

خود اسے نشانے بازی کی مشق کرتے دیکھا۔"

"نہیں بھائیوں میں حقدار کیسے تھے۔"

مسز ریف نے گہری سانس لی۔ "سچ کہوں تو تھے۔ ایلیسن ذمے دار اور سب کا خیر رکھتے تھے جب کہ کرشن بے پردا اور صرف اپنی ذات پر رہنے والا تھا اسے ہمیشہ یہ شکایت رہی کہ میں مقابلے میں ایلیسن کو ترجیح دیتی ہوں۔"

مسز ریف، سر رکھنے لگی تو ایلیس ایک طرف بے عریض شیف پر رکھی ریف خاندان کی تصاویر دیکھنے میں لگی تصاویر میں کرشن موجود تھا۔ ایک تصویر میں ایلیس تھے۔ ایلیس اسے اٹھا کر دیکھ رہی تھی کہ سے کیر آہٹ سنائی دی۔ اسی اثنا میں مسز ریف والپس تھی۔ اسے دیکھ کر ایلیس نے تصویر واپس رکھ دی۔ مسز اس کے پاس چلی آئی تھی۔ وہ اسے تصاویر کے بارے میں بتانے لگی۔ ایلیس نے کرشن کے بارے میں پوچھا۔

"بہت خطرناک اور انتقامی مزاج رکھنے والا اسے کسی سے کوئی عناد ہو جاتا تو وہ بھی اسے معاف نہیں تھا۔ اس کے اسکول کا ساتھی جس سے اس کا کسی لڑکی پر ہو تھا جب بالک جاوے گا شکار ہو جائے گا۔ ایلیس بوش تھو حدیث ترتیب دیا گیا تھا لیکن وہ کسی کے خلاف شکی۔ جب وہ ناچ میں تھا تب بھی کسی مرت کا یہ پیش آ رہا تھا کہ وہ لڑکا اس سے بہتر گھار بھاتا تھا ہے کاچ بینڈ میں منتخب ہو گیا، ایک دن دبیرسل کے ہاتھ اس کے سر میں کرٹ آ گیا۔ جب تک کرٹ نہ ہوتا تھا تو مر چکا تھا۔ اس وقت کے بعد میں نے چینی، اس کے کھل کر بات کی اور اس سے پوچھا کہ سارے رشتہ کی ذات سے کیوں منسوب ہوتے ہیں۔ میں نے ایلیسن کا قاتل بھی قرار دیا تھا۔ اس کے چند دن بعد سے غائب ہو گیا اور میں نے برسوں حد سے نیویارک کی بندرگاہ پر دیکھا۔"

ایلیس نوٹ نہیں کر رہی تھی کیونکہ وہ ریپارڈ تھی۔ ساتھ ہی تمام باتیں اس کے ذہن میں محفوظ تھیں۔ جب اس نے محسوس کیا کہ مسز ریف کے پاس بتانے کو کچھ باقی نہیں رہا ہے تو وہ اٹھ گئی۔ اس نے مسز سے کہا کہ وہ اپنی حفاظت پر توجہ دے اور گراسے میں کوئی خد فب معمول بات محسوس ہو تو فوری پوچھ کرے۔ وہ خوف زدہ ہو گئی۔ "تمہارا مطلب ہے

یہاں آ سکتا ہے؟"

ایلیس نے سر ہلایا۔ آپ کیوں صوں رہی ہیں یہ گھر دن آپ کا ہے اتنا ہی کرشن کا بھی ہے۔"

"میں نہیں رکھوں گی۔"

ایلیس جاتے جاتے بیٹی اور اس نے اپنے بیک سے رچی نیلسن کی بنائی تصویر نکال کر مسز ریف کو دکھائی۔ "کیا آپ کو اس میں کرشن کی شباهت محسوس ہوتی ہے؟"

اس نے غور سے دیکھا۔ "ہونٹ اور ناک ویسی ہی ہے لیکن آنکھوں کی بناوٹ میں کچھ فرق ہے البتہ آنکھوں کا تاثر کرشن جیسا ہی ہے۔ بالوں کا اسٹائل بھی ویسا ہی ہے لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتی۔"

ایلیس اس کا شکر یہ ادا کر رہا تھا کہ ال ورچھ اور اس کے آدمی انتظار کر رہے تھے۔ راستے میں ایلیس نے اپنی اور مسز ریف کی گفتگو کی ریکارڈنگ اسے سنائی۔ یہ گفتگو اس نے اپنے آئی فون میں ریکارڈ کر لی تھی۔ ال ورچھ نے ریکارڈنگ سن کر کہا۔ "کی مسز ریف کو بیٹے سے خطرہ ہو سکتا ہے؟"

"میرا خیال ہے اب تک تو نہیں تھا کیونکہ اگر کرشن اس کے خد فب دل میں کوئی بات رکھتا تو میں اس کا عرصہ کارروائی کے لیے بہت ہوتا ہے۔ اسے اصل خطرہ نیویارک میں دیکھے جانے سے حد ہو ہے۔ کرشن نے محسوس کیا کہ وہ اس کی وجہ سے پکڑا جا سکتا ہے تو وہ اس کے خلاف کچھ کر بھی سکتا ہے۔"

"اس صورت میں مجھے مقامی پولیس کو ہوشیار کر دینا چاہیے۔"

ایلیس نے تائید کی۔ "ضرور اور مجھے راستے میں ریپو آرٹ میری پر تیار دینا۔"

ال ورچھ نے اسے آرٹ گیلری پر اتار دیا۔ "کیا تم نیویارک آؤ گی؟"

"ہاں، وہاں میری کار موجود ہے۔"

"میں کسی کو بھیج دوں گا۔"

"نہیں میں نیسی سے آ جاؤں گی۔"

آرٹ گیلری خاصی بڑی تھی اور اس کے تیرے ہال میں مقامی اور درمیانی درجے کے معصوموں کے فن پاروں کی نمائش جاری تھی۔ رچی ایلیس کو وہیں ملا۔ وہ گیلری سے میجر سے بات کر رہا تھا۔ ایلیس اس کے پاس نہیں گئی۔ اس نے اپنا ایف بی آئی کا کارڈ بھی پرس، میں ڈال لیا تھا۔ یہی اسے اچکے یا تھا۔ نتیجے سے بات کر کے وہ خود اس کے پاس آیا۔ "میرا خیال ہے تمہیں آرٹ سے دلچسپی نہیں ہے۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

رچی نے سنا نے اچکائے۔ "میرا اندازہ ہے۔"

ایلیس نے غور سے اسے دیکھا۔ "شاید تم دوسروں کے بارے میں اندازے بہت لگاتے ہو۔ بہرحال تمہارا یہ اندازہ غلط ہے۔ میں اسکول کے زمانے میں بہت اچھی ڈرائنگ کرتی تھی اور میری اسٹج ایک خاصی موٹی ہو گئی تھی۔"

"پھر تم ایف بی آئی میں آ گئیں۔" رچی مسکراتے لگا۔ "ابھنی اور آرٹ ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے ہیں۔" بولتے بولتے اچانک وہ سنجیدہ ہو گیا۔ "سنو، اس نے مجھ سے رابطہ کیا ہے۔"

ایلیس نے اپنے تاثرات نازل رکھے تھے۔ رچی بھی یوں بات کر رہا تھا جیسے کوئی معمول کی گفتگو ہو۔ "کب... کیسے؟"

"آج صبح... مجھے گیلری کی ریسپشن پر ایک لفافہ ملا۔ لفافہ ذرات کو آیا تھا اور کلرک کو دینے والا یاد نہیں ہے۔"

"لفافے میں کیا تھا؟"

رچی اس کے قریب ہوا اور اس نے کوٹ کی جیب سے ایک چھوٹا سا رتھ نکال کر ایلیس کو یوں دیا کہ کوئی نہ دیکھ سکے۔ رتھ پر تحریر تھا۔ "تم میری نظروں میں ہو۔ آج رات مجھ سے میکانا بار کلب میں ملو۔"

"میکانا بار کلب کہاں ہے؟"

"اسی سڑک پر دو بلاک آگے ہے۔" رچی کسی قدر پریشان نظر آنے لگا۔ "اس کا مطلب ہے اس نے مجھے تلاش کر لیا ہے اور وہ اب میری ناک میں ہے۔"

"تم فکر مت کرو پولیس والے تمہاری حفاظت کر رہے ہیں۔"

"حفاظت کر رہے ہیں یا مجھ پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔" رچی کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "میرا نہیں خیال کہ یہ مجھے قاتل سے بچا سکیں گے جب کہ یہ خود مجھے قاتل سمجھ رہے ہیں۔"

"اگر یہ تمہیں قاتل بھی سمجھ رہے ہیں تب بھی تم پر پوری نظر رکھے ہوئے ہیں۔" ایلیس نے اسے تسلی دی۔

"اب مجھے بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ جب سے یہ رتھ ملا ہے میں بہت پریشان ہوں۔"

"تم جاؤ گے اور فکر مت کرو، تمہاری پوری حفاظت کی جائے گی۔" ایلیس نے کہا۔ "ابھی تم میرے ساتھ پولیس ہیڈ کوارٹر چلو گے۔"

"ابھی مجھے کچھ دیر یہاں رکنا ہے۔" رچی بولائے "کل نمائش کا آخری دن ہے میری ایک درجن تصاویر فروخت ہوئی ہیں۔ ان میں چار نقول اور آٹھ میری اپنی تصاویر ہیں۔ مجموعی فروخت بارہ ہزار سات سو تیس ڈالرز کی ہے۔"

”اس کا مطلب ہے تم اچھے مصور ہو۔“
 ”شاید۔“ اس نے شانے اچکائے۔ ”تم کچھ دیو گی؟“
 یہاں سروں سے۔“
 ایس نے سر ہلاتا تو رچی اس کے لیے کافی لے آیا۔
 ”نمائش کے بعد کیا ارادہ ہے؟“
 ”گہیری کی جانب سے مجھے کچھ کام ملا ہے لیکن وہ میں
 ساں فرانسسکو جا کر کروں گا مگر مجھے پانے کی اجازت ملی تو۔“
 ”تمہارے خلاف کوئی چارج نہیں ہے اور اسٹیو
 ڈیش مرڈر میں بھی تم کلیئر ہو اس لیے میرا خیال کہ تمہیں
 روکا جائے گا۔“

”یہ تو تم کہہ رہی ہو، ممکن ہے پولیس کا خیال مختلف ہو۔“
 وہ دو پہر تک فارغ ہوا تھا۔ ایس نے محسوس کیا کہ وہ
 خاصا سہا ہوا تھا اور اسے خطرہ تھا کہ شاید قاتل یہاں موجود
 ہے۔ ایس بہ خیر تصاویر دیکھ رہی تھی لیکن اصل میں وہ وہاں
 موجود افراد کا جائزہ لے رہی تھی، خاص طور سے ان لوگوں کا
 جو اکیلے تھے اور دوسروں سے دور تھے۔ ایک گول چہرے،
 سنہری بالوں اور گول بینک والے سی نے ایس کی توجہ
 حاصل کی تھی وہ خاص طور سے رچی کی بنائی تصاویر کے آس
 پاس گھوم رہا تھا۔ ایس نے اسے نوٹ کیا۔ مگر کچھ دیر بعد وہ
 غائب ہو گیا تھا۔ ایس نے غیر محسوس انداز میں اپنے آئی فون
 سے اس کی تصویر لی تھی۔ مگر تصویر صاف نہیں آئی تھی۔ کچھ
 دیر بعد وہ رچی سے ملی تو اسے تصویر دکھائی۔
 ”اس شخص کو جانتے ہو؟“

رچی نے غور سے دیکھا اور بولا۔ ”یقین سے نہیں کہہ
 سکتا لیکن اس شخص کی سی شبہات آ رہی ہے جسے میں نے
 پارک میں اسٹیو کو قتل کرتے دیکھا تھا۔“

رچی دو پہر تک فارغ ہوا تھا۔ پہلے انہوں نے نزدیکی
 ریستوران میں بیٹھ گیا۔ اس دوران میں رچی اسے اپنے
 بارے میں بتاتا رہا۔ اس کا تعلق سان فرانسسکو سے تھا، اس
 کا باب ویت نام وار میں مارا گیا تھا۔ چند سال پہلے اس کی
 ماں بھی کینسر سے انتقال کر گئی تھی۔ کوئی رشتے دار نہیں تھا اور نہ
 ہی کوئی گرن فرینڈ تھی۔ اس نے ہائی اسکول کے بعد آرٹ
 کالج میں داخلہ لیا لیکن وساکل نہ ہونے کی وجہ سے کالج
 چھوڑنا پڑا تھا۔ پھر وہ زندگی کے لیے جدوجہد کرتا رہا اور اس
 نے بڑی مشقت سے یہ مقام حاصل کیا تھا۔ وہ دیس ہیڈ کوارٹر
 پہنچنے والے درتھن کا منتظر تھا۔ ایس پہلے ہی سو بائل پر اسے
 صورت حال سے آگاہ کر چکی تھی اور ان درتھن نے پلان بنالیا
 تھا۔ اس نے رچی سے کہا۔ ”میرے آدمی تمہارے لباس

میں ایک ماسک چھپا دیں گے۔ اس کی مدد سے ہم تمہاری بات
 سن سکیں گے۔“

”ات۔“ رچی نے کسی قدر طنزیہ انداز میں کہا۔ ”میرا
 نہیں خیال کہ وہ مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے، وہ میرا کام تمام کرنا
 چاہتا ہے کیونکہ میں اس کے خلاف بھی ہوں۔“

”وہ بھرے بار میں کوئی ایسی حرکت کرنے سے گریز
 کرے گا۔ پھر میرے آدمی سادہ لباس میں آئیں گے۔“

رچی بادل نا خواستہ تیار ہوا تھا۔ ایس اسے سمجھا رہی
 تھی کہ کس صورت حال میں اسے کہا کرنا ہے۔ اپنی حفاظت
 کیسے کرنی ہے اور خطرے کا سامنا ہونے پر اپنی کیسے جان
 بچانی ہے۔ جان طنزیہ انداز میں بولا۔ ”یہ بچہ نہیں ہے جسے تم
 سمجھا رہی ہو۔“

ایس رچی کو پولیس کے پاس چھوڑ کر واپس ہوئی آئی
 تھی۔ وہ شام کے وقت گلی۔ پولیس رچی کو لے کر میگنا بار کلب
 پہنچ گئی تھی۔ براڈ وے، ٹریٹ پر یہ راولد پری درجے کا بار
 کلب تھا۔ بگلی گلی میں اس درتھ اور اس کے آدمی رچی کو تیار کر
 رہے تھے۔ اس کی قمیص میں حاتورا، ماسک چھپا دیا تھا اور ال
 درتھ اسے سمجھا رہا تھا کہ خطرہ محسوس کرتے ہی وہ انہیں آواز
 دے۔ رچی نے سر ہلایا۔ ”اگر مجھے اس کا موقع ملا تو۔“

”میں بھی اندر جاؤں گی۔“ ایس نے کہا۔
 ”یہ ٹھیک نہیں۔۔۔“

”ٹھیک ہو گا۔“ ایس نے اس درتھ کی بات کاٹ کر
 کہا۔ ”مجھ پر کوئی شک نہیں کرے گا۔“

مجبوراً ال درتھ نے سر ہلایا۔ ایس نے اپنا کوٹ اتار
 دیا اور پستول بیگ میں رکھا، اس نے اپنے بال کھول لیے اور
 ٹریٹ کے اوپری ٹیٹن بھی کھول دیے۔ رچی مسکرایا، اس نے
 آہستہ سے کہا۔ ”اب تم مزید اچھی لگ رہی ہو۔ میرا خیال ہے
 اب مجھ میں تم سے زیادہ خوب صورت عورت اور نہیں ہوگی۔“

وہ اندر آئے، ایس ایک کونے کی طرف چلی گئی جہاں
 سے وہ رچی پر نظر رکھ سکتی تھی۔ رچی کاؤنٹر پر نمایاں جگہ
 آ گیا۔ اس نے اپنے لیے سو ڈالمانگا۔ اس کی بے چین نگاہیں
 چاروں طرف تھیں۔ وہ پُر ہجوم بار میں کسی جانے پہچانے
 چہرے کو تلاش کر رہا تھا مگر، بھی تک کوئی نظر نہیں آیا۔ ایس
 بھی نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ رچی کی بیڑ کی بوتل آگئی تھی۔
 وہ اسے پیتے ہوئے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ ایک بار اس نے
 بوتل اٹھائی چاہی تو اس کے نیچے دبے چھوٹے سے کاغذ نے
 اسے چونکا دیا۔ اس پر ”ٹو اگسٹ“ لکھا ہو تھا۔ اس نے جلدی
 سے اس کا پتہ لے لیا۔ ”ٹو اگسٹ“ لکھا ہو تھا۔ اس نے جلدی
 سے اس کا پتہ لے لیا۔ ”ٹو اگسٹ“ لکھا ہو تھا۔ اس نے جلدی

شک نہ کر سکا کہ وہی کاغذ رکھ کر گیا ہوگا۔ ایس بھی غائب تھی۔
مجبوراً وہ کاغذ لے کر پتھر کے درم کی طرف بڑھا۔ پار میں جتنا
ہجوم تھا پتھر روم والا حصہ اتنا ہی سناں تھا۔ وہ اندر آیا یہاں
صرف ایک ادیز عمر شرابی تھا جو ہاتھ دھو رہا تھا اور وہ بھی چلا
گیا۔ رچی نے لیٹرین کے کینوں کی طرف دیکھا۔ وہ آہستہ
سے پہلے کین کی طرف آیا اور اس کا دروازہ کھینچا۔ اس میں
کوئی نہیں تھا اسی لمحے کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ وہ
بڑی طرح چونکا لیٹیں یہ میں تھی۔ اس نے پستول یا ہوا تو۔
”تم نے مانگ کیوں آف کیا ہوا ہے؟“

”میں نے۔“ وہ حیران رہ گیا۔ ”نہیں تو میں نے
اسے چھوا بھی نہیں ہے۔“

”جب شاید اس میں کوئی خرابی آئی ہوگی۔“ ایس نے
کہا۔ ”میں نے دیکھا کہ تم اچانک غائب ہو گئے ہو۔ ال
ور تھ نے بتایا کہ تم باہر نہیں نکلے ہو، مجھے داش روم کا خیال
آیا تم یہاں کیا کرتے آئے تھے؟“

جواب میں رچی نے اسے کاغذ تھما دیا۔ کاغذ دیکھتے
لہجی ایس نے واکی ہاکی پر کہا۔ ”وہ یہاں موجود تھا۔“
”یعنی اب نہیں ہے۔“ رچی نے بے چینی سے
پوچھا۔

”ظاہری بات ہے۔ وہ دیکھ رہا ہوں گا کہ تمہارے
پچھے کون ہے اور مجھے دیکھ کر وہ یہاں سے جا چکا ہوگا۔ ہم سے
حفاظت ہوئی ہے۔“

وہ باہر آئے تو درجن غیبی میں تھا اس نے اپنی قمیض تلے
موجود مانگ اور اس کی تاریخ کھینچ کر نکالی اور مارنے کے انداز
میں جان کو تھما۔ زہر لیے لہجے میں بولا۔ ”یہ تم لوگوں کا پس
ہے اس سے جو تمہو، اب مجھے مزید قریانی کا بکرا مت بناؤ۔“
”ہم تمہاری حفاظت کے لیے موجود تھے۔“ ال ور تھ
نے نرمی سے کہا۔ ”اگر ہم نہ ہوتے تو وہ یقیناً تمہاری خاموشی سے
واپس نہ جاتا۔“

رچی کی پریشانی کم نہیں ہوئی تھی۔ ”تم لوگوں کے
ساتھ دیکھ کر اسے یقین ہو گیا ہوگا کہ میں اس کے لیے خطرہ
ہوں اب وہ مجھے نہیں چھوڑے گا۔ وہ اندر میرے کاتیر ہے اور
ہم میں سے کوئی اس کے بارے میں نہیں جانتا ہے۔“
”پولیس تمہاری حفاظت کرے گی۔“ ایس نے اسے
تسلی دی۔

”ساری عمر۔“ دہلی سے بولا۔
ال ور تھ نے اسی وقت دو پولیس مین بلوائے تھے۔
”رچی نیلسن کی رہائش براڈوے اسٹریٹ کے ساتھ ہی پرانے

معدے میں ایک ایسویں صدی کے عمارت میں تھی۔ اس درجن
سٹائل کی عمارت میں پتھر، لکڑی اور سیمنٹ کے
بھی روزانوں کی طرح مضبوط تھیں۔ دو منزروں پر دو بڑے
ہال نہ کمرے تھے۔ دو در کمرے رچ کے زیر استعمال
تھے۔ اوپری کمرے میں مصوری کا سامان بھی تھا۔ ایزل
گئے تھے اور ان پر مختلف ادھوری تصاویر تھیں۔ ال ور تھ اور
اس کے ساتھی پولیس اہلکار عمارت کی سکیورٹی کا جائزہ لے
رہے تھے۔ ایس رچی کے ساتھ اوپر آئی۔ اس نے
تصویروں کا جائزہ لیا۔ ”تم بیک وقت کئی تصویروں پر
گرتے ہو؟“

”ہاں، یہ میری عادت ہے میں بیک وقت کئی
تصویروں پر کام شروع کرتا رہتا ہوں۔ پھر موڈ کے حساب
سے انہیں مکمل کرتا رہتا ہوں۔“
”کل نمائش کا آخری دن ہے؟“

رچی نے سر ہلایا۔ ”اوہ، جلد میری نمائش ہے۔“
ال ور تھ مطمئن ہو کر اپنے دوستی وہاں چھوڑ
خصت ہو گیا۔ ایس اس سے رات بھر ہی لگی تھی۔ اس نے
دہلی سے کہا۔ ”تم لوگوں کی کوئی مشکوک شخص نظر نہیں آیا۔“
”نہیں، صاف نیک ہم قرض دروڑے پر بھی نظر رہے
ہو۔“

”جب وہ وہاں موجود تھا اور جب ہم روانہ ہوئے تب
بھی وہیں تھا۔“ ایس نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”وہ بہت شرم
ساز ہے، ہمیں مسلسل غچے رہا ہے۔“
”کوئی مجرم مسلسل قانون کو غچے نہیں لے سکتا۔“
پکڑا جاتا ہے یا پھر قانون کی حد سے دور بھاگ جاتا ہے۔“
”مجھے بھی شک رہا ہے وہ بھاگ جائے گا۔“ ایس نے اپنی
کار کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ”اس کا ہاتھ آنا مشکل ہے۔ اس
رچی کے خلاف کچھ کرنے کے لیے جلدی نہیں ہے۔“

”بیرہی۔“ ال ور تھ اس کی کار پر جھکتے ہوئے بولا۔ ”میں
نک رہا ہے یہ تمہاری طرف کچھ زیادہ ہی متوجہ ہے۔“
ایس نے جلدی سے چہرہ پھیر دیا۔ ”ایسی کوئی بات
نہیں ہے۔“

ال ور تھ کی بات نے اسے نروس کر دیا تھا اس لیے وہ
جلدی سے وہاں سے روانہ ہو گئی۔ وہ خود بھی محسوس کر رہی تھی
کہ رچی اس میں انچوں لے رہا ہے۔ ایس کو دیکھ کر اس کی
”کھوں میں مخصوص چمک آ جاتی تھی۔ اس رات جب
یونے کے لیے مٹی تو اس کی نظر چھت پر بھی تصاویر پر پڑی
تھی۔ وہ اب چھین ہو گئی مگر قافل کامیاب رہا تو اس تصاویر

میں رچی کی تصویر کا بھی اضافہ ہو جائے گا۔ وہ قافل کے
بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتے تھے کہ وہ شاید
کمرن ہے۔ اس رات اسے بہت دیر سے نیند آئی تھی۔ صبح
سے ال ور تھ کی کال نے اسے بیدار کیا وہ پر جوش لہجے
میں بولا۔ ”جلدی سے تیار ہو جاؤ میں اپنے آپ کو ہاؤس۔“
”کیا ہوا ہے؟“

”تم نے جس آدمی کی تصویر لی تھی۔ پاپس نے اس کی
دست میں پاس کے علاقے میں چھان بین کی تو وہ شخص
بیک عمارت میں مقیم تھا۔ منجھ نے تصویر دیکھ کر شاکت کر لیا
ہے۔ تم چھاپہ مار۔ جہاں ہے میں۔“

ایس غلات میں تیار ہوئی۔ ابھی وہ ہائی بی رہی تھی کہ
ال ور تھ آ گیا۔ اس نے ایس کا ہاتھ تھما۔ ”وقت نہیں ہے
بدل کر۔ پولیس نے عمارت کو گھیر لیا ہے۔“

کمرت براڈوے سے کچھ ہی فاصلے پر بندرگاہ کے
زیر زمین تھی۔ اندر باہر پولیس والے موجود تھے۔ ایس، ال
ور تھ جان و رست اندر آئے۔ عمارت کا منیجر پریشاں تھا
اس نے اس ور تھ سے کہا۔ ”اس نے دو ہفتے پہلے یہ فیٹ
سے پڑا تھا۔“
”وہ اندر ہے؟“

”میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔“ منیجر چابیوں لے کر اس
نے ہاتھ اوپر کیا۔ اس نے خاموشی سے تال ہٹا کر جیسے ہی
تال کھولا رست اسے بازو سے پکڑ کر سیڑھیوں کی طرف سے
آگیا۔ ال ور تھ نے جان کی طرف دیکھا اور دونوں بیک وقت
براڈوے سے لے ہوئے اندر آئے۔ پہلا کمر خالی تھا۔ یہ لاؤنج
تھا۔ ایس بھی پیچھے آئی۔ جان نے بیڈ روم کا دروازہ کھول کر
اندر جھانکا اور اشارے سے بتایا کہ وہاں کوئی نہیں تھا۔ ایس
تھ روم میں جھانکا۔ ایک منٹ کے اندر انہوں نے پورا
پارٹمنٹ میچ لیا تھا۔ جان نے صوفے کو تھری اور باہر
چلا گیا۔ ایس بیڈ روم کا معائنہ کر رہی تھی۔ وہاں جا بجا سند
چھان کے نیچے پڑے تھے۔ دروازے سے بدبو ٹھہری
تھی۔ پارٹمنٹ کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ کئی دن سے یہاں
بیس آیا تھا۔ یہ جگہ فرسٹ تھی اور کوئی ایسی چیز نہیں تھی جسے قافل
سے منسوب کیا جاتا، وہ اپنا سامان لے گیا تھا۔ ایس
”اس سے دانہ ہوتے ہوئے جتنی پر جوش تھی اب اتنی ہی
”اس کا منہ دس رہی تھی۔ اس نے ال ور تھ سے کہا۔
”اس ایک آخری چانس ہے۔ وہ آج تصویروں کی
نمائش کرے گا۔“

”میں یقین سے ہے۔“

”نوتے فیصد۔۔۔ ہم سے وہیں گھر گئے
میں۔ ایس نے کہا۔ ”یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا تو پھر
شاید وہ کبھی ہاتھ نہ آئے۔“
”تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ وہ وہاں آئے گا۔“

”ایک تو وہ رچی کے پیچھے ہے۔“ ایس نے کہا اور ال
ایک کاغذ ال ور تھ کے سامنے کر دیا۔ اس پر رچی کا اسٹیج بنا ہوا
تھا۔ ”اسے بھی مصوری سے دلچسپی ہے اس لیے وہ ضرور وہاں
آئے گا۔ یہ مجھے صوفے کے نیچے پڑا ہوا ملا ہے شاید وہ بے
دھیانی میں نہیں چھوڑ گیا تھا۔“

نمائش شام تین سے رات بارہ بجے تک تھی۔ جب
ایس آرٹ گیلری پہنچی تو اس کے سامنے شائقین کا ایک بہت
بڑا ہجوم پہلے ہی موجود تھا۔ ال ور تھ کے ساتھ سادہ لباس میں
ایک درجن پولیس مین تھے۔ ایس اور ال ور تھ اندر آئے
جہاں رچی گیلری منیجر اور سکیورٹی آفیسر کے ساتھ موجود تھا۔
منیجر پولیس کی اس طرح موجودی سے مطمئن نہیں تھا۔
اپنی نمائش اور گیلری کی سادگی کی فکر تھی۔ ال ور تھ نے اس
سے کہا۔ ”تم فکر مت کرو یہ ایک بہت اہم سیریل کر کا معاملہ
ہے وہ پکڑا گیا تو تمہیں فائدہ ہی ہوگا۔“

”مالکان یہ سب کہاں دیکھتے ہیں۔“ منیجر نے تلخی سے
کہا۔ ”یہاں نمائش کے دوران کچھ بھی معمول سے ہٹ کر ہوا
تو ذمے دار میں قرار پاؤں گا۔“

کچھ دیر میں نمائش شروع ہوئی۔ لوگ قطار بنا کر اندر
رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے نمائش کے لیے مخصوص تمام ہال بھر
گئے تھے۔ ایس نے شانے پر موجود ریڈیو میں آہستہ سے ال
ور تھ سے کہا۔ ”یہاں تو بہت زیادہ ہجوم ہے۔“

”تم فکر نہ کرو میرے آدمی ہر طرف موجود ہیں۔“
ایس ہال نمبر چار اور پانچ کے سنگم پر آگئی یہاں سے
وہ کئی طرف دیکھ سکتی تھی۔ رچی اپنی ایک تصویر کے پاس
موجود چند شائقین سے بات کر رہا تھا۔ اچانک ایس کی نظر
اس طرف پڑنے والے ایک گروہ پر پڑی۔ اس نے دیکھا
ایک کی قدر طویل قامت شخص خود کو جھکا کر چل رہا تھا۔ وہ
تیزی سے اس طرف آئی تو وہ شخص اچانک راستہ بدل کر چار
نمبر میں داخل ہو گیا۔ رچی پانچ نمبر میں تھا۔ ایس نے ریڈیو
پر کہا۔ ”ایک مشکوک فرد چار نمبر میں داخل ہوا ہے۔ سرنی
کوٹ میں ہے۔“

”میں اس طرف موجود ہوں کو خبر دار کر رہا ہوں۔“
ال ور تھ نے کہا۔ ایس کمرے میں آئی۔ کہنے کو یہ کرا تھا
لیکن وسعت میں کسی ہال سے کم نہیں تھا اور یہاں آنے

جانے لے گئی رہتے تھے۔ وہ لوگوں میں دیکھ رہی تھی لیکن
 اسے مہلت دی گئی تھی۔ یہ سب کچھ اس نے دیکھا۔
 وہ شاید فرار کی کوشش کر رہا ہے اس سے پوچھ لی

موجودگی بھانپ لی ہے۔
 اس کی شامیں باہر جانے والے رہتے پر ایک پولیس
 مین نے مشکوک آدمی کو روکنے کی کوشش کی تو وہ سے دھکا
 دے کر بھاگ نکلا تھا۔ اب پولیس اسے سنا پھینکا کر رہ
 تھے۔ میں خود بھی باہر کی طرف لپکی مگر اس طرف آنے
 والوں کا ہجوم تھا۔ بے لوگوں کو دھکا دینا پڑ رہا تھا۔ جب تک
 وہ میری سے باہر نہ آتی۔ پولیس والے سڑک پر پھیل کر کھڑے
 ہوئے۔ فرار کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر مسدود تھا کہ وہاں ایک فیسٹو
 رہا تھا جس میں بڑے بڑے لوگ بھر کر مختلف آلات موسیقی سے
 شور مچا رہے تھے۔ یہ شاید سیہ فم دور ویسٹ انڈین
 فیسٹو تھا۔ سڑک پر ان کی طرف تشریف لائے گا ہجوم تھا۔ یہی
 نہیں بد آواز کی گلیوں میں بھی دونوں سے خان نہیں تھیں۔
 پولیس نصف گھنٹہ تک سرگرمی سے فرار ہونے والے دھنکائی کرتی
 رہی مگر وہ ایک بار پھر پولیس کو جل دے گیا تھا۔ اس ناکامی
 نے ٹھنڈے مزاج کے بڑے بڑے لوگوں کو شہر پا کر دیا تھا۔ وہ
 سبے آدمیوں پر برس پڑا تھا۔

ایس اسے چھوڑ کر اندر آئی تو درجی قاتل کے فرار کا سن کر
 رو رہا تھا۔ ایس کو اس پر ترس آنے لگا۔ اس کی جان پانی
 ہوئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اگر قاتل نہ پکڑا گیا تو اس کی زندگی
 مشکوک رہے گی۔ قاتل بھی وہی شخص تھا جس نے اس سے پولیس کو
 بیوقوف بنائے ہوئے تھا اور یہاں بھی مسلسل اسے غلے دے رہا
 تھا۔ ایس نے اس سے کہا۔ "کل حیارے میں سو رہوئے تک
 پولیس تمہاری حفاظت کرے گی۔"
 "اور اس کے بعد؟"

ایس کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس نے
 جانے سے پہلے کہا۔ "میں کل صبح آؤں گی۔"
 رچی نے مسکراتے کی کوشش کی۔ "چلو اس سفر میں کوئی
 تو خوشگم رہا ہوں۔"

ایس نے اپنے تاثرات پر قابو رکھا تھا۔ برسوں پہلے
 جب اس نے عمری میں شادی کی اور ایک سال بعد ہی یہ
 شادی بہت تکلیف دہ انداز میں ختم ہوئی تب اس نے فیصلہ کر
 لیا تھا کہ شادی تو ایک طرف رہی اب وہ کسی مرد سے متاثر بھی
 نہیں ہوگی۔ اس نے اپنی جاب کو ہی اپنی زندگی کا مقصد بنا
 لیا تھا۔ لیکن اب اسے اپنا صدمہ حیران کن ہوتا لگ رہا تھا۔ رچی
 اس قدر رنج و غم میں انداز میں اس کی طرف عیش قدی کر رہا تھا

دروہ شادی کی طرز پر پسپا ہوتی بھرتی تھی۔

اب درجہ بدل گیا تھا وہ درجی کو سڑک پر چھوڑ
 چکا تھا۔ اس نے حفاظت کے لیے موجود پولیس والوں و
 چھٹی دیدی۔ اس کے خیال میں اب ان کی ضرورت نہیں رہی
 تھی۔ رچی وہاں جمع ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے ایک اس وقت
 کی ہار کی زانی میں کھوئے۔ اس وقت نے پوچھا۔ "ہاں۔"

"ہاں۔۔۔" رچی کہتے ہوئے چلتا تھا۔ "میں ایک
 بیک رو گیا تھے میں لانا ہوں۔"
 "ٹھیک ہے میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔" اس وقت
 سگریٹ سٹاکتے ہوئے تھا۔ رچی نے پوچھا۔ "سگریٹ تو
 پانی تو اس وقت چھوڑا۔ رچی کو گئے۔ اس نے دیر سے
 تھیں۔ اسے ایک آجیانا چاہیے تھا۔ اس نے سوچا۔
 "اس وقت چھینک رہی تھی۔ اسے مسدود سڑک پر۔
 عمارت کی صوف بڑھاتا تھا کہ موہاں کی بیل لگی۔ یہ میں
 تھی۔ اس نے کال ریسیو کی۔

"رچی تیار ہے؟"
 "ہاں۔" اس وقت وہ۔ "میں اسے چھوڑ
 چھوڑ۔ چار ہوں۔ وہ اندر ہے۔"
 "میں بھی آ رہی ہوں۔" ایس نے کہا۔ "یہ
 عمارت کے سامنے فرار کی آواز آتی۔" یہ وہی سیہ فم تھا۔
 اس وقت فرار ہونے والوں نے پتوں نکالتے ہوئے
 ایس کو بتایا۔ "فرار کسی نے عمارت میں فرار کیا ہے میں
 دیکھتا ہوں۔ تم دیکھنی کو کاں کرو۔"

☆ ☆ ☆
 ایس نے اندر چھٹی کو کال کی تھی اور پھر کار کی رفتار
 بڑھا دی تھی۔ وہ رچی کی رہائش سے کچھ ہی دور تھی۔ وہ منٹ
 بعد وہ اس وقت کی کار کے پیچھے رچی درمیانی سے عمارت
 کی طرف سے فرار لگ کر فرار آئی۔ وہ پستوں نکالتے
 ہوئے اتری اور دوڑتے ہوئے دروازے تک آئی تھی۔ اس
 نے احتیاط سے اندر جھانکا تھا۔ یہاں سے آگے سے وہ
 فرش پر پڑا دکھائی دیتا تھا۔ مگر پتے ہال میں آ رہی نہیں تھی۔
 وہ اندر آئی اور یہ دیکھ کر اسے صدمہ ہوا تھا کہ فرش پر ال درجہ
 پڑا تھا۔ اس کے سینے میں دو سوراخ تھے اور ایک عین ول پر
 تھا، وہ مر چکا تھا۔ اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا
 چارہ لی۔ در آئے فرش پر خون کا ایک دھبہ اور تھوڑی سی
 یا کوئی اور نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اوپر جانے والی سیڑھیوں

طرف بڑھتی تھی کہ اسے باہر سے کسی کار کے اسٹارٹ ہونے
 کی آواز کی۔

"شٹ۔" اس کے منہ سے نکلا اور وہ تیزی سے
 کی طرف لپکی۔ وہ بھول گئی تھی کہ عمارت کا بجلی گلی میں
 کسی ایک دروازہ کھلتا تھا۔ وہ باہر لگی اور ہی مجھے ایک سیاہ
 ہار اس کے سامنے سے گزری۔ ڈرائیونگ سیٹ پر رچی
 تھا اور اس کے برابر میں وہی شخص بیٹھا تھا جسے ایس نے
 آٹھ مہری میں دیکھا تھا اور اس کی تصویر بھی لی تھی۔ اس
 نے ہاتھ میں پستول دبا تھا اور اس کا رخ رچی کی طرف
 تھا۔ وہ رچی کو یرغما بنانے لے جا رہا تھا۔ پاس سے
 گزرتے ہوئے رچی نے اسے بے بسی سے دیکھا
 تھا۔ ایس اپنی کار کی طرف دوڑی۔ جب تک وہ کار گھما
 کر رواں ہوئی دوسری کار سڑک سے مڑ چکی تھی۔ اس
 دوران میں پولیس کاروں کے سائرن کی آواز آنے لگی
 تھی۔ ایس نے رفتار بڑھاتے ہوئے موبائل سے
 یہ منی کال کی دوران درجہ کے بارے میں بتایا۔
 "پولیس بوخاردار کر دو ہم سب کو تھو ویسٹ کی طرف جا
 رہے ہیں۔ سیاہ رنگ کی کار ہے۔"

ایک ہاتھ سے ڈرائیونگ کرنا مشکل تھا کیونکہ اگلی کار
 مسلسل میڑ رہی تھی اور وہ اس سے پیچھا چھڑانے کی کوشش
 کر رہی تھی۔ اس دوران میں ایک پولیس بلی کا پٹر نے
 سیاہ کار دیکھ لی تھی اور اب اس کے اوپر اثر رہا تھا۔ ایس
 نے موبائل رکھ دیا اور پوری توجہ سے ڈرائیونگ کرنے
 لگی۔ سیاہ کار اس سے کوئی سو گز آگے جا رہی تھی۔ اس کا
 نشانہ مارک کے مشہور برج کی طرف تھا۔ چند منٹ بعد
 وہ رنچا پر تھی۔ یہاں ٹریفک بے پندہ تھا مگر سیاہ کار
 خط ناک انداز میں اوور ٹیک کر رہی تھی۔ ایس کے لیے
 تھا کہ اس کا مشکل ہو رہا تھا۔ درمیان میں پل کی مرمت کا
 کام جاری تھا اور نیلے رنگ کے ڈرم رکھے تھے۔ اچانک
 اس نے ڈرموں کی طرف گھومی۔ وہ ڈرموں سے ٹکرائی۔
 تھوڑی سی کی وجہ سے ہوا میں چھٹی اور پھر دو قذایاں کھا
 ایک سگریٹ مسکراتے سے ٹکرائی تھی۔ تصادم شدید
 تھا۔ ایس نے کار میں اور اتر کر بھاگی۔ اس نے رچی کو
 گاہ سے دیکھا۔ وہ بوکھلایا ہوا تھا، قاتل وینڈ
 ٹیڈ ڈرائیونگ باہر آ گیا تھا۔

یہ سب دیکھ کر اس نے چلا کر کہا اور کار
 میں سے پستول نکال لیا اور اس سے پہلے کہ ایس اسے
 اس سے اسے قاتل پر گھرا کر فرار کر دے۔

تھے۔ ایس چلائی۔

"ہاتھوں پیچھے دو۔"

رچی اس کی آواز پر چونکا۔ اس نے دونوں ہاتھ اوپر
 کیے اور پستول نیچے چھینک دیا۔ اسی لمحے ایس کی نظر کار سے
 نیچے پیٹروئل پر گئی اور اس نے آگ پکڑ لی تھی۔ ایس بھاگی اور
 رچی کو بیٹے ہوئی چند منٹ اونچی کنکریٹ کی دیوار کے دوسری
 طرف گری۔ اسی لمحے کار نے دھماکے سے آگ پکڑ لی۔ اگر رچی
 اپنی جگہ کھڑا رہتا تو یقیناً دھماکے کی زد میں آ جاتا۔ فضا میں پولیس
 سائرن کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ جلد ہی آگ بجھانے والا عملہ
 آ گیا اور اس نے چند منٹ کی جدوجہد کے بعد آگ پر قابو پایا
 تھا۔ رچی ڈھکی تھا اس کے بازو سے خون بہہ رہا تھا۔ ایس نے
 بے قراری سے پوچھا۔ "یہ کیا ہوا ہے؟"

"پتا نہیں، کچھ لگا ہے۔" وہ بولا پھر ایس کا ہاتھ چھوا۔
 "تمہیں بھی چوٹ آئی ہے۔ ایک منٹ رکو۔" اس نے اپنی
 جب سے رومال نکالا اور بہت احتیاط اور نرمی سے ہاتھ کا
 زخم صاف کرنے لگا۔ ایس اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔ اس نے
 بڑی تیزی سے خود پر قابو پایا تھا۔
 "یہ سب کیسے ہوا؟"

"میں آخری بیک لینے اندر گیا تھا، یہ پہلے سے اندر
 موجود تھا۔ یہ مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ میں نے
 مزاحمت کی تو اس نے تشدد کیا، مجھے ڈرانے کے لیے ایک
 فائر بھی کیا۔ اتنے میں اس وقت اندر آیا تو اس نے اس پر دو
 فائر کیے اور پھر مجھے پستول کے زور پر دوسرے دروازے
 سے باہر لے آیا۔ اس نے اپنی کار میں بٹھایا اور ڈرائیونگ کرنے
 لگا۔ کا حکم دیا۔ میں اس کے آگے مجبور تھا۔ اسی وقت تم
 دروازے سے باہر آئیں جب یہ مجھے لے جا رہا تھا۔ تم
 اور پولیس پیچھے گئے تو مجھے اُمید ہوئی کہ شاید تم وگ مجھے
 اس سے چھڑاؤ لیکن اس نے مجھے دھمکی دی کہ جہاں
 میں نے کار روکی یہ مجھے شوٹ کر دے گا۔ اس لیے مجھے
 اچانک ہی خیال آیا اور میں نے کار ڈرمز پر چڑھادی۔
 اس کی سیٹ بیلٹ کھلی تھی اور میری بندھی ہوئی تھی۔ اسی
 وجہ سے میں بچ گیا۔"

"میرا خیال ہے وہ حادثے میں ہی مار گیا تھا تم نے
 بلا وجہ اس پر گولیاں برسائیں۔"

پولیس آگئی تھی۔ اس نے کار، قاتل کی لاش اور رچی کو
 اپنی تحویل میں لے لیا۔ ایس کو ابھی پولیس ہیڈ کوارٹر جانا
 تھا۔ اسے ابھی تک ال درجہ کی موت کا دکھ ہو رہا تھا۔ اس کے
 ساتھیوں کا دکھ یقیناً اس سے زیادہ ہی ہوگا۔ پولیس والے

رجی کو اس کے رخصت کی پروا کیے بغیر میڈ کو اڑنے آئے تھے۔ ایس کو غصہ کیا اس نے جان سے کہا۔ "پہلے اسے اسپتال لے جانا چاہیے تھا۔"

"تمہیں اس کی کچھ زیادہ ہی فکر ہے۔" جان سر دلیجے میں بولا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

"مجھے ال ورتھ کا افسوس ہے۔" ایس نے کہا۔ ضروری کارروائی کے بعد وہ خود رجی کو اسپتال لے گئی جہاں اس کے بازو کے زخم پر ٹانگے لگے۔ حادثے کے دوران اسے بھی چوٹ آئی تھی۔ جب وہ اسپتال سے نکلے تو ایس نے پوچھا۔

"تم کہاں رکو گے؟"

"شاید کسی ہوٹل کا رخ کرنا پڑے۔ ابھی مجھے اگلی فلائٹ بھی دیکھنا ہوگی۔"

ایس ہچکچی پھر اس نے کہہ دیا۔ "تم میرے ساتھ کیوں نہیں رک جاتے۔ تمہارا سامان بھی ابھی پولیس کی تحویل میں ہے۔"

رجی نے اس کی طرف دیکھا اور مسکرائے لگا۔ اگلی صبح ایس بیدار ہوئی تو رجی اس کے برابر میں سو رہا تھا۔ وہ اتنا معصوم لگ رہا تھا کہ ایس کو یہ اختیار اس پر پڑا۔ تانے لگا۔ وہ اٹھ کر واش روم جانے لگی تھی کہ اس کے موبائل نے بیل دی۔ رسٹ کال کر رہا تھا۔ اس نے کال ریسیو کی۔ "پوسٹ مارٹر رپورٹ آئی ہے۔"

"موت کی وجہ؟"

"دماغ نہیں ہے۔ سر پر شدید چوٹ بھی آئی ہے اور مری پر گولی بھی لگی ہے دونوں میں سے کوئی ایک وجہ ہو سکتی ہے۔"

"وحتی رپورٹ کب آئے گی؟"

"دو دن میں اور مسز ریف لاش کی شناخت کرنے آ رہی ہے۔ تم بھی گیارہ بجے تک آ جانا۔"

"ٹھیک ہے میں آ جاؤں گی۔" ایس نے کہا اور موبائل بند کر دیا۔ رجی جاگ گیا تھا اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو ایس بولی۔ "مسز ریف لاش شناخت کرنے آ رہی ہے۔ مجھے جانا ہوگا تم چلو گے؟"

"نہیں میں ذرا کام سے جاؤں گا۔" رجی نے انکار کر دیا۔

وہ دونوں آرام سے تیار ہوئے۔ ناشتے کے بعد رجی رخصت ہو گیا تھا۔ ایس گیارہ بجے سے ذرا پہلے اسپتال پہنچ گئی۔ مسز ریف آگئی تھی لیکن اس سے پہلے ایس نے ش کا معائنہ کیا۔ وہ بری طرح جھلس گئی تھی چہرہ بھی تفر۔ انا قابل

شناخت ہو گیا تھا۔ اس نے جان سے پوچھا۔ "اسے کس طرح شناخت کرے گی؟"

"میں نہیں جانتا۔" اس نے شاہ اچکائے۔

کچھ دیر میں رسٹ مسز ریف کو وہاں لایا۔ اس کا اثرات عجیب ہو رہے تھے وہ دھکی دھکی تھی۔ درخوف زور پر ایس سوچ رہی تھی کہ اسے خوف کس بات کا تھا۔ لاش پا کر اسے ڈھکی ہوئی تھی، مسز ریف نے مطالبہ کیا۔ اس نے چہرے سے چادر ہٹا دی۔

ڈاکٹر نے چہرے سے چادر ہٹا دی۔ چہرہ بے ہوش لگا۔ ریف جھکی تھی لیکن پھر صدمہ کر کے اس کے پاس آئی۔ اس نے عقب سے کہا۔ "اسے چھو مات۔"

مسز ریف نے برہمی سے اسے دیکھا۔ "مجھے صدمہ مجھے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔ اگر یہ میرا بیٹا ہے تو اسے ملنا صدمہ کر سکتی ہوں۔"

جان چپ ہو گیا۔ مسز ریف نے ہمت کر کے لاش دیکھ لی۔ آنکھ کا پونا کھولا اور پھر اسے ذرا اوپر چڑھایا۔ وہ کچھ اسے دیکھتی رہی پھر پونا چھوڑ دیا اور پیچھے ہٹ گئی۔ ایس نے محسوس کیا اس بار اس کے تاثرات میں خوف نمایاں تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا اور آہستہ سے بولی۔ "تم اسحق لوگ۔"

وہ کہتے ہوئے ہاں سے چلی گئی۔ جان نے ہاتھ پر ہاتھ کیا۔ "یہ کیا ہو سکتا ہے؟"

ایس مسز ریف کے پیچھے لگی۔ وہ تیز قدموں سے لفت کی طرف جا رہی تھی۔ وہ اسے آواز میں کہنے لگی۔ "لیکن مسز ریف ان سنی کر کے لفت تک پہنچی۔"

اس کا دماغ تھک رہا تھا۔ وہ اندر داخل ہوئی اور اس نے موبائل کا نشان دیکھا۔ اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے اس سے کہا۔ "نام۔"

اس نے مز کر دیا اور اس کی آنکھیں پھلنے لگیں۔ پھر اس نے سر ہراتی آواز میں کہا۔ "میں نہیں کر سکتے ہو لیکن مجھے ڈرا نہیں سکتے، میں تمہاری ماں ہوں۔"

☆ ☆ ☆

جب تک ایس لفت تک آتی اس کا زور بڑھ چکا تھا۔ دوسری لفت کا انتظار بیکار تھا۔ مسز ریف بکلا اور وہ ہر صورت اس سے معلوم کرنا چاہتی تھی کہ اس کس بنا پر لاش کو شناخت کرنے سے انکار کیا تھا۔ یہ جیوں کی طرف لگی۔ تیزی سے بیڑھیں ہونے لگیں۔ وہ پانچویں فلور سے تھک پھٹ کے ہاتھ لگے۔

اس کا دروازہ کھلنے سے پہلے وہ سامنے آگئی تھی۔ دروازہ کھلا تو اس نے رجی کو اس حالت میں وہاں موجود پایا کہ اس کے ہاتھ میں خون آلود جاتو تھا اور مسز ریف اپنے ہی خون میں ڈوبی فرش پر پڑی تھی۔ رجی نے اسے دیکھا اور شکایتی لہجے میں بولا۔ "یہ ہمیشہ مجھے نظر انداز کرتی تھی۔" ایس نے کو مجھ پر ترجیح دیتی تھی۔"

ایس کے منہ سے چیخ نکلی۔ اس وقت وہ بھوکے تھے کہ وہ ایف بی آئی ایجنٹ ہے۔ رجی نے ہاتھ بڑھا کر بشن دیا اور غٹ سمسٹ کی طرف روانہ ہو گئی۔ ایک ایک ایس کو ہوش آیا اور اس نے جلدی سے موبائل نکال کر رسٹ کو کال کی۔ وہ ٹوٹے پھوٹے انداز میں بڑی مشکل سے اسے بتا پائی تھی کہ اصل قاتل رجی ہے اور اس نے اپنی ماں کو بھی قتل کر دیا ہے۔ یہ سنتے ہی رسٹ حرکت میں آیا تھا۔ وہ اور جان تیزی سے نیچے آئے تھے۔ لفت میں رسٹ میں رکی ہوئی تھی۔ خون کی لکیر کل کر واشنگ ایریا کی طرف جا رہی تھی اور وہاں رجی کا خون آ رہا تھا۔ ایس نے دیکھا کہ وہ خود غائب تھا۔ اسپتال میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ اس مسٹ کے اندر پولیس کی ڈھیروں نفری وہاں آگئی تھی اور اس سارے علاقے میں رجی کی تلاش شروع ہو گئی تھی۔ ایس شاک کی کیفیت میں تھی۔ رجی کی تلاش میں ناکامی پر جان ورسب کا غصہ سے برا حال تھا۔ نہیں بہر صورت اپنے پاس کا قتل درکار تھا۔ دو گھنٹے بعد وہ ہیڈ وارڈ میں رجی کا ساتھ ساتھ کال رہے تھے۔ لیکن اس میں یہاں کوئی کمی نہیں ملا جس سے رجی کا سراغ مل سکتا۔ وہ میڈ آئی ایک بار پھر سب کو جل دے کر نکل گیا تھا۔

دو دن بعد ایس پولیس ونگشن روٹہ ہو گئی۔ وہاں اس نے اپنی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے ملامت سنی۔ "یہ کیا کہنا تھا کہ وہ اپنی ڈیوٹی دے رہی نہیں تھی؟ اس سے وہ اسٹیفنی دے رہی ہے۔ اسٹیفنی دے رہی ہے اپنے علاقے کی طرف روانہ ہو گئی۔ ایس کا تعلق میری لینڈ سے تھا۔ اس کا باپ ایک کسان تھا۔ اس کا فارم باؤس اب تک موجود تھا۔ لیکن کسی کے نہ ہونے سے لینڈ خالی تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس فارم کو آباد کر سکتی تھی۔ اس کے استیفنی کی خبر دی پر بھی آئی تھی اور اکثر نیوز چینل نے کرشن میریل ٹی وی کی تفصیلی رپورٹنگ کی تھی۔ اس نے تصدیق کی تھی کہ اس نے اسٹیفنی اور عوام سے اجیل کی تھی کہ وہ اگر اس کے بارے میں کچھ جانتے ہیں تو بتائیں۔ موبائل دیں مگر کرشن عرف رجی سر سے سے

غائب ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

آٹھ مہینے بعد ایس اپنے آبائی قصبے جیمروڈن کے میری میڈیکل اسٹور میں داخل ہوئی۔ میری میڈیکل اسٹور اس کی دور کی پھوپھی لگی تھی۔ وہ ایس کو دیکھ کر مسکرائی۔ "اب طبیعت کیسی ہے؟"

"بہتر ہے۔" ایس جواباً مسکرائی۔ "لیکن سردی جان نہیں چھوڑ رہی ہے۔"

"ہاں مارچ کا مہینا ہے اور برف ابھی تک جمی ہوئی ہے۔" میری نے دکان کے پاس مکان کی چھت پر جمی برف دیکھ کر کہا۔ "آج ریڈیو پر بتا رہے تھے کہ مارچ کے آخر میں مزید برف باری کا امکان ہے۔"

"میرا سامان تیار ہے؟"

میری نے اس کے سامنے ایک بڑا سا کارٹن رکھا۔ "اس میں سب کچھ ہے لیکن تم ایک بار چیک کر لو ہو سکتا ہے کچھ میرے ذہن سے نکل گیا ہو۔ عمر بھی خاصی ہوئی ہے۔"

ایس نے کارٹن کھول کر چیزیں دیکھیں اور بولی۔ "آئی تم اب بھی جوان ہو، سب موجود ہے۔"

وہ کارٹن اٹھا کر باہر اپنی پک اپ تک لائی۔ کارٹن فرنٹ سیٹ پر رکھ کر وہ گھر کی طرف روانہ ہوئی۔ اس کا فارم اور گھر جیمروڈن سے باہر تھا۔ آس پاس چند مکان اور فارم مزید تھے۔ شام قریب تھی اور آسمان سرمئی ہو رہا تھا۔ پک اپ مکان کے سامنے روک کر وہ اندر آئی۔ پتھر لکڑی اور کنکریٹ سے بنی دیوڑی طرز کا مکان اس کے باپ نے خود بنایا تھا۔ ایس نے اپنی عمر کے ابتدائی اٹھارہ برس اسی گھر میں گزارے تھے۔ پھر وہ واشنگٹن یونیورسٹی چلی گئی۔ وہاں سے نکلی تو ایف بی آئی میں ملازمت کر لی۔ اسے بس چھٹیوں میں گھر آنے کا موقع ملتا تھا۔ مکان کے نچلے حصے میں ایک بڑا سا ہال تھا لاؤنج، ایک بڑا کچن اور اس کے ساتھ ڈائننگ ایریا تھا۔ ایک کمر اسٹڈی کے لیے تھا۔ یہاں اس کے باپ کی جمع کی ہوئی کتابیں موجود تھیں۔ اوپر دو بڑے بیڈ روم ہاتھ رومز اور اسٹور تھا۔ مکان سینٹری ہیٹڈ تھا اس لیے اندر باہر کی سردی کا اثر نہ ہونے کے برابر تھا۔

اس نے بھاری بھر کم کوٹ اتارا تو اس کا بڑھا ہوا پیٹ نمایاں ہو گیا۔ وہ اُمید سے اور آخری دنوں سے تھی۔ وہ کارٹن لے کر اوپر آئی۔ کارٹن اس نے اسٹور میں رکھ دیا جہاں اس جیسے کئی کارٹن اور رکھے ہوئے تھے۔ وہ

جھکے ہوئے انداز میں بستر پر بیٹ گئی۔ اس کی صحت ن
 آٹھ مہینے میں گئی تھی اور رنگ زرد ہو رہا تھا۔ کچھ دیر
 آرام کرنے کے بعد اس نے رات کا کھانا کھایا اور تمام
 کھڑکیاں اور دروازے چیک کیے۔ یہ اس کا روز کا
 معمول تھا۔ اب لگ رہا تھا کہ کرسٹن عرفی رچی کا خوف اس
 کے دل سے نکلا نہیں تھا۔ صبح اس کی آنکھ کھلی اور وہ باتھ روم
 سے ہو کر نیچے آئی۔ اسے بھوک لگ رہی تھی لیکن پہلے اس
 نے کافی کافی رکھا اور داؤج میں آکر بیوی آن کر کے
 خبریں دیکھنے لگی۔ موسم کی خبر یہ تھی کہ اگلے دو دن میں برف
 باری کا نیا سلسلہ شروع ہونے والا تھا۔ خبریں دیکھتے ہوئے
 اچانک اسے احساس ہوا کہ ابھی تک کیتلی نے سٹی نہیں
 بھائی جبکہ پانی کھول جانا چاہیے تھا۔ وہ بکن میں آئی، کیتلی
 کے پاس آکر اسے پتا چلا کہ چوہا تو بچھا ہوا تھا جبکہ وہ خود
 چوہا جلا کر گئی تھی گیس کا مسئلہ نہیں تھا بلکہ سوچ ہی بد تھا۔
 خطرے کا احساس ہوتے ہی وہ پلٹی تھی کہ کسی سے کمرائی
 پھر اس کے منہ سے چیخ نکلی کیونکہ سامنے کرسٹن کھڑا تھا۔ وہ
 بڑبڑا کر پیچھے ہٹی پھر اس نے بھاگنا چاہا۔ مگر کرسٹن نے
 ہاتھ بڑھا کر اس کے بال تمام لیے اور اسے اپنی طرف
 کھینچا۔ روئے کے برعکس اس کا لہجہ نرم تھا۔
 "ایس کیسی ہو؟"
 "تم... تم... وہ کہتے کہتے رک گئی۔
 کرسٹن کی نظر اس کے ابھرے ہوئے پیٹ پر
 گئی۔ اس نے بدستور نرم لہجے میں کہا۔ "اوہ، تم امید سے
 ہو... کیا یہ کرسٹن جو نیئر ہے۔"
 ایس نے بھی ہنسی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں کسی کرسٹن کو
 نہیں جانتی، یہ رچی نیسن کا بچہ ہے۔"
 "رچی نیسن کون ہے؟" وہ بولا اور اچانک ایس
 کے بال گھما کر اسے دکھا دیا۔ وہ فرش پر جاگری تھی۔ اس
 کے منہ سے چیخ نکلی تھی۔ وہ بہ مشکل کھڑی ہوئی اور ہاتھ
 پیچھے کر کے بک پر میز پکڑ لی لیکن اصل میں وہ اس کے نیچے
 کی طرح ٹول رہی تھی جہاں اس نے ٹیپ سے ایک تیز دھار
 خنجر بامدھ رکھا تھا لیکن اس کی انگلیاں صرف ٹیپ سے لگی
 تھیں، وہاں خنجر نہیں تھا۔ کرسٹن نے ہاتھ آگے کیا تو اس
 میں خنجر دبا ہوا تھا۔ "شاید تم اسے تلاش کر رہی ہو۔" اس
 نے کہتے ہوئے اچانک خنجر پھینک کر راتوں، ایس کے
 پاس سے ہوتا ہوا عقب میں لکڑی کی دیوار میں جا گرا۔
 ایس کے منہ سے چیخ نکلی۔ کرسٹن اس کی طرف آنے
 لگا۔ "میز کے نیچے خنجر ہاتھ روم میں پستول اور سگے کے

نیچے ایکسٹرنک دائرہ یہ سب میرے عجیبے تھے نا؟" اس نے
 روٹیک سے ہونے پتا تھا۔ ایس نے تڑپ گئے پر
 رکھ، وہ جی جاس سے کانپ رہی تھی۔ "ان سب کو مستعمل
 کرنے کے لیے طاقت چاہیے اور تم بہت کمزور ہو رہی
 ہو۔ اس نے جھپٹے ہوئے ایک بار پھر اسے بے رحمی سے
 دھکا دیا، دروازہ پیٹ کے بل فرش پر جاگری۔ اس بار اس کی
 جتنی میں کرب تھا۔ اسے چوٹ آئی تھی۔ اس سے اٹھ نہیں
 گیا تھا، کرسٹن سے بچنے کے لیے وہ گھسٹ کر آگے
 بڑھی۔ کرسٹن قریب آیا اور اس سے جھک کر اسے شانوں
 سے تھا، اور ایک جھٹکے سے کھڑا کر دیا۔ وہ ہلاتا تو اس کے
 لہجے میں سفاکی تھی۔
 "یہ بچہ کس کا ہے؟"
 "کرسٹن ریف کا... ایس نے سسکیاں لیتے
 ہوئے کہا۔
 اس کے چہرے پر زنی آگئی۔ "گڈ... تم جان گئی ہو
 مجھے اپنی ذات کی نفی کرنا اچھا نہیں لگتا ہے۔ میری ماں ماری
 عمر یہی کرتی آئی تھی۔ آخر میں اسے خمیازہ بھگتنا پڑا۔"
 "تم... تم کیا چاہتے ہو؟"
 کرسٹن نے اسے دھکیل کر دیوار سے لگا دیا۔ "اس
 دن میں مجھے کسی سے دلی گاد ت وہ تم ہو۔ افسوس تم ریف لی
 آئی کی ایکٹ تھیں۔ لیکن اب تم آزاد ہو۔ مجھے معلوم ہے تم
 مجھ سے محبت کرنے لگی تھیں شاید اب نہیں کرتی ہو۔ بہر حال
 اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا میرے لیے، اہم بات یہ ہے کہ تم
 میرے بچے کی ماں بننے والی ہو۔"
 "یہ تمہارا بچہ نہیں ہے۔" ایس نے اہستہ کو کہہ
 "تمہارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"
 "میں پورے چھ مہینے سے تمہیں تلاش کر رہا ہوں۔
 بہت کوشش اور وقت ضائع کر کے میں یہاں پہنچا ہوں کیونکہ
 مجھے معلوم ہو گیا تھا تم ماں بننے والی ہو اور تم کہہ رہی ہو کہ اس
 بچے کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" اس نے کہتے ہوئے ایک
 بار پھر ایس کو دھکا دیا اور وہ ڈانٹنگ ٹیبل سے جا کمرائی۔
 کرسٹن کے رویے سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ رحم کے موڈ
 میں نہیں تھا۔ درجنوں انسانوں کا سہ ک قال دیے ہی رہے
 تھے نا آشنا تھا۔ ایس نے کن آنکھوں سے نزدیک ہی رچی
 نیچی کی طرف دیکھا اور بولی۔
 "وہ شخص کون تھا جسے تم نے قربانی کا بکر بنایا تھا؟"
 "جیسن لیکر۔" کرسٹن نے مسکرا کر کہا۔ "وہ ہے چار
 مصور تھا۔ اسی نے وہ ماری میٹنگر بنائی تھیں جو میں نے چنے

ہم سے آرٹ گیلری میں پیش کی تھیں۔ میں اس کی شخصیت
 سے متاثر ہوا تھا کیونکہ اسے بہت سارے لوگ جانتے تھے
 اس کا فن ضرور حاصل کر لیا تھا اور وہ اسی کے لیے
 یہ بچہ بنایا تھا۔"
 "تم سے پہلے ہی قتل کر چکے تھے؟" ایس نے گھر نے
 بچے ہوئے بولی۔ اس کے چہرے سے تکلیف جھک
 رہی تھی۔ "پوسٹ مارٹم رپورٹ میں آیا تھا کہ وہ کار کے
 دروازے سے پہلے مر چکا تھا۔"
 "ہاں، کار میں بٹھانے سے پہلے میں اسے شوٹ کر
 چکا تھا۔ جب تم نے دیکھا تو ایک لاش پستول ہاتھ میں لیے
 ہوئے تھی۔"
 "پھر تم نے چالاک سے حادثے کا منصوبہ کیا۔ یہ تم سب
 کے سے حوت تھے تھے۔ آخر میں تم نے اس پستول پر
 رچی آؤن کاٹش بھی کی ڈرٹک میں شامل کر دیا۔"
 کرسٹن نے سر ہلایا۔ "میں کامیاب رہا تھا لیکن مجھے
 بعد میں یہی ماں سے شناخت کر سکتی تھی وہ اسے میری لاش
 سے لے کر اپنے سے انکار کر دے گی کیونکہ... اس نے دیکھا
 "لوگوں کی اپنا تو ذیلے کے ایک سیاہ قتلہ نشان نظر
 آیا۔ یہ میری نشانی ہے۔"
 اس نے تم سے اسے قتل کر دیا۔" ایس نے آہستہ
 سے ہاتھ نیچی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
 "ہاں، وہ میرے سر پر خطرے کی تواری صرح تک
 ہی تھی میں نے اس سے چھٹا، حاصل کر لیا، مناسب
 سمجھا۔" کرسٹن نے...
 میں نے تیری دکھلی ورتنی اٹھوں اس کا خیال تھا
 کہ رچی اس پر جھپٹے گا، اسے باز رکھنے کی کوشش کرے گا
 میں وہ خون سے اپنی جگہ کھڑا رہا، ایس نے نیچی کا رخ اس
 کی طرف کیا۔ "میرے پاس مت آنا۔"
 میں آہنی جگہ کھڑا ہوں۔" وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔
 "تم مجھے اب دھوکا نہیں دے سکتے۔ مجھے معلوم ہے تم
 نے کیا کیا۔" اس نے کہا۔ "ایس نے کہتے ہوئے نیچی کھائی۔
 کرسٹن نے پیچھے ہٹ۔
 ... سب یہ یہ کر رہی ہو۔ احتیاط سے وقیفی
 ... میں نے یہاں کر رہی تھی۔ کرسٹن بچ رہا تھا پھر اس
 نے ہاتھ پکڑ لیا اور اسے گھما کر عقب سے جکڑ
 دیا۔ رچی بھی لیکن رستن کی مضبوط گرفت کے
 سب سے... رچی بدستور اس کے ہاتھ میں رہی ہوئی

تھی۔ کرسٹن نے اسے حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی
 تھی۔ "آرام سے ڈیڑھ آرام سے... میں تمہیں نقصان
 پہنچانا نہیں چاہتا۔ میں تمہیں قتل کرنے نہیں آیا ہوں۔ تم غلط
 سمجھ رہی ہو۔"
 رفتہ رفتہ ایس کی مزاحمت کمزور پڑنے لگی۔ کرسٹن
 اس کے بالوں پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ "جب تم کیوں آئے ہو؟"
 "میں اس بچے کو قتل کرنے آیا ہوں۔" کرسٹن نے پھر
 اور ایس کا پیٹ دھکا دیا، ہاتھ کھنکھناتے ہوئے اس کے پیٹ میں نیچی
 گھونپ دی۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی تھی۔ کرسٹن نے سرگوشی
 کی۔ "میں اسے مارنے آیا ہوں کیونکہ میں اس دنیا میں اپنے
 جیسا کوئی برداشت نہیں کر سکتا۔"
 ایس کے منہ سے کراہی نکل رہی تھی، وہ آگے جھکی تھی۔
 کرسٹن نے اسے چھوڑ دیا اور ذرا پیچھے ہوا تھا۔ اس نے
 کہا۔ "یہاں اچھا حال ہے۔ میں نے تمہیں امید ہے ڈیڑھ بریڈ
 کے آگے تک پہنچاؤ۔" اسے رات کے اور کچھ پانی نہیں رہے گا۔"
 اچانک ایس نے اپنے پیٹ سے نیچی نکالتے ہوئے
 محکمہ کرسٹن کے سینے میں ہاتھیں طرف دل سے اوپر گھونپ
 دی۔ "وہ رچی قوت سے کیا کر رہا تھا اور نیچی سے تک اندر تر
 گئی تھی۔ کرسٹن کی آنکھیں حیرت اور تکلیف سے پھیل گئی
 تھیں۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا پھر گھنٹوں کے بل فرش پر بیٹھ
 گیا۔ ایس نے اس کے سینے پر لات ماری تو وہ فرش پر چت
 ہو گیا۔ کرسٹن بکا یا۔ "یہ... یہ کیا ہے؟"
 ایس نے اپنی ڈھیلی فرائک کے اندر ہاتھ ڈالے اور
 مصنوعی پیٹ نکال کر اس کے سامنے پھینک دیا۔ "یہ ہے۔"
 کرسٹن کی بھیجی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ "تم پریسٹ
 نہیں تھیں۔ تم... نے دھوکا دیا۔"
 ایس اس کی طرف جھکی۔ "ہاں، تم جیسے شخص کو دھوکا
 دینا ہی ٹھیک تھا۔ میں آٹھ مہینے سے یہاں تمہارا انتظار کر رہی
 تھی اور یہ وقت میں نے بہت مشکل اور صبر سے گزارا۔"
 نیچی نے کرسٹن کی شریان کاٹ دی تھی، اسے مرنے
 میں ایک منٹ لگا تھا۔ اب تک ایس مسکرا رہی تھی لیکن اس
 کے سرے ہی اس کی آنکھوں میں غمی جھلکانے لگی تھی۔ اس
 نے کان کی دیوار پر لگا فون اٹھایا اور ایک نمبر طایا، رابطہ
 ہونے پر اس نے کہا۔ "جان، میں بات کر رہی ہوں...
 سب پلان کے مطابق ہوا... ہاں وہ زندہ نہیں ہے۔"
 کال کاٹ کر وہ کرسی پر آ بیٹھی تھی۔ چند لمحوں کرسٹن کو
 دیکھتی رہی پھر اس نے پولیس کا نمبر دیا تھا۔

منہ زور

سرزا امجد بیگ

ہر چیز اپنی حد میں اچھی لگتی ہے اور جو حد سے گزر جانے کو کوئی ہنر سمجھتے ہیں کہیں نہ کہیں نقصان بھی اٹھاتے ہیں۔ مگر یہ فارمولا اس کی سمجھ سے بالاتر تھا... محبت تو یہ شمار لوگ کرتے ہیں لیکن رسوائیاں ہر ایک کا دامن داغدار نہیں کرتیں۔ جبکہ یہاں تو گویا موقع کی ناک میں رہنے والے ہوس پرستوں کا بازار گرم تھا، ایسے میں اگر کسی کا گھر جل کر خاکستر ہو بھی گیا تو کیا ہوا... البتہ جلتی آگ کو بجھانے کے لیے مرزا امجد بیگ جیسے لوگ کسی نہ کسی روپ میں موجود رہتے ہیں۔ یہاں بھی دلائل کی برسات نے مہزکتے شعلوں کو ٹھنڈا کر دیا۔

محبت کی راکھ میں

سلگے جذبات کی

کافریاں

سال کی ایک دہائی پتلی لڑکی بھی تھی۔ فوزیہ یا تو مجھے ان کی کے بارے میں بتاتا بھوں کی سی یاد پھر ہو سکتا ہے۔ میں پھرے میں زیب النساء کیلی ہی آئی ہو...

میں نے انہیں بٹھایا اور رکی علیک سلیک کے بعد زیب النساء کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تو فرمائیں میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

زیب النساء کی عمر پچاس سے متجاوز تھی۔ وہ ایک ماہ سی گھریلو عورت نظر آتی تھی۔ اس کے ہمراہ آنے والی لڑکی کے نقش و نگار بڑی حد تک زیب النساء سے مشابہت رکھتے تھے۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق وہ زیب النساء کی بیٹی ہو سکتی تھی۔

"وسیل صاحب اعلیٰ صاحب نے ہمیں آپ کے پاس بھیجی ہے۔" اس نے پریشانی بھرے انداز میں کہا۔ پھر وہ میرے اندازے کی تصدیق کرتے ہوئے بولے۔ "میری بیٹی ہے، نورین"

منگل کی شام میں اپنے آفس میں بیٹھا تھا کہ میری سیکریٹری فوزیہ نے یہ فریو انٹرکام مجھے اطلاع دی۔ "سر! زیب النساء آئی ہیں..."

"کون زیب النساء؟" میں نے بے ساختہ پوچھا۔ "سر! وہ جو پہلے بھی دو تین بار آپ کا پوچھ کر گئی ہیں۔" فوزیہ نے بتایا۔

"ادہ! اچھا وہ۔" میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے، انہیں اندر بھیج دو۔"

آج جب میں عدالتی کھیلوں سے ٹٹ ترنا کر اپنے آفس آیا تو میری سیکریٹری فوزیہ نے مجھے بتایا تھا کہ کورنگ سے زیب النساء کی کوئی عورت مجھ سے ملنے آئی تھی۔ اس نے کچھ دیر میرا انتظار کیا، پھر دوبارہ آنے کا کہہ کر کہیں چلی گئی تھی اور وہ اب آئی تھی۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد زیب النساء میرے چیمبر میں داخل ہوئی۔ وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ بائیس بیس

میں نے وہ طرف دیکھتے ہوئے ریب صاحب سے کہا: "میں نے اس طرف سے دیکھا کہ وہ کبھی نہیں آئے گا۔" "خوش خبر ہو کہ صاحب! اس سے جواب دیا۔ وہ بہت خوش ہوئے۔" "میں نے اس سے کہا کہ وہ کبھی نہیں آئے گا۔" "خوش خبر ہو کہ صاحب! اس سے جواب دیا۔ وہ بہت خوش ہوئے۔"

میں نے کانٹہ قلم سنبھال لیا اور گہری سنجیدگی سے پڑھا۔ آپ کا مسد کیا ہے؟ "میں نے اس کا جواب دیا: "وہ بچکچکاتے ہیں۔"

"کاشف کو کیا ہو گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔ "کاشف کو پولیس نے گرفتار کر لیا ہے۔" وہ بتاتی ہوئی آواز میں بولی۔

"کس الزام میں؟" میں نے پوچھا۔ "کاشف پر پولیس نے الزام عائد کیا ہے کہ وہ ایک قاتل ہے۔" وہ روہی ہوئی۔ "دیکھ صاحب، میں جانتی ہوں، کاشف اس قسم کی حرکت نہیں کر سکتا۔ اس کی گرفتاری کے پیچھے مجھے کوئی گہری سازش نظر آ رہی ہے۔"

"ہوں۔۔۔۔۔" میں گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر پوچھا: "یہ نادرہ کون تھی اور آپ کے بیٹے کاشف سے اس کا کیا تعلق تھا؟"

"نادرہ۔۔۔۔۔" وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بتانے لگی۔ "نادرہ بھی کورنگی ہی میں رہتی تھی۔ ہم سے دو گلیاں پہچوز کر کے کاٹ کر لے کر آیا تھا۔ کاشف سے اس کے تعلق کا پتہ نہ تھا۔" "کاشف تو قاتل ہے۔ اس نے گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

"کاشف، نادرہ کو پسند کرتا تھا۔۔۔۔۔"

اسے قتل کیسے کر سکتا ہے؟" میں نے انھیں راہ نگر سے اس کی طرف دیکھا۔ "میں نے اس کو تپائی میں کاشف سے کہا کہ وہ اس سے ملے۔" وہ سب سے میری جانب دیکھ رہے تھے۔ "یہ تو وہی وہی ہے یا پھر کاشف اس کیس میں جھڑپ کر رہا ہے؟" "میں نے اس سے کہا کہ وہ اس کیس میں جھڑپ کر رہا ہے۔"

"پولیس کی غلط اور خوش فہمیاں تو کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہیں۔" میں نے پھر سے ہونے لگے میں کہا۔ "البتہ کسی سازش کے ذریعے پھنسانے والی بات کسی خفیہ ضمنی کی بنیاد پر نہیں کی جاسکتی۔ آپ کی نظر میں کاشف کا کیا حال ہے؟" "میں نے اس سے کہا کہ وہ اس کیس میں جھڑپ کر رہا ہے۔"

"میں نے اس سے کہا کہ وہ اس کیس میں جھڑپ کر رہا ہے۔" میں نے اس سے کہا کہ وہ اس کیس میں جھڑپ کر رہا ہے۔ "میں نے اس سے کہا کہ وہ اس کیس میں جھڑپ کر رہا ہے۔" میں نے اس سے کہا کہ وہ اس کیس میں جھڑپ کر رہا ہے۔

"میں نے اس سے کہا کہ وہ اس کیس میں جھڑپ کر رہا ہے۔" میں نے اس سے کہا کہ وہ اس کیس میں جھڑپ کر رہا ہے۔ "میں نے اس سے کہا کہ وہ اس کیس میں جھڑپ کر رہا ہے۔" میں نے اس سے کہا کہ وہ اس کیس میں جھڑپ کر رہا ہے۔

"میں نے اس سے کہا کہ وہ اس کیس میں جھڑپ کر رہا ہے۔" میں نے اس سے کہا کہ وہ اس کیس میں جھڑپ کر رہا ہے۔ "میں نے اس سے کہا کہ وہ اس کیس میں جھڑپ کر رہا ہے۔" میں نے اس سے کہا کہ وہ اس کیس میں جھڑپ کر رہا ہے۔

"میں نے اس سے کہا کہ وہ اس کیس میں جھڑپ کر رہا ہے۔" میں نے اس سے کہا کہ وہ اس کیس میں جھڑپ کر رہا ہے۔ "میں نے اس سے کہا کہ وہ اس کیس میں جھڑپ کر رہا ہے۔" میں نے اس سے کہا کہ وہ اس کیس میں جھڑپ کر رہا ہے۔

"جی ہاں کل! وہ تائیدی انداز میں بولی۔" اور یہی بات نادرہ کے گھر والوں کو پسند نہیں آئی تھی۔ "وہ بولتے بولتے اچانک خاموش ہو گئی تو میں نے پوچھا: "اسی نے انہوں نے کیا کیا؟"

"اسی نے انہوں نے نادرہ کا رشتہ کیس اور طے کر دیا تھا۔ وہ پھر سے ہونے لگے میں بولی۔ "ایک ماہ بعد، وہ اور فیصل کی شادی ہونے والی تھی۔" وہ قہقہے بھر کے لیے پوچھا: "جی ہاں کل! وہ تائیدی انداز میں بولی۔"

"میں نے اس سے کہا کہ وہ اس کیس میں جھڑپ کر رہا ہے۔" میں نے اس سے کہا کہ وہ اس کیس میں جھڑپ کر رہا ہے۔ "میں نے اس سے کہا کہ وہ اس کیس میں جھڑپ کر رہا ہے۔" میں نے اس سے کہا کہ وہ اس کیس میں جھڑپ کر رہا ہے۔

"میں نے اس سے کہا کہ وہ اس کیس میں جھڑپ کر رہا ہے۔" میں نے اس سے کہا کہ وہ اس کیس میں جھڑپ کر رہا ہے۔ "میں نے اس سے کہا کہ وہ اس کیس میں جھڑپ کر رہا ہے۔" میں نے اس سے کہا کہ وہ اس کیس میں جھڑپ کر رہا ہے۔

"میں نے اس سے کہا کہ وہ اس کیس میں جھڑپ کر رہا ہے۔" میں نے اس سے کہا کہ وہ اس کیس میں جھڑپ کر رہا ہے۔ "میں نے اس سے کہا کہ وہ اس کیس میں جھڑپ کر رہا ہے۔" میں نے اس سے کہا کہ وہ اس کیس میں جھڑپ کر رہا ہے۔

"میں نے اس سے کہا کہ وہ اس کیس میں جھڑپ کر رہا ہے۔" میں نے اس سے کہا کہ وہ اس کیس میں جھڑپ کر رہا ہے۔ "میں نے اس سے کہا کہ وہ اس کیس میں جھڑپ کر رہا ہے۔" میں نے اس سے کہا کہ وہ اس کیس میں جھڑپ کر رہا ہے۔

نورین ایک ہی سانس میں بہت کچھ بتانے کے بعد خاموش ہوئی تو میں نے پوچھا: "صوفیہ کیس ہے؟" "صوفیہ ہمارے پڑوس میں رہتی ہے وکیل صاحب! نورین نے پھر سے ہونے لگے میں جواب دیا۔ "اس کا گھر ہمارے گھر اور زیر تعمیر عمارت کے بیچ میں ہے اور یہ صوفیہ، نادرہ کی بہت گہری دوست ہے۔ نادرہ اکثر صوفیہ سے ملنے اس کے گھر آتی رہتی تھی۔"

"ہوں۔۔۔۔۔" میں نے سوچ میں ڈوبے لگے میں کہا۔ "صوفیہ نے پولیس والوں کو بتایا ہے کہ نادرہ اور کاشف اکثر رات کی تاریکی میں اس زیر تعمیر عمارت میں ملاقاتیں کیا کرتے تھے۔" ریب التماساً وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "اس کے اسی بیان پر پولیس والوں نے ہمارا دروازہ ہجایا۔ ہم سے نادرہ کے قتل کے بارے میں سوالات کیے۔ جب ہم نے لاعلمی ظاہر کی تو وہ سیدھے کاشف کی دکان پر پہنچے اور اسے نادرہ کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ کاشف کی گرفتاری کے بارے میں دکان والوں نے سہ پہر میں فون کر کے ہمیں بتایا اور ہم ماں بٹی پریشانی میں بھاگ دوڑ کرتے ہوئے پالا خراپ تک پہنچ گئے ہیں۔"

"اس کے علاوہ آپ اس واقعے کے بارے میں اور کیا جانتی ہیں؟" میں نے قہقہہ کو اپنی آنکھوں میں گھساتے ہوئے سوال کیا۔ "میں جو کچھ معلوم تھا وہ آپ کو بتا دیا۔" ریب التماساً بڑی رسائی سے بولی۔ "اس کے علاوہ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ کاشف قاتل نہیں ہو سکتا۔ وہ تو نادرہ سے محبت کرتا تھا، اس کی جان کیسے لے سکتا ہے؟"

ایک بیٹے کے لیے اس کی ماں کے جذبات کی اپنی جگہ بڑی اہمیت ہوتی ہے لیکن عدالت جذبات و احساسات کے بجائے ثبوت اور منطقی دلائل کو اہمیت دیتی ہے لہذا میں نے توجہ سے ریب النسا کی بات سنی اور سوال کیا۔

"نادرہ کی فیصل سے منطقی ہو جانے پر کاشف کا رد عمل کیا تھا؟"

"اسے اس منطقی اور بعد ازاں شادی کی تاریخ مقرر ہو جانے کا دکھ ہوا تھا۔" ریب النسا نے جواب دیا۔ "وہ بہت ہی اداس اور کھویا کھویا سا رہنے لگا تھا۔"

"نادرہ کی کیا کیفیت تھی؟" میں نے پوچھا۔ "ظاہر ہے جناب۔۔۔۔۔ اسے بھی یہ شادی پسند نہیں تھی۔" ریب النسا نے سادہ سے لہجے میں بتایا۔ "وہ کاشف کو چاہتی تھی اور شادی بھی اسی کے ساتھ کرنے کی خواہاں تھی۔"

لیکن بے چاری گھر والوں کی مرضی کے سامنے مجبور تھی۔
 "کیا کاشف نے نادرہ کو کسی جرأت مندانہ اقدام کے لیے اس کے بے کسانے کی ہوشش نہیں کی تھی؟" میں نے معنی خیز انداز میں باری باری دونوں کی جانب دیکھا۔
 "میں کچھ بھی نہیں دیکھ سکتی صاحب! زہیب اللہ نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

تورین میرا اشارہ پر خوشی سمجھ گئی تھی، جلدی سے بولی۔ "بھائی بہت ہی صلح پسند انسان ہیں۔ ان کے اندر کسی انقلابی اقدام کی جرأت نظر نہیں آتی۔ اس موقع پر انہوں نے نادرہ ہی کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ جو قسمت میں لکھا ہوگا، ہوتا تو وہی ہے۔ کسی احتجاج یا داوے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

"اگر کاشف اس انداز میں سوچنے کا عادی ہے تو پھر واقعی وہ انتہائی امن پسند اور صلح جو انسان ہے۔" میں نے کہا۔ "عرف عام میں فی زمانہ ایسے لوگوں کو بے وقوف یا بزدل بھی کہا جاتا ہے۔" میں نے لمبائی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر افسوس سے بولے۔

"دردنا ایسے مواقع پر تو عموماً لڑکا سینڈ لیتا ہے اور اپنی محبت کو حاصل کرنے کے لیے ہر جائز و ناجائز راستہ اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے جبکہ کاشف نے نادرہ کو یہ سمجھایا کہ اس کے گھر والے جہاں چاہتے ہیں، وہ چپ چاپ شادی کرے۔" میں نے کہا۔

میں نے سوالیہ نظر سے تورین کی طرف دیکھا تو وہ اثبات میں گردن ہلا کر رہ گئی۔

میں نے زہیب اللہ سے سوال کیا۔ "گزشتہ رات کاشف کتنے بچے گھر آیا تھا؟"

"بہن کوئی آٹھ بچے۔" اس نے جواب دیا۔ "دکان سے اس کی چھٹی سات بچے تک ہو جاتی ہے۔ وہ ساڑھے سات یا زیادہ سے زیادہ آٹھ بچے گھر پہنچ جاتا ہے۔"

"کاشف گزشتہ رات آٹھ بچے گھر آیا تھا۔" میں نے رف پیڈ پر قلم چلاتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں کہا پھر زہیب اللہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "اس کے بعد وہ گھر سے باہر تو نہیں گیا تھا؟"

"جی گئے تھے۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے پوچھا۔ "کہاں گیا تھا؟"
 "پنے دوستوں سے گپ شپ کرنے۔" اس نے بتایا۔ "یہ اس کا معمول ہے کہ دکان سے آنے کے بعد وہ ہاتھ منہ دھو کر فریش ہوتا ہے، پھر ہم لوگ مل کر ایک ساتھ

رات کا کھانا کھاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ محلے کے دوستوں کے ساتھ گپ شپ کرنے کے لیے گھر سے نکل جاتا ہے۔"
 "اور اس کی واپسی کب تک ہوتی ہے؟"
 "وہ دس ساڑھے دس بجے تک واپس آ جاتا ہے۔"
 "کیا گزشتہ رات بھی وہ دس، ساڑھے دس بجے تک واپس آیا تھا؟"

"میں بہت تھکی ہوئی تھی۔" زہیب اللہ نے جواب دیا۔ "اس لیے رات کے کھانے کے فوراً بعد سو گئی تھی۔" پھر اس نے تورین کی جانب دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔ "پچھلی رات وہ کب واپس آیا تھا، نہیں پتا ہوگا۔"

"بھائی آدمی رات کو واپس آئے تھے۔" تورین نے بڑی رसान سے جواب دیا۔ "میں اس وقت جاگ رہی تھی اور میں نے ہی ان کے لیے دروازہ کھولا تھا۔ اس وقت رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔"

"کیا آپ نے بھائی سے پوچھا تھا کہ وہ اتنی رات تک کہاں تھا؟" میں نے تورین کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ "دوہین کے مطابق تو وہ دس، ساڑھے دس بجے تک واپس آ جاتا تھا۔"

"جی نہیں۔" تورین نے نفی میں گردن ہلائی۔ "میں نے اس بارے میں ان سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔"

میں نے زہیب اللہ سے پوچھا۔ "کیا آپ کاشف کے ان دوستوں کو گواہی کے لیے آمادہ کر سکتی ہیں، گزشتہ رات جن کے ساتھ وہ گپ شپ کر رہا تھا؟"

"جی میں یہ کام کر لوں گی۔" میں نے مطمئن انداز میں کہا پھر پوچھا۔ "کاشف کو کس تھانے کی حوالات میں رکھا گیا ہے؟"

اس نے متعلقہ تھانے کا نام بتا دیا۔

"کیا آپ لوگ کاشف سے ملاقات کے لیے تھانے گئی تھیں؟"

"گئے تھے۔ مگر پولیس والوں نے ہمیں اس سے ملنے نہیں دیا۔"

"انہوں نے کیا کہا تھا؟" میں نے استفسار کیا۔

"وہ کہتے ہیں، کل صبح کاشف کو عدالت میں پیش کیا جائے گا تو وہاں جس کو ملتا ہو، اس سے مل لے۔" زہیب اللہ نے جواب دیا۔

میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھیں خاتون! میں ایک بات واضح کر دوں کہ قتل کے ملزم کی ضمانت نامہ ممکن کی حد تک مشکل ہوتی ہے مگر آپ

بے گناہ ہیں، میں اپنی سی پوری کوشش کروں گا۔ آگے نہ بڑھیں۔" ٹکڑے ہوئے۔
 "بہت بہت شکر یہ دیکھل صاحب! وہ منونیت بھر۔" ایک میں بولی۔

اس کے بعد میں نے زہیب اللہ سے ہتی نصیب رسول کی دیکھ کر بے سوئے لہجے میں کہا۔ "میں آج رات ہی کی بات تھا۔ جہاں کاشف سے ملاقات کر لیتا ہوں۔ ممکن ہے کہ اس سے کوئی نئی بات پتا چل جائے۔ بھاری ملاقات کل ہو گئی۔"

اس نے ایک بار پھر میرا شکریہ ادا کیا اور سلام کر کے، بیٹنی کے ساتھ میرے دفتر سے رخصت ہو گئی۔

XXX

میں نے قارئین کو اس بات پر اعتراض ہے کہ میں اپنے لیے جیسے کوئی عدالت کا کرائی لیتا ہوں۔ جو بھی شخص ملاقات کی حیثیت سے میرے پاس آتا ہے، میں اس پر ہی جرم شروع کر کے درجنوں سوالات پوچھتی ہوں۔ تو اس سلسلے میں، فاضل عرض کرتا چلوں کہ ہر شخص کا اپنا ایک اصل ہوتا ہے، کام کرنے کا۔ سو، میرا بھی ہے، چونکہ یہ دوسرے اعلیٰ سے بہت مختلف ہے، اس لیے بھی لوگوں کو عجیب سا لگتا ہے۔

اللہ کا مجھ پر لاکھ لاکھ گرم رہا ہے کہ اگر میں شپ کے وقت سے میرے پاس کلاس کی بھی کی نہیں رہی لہذا میں ہر بار سے غیرے غور سے غور سے کاہنیں نہیں پکڑتا۔ جب تک میں خود اپنے کلاس سے مطمئن نہ ہو جاؤں، میں اس کا ہاتھ میں نہیں لیتا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے آج تک کسی بے گناہ کو سزا دلوائی ہے اور نہ ہی کوئی گناہ گار میری بات سے بچنے میں بری ہو ہے۔ میں اس احسان کے لیے دعا کرتی ہوں کہ وہ کم ہے۔

آفس کی مصروفیات سے فارغ ہونے کے بعد میں ہاتھ سے ملے متعلقہ تھانے پہنچ گیا۔ میں نے اپنی کار کو تھانے کی دھڑری وال کے ساتھ پارک کیا اور بڑے سانس سے ہاتھ دھوئے ہوئے انچارج صاحب کے کمرے سے ملنے حاصل کر دی۔

تورین نے اپنی اس وقت اپنے کمرے میں موجود نہیں تھا۔ وہ کمرے میں بیٹھے ایک اے ایس آئی سے میری ملاقات ہوئی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"پتا صاحب کہاں ہیں؟"

گہری نظر سے میرا جائزہ لیا پھر اکھڑے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ "آپ کون۔۔۔ اور انچارج صاحب سے آپ کو کیا کام ہے؟"

"میرا نام امجد ہے۔" میں نے دانستہ اپنا اوجھڑا تعارف کرایا۔ "اور کام تو میں انچارج صاحب ہی کو بتاؤں گا۔" "انچارج صاحب اس وقت راولپنڈی پر ہیں۔" وہ سرسری لہجے میں بولا۔ "ان سے ملنا ہے تو رات میں کسی وقت آ جائیں۔"

مجھے تفریح کی سوچھی۔ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "تو آپ کے خیال میں اس وقت دن ہے۔"

اس نے قہقہے آمیز نظر سے مجھے گھورا اور بولا۔ "میرا مطلب تھا، جب انچارج صاحب تھانے میں موجود ہوں، آپ اس وقت آ جائیں۔"

"جب تک تو بہت دیر ہو جائے گی۔" میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" وہ سیدھا ہو کر پوچھ گیا۔

"کس بات کی دیر ہو جائے گی؟"

"کاشف سے ملاقات میں دیر ہو جائے گی۔" میں نے سنجیدگی کا انداز برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

"کاشف؟" اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

"کون کاشف؟"

میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "وہ تو جوان جسے آپ لوگوں نے آج سہ پہر دو بجے صدر میں واقع ایک جیولر کی دکان سے گرفتار کیا ہے۔۔۔ قتل کے الزام میں۔"

"آ۔۔۔ آپ اس ملزم سے نہیں مل سکتے۔" وہ انتہائی روکھے لہجے میں بولا۔

"میں کاشف کا وکیل ہوں، مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "آپ مجھے ملزم سے ملنے سے نہیں روک سکتے۔"

یہ سنتے ہی کہ میں ایک وکیل ہوں وہ بے حد عطا ہو گیا اور خامے جارحانہ لہجے میں بولا۔ "آپ جو کوئی بھی ہیں، رات میں آجائیں جب انچارج صاحب تھانے میں موجود ہوں۔ ان کی اجازت نہیں ہے۔"

میں نے میز پر رکھے مکی فون سیٹ کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اجازت کا مسئلہ بھی مجھ حل کر دیتے ہیں۔"

وہ بڑبڑ گیا۔ "آپ انچارج صاحب کو فون کریں گے۔"

"نہیں۔" میں نے ریسورٹ لیتے ہوئے کہا۔ "پھر۔۔۔" اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”میں آپ کے انچارج صاحب کے انچارج صاحب کو فون کروں گا۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”اس مسئلے والی جی صاحب ہی حل کریں گے۔“

”جناب۔۔۔ یہ آپ کی غصہ کر رہے ہیں۔“

اس نے میرے ہاتھ سے ریسیور جھپٹتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو حوالہ دے دیتا ہوں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ۔“

میں نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”واقعی، آئی جی صاحب کی بڑی پادشہی ہے۔ فون کرنے سے پہلے ہی میرا مسئلہ حل ہو گیا۔“

اے ایس آئی نے کھا جانے والی نظر سے مجھے دیکھا اور دروازے کی جانب منہ کر کے آواز لگائی۔ ”خادم حسین۔۔۔۔۔۔“

اگلے ہی لمحے ایک کانشیل کمرے کے اندر حاضر ہو گیا۔ یقیناً وہ خادم حسین ہی تھا۔ اے ایس آئی نے مذکورہ کانشیل سے کہا۔

”خادم حسین۔۔۔۔۔۔ امجد صاحب کو اس حوالاتی سے پاس لے جاؤ جسے آج دن میں قتل کے الزام میں گرفتار کر کے تھانے لایا گیا ہے۔“

خادم حسین نے اثبات میں سر ہلایا اور میں اس کے ساتھ چل پڑا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد میں کاشف کے سامنے کھڑا تھا۔ آہنی سلاخوں کی دوسری جانب وہ حوالات کی برہنہ زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ کاشف کی عمر ستائیس کے آس پاس رہی ہوگی۔ وہ ایک صحت مند شخص تھا۔ اسے بلاشبہ وجہہ و شکلیں کہا جاسکتا تھا تاہم اس وقت وہ بڑی کمپری کی حالت میں، اکڑوں بیٹھا اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

مجھے اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر اس نے نگاہ اٹھائی پھر وہ کانشیل خادم حسین کی جانب سولہ انداز میں نکلے گا۔ کانشیل نے اس سے کہا۔

”تمہاری ملاقات آئی ہے۔ ان سے بات کرو۔۔۔۔۔۔“

ظاہر ہے، وہ مجھے نہیں جانتا تھا۔ اس سے پہلے ہمارا کبھی سامنا نہیں ہوا تھا۔ وہ فرش سے اٹھا اور تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد چلتے ہوئے آہنی سلاخوں کے قریب آ گیا۔ میں نے گردن کھما کر کانشیل کی طرف دیکھا اور اپنا ہاتھ ہپ پاکٹ کی طرف لے جاتے ہوئے اس سے کہا۔

”خادم حسین! سنا ہے، آج کل بہت مہنگائی ہو گئی ہے۔“

”جی صاحب! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے۔“

چار سے چار روپے لیٹر اور ٹوسٹ آٹھ سے پانچ روپے ہو گیا ہے۔۔۔۔۔۔ قاتی چیزوں کا بھی کچھ نہ پوچھیں جناب۔

میں نے جب میں سے بخواب آمد کیا اور نوٹس سے چپس کا ایک کرارا سا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”خادم حسین! تمہارا انعام ہے، رکھ لو۔“

حوالاتی سے دس منٹ تک تنہائی میں بات کرنا پڑا ہوں۔ اتنی دیر میں تم باہر گھوم پھر آؤ اور ایک کڑا دودھ پتی بھی پی لینا۔“

اس نے خوش ہو کر میرے ہاتھ سے چپس ڈار پکڑ لیا اور جانے کے لیے پلٹا۔ میں کانشیل کی جانب مطمئن ہو کر کاشف کی جانب متوجہ ہو گیا اور اپنا تہہ کرتے ہوئے کہا۔

”میرا نام مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہے۔ تم والدہ نے مجھے تمہارا وکیل مقرر کیا ہے۔ میں تمہیں مصیبت سے نجات دلاؤں گا جس میں اس وقت گرفتار ہیں۔“

اس نے تنہا انداز نظر سے مجھے دیکھا اور بولا۔

”کیا میں صاحب۔۔۔۔۔۔“

”یکہ یہ کہ۔۔۔۔۔۔ میں تم سے جو بھی پوچھوں گا، سچا اور سیدھا جواب دو گے۔“ میں نے ایک ایک لفظ دہاتے ہوئے کہا۔

”جی بالکل۔“ وہ جلدی سے اثبات گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

میں نے اپنے بریف کیس میں سے چند ہدایت کر اس کی جانب بڑھا دی اور مخصوص مقامات پر اشارہ کر کے اس سے دستخط کر کے لیے کہا۔ ”ان تمام دست نامہ درخواست سمیت سرفہرست تمہیں۔“

جب اس نے میری ہدایت کے مطابق دست نامہ تو میں نے وہ کاغذات و پیس بریف کیس میں رکھ دیے اس کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

”کاشف مجھے بتاؤ، اصل معاملہ کیا ہے؟“

”اصل معاملہ۔۔۔۔۔۔“ وہ تھوک نکلے ہوئے ”اصل معاملہ یہ ہے جناب کہ میں بے گناہ ہوں۔ میں نادروہ قتل نہیں کیا۔“

”یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔“ میں نے تادیبی

میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم نے نادروہ قتل کیا ہوتا تو میں ہرگز ہرگز نہیں لیتا۔۔۔۔۔۔“ میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک مہر کی ساکھ پر ساندہ کرتے ہوئے کہا۔

”میں یہ جانتا چاہتا ہوں کہ جب تم نادروہ کے قاتل ہو، پھر پائیس نے کس بنیاد پر تمہیں اس کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا ہے؟“

”میں والوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے جناب۔“

وہ جلدی سے سر جھٹکتے ہوئے بولا۔ ”اور اس کا دماغ صوفیہ خراب کیا ہے۔“

”یہ صوفیہ وہی بڑی ہے نا۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”جو نادروہ کی رازدار کہتی ہے۔ اہ تمہارے اور نادروہ کے عشقہ محاطات سے اچھی طرح واقف ہے۔ اسی صوفیہ نے پوچھیں کہ بتایا ہے کہ تم نادروہ سے ریر تعمیر عمارت میں چھپ چھپ رملقاتیں کرتے تھے؟“

”جی ہاں۔۔۔۔۔۔ یہ ساری آگ اسی صوفیہ کی لگائی ہوئی ہے۔“

”اور یہ سنا دیتے ہوئے بولا۔“

”یہ سچ ہے کہ تم اس ریر تعمیر عمارت میں نادروہ سے ملاقاتیں کیا کرتے تھے جہاں سے اس کی لاش دریافت ہوئی ہے؟“ میں نے یہ دستور اس کی آنکھوں میں دھکتے ہوئے سوال کیا۔

وہ جڑبڑھوتے ہوئے بولا۔ ”ہاں! یہ بات درست ہے۔“

”اس کا مطلب ہے، تمہارے اور نادروہ کے بیچ خاصا شہیدہ تعلق تھا؟“

”جی ہاں، ہم ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔“

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”میں نے سنا ہے، نادروہ کے گھر والے تم دونوں کی بات سے سخت خلاف تھے۔“ میں نے سوالات کے سلسلے کو بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اور انہوں نے نادروہ کا رشتہ اس سے کس فیصل سے طے کر دیا تھا اور۔۔۔۔۔۔ ایک ماہ کے بعد ان کی شادی موت والی تھی؟“

”جی ہاں، یہی حقیقت ہے۔“

”مجھے یہ بھی بتا چد ہے کہ نادروہ، فیصل کو سخت پسند کرتی تھی؟“

”جی ہاں، آپ کو بالکل ٹھیک بتا چد ہے۔۔۔۔۔۔“

میں نے کاشف کے دل کا حال ٹٹولنے کے لیے اس سے ایک تیر چھوڑا اور ٹھہرے ہوئے بچے میں

کہا۔ ”پولیس نے موقف اختیار کیا ہے کہ تم نادروہ اور فیصل کے رشتے کے سخت خلاف تھے۔ تم نے نادروہ و فیصل کے خلاف خوب بھرا تھا اور اسے اکسالتے رہتے تھے کہ وہ تمہارے ساتھ کہیں فرار ہو جائے؟“

”یہ سراسر بگواس اور جھوٹ ہے۔“ وہ برہمی سے بولا۔ ”میں نے ہمیشہ نادروہ کو سمجھانے بچھانے کی کوشش کی تھی۔ بھاگ جانے کا ٹیڈیا اسی کا تھا لیکن میں نے اس کی مخالفت کی تھی۔ وکیل صاحب۔۔۔۔۔۔“ لمحاتی توقف کر کے اس نے گہری نظر سے میری آنکھوں میں دیکھا اور ٹھوس لہجہ میں بولا۔ ”میں ایک جون بہن کا بھائی ہوں۔ میں کسی لڑکی کو گھر سے بھاگنے کے بارے میں کیسے سوچ سکتا ہوں۔۔۔۔۔۔“

”یہ میرا نہیں، پولیس کا خیال ہے۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ”دودھ کے روزنی گزشتہ رات کھا نا کھانے کے بعد تم اپنے دوستوں سے کپ شپ کرنے گھر سے باہر نکلے تھے۔ میں تمہارے ان دوستوں کے نام جانتا چاہتا ہوں؟“

”ان دوستوں کے نام وسیم، آفتاب اور عارف ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”تمہاری چھوٹی بہن نورین نے مجھے بتایا ہے کہ گزشتہ رات تم لگ بھگ سڑھے بارہ بجے گھر واپس آئے تھے۔“ میں نے پوچھا۔ ”اتنی دیر تک تم اپنے دوستوں کے ساتھ کون سی کپ شپ کرتے رہے تھے؟“

”وہ بات دراصل یہ ہے وکیل صاحب۔“ وہ ایک پوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”میں نے پچھلی رات وسیم، آفتاب اور عارف کے ساتھ تو بس تھوڑی دیر تک کپ شپ کی تھی پھر میں عارف کے ساتھ چل گیا تھا۔۔۔۔۔۔“

”کہاں۔۔۔۔۔۔ تم عارف کے ساتھ کہاں چلے گئے تھے؟“

”پکچر دیکھئے۔“ اس نے جواب دیا۔

”اوہ۔۔۔۔۔۔“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”تم دونوں کو ہی پکچر دیکھئے گئے تھے؟“

اس نے ایک انگلی پکچر کا نام بتایا۔

میں نے پوچھا۔ ”کیا عارف اس بات کی گواہی دے گا کہ تم گزشتہ رات اس کے ساتھ آخری شو دیکھنے پکچر ہاؤس گئے تھے؟“

”کیوں نہیں۔۔۔۔۔۔ وہ ضرور گواہی دے گا۔“ وہ پورے یقین سے بولا۔

”اور وسیم و آفتاب کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

میں نے استفسار یہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ”وہ دونوں اس بات کی گواہی دیں گے کہ ان کے سامنے تم دونوں کچھ دیکھنے کے لیے گئے تھے اور اس سے پہلے انکی کے ساتھ گپ کر رہے تھے۔“

اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

میں نے اس سے مزید دو چار اہم سوالات پوچھے۔ پھر کاشیہاں خام حسین وہاں سے گھبراہٹ سے نکل کر ناپڑا۔ میں نے مناسب الفاظ میں اسے تسلی دلاسا دیا اور وہاں سے واپس آ گیا۔

XXX

آئندہ روز پولیس نے ملزم کاشف کو عدالت میں پیش کر کے اس کا ریمونڈ لینے کی کوشش کی۔ اس موقع پر میں نے اپنے موکل کی ضمانت کے لیے زور مارا لیکن مجھے اس مقصد میں کامیابی نہ ہو سکی جس بات کا مجھے پہلے سے بخوبی اندازہ تھا۔ عدالت نے دونوں جانب کے دلائل سننے کے بعد ملزم کی درخواست ضمانت کو رد کرتے ہوئے اسے سات روز کے ریمانڈ پر پولیس کسٹڈی میں دے دیا۔

گزشتہ رات جب میں کاشف سے ملاقات کرنے گئے تو یہ گویا تھا تو یہ بات میرے ذہن میں موجود تھی کہ اس کی ضمانت کی درخواست مسترد بھی ہو سکتی ہے لہذا میں نے اسے پولیس کی ”خاطر داری“ سے محفوظ رہنے کے کئی ایک مفید گرتا دیے تھے۔ مجھے اُمید تھی کہ ریمانڈ کی مدت کے دوران میں وہ پولیس کی مشق ستم بننے سے خود کو بچا لے گا۔

اس ایک ہفتے میں، میں اس کیس کے مختلف پہلوؤں پر غور و فکر کرتا رہا اور اس سلسلے میں، میں نے اپنے دیرینہ دوست اور زیب النساء کے خیر خواہ معروف صحافی خورشید عباسی سے بھی بہت مدد لی۔ عباسی صاحب ایک جتنا پر زور آدمی کہ انسان تھے۔ آئران کے اُسے کوئی کام لگا دیا جاتا تو وہ اس کے بارے میں باتوں سے بھی معلومات نکال کر لے آتے تھے۔

اس دوران میں دو مرتبہ زیب النساء بھی مجھ سے ملنے دفتر آئی۔ ایک دفعہ ایکلی اور ایک مرتبہ تورین کے ساتھ۔ وہ خاصی پریشان و رنجیدہ لگی ہوئی تھی۔ اس بے چاری کا پہلی مرتبہ پولیس اور عدالتی معاملات سے واسطہ پڑا تھا۔ میں نے اس کی سلی ور ظہین کے لیے اسے کیس کے مختلف زاویوں کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ میری وضاحت سے اسے خاصی حد تک سکون حاصل ہوا تھا۔

XXX

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے کیس کا جائزہ عدالت میں پیش کر دیا۔ استغاثہ کے گواہوں کے بیانات کے ساتھ ہی ملزم کا بیان بھی شامل رہا۔ ریمانڈ کے دوران میں پولیس کے نزدیکی میں ملزم جو بھی ریکارڈ کراتا ہے اسے ملزم کا ”اقبالی بیان“ کہا جاتا ہے۔ میں نے اپنے موکل کو پولیس کی ”مہربانیوں“ سے محفوظ رکھنے کے لیے جو ہدایات دی تھیں ان کے نتیجے میں میرے گواہوں نے پولیس کے حسب منشاء بیان لکھوا دیا تھا۔ یہ بات جانتے ہیں کہ پولیس کی تحویل میں دیے گئے کسی پر عدالت کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ عدالت کے ہاں ایک مخصوص طریقہ کار ہے جہاں واقعی شہادت گواہوں کے بیانات، ٹھوس حقائق، ناقابل تردید ثبوت و کلام کے زوردار دلائل کی روشنی میں فیصلے کیے اور سنا جاتے ہیں۔

عدالت کی ابتدائی کارروائی نہایت ہی غیر دلچسپ اور خشک ہوتی ہے لہذا میں آپ کو یوریت سے بچانے ہوئے دو چار قدم آگے لے جاتا ہوں یعنی عدالت کا قاعدہ کارروائی کی جانب۔ کوئی دو ماہ کے بعد اس مرحلے کی نوبت آئی تھی۔

اس روز عدالت کے کمرے میں، اس کیس سے متعلق تمام افراد موجود تھے۔ جج اپنی مخصوص نشست انصاف پر براجمان ہو چکا تو اس کے حکم پر کارروائی کا آغاز ہوا۔ جج نے فرد جرم پڑھ کر سنائی۔ ملزم نے صحت جرم۔ صاف انکار کر دیا۔ اس کے بعد استغاثہ کی جانب سے گواہوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

استغاثہ نے نصف درجن سے زیادہ گواہوں کی فہرست عدالت میں دائر کی تھی لیکن میں ان صفحات پر صرف انکی گواہوں کا ذکر کروں گا جن کا بیان یا گواہی کی اہمیت حامل ہوگی۔ اور اس سے پہلے پوسٹ مارٹم رپورٹ، استغاثہ کے موقف اور ملزم کے بیان کا مختصر تذکرہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتولہ نادرہ کی موت وقوع کی رات دس اور بارہ بجے کے دوران میں واقع ہوئی تھی۔ اسے گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ میڈیکل ایگزامینر کی رپورٹ میں بڑے واضح الفاظ میں ہوا تھا کہ مقتولہ کی موت کے حوالے کرنے سے پہلے نادرہ کے بدن پر مہاجرین کے بدن پر مہاجرین کی طرح سے بھی لگی نظر ہوتا تھا کہ قاتل نے اسے ہتھی

کا نشانہ بنے سے قبل سب رنجی سے رنجیدہ بھی تھا۔ مقتولہ کے جسم کے بعض حصوں پر دووب کے آثار بھی پائے گئے تھے۔ اس لئے کہ اس میں پدم، کشکوت بھی لگے گئے تھے مگر ان غایت کا خاصہ ہے کہ یوں کھلے عام انہیں ضابطہ تحریر میں نہ لایا جا۔

پولیس نے مقتولہ کی روتہ اور چادر کی شکل میں یہ موقع اختیار کیا تھا کہ مقتولہ کا وہ غمزہ کاشف سے محبت کرنی بھی ممکن مزم اس کے ساتھ سیدہ بی بی تھا۔ مقتولہ مزم سے ساتھ شادی کر کے ایک معتبر اور با عزت۔ مدگی گزرنے لگا تھا مگر مزم نے بھی اس معاملے میں سنجیدہ دلچسپی نہ برتیں کی تھی۔ اسی دوران میں جب مقتولہ کے گھر والوں نے اس کی شادی اس کے زمان فیصل سے کرنے کا نہ صرف فیصلہ کر لیا، بلکہ اس شادی کی تاریخ بھی مقرر کر دی تو مزم کو یقین ہو گیا کہ مقتولہ بہت جلد اس کے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ یہ نوک زیر تعمیر عمارت (جائے وقوعہ) پر اکثر ملاقاتیں کیا کرتے تھے۔ جب مقتولہ کی شادی میں ایک ماہ کا عرصہ باقی رہ گیا تو مزم نے ایک سوپے کچھے منصوبے کے تحت وقوعہ کی رات مقتولہ سے ملاقات کا پروگرام سیٹ کیا۔ جب مقتولہ حسب پروگرام مزم سے ملنے زیر تعمیر عمارت میں پہنچی تو پہلے وہ اس سے پیار محبت کی باتیں کرتا رہا پھر اس کے اندر کا شیطان جاگ اٹھا اور اس نے اپنی طاقت کے بل پر مقتولہ کو زیر کر کے بالجبر اپنی ناپاک و مذموم خواہش کی تکمیل کر لی۔ یہ اس کے منصوبے کا پہلا حصہ تھا۔ دوسرے حصے پر عمل کرتے ہوئے اس نے پکڑے جانے کے خوف سے بعد از اس مقتولہ کا گلا گھونٹ کر اسے موت کے سپرد کر دیا۔ مزم کو کسی بھی قیمت پر یہ گوارا نہیں تھا کہ مقتولہ کی شادی ہو اور وہ اس کے ہاتھ سے نکل جائے لہذا اپنے ہوس ناک عزائم کی تکمیل کے بعد مقتولہ کو ٹھکانے لگا کر اس نے اپنا مقصد حاصل کر لیا تھا۔

عدالت کے روبرو اپنے بیان کو پکارا کرتے ہوئے اس کیس کے مزم و میرے موکل کاشف محمود نے بتایا تھا کہ وہ مقتولہ سے بچی اور سنجیدہ محبت کرتا تھا۔ اس نے اس بات کا بھی قرار کیا کہ وہ زیر تعمیر عمارت میں چھپ چھپ کر مقتولہ سے ملاقات کر کرتا تھا لیکن مقتولہ کے حوالے سے کبھی اس کے ذہن میں شیطانی خیالات کا گزر نہیں ہوا۔ اس کی محبت پاکیزہ بھی اور وہ کسی بھی قیمت پر اپنی محبت کو دغا دہانہ نہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مزم نے اس مرمی قہر میں بھی کہ مقتولہ کی گہری سبکی صوفیانہ کے معاملات

محبت کی رزدار تھی۔ اپنے بیان میں اس نے ایک انگشت یہ بھی کیا کہ مقتولہ کی منگنی مجھے پہلے اس نے منگنی۔ مدینہ کے ایک صاحب سے اس نے منگنی کی تھی۔ مقتولہ و پسند کرتا ہے اور اس سے شادی کا جواب دے گا۔ مقتولہ کے مدینہ۔ اس کے خد کا کوئی جواب دے گا۔ چند روز کے بعد پتا چلا۔ نبیوں نے مقتولہ کو اس کے فیصل سے منسوب کر دیا ہے۔ اس بات کا مزم کو دکھ تو نہ ہوا تاہم یہیں وہ چونکہ فطری طور پر ایک صانع پسند نہیں تھا۔ اس لیے اس نے کوئی جارحانہ رویہ نہ کرنے کے بجائے حالات سے سمجھتا رہا۔ اور مقتولہ کو بھی یہی سمجھا کہ وہ مقتولہ کے سامنے سپرد اہل۔ لیکن مقتولہ شست تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھی۔ مقتولہ نے مزم سے یہ بھی بھلی کہ وہ دونوں جب چاہیں کھیں بھاگ جاتے ہیں لیکن مزم اس آئیڈیا پر عمل کرنے کے لیے راضی نہ ہوا۔ وقوعہ کی رات بھی انہوں نے زیر تعمیر عمارت میں ایک مختصر ملاقات کی بھی اور (کاشف) نے مقتولہ کو ایک بار پھر اچھا برا سمجھانے کی کوشش کی تھی اور پھر اسے وہیں چھوڑ کر وہ اپنے دوست کے ساتھ بچھڑ بیٹھے چلا گیا تھا۔

ویل استغاثہ کی فرمائش پر مزم کو اس کے حوالے دیا گیا۔ مزم نے جیسے ہی پتا بیان دیکھا کہ اس نے استغاثہ جرح کے لیے کیڑا پا کس کے قریب پہنچ گیا پھر اس کی ہتھکڑیوں میں دھبے موئے سوال کیا۔

”کیا یہ سچ ہے۔ تم چھپ چھپ کر مقتولہ سے زیر تعمیر عمارت میں ملاقاتیں کیے کرتے تھے؟“

”جی ہاں۔ یہ سچ ہے۔“ اس نے بڑی رسوائی سے جواب دیا۔ ”میں اپنے بیان میں اس بات کی وضاحت کر چکا ہوں۔“

”کیا یہ بھی درست ہے کہ مقتولہ کی شادی اس کے ر کے ہاتھ سے ہوئے گا کہ اس نے انہیں بہت اچھا دیکھا؟“

”فطری بات ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ میں مقتولہ کے ساتھ بچی و رکھری محبت کرتا تھا۔ اس کے ہاتھ شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس کی شادی کہیں ورنہ ہو۔ کان مجھے یقیناً دکھائے دیتا ہوتا چاہیے تھا۔“

”جی اور کھری محبت؟“ ویل استغاثہ نے طنز لگے میں کہا پھر اس کی ہتھکڑیوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ”مقتولہ کے ساتھ وقوعہ کی رات زیر تعمیر عمارت میں جو مجھ پیش آیا، وہ تمہاری بچی و رکھری محبت کا نتیجہ تھا۔ میں مزم نے قدرے ساری سے جواب دیا۔ ویل

صاحب جو حقیقت تھی وہ میں نے آپ کو بتا دی ہے اب آپ اس سے جو بھی نتیجہ اخذ کریں، آپ کی مرضی ہے۔“

مزم نے اپنے حسیہ بیوت میں معزز عدالت وینا یہ اب مزم نے مقتولہ کا اس کے کڑے فیصل سے رشتہ طے کرانے کے بعد مقتولہ کے والدین کو کوئی خط لکھا تھا۔“

”جی ہاں۔“ مزم نے اثبات میں تردید نہ کی۔ ”میں نے خط ضرور لکھا تھا مگر مقتولہ کا رشتہ طے ہونے سے پہلے۔“

ویل استغاثہ نے اس کے جواب پر کوئی توجہ نہیں دی اور سلسلہ جرح کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”اور اس خط میں تم نے مقتولہ کے والدین کو خطرناک نتائج کی دھمکیاں بھی دی تھیں؟“

”اس بات میں کوئی حقیقت نہیں۔“ مزم نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ”میں نے مقتولہ کے والدین کو یہ باور کرایا کہ کوشش کی تھی۔ میں ان کی بیٹی سے شادی کرنے کے لیے سنجیدہ ہوں اور مقتولہ بھی مجھے دس دھان سے چاہتی ہے۔ یہ وہ وہاں ہماری محبت سے دشمنی کرنے کے بجائے ہمیں ایک معتبر رشتہ میں باندھنے کی کوشش کریں۔“

”یہ تو تم کہہ رہے ہو نا۔“ ویل استغاثہ نے شک جہری نظر سے مزم کی جانب دیکھا۔ ”جبکہ مقتولہ کے والدین کا موقف اس سے برعکس ہے۔ تم نے انہیں جن خطرناک نتائج سے دانت کی کوشش کی تھی، وقوعہ کی رات باختر تم نے ان پر عمل بھی کر دیا۔“

”میں نے ایسا کچھ نہیں کیا جو آپ بیان کر رہے ہیں۔“ مزم نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”میں مقتولہ کو کاٹا جھونے کے برابر بھی تحلیف دینے کا تصور نہیں کر سکتا۔ اسے سب آبرو کر کے نکل کرنا۔ کوئی توقف کر کے اس سے یہ جھجھکی لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”اس گستاخانہ فعل کے بارے میں سوچنے کا تو سوال نہ پیدا نہیں ہوتا۔ میں سمجھتا ہوں، مجھے کسی گہری سازش کے تحت اس کیس میں پھسانے کی کوشش کی گئی ہے۔“

اس میں کا مزم اور میرا موکل بڑی بہادری کے ساتھ ویل استغاثہ کے سوالات کے جواب دے رہا تھا۔ مجھے یہ اندیشہ بھی کہ وہ اس اعتبار کا مظاہرہ کر پائے گا۔

”جب کوئی شخص قانون کے جواب میں پوری طرح جبراً پہنچتا ہے اور سے فرار کے لیے کوئی راستہ نظر نہیں آتا تو وہ اس کی باتیں کرتا ہے۔“ ویل استغاثہ نے جارحانہ انداز میں کہا۔ ”وہ سارے کا سارا الزام کسی نامعلوم شخص کی سار

پر ڈال دیتا ہے، اور خود کو معصوم و بے گناہ ثابت کرنے کے لیے اس کی کہانیاں گھڑ دیتا ہے جس سے وہ لوگوں کی ہمدردیاں سمیٹ لے لے میں۔“ کان توقف کرے۔ اس نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”لیکن عدالت لوگوں کے جذباتی بیانات کی روشنی میں فیصلے صادر نہیں کرتی بلکہ عدالت کی کسوٹی ہر بات کو ٹھوس حقائق اور دلائل کی بنا پر پرکھتی ہے۔“

ویل استغاثہ نے اس تقریر پر مزم نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ویل استغاثہ نے استفسار کیا۔ ”کیا یہ سچ ہے کہ مقتولہ کی ایک بہلی تمہارے پڑوس میں رہتی ہے؟“

”جی ہاں۔ یہ سچ ہے۔“ مزم نے اثبات میں جواب دیا۔ ”اس بڑی کا نام صوفیہ ہے۔ صوفیہ کا ہمارے گھر میں بھی آتا چاہتا ہے۔“

”صوفیہ نامی وہ لڑکی تم دونوں کے معاملات محبت سے اچھی طرح آگاہ تھی۔“ ویل استغاثہ نے جرح کے سلسلے کو دور کر کے ہوئے کہا۔ ”اسی صوفیہ کے توسط سے تم لوگوں کی ملاقات طے ہو کر گئی تھی؟“

”آپ بالکل غیب کہہ رہے ہیں۔“ مزم نے مختصر جواب پر اکتفا کیا۔

”کیا وقوعہ کی رات بھی تم دونوں صوفیہ کے توسط سے ملے تھے؟“ ویل استغاثہ نے بڑے جارحانہ انداز میں سوال کیا۔

”جی ہاں۔“ ویل استغاثہ نے اسی طرح سے مزید دو تین تیز دھند سوالات کیے پھر جرح ختم کر دی۔ اپنی پاری پر میں جج کی اجازت حاصل کر کے اکوڑا پاس کے قریب چلا گیا۔ میں نے مزم سے نہایت ہی مختصر جرح کی۔

”کاشف اتم نے معزز عدالت کے روبرو مقتولہ کے والدین کو کوئی خط لکھنے کا قرار کیا ہے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”تمہارا موقف یہ ہے کہ تم نے اس کے والدین کو اپنی اور مقتولہ کی شادی کے لیے ہموار کرنے کا مشورہ دیا تھا جبکہ استغاثہ کا دعویٰ ہے کہ وہ ایک دھمکی آمیز خط تھا۔ یہ کیا قصہ ہے؟“

”قصہ یہ ہے جناب کہ۔“ وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔ ”میں نے جو کہا وہ سچ ہے۔ استغاثہ کا دعویٰ سراسر جھوٹ پر مبنی ہے۔ مگر میں نے مقتولہ کے والدین کو کوئی دھمکی آمیز خط لکھا تھا تو وہ ثبوت کے طور پر اس خط و عدالت

میں نے دانستے سولہ انداز میں جملہ امور چھڑا دیے
وہ جلدی سے ہوا۔ زیادہ تر رات کی تاریکی میں اور بھی
کچھ روٹا میں بھی۔

”دوسری گلی میں پہنے دوستوں کے پاس۔“ اس نے جواب دیا۔ ”دس پندرہ منٹ تک میں نے ان سے تہ چیت کی لیکن میرا ذہن دستور الجھن کا شکار رہا۔ پھر

پارٹ مارٹیم پورٹ کے مطابق مقتول نادروہ کی
تہہ رست دس ور بارہ بجے کے دوران میں واقع
تھا۔ جس حادثہ تو میں کہہ رہا تھا۔
آپ بالکل درست فرما رہے

”پھر“ اس نے سواۓ نظر سے میری طرف دیکھا۔ ”پھر آپ کیا چاہتے ہیں؟“

اس نے مقتولہ اور ملزم کی محبت والے معاملے کو آپ سے کیوں چھپا رکھا۔ خصوصاً زیرِ قیہ عزائم کے اندر ملاقاتوں کے سلسلے کے بارے میں۔

”پوچھا تھا۔“ وہ ایک معمولی سی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”وہ آئیں بائیں شائیں کر کے رہ گئی تھی۔ اس نے دانستہ ان کی ملاقاتوں والا راز ہم سے چھپایا تھا۔ وہ نادرہ کی پہلی تھی اس لیے اس نے اس معاملے کو آؤٹ نہیں کیا تھا۔“

”یعقوب صاحب!“ میں نے جرح کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے گواہ سے سوال کیا۔ ”اب یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ آپ لوگوں کو مقتولہ اور ملزم کے تعلقات کا علم، مقتولہ کی موت سے بہت پہلے ہو گیا تھا جب ملزم نے ایک خط لکھ کر آپ کو بتایا تھا کہ وہ مقتولہ سے شادی کا خواہاں ہے اور وہ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”آپ غلط نہیں کہہ رہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”لیکن خط کے حوالے سے بہت سی غلط فہمیاں ہیں۔“

”کیسی غلط فہمیاں؟“ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”ملزم کا دعویٰ ہے کہ اس نے خط نادرہ کی منگنی اور شادی کی تاریخ طے ہو جانے سے پہلے لکھا تھا اور اس میں اپنی اور نادرہ کی باہم پسندیدگی کا ذکر کیا تھا جبکہ ہمارے مطابق وہ خط نادرہ کی شادی کی بات مکی ہونے کے بعد موصول ہوا تھا جس میں ملزم نے ہمیں دھمکی دی تھی کہ اگر ہم نے نادرہ کی شادی اس کے ساتھ نہیں کی تو ہمیں خطرناک نتائج کے لیے تیار رہنا چاہیے۔“

”ایک منٹ۔۔۔“ میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ”ملزم نے اپنے خط کے ذریعے آپ لوگوں کو کس نوعیت کے خطرناک نتائج کی دھمکی دی تھی؟“

”بھئی کہ۔۔۔۔۔ اگر ہم نے اس کی خواہش پوری نہیں کی تو وہ کوئی بھی سنگین قدم اٹھانے پر مجبور ہو سکتا ہے۔“ استغاثہ کے گواہ یعقوب نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

”مثلاً؟“ میں نے پوچھا۔ ”کیا واقعی یہ دھمکی دار باتیں اس خط میں لکھی ہوئی تھیں؟“ میں نے حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے سوال کیا۔ ”یعقوب صاحب! کیا آپ نے خود وہ خط پڑھا تھا؟“

”جیسے پڑھ کر سنایا تھا۔“ میں نے زبانی جواب دیا۔ ”موت کے بعد کر دی۔“

استغاثہ کی جانب سے انکار گواہ مقتولہ کی وراثت تھی۔ اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد رپورٹ کر دیا۔ مکمل استغاثہ نے مکی سی جرح کے سلسلے کو فارغ کر دیا تو جج کی اجازت حاصل کرنے کے لیے وٹس باکس کے قریب چلا گیا۔

سلطانہ ایک اوجیز عمر اور فخر۔ اندام عورت تھی۔ آنکھوں کی حرکات سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بہت ہی پرسنیز طرز عورت ہے۔ جب وہ اپنا حلفیہ بیان دیکھا تو گراہ تھی تو اندازِ تکلم سے بھی یہی اندازہ ہوتا تھا کہ ایک دراز اور منہ پھٹ عورت تھی۔

سلطانہ نے اپنا بیان دیتے ہوئے عدالت کو بتایا کہ ملزم ایک آوارہ اور لقمہٴ قتل تھا۔ وہ ہاتھ جوکرس کی کے پیچھے پڑ گیا تھا اور ہر وقت اسے درغائے کی دشمنی رہتا تھا۔ نادرہ پوری طرح اس کی منگنی میں تھی۔ اس دور میں جب انہوں نے مقتولہ نادرہ کی منگنی اس کے کزن سے کر دی تو ملزم چراغ پا ہو گیا اور مقتولہ کی شادی کی تاریخ طے ہو جانے کے بعد تو ملزم نے انہیں ایک خطرناک خط بھرا خط لکھ مارا تھا۔ اس نے واضح الفاظ میں ہمیں یہاں کرانے کی کوشش کی تھی کہ اگر ہم نے نادرہ کی شادی کے کزن فیصل سے کرتے کی کوشش کی تو ہمیں بھیا تک نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔ میں نے جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

”صاحب! میں آپ سے یہ بحث نہیں کروں گا کہ ملزم دھمکی والا خط مقتولہ کی شادی کی تاریخ طے ہونے سے لکھا تھا یا بہت پہلے میں۔“

”جناب! اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ اس نے خطرناک نتائج کی دھمکی والا خط شادی کی تاریخ طے ہونے کے بعد لکھا تھا۔“ وہ قطع کلامی ہوئے تیز لہجے میں بولی اور ناپسندیدہ انداز میں گھبراہٹ مچا دی۔

مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی۔ میرے موبل سے شدید نوعیت کی غرت کرتی تھی۔ میں اس کی قطع کلامی کا ارمان۔ بغیر معتدل لہجے میں کہا۔ ”فیصل۔۔۔ میں آپ کی بات کو ٹھونڈی رہے۔“

”جب آپ نے اپنے بیان میں حلفیہ ریکارڈ کر لیا ہے۔ کیا یہ سب کچھ عدالت میں پیش کر سکتی ہیں۔“

پھر۔۔۔ خان کا جواب سننے بغیر میں نے جج کی جانب سے ہدایت ہی سنجیدگی کے ساتھ چھوٹ کر جرح صاف کیا۔ میں اپنی پہلی پیشی پر، میری درخواست وراثت کے لیے ہوئے معزز عدالت نے استغاثہ کو اس بات کی تاکید کی تھی کہ وہ اس پیشی پر ملزم کے لکھے ہوئے خط کو عدالت میں پیش کرے۔

جج نے اپنی میز پر پھیلے ہوئے کاغذات پر ایک بجاہالی پر وکیل استغاثہ کی جانب دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ ”وکیل صاحب! کیا حذکرہ خط عدالت میں پیش کر دیا گیا ہے؟“

”نہیں جناب عاں۔“ وکیل استغاثہ نے غی میں گردن ہلاتے ہوئے سہ بسی سے کہا۔ ”بد قسمی سے وہ خط ہٹا دیا گیا ہے۔“

جج کی پیشانی پر ناگواری سے تاثرات نمودار ہونے لگے۔ میں نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”بیک صاحب! پلیز پریزید۔“

”میں استغاثہ کی معزز گواہ۔۔۔۔۔ مقتولہ کی والدہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔“ سلطانہ صاحبہ! میں نے بڑی کراہی آواز میں سے مخاطب کیا۔ ”ملزم کے بیچے ہوئے خط کے ضائع ہونے کی ہسٹری کیا ہے؟“

”وہ جناب۔۔۔۔۔ وہ جناب۔۔۔۔۔“ وہ سنبھال لیتے ہوئے بولی۔ ”وہ ایسا ہے ہودہ اور واپیت خط تھا کہ میں نے اسے ابا کو پڑھ کر سنایا پھر پرز سے پرز سے کر کے اسے چھپے میں ڈال دیا تھا۔“

”اب کیا چھپے میں۔۔۔۔۔ میں نے طنز یہ لہجہ میں کہا۔ اس بات کا فیصلہ کرنا ممکن نہیں رہا کہ ملزم نے اس خط میں کیا لکھا تھا۔ میں نے کھاتی توقف کر کے یہ کہہ کر سانس نہ پھر جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”آپ غلط نہیں کہہ رہے، صورت حال کچھ ایسی ہی تھی۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا پھر غوغو اور انداز میں کاشف محمود کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”میری بچی تو معصوم اور نادان تھی۔ اس شیطان نے اسے پوری طرح اپنے چنگل میں جکڑ رکھا تھا۔ وہ اس کے ہاتھ میں کھلوٹا بیٹی ہوئی تھی اور ہماری نصیحت پر بالکل کان نہیں دھرتی تھی۔ اس منحوس نے چنانچہ، میری بچی کے ذہن میں کسباز ہر بھر دیا تھا کہ وہ اس کے اشاروں پر ناپچے گی تھی۔ یہ کسی درندے سے کم نہیں۔۔۔۔۔“ بات ادھوری چھوڑ کر سلطانہ نے بڑے غضب ناک انداز میں کاشف کی جانب انگلی سے اشارہ کر دیا اور پھر جذباتی بیان کو جاری رکھتے ہوئے بول۔

”اس بد بخت کی نیت شروع ہی سے ٹھیک نہیں تھی۔“ اس نے ایک مرتبہ پھر اکیڈڈ باکس میں کھڑے ملزم کاشف محمود کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس نے بڑی صفائی سے نادرہ کو غلط راستے پر ڈال دیا تھا۔ ہم نے اس کی اوچھی حرکتوں سے تنگ آ کر ہی نادرہ کی فیصل سے منگنی کر دی تھی اور پھر شادی کی تاریخ بھی طے کر دی تھی۔ جب اس کینے کو محسوس ہوا کہ نادرہ ہمیشہ ہمیش کے لیے اس کے ہاتھ سے نکلنے والی ہے تو اس نے دھوکے بہانے سے اسے زیرِ تعمیر عیادت میں بلایا۔ اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کے بعد میری بچی کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ہمارا ہنسا ہنسا گھرا جڑ گیا۔“ وہ روہا سی ہو گئی۔ ”یہ درندہ سخت سے سخت سزا کا حق دار ہے۔ میں تو کہتی ہوں، اس مردود کو ہرے عام بھانسی دی جائے۔“

میں نے اس کی جذباتی تقریر کے جواب میں ایک لفظ نہیں کہا۔ جب وہ قدمے معتدل ہوئی تو میں نے پوچھا۔ ”سلطانہ صاحبہ! جب یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ ملزم، مقتولہ کو کسی غلط راہ پر چلا رہا ہے تو پھر آپ لوگوں نے اپنی بیٹی کی آمد و شد کا تنقیدی جائزہ کیوں نہیں لیا۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ مقتولہ کی پہلی صوفیہ کا گھر ملزم کے گھر کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ آپ کو چاہیے تھا کہ آپ مقتولہ کو صوفیہ کے گھر جانے سے روک دیتے۔ آپ نے ایسا کیوں نہیں کیا؟“

”ہم نے اسے روکا تھا، بہت روکا تھا۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ”اور نادرہ بڑی حد تک بازمجی آگئی تھی لیکن وقوعہ کی رات چنانچہ، وہ کس وقت نکل گئی۔ مجھے صبح سے بخار تھا۔ ڈاکٹر نے طیر یا بتایا تھا۔ میں رات کو چل دی سو گئی تھی اور۔۔۔۔۔“ وہ سانس درست کرنے کے لیے کھینچی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

کہ ملزم کے ساتھ وہ ڈیر تعمیر عمارت میں ملاقاتیں کرتی تھی۔
 وہ نے اس کے پاس سے اس کا ہوتا تو شاید یہاں تک وقت ہی
 نہیں آتی۔ صوفیہ نہیں اندھیرے میں رکھ کر نادرہ سے اپنی
 اتنی بھائی رہی اور اس کی آواز نہ دھنگی۔
 صوفیہ نے آپ لوگوں کو اندھیرے میں رکھ کر نادرہ
 سے اپنی دوستی نبھائی۔ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے
 ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”جس کے نتیجے میں بالآخر
 نادرہ موت کے منہ میں چلی گئی۔ سلطانہ صاحبہ! آپ کے
 خیال میں کیا صوفیہ کو بھی کوئی سزا نہیں ملنی چاہیے؟“
 ”ہاں، ضرور ملنی چاہیے۔“ وہ بے ساختہ بولی۔
 ”صوفیہ کو بھی ضرور کوئی سزا ملنی چاہیے۔“ میں نے
 وکیل استغاثہ کی جانب دیکھتے ہوئے بڑے معنی خیز انداز
 میں سلطانہ کے الفاظ دہرائے پھر دوبارہ استغاثہ کی گواہی کی
 جانب متوجہ ہو گیا۔

”سلطانہ صاحبہ!“ میں نے اس کی آنکھوں میں
 دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ”آپ نے ملزم کے خد کو چوٹ
 میں ڈال کر ایک جینا جاکتا ثبوت جلا کر خاکستر کر دیا۔ کیا
 آپ معزز عدالت کو بتانا پسند کریں گی کہ وہ خط کس کس نے
 پڑھا تھا؟“
 ”میں نے اور نادرہ نے۔“ اس نے ترت جواب
 دیا۔ ”اور نادرہ کے ابا کو میں نے خود پڑھ کر سنایا تھا۔“
 ”خط نذر آتش ہو چکا اور نادرہ زمین اوڑھ کر سو گئی
 ہے۔“ میں نے سلطانہ کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ
 لیتے ہوئے کہا۔ ”کیا آپ کسی ایسے شخص کو گواہی کے لیے
 عدالت میں پیش کر سکتی ہیں جس نے آپ لوگوں کے علاوہ
 کچھ پڑھا ہو؟“

”انجیکشن یور آئر“ وکیل استغاثہ نے نیم
 احتجاجی انداز میں آواز بلند کی۔ ”استغاثہ کی معزز گواہ دو
 ٹوک الفاظ میں معزز عدالت کے رو برو بتا چکی ہے کہ مذکورہ
 خط کے بارے میں صرف گھر کے، نہی تین افراد کو علم تھا۔
 وکیل صفائی الٹے سیدھے سوالات کر کے خواجوا گواہ کو کفیوز
 کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انہیں اس قسم کی حرکت سے
 باز رہنے کی تاکید کی جائے۔“
 ”بگ صاحب!“ وکیل استغاثہ کے رخصوں پر مرہم
 لگاتے ہوئے جج نے مجھ سے کہا۔ ”یا استغاثہ کی گواہ سلطانہ
 کے جواب سے صورت حال واضح نہیں ہو رہی۔“
 ”اس اوکے یور آئر۔“ میں نے اثبات میں گردن
 ہلاتے ہوئے کہا اور دوبارہ گواہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”سلطانہ صاحبہ!“ میں نے اپنی جرح میں
 مدد کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے بڑے زور و انداز سے
 عدالت سے سامنے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ملزم نے ہدایت میں
 بازی سے آپ کی بیٹی نادرہ کو درغل رکھا تھا اور گاہے گاہے
 مقتولہ کے دہن میں زہ بھر کر اسے آپ لوگوں سے متنفر
 رہتا تھا۔ کیا آپ اس سراسم کے سلسلے میں کوئی ٹھوس ثبوت
 غیر جانب دار پیش کر سکتی ہیں؟“
 ”آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں وکیل صاحب۔“
 غصیلی نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔ ”کیا
 بات کے ثبوت کے لیے یہ کافی نہیں ہے۔ اس شخص نے
 درغلانے پر ہی میری بیٹی کا دماغ خراب ہوا تھا اور وہ چھپ
 چھپ کر اس سے مل کر رہتی تھی؟“

”واقعاً یہ کافی نہیں ہے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے
 کہا۔ ”ابھی آپ نے جو کچھ فرمایا، یہ آپ کا ذاتی خیال ہے۔
 لیکن ملزم کا دعویٰ اس سے قطعی مختلف بلکہ اس کے برعکس ہے۔
 اس کے مطابق مقتولہ اس سے سچی محبت کرتی تھی اور اس سے
 شادی کی خواہش بھی لیکن آپ لوگوں کی سختی لفت سے انہیں یہ
 نہیں ہونے دیا۔ آپ نے مقتولہ کی منتہی اس کے کزن سے
 کر دی اور مقتولہ اس شادی کے لیے قطعاً تیار نہیں تھی۔ وہ
 نے ساتھ میں بھگ سنا چاہتی تھی مگر ملزم نے اس کی بات
 ماننے سے انکار کر دیا پھر۔ آپ کی بیٹی کو کس کر دیا گیا۔“
 ”یہ وہ کہانی ہے، جو ملزم نے آپ کو سنائی ہے۔
 ملزم یہ سبج میں بولی۔ ”جبکہ حقیقت وہی ہے جو میں نے
 بیان کی ہے۔“

”اور اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے آپ کے پاس
 کوئی معجز گواہ نہیں ہے۔“ میں نے ترکی بہ ترکی جواب میں کہا۔
 ”شاید آپ کو معلوم نہیں کہ عدالت کسی بھی بات کی صحت جان
 کے لیے ٹھوس ثبوت مانگتی ہے۔“ لٹائی توقف کر کے میں نے
 ایک گہری سانس لی پھر اذکار کرتے ہوئے کہا۔
 ”ملزم کا لکھا ہوا خط آپ نے نذر آتش کر دیا۔ ملزم
 ذات سے دیگر شکایات کے حوالے سے آپ کے پاس کوئی
 شہادت نہیں ہے۔ علاوہ ازیں، آپ ایسا کوئی بھی ثبوت
 ثبوت عدالت میں پیش نہیں کر سکیں جو ملزم کو آپ کی
 قاتل ثابت کرتا ہو۔“ میں نے روئے سخن جج کی جانب
 موڑا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”یور آئر! تمام تر حقائق اور واقعات معزز عدالت
 سامنے ہیں۔ مجھے استغاثہ کی گواہ سلطانہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا
 اس کے ساتھ ہی معزز عدالت کا وقت مقرر ہے۔“

جج نے دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت
 پر دست روی۔

XXX

دعویٰ عدالت کا تھا اور گواہوں والے شہرے میں
 متقاضی ایک اہم گواہ اور مقتولہ کی رازدار سبکی صوفیہ کھڑی
 تھی۔ صوفیہ کی عمر پچیس اور تیس سال کے درمیان نظر آتی
 تھی۔ وہ بے شش خدو خال کی مالک ایک دلی پگلی اور
 بالوں صوفی رنگ کی تھی۔

جج بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اس نے اپنا بیان
 پکار کر تے وقت معزز عدالت کو بتایا کہ وہ مقتولہ نادرہ کو
 نہیں سے جانتی تھی۔ دونوں نے ایک ہی اسکول میں تعلیم
 حاصل کی تھی اور یہ کہ نادرہ اس کی رازدار سبکی تھی۔ وہ صوفیہ
 سے اپنی کوئی بات چھپاتی نہیں تھی۔ صوفیہ نے اپنے بیان
 میں اس بات کا حکم کھلا، قرار کیا کہ وہ مقتولہ اور ملزم کی محبت
 کے معاملات سے بہ خوبی آگاہ تھی۔ ان دونوں کی زیر تعمیر
 بات میں ہونے والی غفیہ ملاقاتوں سے بھی وہ اچھی طرح
 واقف تھی۔ صوفیہ نے عدالت کو بتایا کہ اپنی موت سے چند
 دن پہلے نادرہ بہت پریشان اور الجھی ہوئی رہنے لگی تھی اور
 اس کا سبب یہ تھا کہ اس کے گھر والوں نے اس کے کزن
 نبیس سے اس کی شادی کی تاریخ کی کر دی تھی۔ وقوعہ کے
 روز بھی مقتولہ پہلے صوفیہ کے گھر آئی تھی اور پھر وہاں سے
 زیر تعمیر عمارت میں ملزم سے ملاقات کرنے چلی گئی تھی۔ اس
 کے علاوہ اس نقل کی واردات کے بارے میں وہ اور کچھ نہیں
 بتاتی تھی۔

صوفیہ کا بیان مکمل ہوا تو وکیل استغاثہ جرح کے لیے
 نبیس باکس کے قریب چلا گیا۔ اس نے گواہ کو مخاطب کرتے
 ہوئے، اپنی جرح کا آغاز کیا۔

”صوفیہ صاحبہ! آپ اس بات کی گواہ ہیں تاکہ ملزم
 اور مقتولہ کے درمیان بڑا اوجھا سوجھا کا عشق چل رہا تھا اور وہ
 دونوں ایسا دالوں کی نظروں سے چھپ کر رات کی تاریکی
 میں پندری چوری ملاقاتیں کیا کرتے تھے۔“
 ”جی ہاں یہ بات بالکل درست ہے۔“ اس نے
 ثابت میں گردن ہلائی۔ ”اور میں اس کی صفیہ گواہی دے
 سکتی ہوں۔“

”کیا یہ بھی درست ہے کہ مقتولہ کو جب بھی ملزم سے
 ملاقات رہا ہوتی تھی وہ آپ سے ملنے کا بہانہ کر کے گھر سے
 باہر نکلتی تھی؟“ وکیل استغاثہ نے پوچھا۔
 ”جی ہاں۔“ صوفیہ نے سر کو اٹھاتی جنبش دی۔ ”وہ

صرف ملزم سے ملاقات کرنے ہی نہیں بلکہ ویسے بھی مجھ سے
 ملنے میرے گھر آتی رہتی تھی۔“

”وقوعہ کے روز بھی وہ ملزم سے ملنے کے لیے ہی آپ
 کے پاس آئی تھی۔“ وکیل استغاثہ نے اس کی آنکھوں میں
 دیکھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ”اس کے بعد سے تم نے
 اپنی سبکی کو زبردہ نہیں دیکھا۔؟“
 ”جی ہاں۔۔۔ یہی حقیقت ہے۔“ صوفیہ نے بڑے
 اعتماد سے جواب دیا۔

وکیل استغاثہ نے مزید چند سوالات کے بعد جرح
 موقوف کر دی۔

جج نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”بگ
 صاحب! آپ استغاثہ کی گواہ سے کوئی سوال کرنا چاہیں
 گے؟“

میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور اٹھ کر نبیس
 باکس کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور
 اپنی جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

”صوفیہ صاحبہ! آپ نے معزز عدالت کو تھوڑی دیر
 پہلے بیان دیتے ہوئے بتایا ہے کہ مقتولہ آپ کی بچپن کی
 دوست تھی۔ آپ دونوں نے اسکول میں ایک ساتھ پڑھا
 اور ایک دوسرے کی رازدار تھیں۔ آپ مقتولہ اور ملزم کی
 عشقیہ داستان سے بھی اچھی طرح واقف تھیں اور انہیں
 چوری چھپے ملاقاتوں کے لیے مواقع بھی فراہم کرتی تھیں۔
 میں کچھ غلط تو نہیں کہہ رہا۔؟“

”جی نہیں جناب۔ آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“
 اس نے مختصر جواب دیا۔

”کیا یہ بات درست ہے کہ مقتولہ، ملزم کو دل و جان
 سے پسند کرتی تھی اور اس سے شادی کی خواہاں تھی؟“
 ”جی ہاں۔۔۔ یہ بات درست ہے۔“ اس نے
 اثبات میں گردن ہلائی۔

”اور کیا یہ بھی درست ہے کہ ملزم نے اپنی پسند کے
 حوالے سے خط کے ذریعے مقتولہ کے والدین کو آگاہ کر دیا
 تھا؟“ میں نے جرح کے سلسلے میں تیزی مارتے ہوئے پوچھا۔
 ”خط کا تو مجھے کوئی علم نہیں۔“ وہ ہچکچاہٹ آمیز انداز
 میں بولی۔ ”البتہ، یہ بات میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ
 نادرہ کے والدین تک ان کی محبت کا معاملہ ضرور پہنچ چکا تھا
 اور وہ ان دونوں کی شادی کے سخت خلاف تھے۔“
 خط کے ذکر پر اس کی ہچکچاہٹ کو دیکھتے ہوئے میں
 نے وضاحت ضروری سمجھی اور کہا۔ ”میں اس خط کے بارے

میں پوچھ رہا ہوں جو ملزم کے مطابق ایک درخواست کی حیثیت رکھتا تھا کہ وہ مقتولہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ جبکہ مقتولہ کی والدہ کے مطابق وہ ایک دھمکی آمیز خط تھا جس میں ملزم نے انہیں خطرناک نتائج سے ڈرنے کی کوشش کی تھی۔

”میں ایسے کسی خط کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔“

وہ نظر چراتے ہوئے بولی۔

مجھے یہ اندازہ لگانے میں قطعاً کوئی شوری محسوس ہوئی کہ وہ مذکورہ خط کے حوالے سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ مقتولہ کو اس خط کی خبر ہو اور اس نے اپنی رازدار کیلی صوفیہ کو نہ بتایا ہو۔ صوفیہ کے روپے سے واضح ہوتا تھا کہ وہ مقتولہ کی ماں سے تعاون کی پالیسی پر کاربند تھی۔ اس سے ایک بات کھل کر سامنے آ جاتی تھی کہ خط کے معاملے میں ملزم کا موقف ہی درست تھا۔

”خط کو تو مقتولہ کی والدہ نے پڑے پڑے کر کے چو لھے میں ڈال دیا تھا لہذا اس کے ذکر پر مٹی ڈالتے ہوئے ہم آگے بڑھتے ہیں۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ پھر استفسار کی گواہ کی آنکھوں میں جھپٹتے ہوئے پوچھا۔

”اس امر کی تو آپ تصدیق کرتی ہیں تاکہ مقتولہ اور ملزم ایک دوسرے کی محبت میں گروں گردن تک دھنسن چکے تھے اور ان کی اولین خواہش یہی تھی کہ وہ جلد زبردستی شادی کریں۔“

”جی ہاں، ایسے ہی حالات تھے۔“

”مگر مقتولہ کے والدین ملزم کو ناپسند کرتے تھے۔“

میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”لہذا انہوں نے پہلی فرصت میں نہ صرف یہ کہ مقتولہ کی منگنی اس کے کزن فیصل سے کر دی بلکہ ایک ماہ کے بعد ان کی شادی کی تاریخ بھی مقرر کر دی تھی؟“

صوفیہ نے اثبات میں گروں ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”جی ہاں۔“

”فیصل سے شادی کی تاریخ طے ہونے پر مقتولہ سخت پریشان ہو گئی تھی۔“ میں نے کہا۔ ”اس موقع پر ملزم کا کیا رد عمل تھا؟“

”جہاں تک میری معلومات ہیں، ملزم کو یہ سن کر بہت دکھ ہوا تھا۔“

”آپ کی معلومات کا ذریعہ کیا ہے؟“

”مجھے سب کچھ مقتولہ کی زبان سے پتا چلتا تھا۔“ اس نے جواب دیا۔

”ملزم کو صرف دکھ ہو تھا یا اس نے کسی شدید رد عمل کا

اظہار بھی کیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے میری توقع کے برخلاف اور ملزم کی مدد میں جواب دیا۔“ ملزم نے کسی منفی رد عمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ انہوں نے مقتولہ کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ والدین کی خواہش سے اسے بچنا پڑے گا۔

”پھر ملزم کی اس نصیحت پر مقتولہ نے کیا جواب دیا؟“

”مقتولہ اسے کزن فیصل کو سخت ناپسند کرتی تھی۔ گواہ نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”ملزم کی پالیسی کے باعث وہ مجبور ہوئی تھی ورنہ وہ تو ایک شہر میں اٹھنے کو بھی تیار تھی۔“

”صوفیہ صاحبہ! اس نے نہایت ہی ذہنی بات اسے مخاطب کیا۔ ”معزز زبردستی یہ بتانا چاہتی ہے کہ مقتولہ کس نوعیت کا سنگین قدم اٹھانے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ آپ کی رازدار کیلی تھی۔ یہ ممکن نہیں کہ آپ کے رادے سے وقف نہ ہوں۔“

”وہ ملزم کے ساتھ گھر سے بھاگنے کا پروگرام بنا رہی تھی۔“ صوفیہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ”اس واقعے کے رد مجھے بتایا تھا کہ وہ اپنی خواہش کے بارے میں آج ملزم کو بتائے گی اور اس بات پر آمادہ کرے کہ کوشش کرے گی کہ وہ گھر سے بھاگ کر کوٹ میرا کر بیٹے میں۔ بعد میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”مقتولہ کے اس باغیانہ منصوبے پر ملزم نے رد عمل کا اظہار کیا تھا؟“ میں نے متفہم رکھا۔

”اس بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں۔“ صوفیہ نے گروں ہلاتے ہوئے بولی۔ ”توقیر کی ریت برب مقولہ میرے گھر سے رخصت ہوئی تو پھر اس کے بعد میری اپنی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اگلی صبح مجھے پتا چلا کہ اسے گریا گیا ہے۔“

”آپ کی مقتولہ سے ملاقات نہیں ہو سکی لیکن میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ توقیر کی رات مقتولہ نے ملزم کے رات اپنی تجویز رکھی تھی مگر ملزم نے ایسی حماقت سے صاف انکار کرتے ہوئے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی اور پھر یہ رقیعہ عمارت میں چھوڑ کر وہ اپنے دوستوں کی طرف چلا تھا۔ جب ملزم مقتولہ سے رخصت ہوا تو وہ زندہ سلامت ٹھیک ٹھاک تھی۔“

وہ لاحقہ حق کے سے انداز میں بولی۔ ”ہو سکتا ہے کہ وہ جی ہوا ہو۔“

”صوفیہ صاحبہ! آپ کو مقتولہ اور ملزم کے مستقبل

میں کی خبر تھی۔“ میں نے قدرے جارحانہ انداز میں سوال کیا۔ ”جب آپ کو یہ صاف پتہ چلا کہ اس نے ایک مکان کے امکانات نہیں ہیں اور مقتولہ کی سس کے رات باغی بھی طے ہو چکی ہے تو ایسی صورت حال میں کیا آپ نے گھر سے بھاگ جانے کا ارادہ نہ کر لیا تو آپ کو تو پتا تھا کہ آپ کو رتی طور پر مقتولہ کے والدین کو رات کو سب سے آگاہ کر دیں۔ آپ نے اس وقت اس سے کیا کہا؟“

”موت کا ایک وقت مقرر ہو گیا۔ وکیل صاحب! وہ مجھے بتاتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”میرے اس وقت کو صاف پتا چل چکا تھا کہ وہ وقت بدل نہیں سکتا تھا۔ اور آپ کے سوال کا حقیق ہے تو میری زبان نہ کھلے گی۔“

”تھا کہ مقتولہ نے اس سلسلے میں مجھے بڑی پکی قسم دے رکھی تھی۔“

”یہ مقتولہ کی وہ قسم اس کی زندگی سے زیادہ اہم تھی۔“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں! وہ قطعیت سے بولی۔ ”اگر مجھے پتا ہوتا کہ توقیر کی رات میری کیکل کڑوت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا تو میں بھی اور کسی قیمت پر اسے رقیعہ عمارت میں نہ لے دیتی ورنہ اگر وہ زبردستی ملزم سے ملنے کی عہد کرتی تو میں فی الفور اس کے والدین کو صورت حال سے آگاہ کرتی۔“

”ٹھیک ہے۔ اپنی کیکل مرحومہ ماہرہ کے لیے آپ نے ان جذبات کی قدر کرتا ہوں۔“ میں نے انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”آپ کے خیال میں توقیر و ملزم کے درمیان یہ پیار و محبت کا سلسلہ کتنے لمبے سے چل رہا تھا؟“

”لگ بھگ ایک سال سے۔“ اس نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔

”ایک سال چھ ماہ صاف عرصہ ہوتا ہے۔“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”مقتولہ آپ کی گہری اور پکی تھی۔ وہ اپنے اور ملزم کے مابین ہونے والی پیار و محبت کے بارے میں یقیناً سب کو بتاتی ہوگی۔“

”جی ہاں، وہ مجھ سے ہر بات شیئر کرتی تھی۔“ وہ بات میں گروں ہلاتے ہوئے بولی۔ ”جیسی تو میں یقیناً سب کچھ بتا رہی ہوں کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو بڑی محبت سے ساتھ چاہتے تھے۔“

”مقتولہ، ملزم کے مزاج، عادات اور عمومی رویے کا بھی ذکر کرتی ہوگی۔“ میں نے بڑی ہوشیاری سے اپنے مقصد کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔ ”کیا کبھی تنہائی میں ملزم نے حد سے آگے بڑھنے کی کوشش کی تھی؟“

مقتولہ نے بھی آپ کو ملزم کے جارحانہ فعل یا طرز عمل کے بارے میں کچھ بتایا تھا۔

”نہیں۔“ اس نے بڑی شدت سے نفی میں گردن جھٹکی۔ ”مقتولہ نے ملزم کی ایسی کسی حرکت کے بارے میں مجھ سے کبھی کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔“

”مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!“ میں نے جج کی جانب مڑتے ہوئے کہا۔ ”استغاثہ کی معزز گواہ کے بیان سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی ہے کہ ملزم ہوس پرست یا شیطانی ذہنیت کا مالک ہرگز ہرگز نہیں۔ ملزم اور مقتولہ کے درمیان کم و بیش ایک سال تک عشق و محبت کا سلسلہ جاری رہا۔ اس دوران میں وہ دونوں دنیا والوں کی نظروں سے چھپ کر تنہائی میں بھی وقت گزارتے رہے لیکن ملزم نے اس موقع کا فائدہ نہ اٹھا کر کبھی حد سے تجاوز کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ملزم کی طرف سے کسی بے ہودگی یا بدتمیزی کا ریکارڈ بھی نہیں ملتا۔ بہت درزی اور تجربہ مند بہت دور کی بات ہے، ملزم نے بھی تنہائی میں مقتولہ سے کوئی ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ استغاثہ کی گواہ صوفیہ کا بیان ملزم کے شریف النفس اور باکردار ہونے کی تصدیق کرتا ہے۔ ایب امن پسند اور صلح جو انسان اپنی محبت کو تو داغ دار کر سکتا ہے ورنہ ہی اس کا گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتار سکتا ہے۔“ میں نے بحالی توقف کر کے حاضرین عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی پھر ایک گہری سانس خارت کرنے کے بعد دوبارہ جج کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”جناب عالی! اس کیس میں بے درپے سامنے آنے والے متعدد جھول سے ثابت ہوتا ہے کہ میرا موکل ملزم کاشف محمود بالکل بے گناہ اور محبت کرنے والا ایک صلح جو اور باکردار شخص ہے۔ اسے کسی گہری سازش کے تحت قتل کے اس مقدمے میں ملوث کرنے کی کوشش کی گئی ہے مثال کے طور پر۔“

میں نے ایک مرتبہ پھر تھوڑا توقف کر کے کچے بعد وکیل وکیل استغاثہ اور اس کیس کے انکوائری آفیسر سب انسپکٹر بشیر احمد کی جانب طنزیہ نظر سے دیکھا اور اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”مثال کے طور پر استغاثہ کی جانب سے جو چالان

پیش کیا گیا ہے اس کے ساتھ فکر پرش کی رپورٹ منسلک نہیں ہے جبکہ یہ بالکل سامنے کی بات ہے کہ جب کسی شخص کو گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتارا جاتا ہے تو مقتولہ کی گردن پر قاتل کی انگلیوں کے بڑے واضح نشانات بن جاتے ہیں۔ ان فکر پرش کو مخصوص طریقے سے اٹھا کر گرفتار شدہ کسی بھی مشتبہ شخص کے فکر پرش سے میچ کر جاسکتا ہے لیکن زیر سماعت کیس میں استغاثہ کی طرف سے ایسی کوئی زحمت نہیں کی گئی اور جب میں نے معزز عدالت کے روبرو اس کیس کے تفتیشی افسر سے یہی سوال کیا تو اس کا جواب تھا..... ہم نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی..... میری اور قانون کی نظر میں یہ خاصا ناقص جواب ہے، بہر حال، آگے بڑھتے ہیں۔ میں نے سانس اہوار کرنے کے لیے توقف کیا پھر سلسلہ دلائل کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”مقتولہ کے والدین خصوصاً مقتولہ کی والدہ سلطانہ کا یہ دعویٰ ہے کہ ملزم نے انہیں ایک دھمکی آمیز خط لکھا تھا جس میں اس نے مقتولہ کے والدین کو خطرناک نتائج سے ڈرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر انہوں نے مقتولہ کی شادی اس سے نہ کی تو انہیں زندگی بھر بچھڑانا پڑے گا۔ افسوس کا پہلو یہ ہے کہ استغاثہ کی جانب سے اس خط کے متن کو بنیاد بنا کر ملزم کو قاتل ٹھہرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ملزم نے اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہناتے ہوئے پہلے مقتولہ کی عزت کو پامال کیا پھر گلا گھونٹ کر اسے موت سے ہمکنار کر دیا تاکہ اس کے والدین کو موت و حیرت دکھائے لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ استغاثہ ملزم سے منسوب اس خط کو دستاویزی ثبوت کے طور پر عدالت میں پیش کرنے سے قاصر رہا ہے۔ مذکورہ خط مقتولہ کی موت سے کئی روز پہلے نذر آتش کر دیا گیا تھا اور آخری بات ”میں نے ایک مرتبہ پھر ڈرامائی انداز میں رک کر ایک پچھل سانس خارج کی پھر بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”آخری بات ملزم کے کردار اور فطرت کے حوالے سے ہے۔ استغاثہ کی معزز گواہ صوفی کا بیان اس امر کا ثبوت ہے کہ ملزم در مقتولہ کو کئی مرتبہ جھپائی میں ملاقات کے مواقع میسر آئے مگر ملزم نے بھی ان مواقع سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی جو اس کے مضبوط کردار کو ثابت کرتی ہے لہذا معزز عدالت سے میری گزارش ہے کہ حالات و واقعات کی روشنی میں میرے موکل کو بے گناہ دے قصور جانتے ہوئے اس کی رہائی کے احکامات صادر

کیے جائیں۔“
”آجیکشن۔“
موجودگی کو نظر کرنے کے لیے ایک نعرہ مستانہ بلند کیا۔
”جج نے چونک کر سواہیہ نظر سے وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا۔“

وہ اپنے ”آجیکشن“ کی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ راز! میرے فاضل دوست نے قبل از وقت دلائل کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ ابھی استغاثہ کے گواہوں کے بیانات کا سلسلہ مکمل نہیں ہوا۔“

جج نے استغاثہ کی جانب سے دائر گواہوں کی فہرست پر نگاہ ڈالی اور خود کلامی کے انداز میں بولا۔ ”بشارت مرزا کی گواہی ابھی باقی ہے۔“ پھر اس نے گردن اٹھا کر وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا اور استفسار کیا۔

”وکیل صاحب! آپ اپنے گواہ بشارت مرزا کو کس پیش کردہ ہیں؟“
”آئندہ پیشی پر جناب عالی!“ وکیل استغاثہ نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔“ جج نے اثبات میں گردن ہلائی اور میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔ ”بیک صاحب! آپ ڈیفنس میں کتنے گواہ پیش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟“
”میں سمجھتا ہوں، ایک ہی گواہ سے کام چل جائے گا۔“ میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔

”اوکے۔“ جج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔
”استغاثہ اور ڈیفنس آئندہ پیشی پر ان مذکورہ گواہوں کو عدالت میں پیش کر دے تاکہ اس کیس کا فیصلہ جلد رجسٹریا جاسکے۔“

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت اختتام پذیر ہو گیا۔ جج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخواست کر دی۔

XXX

آئندہ پیشی پر میں نے صفائی کے گواہ اور ملزم کے دوست عارف کو پہلے ہمکنار کی درخواست کی جسے عدالت نے فوراً قبول کر لیا۔ میں نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ گواہ کا آج بد وقت اپنی نوکری پر پہنچنا ضروری ہے لہذا اس کا بیان پہلے ریکارڈ کر لیا جائے۔ عدالت نے اس بات کی بخوبی اجازت دے دی تھی۔

عارف وہی نوجوان تھا، ملزم جس کے ساتھ وقوعہ کی رات ایک انگشٹ فلم کا آخری شو دیکھنے گیا تھا۔ پوسٹ مارٹم

منہ زور

اور ہر سہ۔ مطابق مقتولہ نادرہ کی موت وقوعہ کی رات ۱۰ بجے ہوئی تھی۔ یہ ایسی وقت تھا کہ ملزم کے ساتھ ایک مقامی بچی ہاؤس میں بیٹھ کر فلم دیکھ رہا تھا اس کے نادرہ کے کمرے میں موت مارنے کا شور مچا رہا تھا۔

”رہا بچہ یوں لے کا حلق اٹھانے کے بعد اپنا بیان دے گا۔“ ایک تو میں ضروری جرح کے لیے وٹنس باکس کے قریب چلا گیا۔ میں نے گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دوشنبہ کیس میں سوال کیا۔

”عارف صاحب! جس رات مقتولہ نادرہ کو موت کے گھاٹ اتارا گیا وہ رات آپ کی یادداشت میں محفوظ تو ہے؟“
”جی ہاں، مجھے سب یاد ہے۔“ اس نے اثبات میں جواب دیا۔

”وقوعہ کی رات ملزم کاشف سے آپ کی ملاقات کتنے ہوئی تھی؟“
”لگ بھگ سو نو بجے رات۔“
”آپ اس سے کتنے گئے تھے یا آپ کے پاس آیا تھا۔“
”یہ ہمارے پاس آیا تھا۔“

”ہمارے پاس“ میں نے چونکے ہوئے لہجے میں جواب پوچھا۔ ”کیا مطلب؟“
”مطلب یہ کہ“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”میں اس وقت اپنے دو دوستوں وسیم اور آفتاب کے ساتھ اپنی گلی کے کٹڑ پر کھڑا تھا۔ کاشف ہمارے پاس آیا اور ہمارے درمیان بگلی بھگلی گفتگو ہونے لگی۔ یہ مجھے یاد ہے۔“

”اس اور الجھا ہوا نظر آیا۔ میں بھی اس دن کافی بے ہوش تھا۔ میں نے کاشف کی اداسی اور اپنی پوری توجہ دے کر اس کے لیے اس کے سامنے بکچر کا منصوبہ رکھا۔ یہ فوراً تیار ہو گیا پھر ہم وسیم اور آفتاب کو وہیں چھوڑ کر بکچر دیکھنے کے گئے تھے۔“

”کس رات تم لوگوں نے کون سی بکچر دیکھی تھی؟“
”وہ ایک انگشٹ بکچر تھی۔“ گواہ نے بتایا۔ ”بروس لی مارو جاز سے بھر پور۔“ فلم کا نام تھا، وہ آف دی ویس کے تھے۔“

”میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے قہقہہ دیا۔“ وقوعہ کی رات تم لوگ کتنے بچے بکچر ہاؤس پہنچے تھے؟“

”میرا خیال ہے، اس وقت رات کے پونے دس بجے ہوں گے۔“ اس نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ”کیونکہ جب ہم ٹکٹ لے کر ہال کے اندر داخل ہوئے تو اسکرین آن ہو چکا تھا اور آنے والی فلموں کے ٹریلر دکھائے جا رہے تھے۔“

”تم لوگ فلم دیکھ کر کتنے بچے بکچر ہاؤس سے باہر نکلے تھے؟“
”بارہ بجتے میں دس منٹ باقی تھے۔“
”تم لوگ اس رات گھر کتنے بچے پہنچے تھے؟“
”کم وٹنس ساڑھے بارہ بجے رات۔“

”ذرا سوچ کر بتائیں عارف صاحب!“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے استفسار کیا۔ ”وقوعہ کی رات ملزم کاشف سوانو بچے سے لے کر ساڑھے بارہ بجے تک آپ کے ساتھ رہا تھا۔ کیا اس دوران میں تھوڑی دیر کے لیے وہ آپ سے جدا بھی ہوا تھا؟“
”سوال غلط نہیں ہوتا۔“ وہ پوری قطعیت سے بولا۔ ”یعنی آپ حلف یہ بات کہنے کو تیار ہیں کہ وقوعہ کی رات..... میں نے ڈرامائی انداز میں پوچھا۔ ”ملزم کاشف رات دس بجے سے بارہ بجے کے درمیان ایک لمحے کے لیے بھی آپ کی نگاہ سے اوجھل نہیں ہوا تھا؟“

”جی ہاں، میں اس حقیقت کے بیان کے لیے بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔“ وہ پُر اعتماد لہجے میں بولا۔ ”آخری سوال.....“ میں نے صفائی کے گواہ عارف کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”وقوعہ کی رات ملزم کاشف نے لگ بھگ تین گھنٹے آپ کے ساتھ گزارے تھے۔ آپ کو اچھی طرح یاد ہونا چاہیے کہ مذکورہ رات آپ کے دوست اور اس کیس کے ملزم کاشف محمود نے کس قسم کا لباس پہنا ہوا تھا؟“
”جی ہاں..... اچھی طرح یاد ہے۔“ اس نے بڑے وثوق سے اثبات میں گردن ہلائی۔

”معزز عدالت کے سامنے اس لباس کی تفصیل بیان کریں؟“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔
”کاشف نے اس رات سیاہ جینٹ اور چمک دار شرٹ پہن رکھی تھی۔“ گواہ نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ”شرٹ والے چمک کی دھاریاں ہزاروں جاسمی رنگ کی تھیں۔“

”آر پو شیور.....؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”بس“ وہ دو ٹوک انداز میں بولا۔ ”آئی ایم

شیر“ میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔
”جناب عالی استغاثی کا گواہ اس امر کا دعویدار ہے کہ وقوعہ کی
ہدایت ملزم کا شرف دس اور بارہ بجے کے دوران میں جائے
وقوعہ سے کافی دور ایک مقامی بکچر ہاؤس میں سو قید اس کے
ساتھ تھا ہذا اس بات کا سبب ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ کی بھی
زاویے سے مقتولہ تادورہ کے قتل میں ملوث رہا ہو۔“ میں نے
لجائی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے
ہوئے کہا۔

”دیش آں پورا آرزو“

صفائی کے گواہ عارف کو عدالت سے جانے کی
اجازت مل گئی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد دیش باکس میں
استغاثہ کا گواہ بشارت مرزا آکر کھڑا ہو گیا۔

بشارت مرزا کی عمر پینتیس کے اریب قریب تھی۔ وہ
پیشہ قامت کا مالک ایک قریب انداز شخص تھا۔ سر کے بال
چھڑی اور توند باہر کو نکلی ہوئی۔ پیشے کے اعتبار سے جیسا کہ
پہلے بتایا جا چکا ہے، وہ ایک پراپرٹی ایجنٹ تھا۔ اس کی
پراپرٹی کی دکان لانڈھی کے علاقے میں واقع تھی جبکہ
رہائش زیر تعمیر عمارت کے پچھواڑے تھی۔ اس کے مکان کی
پشت زیر تعمیر عمارت کی پشت کے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔
بشارت مرزا اس مکان میں اکیلا ہی رہتا تھا۔ اس کی فیملی
اندرون سندھ کے علاقے میرپور خاص میں تھی۔

استغاثہ کے آخری اور سب سے اہم گواہ بشارت
مرزا نے اپنا حلیہ بیان ریکارڈ کر دیا تو جرح کی غرض سے
وکیل استغاثہ نے اسے گھیر لیا۔ یہاں ایک بات کا ذکر
کرنا چلوں کہ ملزم کے ایک خیر خواہ معروف اور جید صحافی
”خورشید عباسی“ نے اس کیس کے سلسلے میں مجھ سے گراں قدر
تعاون کیا تھا اور کیس کے جن مختلف کرداروں کے حوالے
سے اس نے مجھے معلومات فراہم کی تھیں ان میں سرفہرست
استغاثہ کا گواہ بشارت مرزا ہی تھا۔

”بشارت صاحب!“ وکیل استغاثہ نے جرح کا
آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا یہ درست ہے کہ ملزم کو آپ
پہلے سے جانتے تھے؟“

”جی ہاں، میں تو اسے اکثر ادھر محلے میں دیکھا کرتا
تھا۔“ گواہ نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔
”لیکن کبھی میرے اس کے ساتھ مراسم وغیرہ نہیں رہے۔“
”یہاں مراسم وغیرہ کا کوئی تذکرہ بھی نہیں۔“ وکیل

استغاثہ نے سرسری انداز میں کہا۔ ”میں صرف یہ جانتا تھا
کہ جب آپ نے قیود کی رات گزارا جائے گا،
سے جاتے ہو۔ دیکھ تو آپ کو پچھنے میں کوئی دشواری
منہ نہ تو نہیں ہوا تھا۔“

”استغاثہ کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا جناب۔“ وہ رے
عطا سے بولا۔ ”میں نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔“
”بشارت صاحب! معزز عدالت یہ جانتا چاہتی ہے
کہ جب آپ نے وقوعہ کی رات ملزم کو زیر تعمیر عمارت سے
نکلنے دیکھا اس وقت رات کا یہ بجھا تھا۔“ وکیل استغاثہ
جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے سہارا لیا۔

”میرا خیال ہے اس وقت رات کے بارہ بجے دس
گیارہ بجے کا وقت تھا۔“ گواہ نے جواب دیا۔
”زیر تعمیر عمارت سے نکلے ہوئے ملزم کی کیسٹ
یہ تھی۔“

”یہ بہت گھبرایا ہوا نظر آتا تھا۔“ گواہ نے ملزم کی
جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ”چہرے پر پریشانی کے
تاثرات تھے اور سر کے بال ری طرح کھڑے ہو
تھے۔ یہ ایسی امر آخری کے عالم میں زیر تعمیر عمارت سے
تھا جیسے سے کہیں جانے کی جلدی ہو۔“

اس دوران میں میرا موکل اور اس کیس کا ملزم کا شرف
چپ چاپ اکیونڈ باکس میں کھڑا تھا۔ کسی بھی کیس کی
سماعت کے وقت ملزم کی کیفیت بڑی حسرت ناک ہوتی
ہے۔ اس ناجی دوست کیسٹ وکیل رہا ہوتا ہے۔ چپ
خاف ہر تشریف بات ان کے اسے خاف و خوش رہنا چاہتا ہے۔
یہ دراصل اس کے مہر کا حق ہوتا ہے۔ عدالت کی
سے اسے زخود ہٹا بھی ہوئے کی اجازت نہیں ہوتی۔
زندگی میں انسان اپنے خاف جھوٹ میں چند سینڈ کے
بھی خاموش نہیں رہ سکتا لیکن ٹھہرے میں کھڑے ہوئے
اپنے خداف بر جھوٹ اور انرا چپ چاپ اور صبر و تحمل سے
سننا پڑتا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر خوش ہوئی کہ میری مدد
یعین مطابق، کا شرف بڑے عزم کے ساتھ بائیں
سائے ثابت قدم کھڑا تھا۔

وکیل استغاثہ نے مزید دو چار سوالات کے بعد
ختم کی توجہ کی اجازت پا کر میں نے بشارت مرزا کو
میں نے ہلکے پھلکے انداز میں جرح کا آغاز کیا اور اسے
بھی محسوس نہیں ہونے دیا کہ آگے چل کر میں اسے
سوڈا سے دھونے کا ارادہ رکھتا ہوں۔
”بشارت مرزا صاحب!“ میں نے، سے متانہ

منہ زور

میں کہا۔ ”جناب عالی اس وقت عدالت میں تادورہ مرز
کیس زیر سماعت ہے اور میرے ہاں ضل دوست استغاثہ کے
معزز گواہ کے خاگی حادیت کا ذکر چھیڑ کر خیر مقدمت میں
عدالت کا قیمتی وقت بہادر کر رہا ہوں۔ یہ گواہ کی حادیت کو
مرد مت ایجتا تن و شش کر رہے ہیں۔“

ایسی کوئی بات نہیں ہے جناب عالی میں نے
وکیل استغاثہ کے سوال کے جواب میں تن سے کہا۔ میں

پریچا
نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں
کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں کارپین کو پرچا نہیں ملتا۔
ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش
ہے کہ پرچا ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون
کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ ایک استغاثی کا نام جہاں پرچا استغاثہ ہے۔
☆ شہر کا نام ہے۔
☆ ممکن ہو تو ہمیں اس کی PTCL یا 35802552-35386783-35804200 فون نمبر

رابطے اور مزید معلومات کے لیے
نصر عباس
03012454188

جی ڈی پی گروپ
35802552-35386783-35804200
ای میل: jdpgroup@hotmail.com

مجھے سوچے دیں۔ وہ سارا زہر سے چاروں
جانب کیکتے ہوئے۔ ”مم“ میں ابھی بتاتا ہوں۔
”دشمن سب پر آ رہا“ میں نے بیچ کی جانب دیکھتے
ہوئے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ”استغاثہ کے گواہ بشارت
مرزا کی دروغ گوئی راز روشن کر دے گی۔“
بعد عدالت سے میری درخواست ہے کہ مرزا صاحب کو
تفتیش کی غرض سے اگر حوالہ پولیس کیا جائے تو نہایت ہی
کارآمد معلومات حاصل ہو سکتی ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ان
کارآمد معلومات کی روشنی میں نادرہ کے اصل قاتل کا چہرہ بھی
چمک اٹھے گا۔

پولیس کے حوالے کرنے کا سن کر بشارت مرزا بری
طرح ہراساں ہو گیا۔ وہ کٹہرے سے باہر نکلتے ہوئے
خودکشی کے انداز میں بڑبڑایا۔

”مم۔۔۔ میں نے نادرہ کو۔۔۔ قتل نہیں کیا۔۔۔ مجھے
جانے دیں۔۔۔ میں خود کو پولیس کے حوالے نہیں کروں گا۔۔۔
میرا اس معاملے سے کوئی حق نہیں ہے۔ میں جا رہا ہوں۔“
جج نے بدلتی ہوئی صورت حال کے پیش نظر حکم دیا کہ
استغاثہ کے گواہ بشارت مرزا کو فوراً گرفتار کیا جائے۔
جج کا حکم سن کر ایک جانب پولیس حرکت میں آئی تو
دوسری طرف بچے والوں نے آنا قانا میں عدالت کا دروازہ
بند کر دیا۔ اگلے ہی لمحے پولیس نے فوری کارروائی کر کے
بشارت مرزا کو گرفتار کر لیا۔

XXX

جب کوئی شخص اپنے جرم کے محسوس شواہد کے ساتھ
پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا ہے تو پھر اس کی زبان کھلوانے
کے لیے پولیس کو زیادہ محنت نہیں کرنا پڑتی۔ بشارت نے بھی
نادرہ کے قتل کا اقبال کر لیا تھا۔

واقعات کے مطابق بشارت مرزا کو اس راز سے
آگاہی ہو گئی تھی کہ مقتولہ درمزمزیر قریب عمارت میں چھپ
چھپ کر ملاقاتیں کیا کرتے تھے۔ اس نے اپنے گھر کی
عربی دیوار کا ایک بلاک توڑ کر چھوٹا سا روزانہ بنا لیا تھا
جہاں کان لگا کر وہ ان کی محبت بھری باتیں سنا کرتا تھا۔
دو قہر کی رات مقتولہ اور درمزمزیر کی گفتگو نے بشارت مرزا کو
چونکا دیا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ مقتولہ، درمزمزیر کے
ساتھ گھر سے بھاگ جانے پر اصرار کر رہی تھی لیکن درمزمزیر
اسے سمجھانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا، بالآخر ان کے بیچ
ہلکی سی تلخ کھادی بھی ہوئی اور پھر درمزمزیر، مقتولہ کو زیر تعمیر

عمارت میں چھوڑ کر چلا گیا۔ مقتولہ اسے بزدلی کے طعنے
دیتے ہوئے وہیں بیٹھ کر روئے گی۔

اسی لمحے بشارت مرزا پر شیطان سوار ہو گیا۔ اس سے
پہلے کہ مقتولہ زیر تعمیر عمارت سے نکل کر اپنے گھر کا رخ
کرتی، وہ اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اپنے گھر کے اندر رستے
ہوئے مرزا نے نہ تو درمزمزیر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور۔
ہی اس کے لباس کے بارے میں کچھ جانتا تھا نہ ہی محبت
سے درمزمزیر کو دیکھنے اور اس کی کیفیت اور لباس کے بارے میں
اس نے جو کچھ بھی بیان کیا تھا وہ جھوٹ کا پلندا تھا اور یہ
جھوٹ اس نے اپنی بلا درمزمزیر کے سر ڈالنے کے لیے بولا تھا۔

جب بشارت مرزا مقتولہ کے پاس پہنچا تو اس کی
خواہش درحقیقت مکمل طور پر شیطان کے قبضے میں تھی۔
مقتولہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے ہی والی تھی کہ بشارت
نے اسے اپنی گرفت میں جکڑ لیا۔ مقتولہ نے چیخنے چلانے اور
بشارت کی گرفت سے نکلنے کی بہت کوشش کی لیکن بشارت
کے اندر جاگتے چنگھاڑتے شیطان نے سب کی پیش نہ چھوڑ
دی۔ بشارت نے ایک ہاتھ کو بڑی مضبوطی کے ساتھ اس
کے منہ اور ناک پر بھرا رکھا تھا تاکہ اس کی آواز اس عمارت
سے باہر نہ نکل سکے، دوسرے ہاتھ سے وہ مقتولہ کو زیر کر۔
کی کوشش کر رہا تھا۔ اس چھینا جھپٹی میں مقتولہ کا لباس جگہ جگہ
سے پھٹ گیا اور اسے چوٹیں بھی آئیں۔ سانس کی آمد و شد
محطل ہونے کے باعث مقتولہ بے دم سی ہو کر ڈھلے گی۔
اس کے بعد بشارت مرزا کو اپنے شیطانی عزائم کی تکمیل میں
کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی۔

جب بشارت مرزا کے حواس ٹھکانے پر آئے تو وہ
پکڑے جانے کے ڈر سے یک دم ہل کر رہ گیا۔ مقتولہ اپنے
ساتھ ہونے والے ظلم کے بارے میں سب کو بتاتی پھر اس کا
پچھتاہنہ نہ رہتا۔ پکڑے جانے کے خوف سے اس نے
اضطراری انداز میں، گلا گھونٹ کر مقتولہ نادرہ کو موت کے
گھاٹ اتار دیا۔

عدالت نے آئندہ پیشی پر میرے موکل کو باعزت
بری کر دیا۔ بشارت مرزا کے اقبال جرم کے بعد عدالت
کے لیے فیصلہ سنانا بہت آسان ہو گیا تھا۔

نادرہ ایک خود سارا اور منہ زور لڑکی تھی۔ اگر اس نے
کاشف کی بات مان لی ہوتی تو ایسی عبرت ناک موت اس
کے حصے میں نہ آتی۔ لیکن وہ کیا کہتے ہیں کہ مقدر میں جو دکھ
اور پریشانی لکھی ہو، وہ بالآخر مل کر رہتی ہے۔۔۔!

(تحریر: حسامہ بیگم)



تہ دام

سلیم انور

داناہ ڈال کر پنچھی قید کرنے والے صیاد جب خود جال میں الجھتے ہیں تو
بے بسی انہیں پھڑپھڑانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ایسے میں زمانہ ان پر
ہدستا ہے اور گردشِ دوراں ان کے دائرہ اختیار کو تنگ کر دیتی ہے اور پتہ
رفہ رفہ بڑھتا ہوا حبس انہیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

میں عام طور پر ہوائی جہاز کے سفر کے دوران
اکتھبٹ دور کرنے کے لیے مسٹری اسٹوری میگزین خرید لیتا
ہوں اور پھر اسرار کہانیاں پڑھتا رہتا ہوں لیکن اس مرتبہ
مجھے کہانیاں پڑھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ اس لیے
کہ جہاز میں میرے برابر کھڑکی کے ساتھ والی نشست پر
بیٹھا ہوا شخص کسی بھی میگزین کے مطالعے سے کہیں زیادہ
دلچسپ لگ رہا تھا۔

وہ ایک ادیبِ عمرِ مختصر تھا۔ اس نے روایتی لباس زیب

تن کیا ہوا تھا لیکن قدرے بے احتیاجی کے ساتھ۔ اس کی ٹیڈی سے بچے کا گوشت لگا ہوا تھا اور پر سکوں برادوں آنکھوں کے اوپر بھوئیں خاصی گھنی تھیں۔

فلک آف سے ٹل جب میں نے اس کے برابر میں درمیانی راستے کے ساتھ والی سیٹ سنبھالی تو اس نے ایک اچھٹی ہوئی نگاہ مجھ پر ڈالی اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔ میں اس سے بات چیت کرنا چاہتا تھا لیکن نہ جانے کیوں آغاز نہ کر سکا اور وہ بھی اس وقت تک خاموشی اختیار کیے رہا جب تک جہاز ہوا میں بلند نہیں ہو گیا پھر اشارہ ملنے پر ہم نے اپنے سیٹ بیلٹ کھول لیے۔

تب گفتگو کا آغاز اسی نے کیا۔ انداز دوستانہ اور نرم تھا۔ "میں دیکھ رہا ہوں کہ تم پراسرار کہانیوں کے شیدائی ہو۔" اس نے میرے ہاتھ میں دبے ہوئے مسٹری اسٹوری میگزین کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں حقیقت میں ان کہانیوں کا رسیا تو نہیں ہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن ہوائی سفر کے دوران وقت گزاری کے لیے یہ کہانیاں میرے لیے خوش گوار ثابت ہوتی ہیں۔"

"میں بھی اصل میں پراسرار کہانیوں کا حقیقی شیدائی تو نہیں ہوں لیکن میں یہ کہانیاں اس لیے پڑھتا ہوں کہ مجرموں کی متقی مجرمانہ عکس سے باخبر رہوں۔" اس نے بتایا۔

"یہ بات بہت سے لوگوں کو غلط رائے قائم کرنے پر مجبور کر سکتی ہے۔" میں نے اس کی بات کو خوش مزاجی میں لیتے ہوئے تبصرہ کیا۔ "وہ سمجھ سکتے ہیں کہ تم کوئی عادی مجرم ہو جو اپنے ٹریڈ جنرلز کا مطالعہ کر رہا ہے۔"

میرے تبصرے پر وہ دھیمے انداز میں مسکرا دیا۔ "یہ بات ایسی بری نہیں ہے جیسی کہ تم سمجھ رہے ہو۔" اس نے کہا۔ "میں ایک بینک میں کام کرتا ہوں۔ بینک پیسے کا کاروبار کرتا ہے اور جیسا مجرموں کی توجہ کھینچتا ہے۔ بات صرف یہ ہے کہ میں ہر مشکل وقت کے لیے خود کو ریڈی رکھنا چاہتا ہوں، اگر وہ اس بینک میں کسی کارروائی کی کوشش کرتے ہیں جہاں میں کام کرتا ہوں۔"

میں نے اس بات پر اشارات میں سر ہلا دیا۔ تب وہ طنز رائے لہجے میں بولا۔ "میرا نام کو لیا کی ہے۔" "اور میرا نام ڈکسن ہے۔" میں نے کہا۔ "تم سے مل کر خوش ہوئی۔"

"میں خود بھی ایک مرتبہ مرجنس نیشنل بینک میں بینک ڈکیتی کی ایک واردات میں کس آپ ہو چکا

ہوں۔" اس نے کیلی فورنیا بے میپ جھونے سے ناواں ہٹا کر دیکھ کر کہا۔ "میں نے اسے دیکھا ہے۔ یہ اتنی عجیب سی چیز ہے کہ اسے دیکھ کر ہر آدمی ہلکا ہوتا ہے۔"

"یہ تو بڑی دلچسپ بات ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ سن کر اس نے شانے اچکا دیے۔" تم اسے دلچسپ کہہ سکتے ہو، آل رائٹ۔" پھر اس نے اپنی نشست کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور یہ ظاہر تعلق سا ہو گیا۔

لیکن میں اس سے یہ کہانی اگلوں چاہتا تھا۔ چاہتا تھا کہ وہ خود اسے بیان کرے۔ "مجھے اس کے بارے میں بتاؤ۔" میں نے کہا۔

"تم پور ہو جاؤ گے۔" اس نے کہا اور دوبارہ آنکھیں کھول دیں۔

"میں پور نہیں ہوں گا۔" میں نے اپنے لہجے میں دلچسپی کا عنصر پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"تو پھر ٹھیک ہے، یہ کوئی طویل داستان بھی نہیں ہے۔ یہ واقعہ آج سے بیس برس پہلے پیش آیا تھا۔" اس نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں جیسے اس واقعے کو آپ ان میں تازہ کر رہا ہو۔ میں ہر تن گوش تھا۔

"میں اس وقت بینک میں اسسٹنٹ کیشیر تھا۔ اس نے اپنی بات کا سلسلہ جوڑتے ہوئے کہا۔ "بلکہ درحقیقت ایک کلرک تھا۔ ہمارے بینک میں شینڈل پارٹ کی سہولیت مہیا تھی جہاں پر اس ناؤن کے تاجرات کو اپنے اسٹور بند کرتے کے بعد اپنے کیش کو محفوظ رکھنے کے لیے بینک میں ڈیپازٹ کر دیا کرتے تھے۔ ان دنوں میں تمام اسٹور جمعات کی شب نو بجے تک کھلے رہتے تھے اس لیے مجھے کی بج ہمارا نام ڈیپازٹیری میں اچھا خاصا کیش موجود ہوتا تھا۔"

"مجھے اس بارے میں بہ خوبی معلومات حاصل ہیں۔" میں نے کہا۔ "میں فریسو میں ایک اسپورٹنگ گڈر کا مالک ہوں۔"

"ادو، واقعی؟ یہ اس ملک کا ایک عمدہ علاقہ ہے۔ بہر حال، بینک میں مجھے تعویض کردہ فرائض میں سے ایک سب سے سیر سے بینک میں پہنچنا، رات بھر کی جمع شدہ رقم کو سینٹا، اس کی گنتی کرنا اور جب اسسٹنٹ کیشیر بینک کھلنے کے وقت آ جاتا تو تمام رقم اس کی میز پر اس کے سپرد کر دینا شامل تھا لہذا ہمیشہ یہ میں ہی ہوتا تھا جو سب سے پہلے بینک پہنچتا تھا۔ دیگر بینک ملازم بینک کھلنے کے مقررہ وقت سے پندرہ منٹ پہلے سے آنا شروع ہوتے تھے لیکن میں سرور

ج آئے گئے سے بھی پہلے بینک میں موجود ہوتا تھا اور اسے یہ کام لینا تھا۔ رات چھ بج گئی تھی۔ اس نے مجھے یہاں سے دیکھا کہ کسی کے پیچھے سے قتل میں ہی اس کے بینک کا ڈسے دار تھا اور اپنی مرضی سے آزادانہ نقل و حرکت کر سکتا تھا۔" میں نے قابل فہم انداز میں سر ہلا دیا۔

بہر حال، ایک روز میں معمول کے مطابق صبح آٹھ بجے تک بینک اپنے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ میں اپنے رہنما کارٹر چرپس کے انتقاد میں کھڑا ہوا تھا جس میں بیٹھ کر میں اپنی ڈیوٹی پر جا کر رہتا تھا۔ اسے میں ایک گرسے رنگ کی ٹورڈ سیزان کار آئی اور بس اسٹینڈ کے برابر میں آکر میرے سامنے رک گئی۔ ڈرائیور نے کھڑکی سے سر نکالتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ مجھے شہ جانے کے لیے اسٹاپ چاہیے؟ میں نے جواب دیا کیوں نہیں۔ تب ڈرائیور نے میرے لیے اپنے برابر کی نشست کا دروازہ کھول دیا۔

نیا ٹورڈی کار میں بیٹھ گیا۔ "ایک سٹری کہانی میں تمہیں اسی وقت شبہ ہو جاتا ہے تھا کہ ایک جنی بلاؤج نہیں لٹھ کی پیشکش کر رہا ہے جو تم سے اس سے حد لینے کا اشارہ بھی نہیں کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "نہیں تو تھینک ٹو کہہ کر اپنی بس کا انتظار کرنا پڑے گا۔"

"نابا مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا لیکن یہ بات قطعی ہے کہ اس کے کسی گوشے میں بھی نہیں آئی کہ اس روز کوئی چال میرے خلاف زیر عمل ہے۔ فورڈ میں ۳۰۰ ہونے کے بعد تب مجھے احساس ہوا کہ میرے اور ڈیپازٹ کے عقب میں دو افراد پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے ہیں اور جس بات سے مجھے انتہائی زبردست جھٹکا لگا وہ یہ تھی کہ جو شخص اس کی جانب بیٹھا ہوا تھا اس نے اپنے ہاتھ میں ایک لمبے ٹول اور ریو اور تھا ماہو، تھا اور اس ریو الوو کارخ میں میری طرف تھا۔ مجھ پر صدمہ سے اور حیرت کی ٹلی جلی کیفیت طاری ہوئی تھی۔ مزید حیرت کی بات یہ تھی جو مجھے پادروہ گئی تھی کہ اس شخص کے سامنے بیرل پر وہ ابھار نما پرزہ نہیں لگا ہوا تھا جس سے شائد لیا جاتا ہے۔"

"تک سے کہ کسی بہر چوب کار نے اسے رہتی سے پھینک دیا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "ایک قسم کا ٹارگٹ تھا۔ ایک پستول میں اپنے اسٹور میں فروخت ہوا۔ وہ جو کہ یقیناً دماغ چلا تھا جو اس قسم کی پچھلے گن کے ساتھ کوئی کام سرانجام دینے نکل کھڑا ہوا

"جہاں تک میرا تعلق تھا، وہ یقیناً دماغ چلا ہی تھا۔ اپنی حالت پر توجہ دلانے کے لیے میں نے نڈو کچھ کہا اور نہ ہی کوئی واحد حرکت کی۔ میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ رہا ہوں۔ اس لیے کہ جس شخص نے گن تھامی ہوئی تھی اس نے ہی مجھ سے کہا تھا کہ میں نہ تو کسی قسم کی حرکت کروں اور نہ ہی میری کوئی آواز نکلے اور میرے لیے یہی ایک وجہ کافی تھی۔

ہم خاموشی سے بینک کی جانب رواں تھے لیکن نہایت متوازن رفتار کے ساتھ۔ ڈرائیور نے فورڈ بینک کے عقب میں وہاں کادروک دی جہاں سے میں ہمیشہ بینک کے اندر جایا کرتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ میرے روز کے معمول سے بہ خوبی واقف تھا۔ بینک کا حقیقی حصہ ایک پتلی ی گلی میں واقع تھا اور حقیقی دروازہ صرف بینک کے ملازمین استعمال کرتے تھے اور اتنی صبح پوری گلی سسٹان پڑی تھی۔"

"ریو الوو بردار شخص نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔" ہم پہنچ گئے ہیں دوست۔ اب باہر نکل آؤ۔" اس نے مجھے کار سے نیچے اترنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی وہ اور اس کے ساتھ عقبی نشست پر بیٹھا ہوا اس کا ساتھی بھی باہر نکل آئے۔

تب میں نے پہلی مرتبہ ان دونوں کا چپکے سے جائزہ لیا۔ جس شخص نے ریو الوو تھا، ہوا تھا وہ دراز قامت اور خاصا بڑا پتلا تھا۔ اس کے بالوں کی رنگت سنہری تھی۔ اس کا ساتھی موٹا تھا اور اس کے بال سیاہ ٹھنکے والے تھے اور گردن کے عقب میں کالر تک آئے ہوئے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔

پھر دراز قامت ڈرائیور سے مخاطب ہوا۔ "تم گاڑی کے ساتھ ہمیں ٹھہرو۔" اس کے بعد مجھ سے بولا۔ "اگر تم ہائٹلر نہ کرو تو اب دروازہ کھول کر اندر چلتے ہیں۔" اس کا لہجہ نرم، شائستہ اور عجلت سے عاری تھا جیسے کہ وہ اس قسم کے کاموں کا روزمرہ کا عادی ہو یا ہو سکتا ہے کہ عادی رہا ہو۔

مجھے کسی قسم کی بحث کرنے کا کوئی جواز دیکھائی نہیں دیا کیونکہ لمبے بیرل والی گن میری پیٹھ پر چبھ رہی تھی لہذا میں نے اپنی چابیاں نکالیں اور دروازہ کھول دیا۔ جب میں تالے میں چابی لگا رہا تھا تو میری آستین اوپر ہو گئی اور میری نگاہ اپنی کلائی پر بندگی گھڑی پر پڑ گئی۔ اس وقت صرف سو آٹھ بجے تھے۔ ابھی بینک کے گاڑی یا کسی دوسرے ملازم کے آنے میں خاما وقت باقی تھا۔ مجھے کسی کے جلد آنے کی توقع بھی نہیں تھی لیکن مجھے یہ معلوم تھا کہ والٹ پر لگا ہوا تمام لاک بینک کھلنے کے وقت سے صرف چند منٹ پہلے پر سیٹ تھا اور مجھے یقین واقعی تھا کہ وہ والٹ کے بارے میں کچھ بھی

ناٹنے کے لیے نکلنے سے پہلے اس کے گھر پر فون کر کے کہہ دیتی کہ آج جب وہ بینک کے سامنے سے گزرے گا تو اسے چھوڑ کر فرار ہو جائے گا۔

”اور سیکورٹی کے بارے میں کیا ہوتا؟ فرض کرو کہ ڈکیتی والے اس مخصوص دن وہ خود بیمار پڑ جاتا؟“ میں نے سوال کیا۔

”یہ ایک غیر متوقع اتفاق ہوتا۔“ کولہائی نے جواب دیا۔ ”میرا خیال ہے کہ ایسی صورت میں یہ میرے اور ٹائٹ ڈیپارٹمنٹ کے لیے بہت برا ثابت ہوتا۔“

جب میں نے جہاز کے پیپر رن وے سے چھوٹے محسوس کیے تو اپنا سیٹ بیلٹ کھول دیا۔ ”میں تو یہ کہوں گا کہ وہ تمہارے لیے واقعی بہت برا دن ثابت ہوا تھا، ٹھیک ہے ناں؟ تم اپنے لائیو برگر الارم سسٹم کے ’ان سائیڈ‘ میں آتے تھے۔ تم نے خود ہی خطرہ مول لینے کا جائس لے رکھا تھا۔ ان ڈکیتوں نے تمہارے سر پر ضرب لگا کر تمہیں بے ہوش کر دیا تھا جبکہ تمہارا دوست سیکورٹی ڈیپارٹمنٹ کا کافی شاہد تھا۔ اور انڈسٹری کھارہا تھا۔“ جہاز رک گیا تو ہم اپنی نشستوں پر سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”ہاں، میرے خیال سے یہ بات درست ہے۔“ کولہائی نے بار بار دہرایا۔ ”میں اس وقت ہم جہاز پر تھے اور جیسا کہ تم نے پہلے تبصرہ کیا تھا، یہ سب خاصا ہیجان خیز اور پُر تش رہا تھا۔“ میں نے اس بات کا جواب دیا۔ ”ابھی آپ نے کہا کہ سسٹم ڈکسٹن کہ یہ کتنی سستی خیز بات تھی کہ آپ نے اپنی کھوپڑی کو ایک ریو اور کے دستے کا نشانہ بننے دیا اور آپ نے کو کچھ بتا نہیں چلا کہ آپ کے ساتھ کیا ہوا ہے حتیٰ کہ دو گھنٹے بعد آپ کو ہوش آتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ آپ کو کل نہیں کیا گیا۔ آپ زندہ ہیں۔ یہ سب بے حد سستی خیز تھا سسٹم ڈکسٹن۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیا تم اب بھی مرچنٹس نیشنل بینک سے وابستہ ہو؟“

”ہاں ابھی تک اسی پرانے کھوٹے سے بندھا ہوا ہوں اور جوئی سیکورٹی بھی۔ وہ اب بھی اس بینک کا پریزیڈنٹ ہے۔“ کولہائی نے جواب دیا۔

”یہ تو اس کے لیے بہت اچھا ہوا۔ اسے نیکی اور مہربانی کہا جاتا ہے اور آج کل تم کیا جاب کر رہے ہو، مسٹر کولہائی؟“ میں نے جانتا چاہا۔

”میں اس بینک کا پورڈ چیئر مین ہوں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ ”میں بہ دستور خطرات مول لے

رہا ہوں۔“

”اب پوری کہانی میری سمجھ میں آگئی۔“ میں نے دہرائی۔ ”شروع سے لے کر حال تک کی کہانی۔ ہم ریسیپ پر چلتے ہوئے ایک ساتھ ایئر پورٹ ٹرمینل پر آ گئے۔ میں اس بے قدرے پیچھے چل رہا تھا۔ میرا ٹاپ کوٹ میرے دائیں بازو پر لٹکا ہوا تھا۔ جب ہم ٹرمینل کی لابی میں پہنچے تو میں نے بے اختیار اپنے ٹاپ کوٹ کی آڑ سے اپنی شہادت کی انگلی اس کی کمر میں گاڑ دی اور بولا۔ ”بائیں طرف محوم جاؤ مسٹر کولہائی اور سیدھے مردانہ وارث روم میں داخل ہو جاؤ، کیا سمجھے؟“

اس نے خامسے پُر سکون انداز میں ریوئل کا اظہار کیا۔ جب وہ میری طرف گھوما تو اس کی آنکھیں قدرے پھٹی ہوئی تھیں۔ اس کا جسم بھی قدرے تھک گیا تھا اور اس کی پشت کی مسٹر جھے اپنی انگلی تھارتزتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں تب وہ بولا۔ ”دش رہے ہیں، کیوں؟“

”اب سمجھتے ہیں یہ مت نہ نہ۔“ اس کی چالی صرف تھیں۔ ”سسٹم کیئر کے پاس ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ہم پکڑ گئے۔ اب اندر چلو۔“ ہم، دش رہے ہیں، روم میں داخل ہوئے۔ ”دش کا“ اس نے کہا۔ ”مجھے خدا کا شکر ہے۔“

جب دش روم کا رونا دہنا دیکھا تو ایک لمحے کے ساتھ اندر تو میں نے یہ بات کی کہ اس کی پشت پر سے ہنسی۔ ”مہربانی سے اس جاب کو کرنا۔“ اس کی نگاہیں حقیقت میں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ وہ سر کو پیچھے کی جانب خم دیتے ہوئے میرے چہرے پر نقوش کا بغور جائزہ لینے لگا اور تب پوری بات بلا تاخیر سن سبھی میں آگئی۔ اس نے مجھے پچھون لیا۔

”تم نے اس کے بعد اپنا خاصا وزن بڑھا دیا ہے ڈکسٹن۔“ اس نے کہا۔ ”اور نام بھی تبدیل کر لیا ہے۔“

”کیا تم واقعی فریسو میں کھیلوں کے سامان کے اسٹور کے مالک ہو؟“ کولہائی نے جانتا چاہا۔

”میں نے اس سلسلے میں اُمید باندھی ہوئی ہے۔“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ایک اسپورٹنگ گڈز اسٹور میں کلرک ہوں اور مجھے ایک خریدنے کا ایک شاندار موقع مل رہا ہے، اگر اس بٹنے کے خرچہ میں ایک لاکھ ڈالر کا انتظام کر لوں۔“

”اوہ۔“ کولہائی نے کہا۔ ”تب تو تم جرم سے تائب ہو شریفانہ زندگی گزار رہے ہو گے؟“

”اب پاس کے بند سے میں ہیں خوش رہ رہا ہوں۔“ میں نے اپنی انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”اب میں اپنی جگہ پر نشہ لینے والے بھڑا رہتی سے ہیں گھٹا۔“

”تم قرض کے لیے درخواست کیوں نہیں دیتے؟“

”میں نے چاہا۔“

”کیا تم کسی ایسے ادارے سے واقف ہو جو ساہتہ مجرموں کو احارم دیتا ہو؟ میں نے تو کوشش کمرے کے دیکھ لی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”تم نے ہمارے بینک میں کوشش نہیں کی؟“

”میں کرنے جا رہا تھا بلکہ آج صبح اس بارے میں اتنی طور پر پتیل کرنے کے لیے تمہارے پاس جا کے کہ اس سے وہاں گیا بھی تھا یہ سوچ کر نہ یہ تم ب بھی وہاں کام کر رہے ہو گے۔“

”تو پچھتم میرے پاس تھے کیوں نہیں؟“

”میں اس وقت جواب دے گئی جب میں نے وہاں پہنچا۔“ میں نے تفسیر دیا۔ ”اس پریذیڈنٹ کے ناموں کا ایک عجیب و غریب ہجے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ وہی ہے جسے میں نے دیکھا تھا۔“

”تم نے مارٹن سے کچھ نہیں سنا؟“

”کولہائی نے جانتا چاہا۔“

”ہاں، میں نے اتفاقاً تمہیں بینک کے نکلے ہوئے پتے پر ملایا تھا۔ تمہارا ہیڈ اور اوور کوٹ اور اوور ٹائٹ بینک کے پاس تھا۔ درحقیقت ایئر پورٹ کی ٹیکسی میں سوار ہو رہے تھے۔ میں نے فوراً ہی تمہیں پچھون لیا تھا سو میں نے اثر ڈال دیا تھا۔“

”تم نے اس بات میں سہارا دیا۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے اثرات سے عاری تھا۔“ ایک لاکھ ڈالر۔“ اس نے دہرایا۔

”اس اتنی ہی رقم درکار ہے اور میرے پاس قرض سے یہ ضمانت پر رکھنے کے لیے کوئی شے بھی نہیں ہے۔“

”میں نے اس سلسلے میں اُمید باندھی ہوئی ہے۔“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ایک اسپورٹنگ گڈز اسٹور میں کلرک ہوں اور مجھے ایک خریدنے کا ایک شاندار موقع مل رہا ہے، اگر اس بٹنے کے خرچہ میں ایک لاکھ ڈالر کا انتظام کر لوں۔“

”میں نے اس سلسلے میں اُمید باندھی ہوئی ہے۔“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ایک اسپورٹنگ گڈز اسٹور میں کلرک ہوں اور مجھے ایک خریدنے کا ایک شاندار موقع مل رہا ہے، اگر اس بٹنے کے خرچہ میں ایک لاکھ ڈالر کا انتظام کر لوں۔“

”مجھے معلوم ہے اور مجھے اس پر کوئی فریب نہیں ہے۔“

اس معاملے کو دوسری نظر سے دیکھو مسٹر کولہائی۔ کیا بینک ڈکیتی کا کامیابی کے ساتھ کام بنانے کی تمہاری وہ کوشش یہ پہلا اتفاق نہیں تھا کہ جب تمہاری بینک انتظامیہ تمہارے اور سیکورٹی کی جانب واقعی متوجہ ہوئی تھی؟ کیا یہی واقعہ دیگر واقعات کو راہ دینے کا سبب نہیں بنا تھا جس کے نتیجے میں تم دونوں آج ان اعلیٰ ترین عہدوں پر براجمان ہو؟“

”میں ٹیکسی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں عارضی طور پر سانس لینا بھول گیا ہوں۔ میرے پاس یہی وہ واحد ہتھیار تھا جو میں مسٹر کولہائی کو دوسری مرتبہ اپنا شکار بنانے کے لیے استعمال کر سکتا تھا۔ اس نے ایک منٹ تک کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھا پھر اس کے ہونٹوں نے معمولی سی حرکت کی تو میں نے دوبارہ سانس لینا شروع کر دیا۔“

”تم جانتے ہو۔“ اس نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو، ڈکسٹن۔ یہ تمہاری بدولت ہوا تھا جب بینک نے پہلی بار مجھے قابل توجہ سمجھا تھا۔ میں نے اس سے پہلے بھی اس بارے میں تصور بھی نہیں کیا تھا پھر اس کے بعد ہی سے بینک ہم پر مکمل بہ کرم ہونا شروع ہوا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ایک طریقے سے میں اور سیکورٹی دونوں ہی تمہارے مفروض ہیں۔“

”تو پھر دونوں کی جانب سے پچاس پچاس ہزار ڈالر کیوں نہ ہو جائیں؟ تم اسے ذاتی قرض کہہ سکتے ہو مسٹر کولہائی اور میں یہ قرض لوٹا دوں گا۔“ میں نے صدق دل سے کہا۔

اس نے فوراً ہی ارادہ کر لیا۔ ”مجھے پتہ نہیں ہے کہ تم قرض لوٹا دو گے۔“ اس نے جواب دیا پھر اس نے چیک بک نکالی اور ایک لاکھ ڈالر کا چیک لکھ دیا۔ وہ چیک میرے حوالے کرنے کے بعد ہم دونوں نے گرم جوش کے ساتھ ایک دوسرے سے مصافحہ کیا۔

”ایک بات تو بتاؤ۔“ اس نے تجسس لہجے میں کہا۔ ”تم اس بات کے لیے مجھے یہاں کیوں لائے تھے؟ تم مجھ سے جہاز میں یا باہر لابی میں بھی تھا سنا کر سکتے تھے؟“

میں نے داش روم میں چاروں طرف نگاہیں دوڑاتے ہوئے سفید ٹائلز سے آراستہ خالی دیواروں کا جائزہ لیا اور اس کی جانب دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولا۔ ”یہاں کوئی چلن نہیں ہے، مسٹر کولہائی۔“

مہفل شہر و سخن

رضاوان تہوں اور نگہ ناؤں، کراچی
نہ مچھوں سے سوئے بھی ٹیپ کرتے ہو
بس مسکراتے ہو اور دل خرید لیتے ہو
سوہتی ہو رینٹ

مجھ سے گریز پا ہے تو ہر راستہ بدل
میں سنگ راہ ہوں تو سبکی راستوں میں ہوں
مجھ سے بچنے کے تو بھی روئے گا، عمر بھر
یہ سوچ لے کہ میں بھی تیری خواہشوں میں ہوں
قیصر اقبال کچہ کھول، ضلع بھکر
تو ماری دھم لگا ہے دل پر پہلے اس کی فکر کر
یہ بعد میں دیکھ جائے گا یہ کسی کی کارگزاری ہے



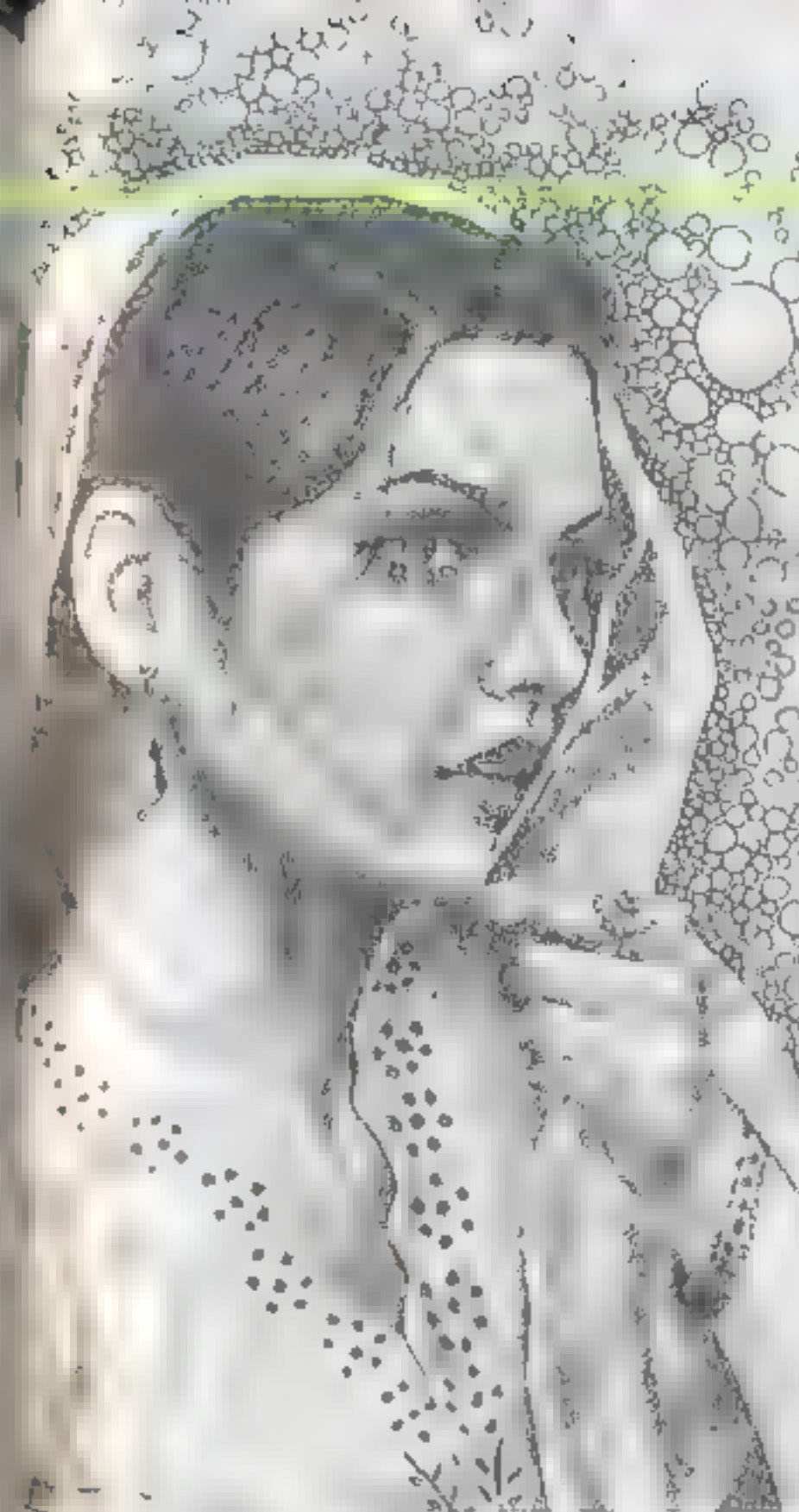
حسب احمد پناہ، سندھی کرک
غل تک تھا حساس کسی کے ہونے
تو سے صرف درد کسی کے کھونے کا
طہر حسین پچرہ، بناری

وہ رستے وہ منز، وہی کاررواں وہی مرتے
لیکن اپنے اپنے مقام پر بھی ہم نہیں بھی تم نہیں
تفسیر عباس بار، انکارہ

قرب جہاں کی آرزو کر کے!
رب کون وہاں سے گزرے ہیں
رندی تیری تلاش میں ہم
موت کے درمیاں سے گزرے ہیں

حافظ شہد مہر چدرا، سینٹرل جیل کوہاٹ
مرگے ان سے ہے "وفا" کی امید
جو نہیں جانتے کہ وفا کیا ہے
جاوید شہیر بربرہ، مظفر گڑھ

سب قسانے ہیں دنیا کی
سب نے اس کا سونہا ہوا ہے
جی تو یہ ہے اس زمانے میں
نہ کسی سہا سوں تو بھی جھوٹے



ایر وارث، سندھ لیاؤں

آج اس نے درد بھی اپنے ساتھ لے لیا ہے
آج میں رویا تو مرے ساتھ وہ رویا نہ تھا

حیات خان، رحیم یار خان
مجھے کسی سے بھلائی کی اسب توقع نہیں تھی
میں سانسب سے کہہ رہا ہوں مجھے دعاؤں میں بارش

عادل عاصی خان، ڈسٹرکٹ کرک
آہ کو چاہے اک عمر اڑ ہونے تک
کون جیتا ہے تری ذلف کے سر ہونے تک
ماتا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

عاقب اقبال، سالم جیل سرگودھا
بزم وفا میں میری غریبی نہ پوچھ غائب
کے وہاں ہے وہ بھی کی

نوائے نارساں ملد، انک

وہاں تہ میں چل دیے، دعا نہ سلام
وہاں دیر میں کیا ہو گیا زمانے کو

نوائے عباس بابر، لاہور
ماثر انداز میں جب مجھ کو بسل تھا
یہ میری بھری رشتوں کو، ہاتھ سے میں لٹکا تھا

امد خان تو حیدری، پاکستان آئیں، کراچی
ہر روز ہے دفتروں کی اسی ایک فصاحت میں
خمس کا جہاں اور ہے شاہین کا جہاں اور

عاصم اقبال، جہاں... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
تہی بے کیف سی رہ جاتی ہے دل کی ہستی
کتے چپ چاپ چلے جاتے ہیں جانے والے

حسین ہاشمی صاحب، سینٹرل جیل کوہاٹ
نئے ہی آج اب سیاد کیا پڑے گے
پھوٹے فقس سے بارہا پکڑے گئے
نہ چھوڑا مہا نے اسے ہماری کیا خطا
نہ ملا، جس بے خطا پکڑے گئے

نشین عباس، کھاریاں
اب وفا کو پانے کی کوشش میں
رہی ہوئی تھی وفا میں کتنی
تو معصوم سا لگتا ہے غلام محبت؟
وہ لفظ سے ملتی تھی سزا میں کتنی؟

محمد رشید سیال، سدھو ہڑی، ضلع سکھر
نہ ہاتھوں کی لیکروں میں عیب ہے اک محسن
نہ کسا سے ہاتھ ملاتا ہوں وہ میرا نہیں ہوتا

مہرین باز، حیدرآباد
میں جہاں دیار دل، نہ بچھڑنے کا تو ملاں کر
نہ سبک دینے کا حوصلہ میری یاد رکھ لے سنبھال کر
نہ سدھو کا میرے ضبط کا، میری بے بسی میرے صبر کا
نہ نہ آئے تو دیکھ لے تو ہوا میں پھول اچھال کر

باجا احمد رحیل، ساہیوال
وہاں میں کسک دل میں دما چھوڑ گئے
وہاں کیا محبت کا جہاں چھوڑ گئے
یہ تو دھڑکنے کی صدا بھی نہیں سنائی دیتی
وہاں سے سینے میں دل ہی کہاں چھوڑ گئے؟

نوائے نارساں ملد، انک

اچھے تھے وہ دن جب میری ہاں زندہ تھی
ایک دروازہ جنت میرے دلائل میں تھا

نوائے کائنات مریم، حیدرآباد
وہاں کر آگ دل میں اب چلے ہو تم کہاں
ابھی تو راکھ اڑنے پر تماشاً اور بھی ہوگا

فشی عاشق حسین، پنجاب یونیورسٹی، لاہور
ضبط گریہ نے مجھے تھم تو رکھا ہے مگر
مجھ سے تاوان میں آنکھوں کی جلن مانگتا ہے

کنول ناریہ، سلیم ناریہ، کھاناں
ہم وفا میں کر کے رکھتے ہیں وفا کی آرزو
دوستی میں اس قدر سودا گری بھی جرم ہے

سلیم شہزاد رائے، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
منسوب تھے جو لوگ میری زندگی کے ساتھ
اکثر وہی ملے ہیں بڑی بے رخی کے ساتھ

چہرے بدل بدل کے مجھے مل رہے ہیں لوگ
اتنا برا سلوک میری سادگی کے ساتھ
رہی جانہ، سکھر

وہ میری روح کی چادر میں آکے چھپ گیا ایسے
کہ روح نکلے تو وہ نکلا، جو وہ نکلا تو روح نکلے
بابر عباس، گلپانہ روڈ

کچھ قسلی ہو چاہتا ہوں میں
اتک خونیں کا بانٹ دوں حصہ
جس کو دیکھوں اسے سنا ڈالوں
اپنے دور شباب کا قصہ

مہربا بابر عباس، گلپانہ روڈ، کھاریاں
میرے ہمراہ بنے میری جیتو رکھتے
ایک ہی صبح کی طرح میری آرزو رکھتے
اپنے دل میں چاہے مجھے کوئی مقام نہ دیتے
زمانے کی نظر میں تو میری آمد رکھتے

ملک انصاف نادر، جنڈالہ کھاریاں
میں جب بھی دل سے پوچھوں تیرے ہونے کا سبب
بے قرار اس دل کو چھین بھی آتا ہے
میں چاہتا ہوں آپ کو اپنے انداز سے
لوگ کہتے ہیں کہ مجھ کو پیار بھی آتا نہیں

موسم خشک اور گرم تھا۔ آسمان پر کہیں کہیں بادل
 ہرگز نہیں آتے تھے۔ لیکن ہلکی ہلکی بارشیں آتی تھیں۔ گنت تھیں۔
 دن کی آمد کو بھی نہیں روکا جاسکتا تھا۔ اس دنیا میں ہر چیز کو ختم
 ہونا ہے اور وہ جاتی تھی کہ اس شخص کی جڑیں پر آمد کے

انصاف

تویر ریاض

کہنے کو تو اس دنیا کی اساس میں توازن شامل ہے مگر
 دنیا والے جانے کیوں اس خوبی کو اپنانے سے کتراتے
 ہیں۔ اسے بھی اعتدال سے کوئی خاص واقفیت نہ
 تھی۔ لہذا حالات کی سرکش موجوں نے اس کے توازن
 کو اپنی لپیٹ میں کچھ ایسا لیا کہ زندگی کا نقشہ ہی
 بدل گیا۔۔۔ ویسے بھی سرکشی کسی بھی روپ میں
 بویقاوت پر اکساتی ہے اور بقاوت میں بہت کم انصاف
 سے کام لیا جاتا ہے مگر جذب قدرت منصف ہو تو تمام
 تعاصیہ سیاسی بدھالے جاتے ہیں۔

سرمایہ داروں کی غارتگریاں



محمد قدس سرہ اند نیازی، حکیم ناؤن، خاندان
 وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔
 وقت سے بھی تیز نکلے ہو صاحب
 بہت حد تک اپنی
 میں سے لی دستار میں ہوں پر بھی
 وہ مجھے کو میری رضا سے مانگتا ہے
 جنید احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی
 فکر یہ ہے کہ تم میرے ہو
 فکر یہ ہے کہ پتا نہیں کب آنکھ؟
 کمال انور..... اورنگی ناؤن، کراچی
 بے وجہ جب تم، ہم سے لڑتے تھے تا
 بس وہیں سے ہوئی تھی ابتدا محبت کی
 نذوہ سب احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی
 انا بھند ہے کہ جانے دو روٹھے والے کو
 اندر سے آتی ہے آواز منا لیتے تو اچھا تھا
 محمد علی..... گوجرانوالہ
 بڑھ گیا اور بھی تنہائی کا میری احساس
 اپنی تنہائی میں اک شخص کو شامل کر کے
 عرفان علی..... لاہور
 اچھے چہرے، کالے کنوئیں سے جسے رہائی دی
 وہ شخص میرے ہی گھر کا بچا رہا ہے دیا
 جمشید احمد..... اسلام آباد
 آنکھوں میں خیمے ڈال دیے رت جیکوں نے پھر
 دیکھا تھا میں نے خواب میں بستر لہو میں تر
 اشفاق احمد..... کوئٹہ
 دیکھتا ہے کب تک رکھتی ہے اپنی قید میں
 یہ تری ویراں سرائے رنگ خوشبو روشنی
 زید سائے نیازی..... ڈسٹرکٹ جیل، سرگودھا
 مدت کے بعد اڑن تبسم مل
 تھا وہ بھی اتنا تلخ کہ آنسو نکل پڑا

نوشین گل حیدر سید
 دل تو سدا گم رہا ہے اب اس کو مت توڑ
 گیت میں گاتا پڑتا تھا اک پھل دیوانہ
 ریاض بٹ حسن بڈاں
 خاموشی کی گویا میں سوئی۔ تمہیں شاید جاگ انہیں
 سول سر پتھر پھینکیں شیشے کی دیوروں پر
 ناصر علی صدیقی..... رحیم یار خان
 ہم جان سے جائیں گے بھی بات بنے کی
 تم سے تو کوئی ماہ نکالی نہیں جانی
 یاسر علی راجپوت..... گوجرہ، نواں لاہور
 خرو نے کہہ بھی دیا لالہ تو کیا حاصل
 دل و نگاہ مسلاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
 محمد تقی عباس..... سینٹرل جیل میانوالی
 جب اعلان مرگ ہوا تو اس نے بھی کہا وہی
 چلو اچھا ہوا مر گیا اکثر اداں رہتا تھا
 محمد اعجاز، عبدالغفور خان خٹک..... انک
 غلطیاں شامل فطرت ہیں ازل سے میر
 تم قرشتوں کی نظر سے مجھے دیکھا نہ کرو
 رمضان پاشا..... گلشن اقبال، کراچی
 بہت اندر تک جا ہی چکا دیتا ہے
 وہ اشک جو آنکھوں سے بہہ نہیں جاتا
 طاہرہ گلزار..... پشاور
 باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
 کار جہاں وراز ہے اب میرا انتظار کر
 رانا عامر شاد..... مہیاں چنوں
 ہم غریبوں سے دوستی کر لے
 ڈھنگ سکھا دیں گے بادشاہی کے
 قاضی عرفان احمد عاجز..... آڑہ چکوال
 احساس محبت کے لیے بس اتنا ہی کافی ہے
 تیرے بغیر بھی ہم تیرے ہی رہتے ہیں

ساحل پر ہندھی موثر بوٹ کو دیکھ کر مارتھا سمجھ گئی تھی کہ یہ وہاں آگیا ہے۔ سبے بچھیں سال قید کی سزا ہوئی تھی۔ گوکہ اس بات کو طویل عرصہ بیت گیا لیکن اس جرم کی کسک آج بھی مارتھا کے دل میں موجود تھی اور اب اس چھوٹے سے جزیرے پر ایک بار پھر ان دونوں کا آمناسامنا ہونے والا تھا۔ قانون کی نظر میں وہ اپنے کیے کی سزا بھگت چکا تھا لیکن مارتھا نے اسے معاف نہیں کیا تھا اور وہ ایک لمحے کے لیے بھی جزیرے پر اس کا وجود برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اسی لیے وہ مارو یا مرجاؤ کا تصور لے کر گھر سے نکلی تھی کہ شام ہونے سے پہلے دونوں میں سے کسی ایک کو زندہ رہنا ہے۔ اب صرف یہ فیصلہ ہونا باقی تھا کہ دونوں میں سے کون موت کو گلے لگائے گا۔

مارتھا کھر واپس چلی آئی۔ وہ رچرڈ کا سامنا کرنے سے پہلے کچھ تیار ہی کرنا چاہ رہی تھی۔ مکمل شروع ہو چکا تھا اور وہ دونوں ہی جانتے تھے کہ اس دوڑ میں تیز رفتاری، جیت کی ضمانت نہیں ہو سکتی کیونکہ دونوں ہی بوڑھے ہو چکے

”یقیناً“ مار تھانے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔
کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد چڑھ بولا۔ ”تم بہت

قریباً ۱۰۰ سال کی عمر میں وہ اپنے گھر میں ہی انتقال فرمایا۔

”جھوٹی!“ رچرڈ کا ضبط جواب دے گیا۔ وہ غصے کے عالم میں اس کی جانب لڑکا اور اس تک پہنچنے کے لیے

ایک بیری کی جھاڑیوں میں راستہ بناتے لگا۔ مارتھا نے اس کی پہنچ سے دور ہونے کی کوشش کی اور اندھا دھند بھگن شروع کر دیا گوکہ جوتوں کی وجہ سے اسے مشکل پیش آ رہی تھی لیکن اس کے لیے اس نے چھڑی کا سہارا لیا، اس کی جاں کامیاب رہی اور چڑھنے کے بعد قتب میں آگے بڑھتا گیا۔ وہ اسے آسانی درختوں کے جھنڈ تک لے آئی۔ وہ جانتی تھی کہ گرے ہوئے درختوں اور عشق ویاہ کی جھگی ہوئی بیویوں کے درمیان سے کس طرح راستہ بنایا جاتا ہے۔ رچرڈ اس سے بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ اس کے پاس ایک کلہاڑی تھی اور وہ جھاڑیوں کاٹ کر ان میں سے گزرنے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ مارتھا کے پاس صرف ایک چھڑی اور پارچہ تھی۔ اگر انہیں اندھیر ہوئے تک جنگل میں رکن پڑ جاتا تو وہ اسے ایک ہی دائرے میں چکر دے کر تھکا دیتی۔ جوتوں کی وجہ سے اسے چھنے میں تکلیف ہو رہی تھی لہذا اس نے سوچا کہ اب دلدل کا رخ کرنا چاہیے۔ وہ آنے والے وقت کے لیے اپنی توانائیاں بچا کر رکھتا چاہ رہی تھی۔

درختوں کے جھنڈ سے نکل کر وہ اگلی جگہ ٹہرتی اور رچرڈ کا انتظار کرنے لگی۔ اس نے ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگائی اور ماضی کی یادوں میں گم ہو گئی۔ انہیں سال پہلے کے واقعات اس کی آنکھوں کے سامنے کسی فلم کی طرح چھنے لگے۔ یاد آ گیا کہ اس نے بھی کبھی کسی سے محبت کی تھی۔ رچرڈ سے مارتھا کی ملاقات موسم گرما کے اوائل میں ہوئی جب وہ اپنے باپ کے ساتھ کچھ سامان کی خریداری کے سلسلے میں قریبی قصبہ گئی تھی۔ اس کے بعد یہ ملاقاتیں بڑھتی گئیں۔ رچرڈ کو جب بھی موقع ملتا وہ اپنی کشتی پر سوار ہو کر جنوبی چراگاہ کی طرف چلا آتا۔ درمیان میں دوسرے پڑتی تھی اور مارتھا کے باپ نے راستے سے واقف ہونے کے باوجود اسے پار کرنے کی کوشش نہیں کی۔ مارتھا کا باپ کسی ایسے شخص پر بھروسہ نہیں کر سکتا تھا جو اس کی بیٹی پر نظر رکھتا ہو۔ اس کی کڑی نگرانی سے تنگ آ کر مارتھا نے اسے دھمکی دی کہ اگر اس نے اپنی روش نہ بدلی تو وہ ساری عمر کنواری بیٹھی رہے گی اور کوئی اسے نہیں پوچھے گا۔ اس کے منہ سے نکل ہوئی بات سچ ثابت ہوئی اور وہ واقعی کنواری رہ گئی لیکن اس میں باپ کا کوئی قصور نہ تھا۔

چراگاہ کی گھاس انہیں بہ آسانی چھپا لیتی اور وہ لوگوں کی نگاہوں سے چھپ کر روزانہ ایک ہی قلیل کھیلتے۔ شروع میں بات سرگوشیوں اور محبت بھرے مکالموں تک محدود رہی پھر رچرڈ کی دست درازی بڑھنے لگی لیکن مارتھا نے کبھی اسے

ایک حد سے آگے بڑھنے کا موقع نہیں دیا۔ وہ جانتی تھی اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوگئی تو باپ اسے جان سے ڈالے گا۔ وہ رچرڈ کو بالکل بھی پسند نہیں کرتا تھا نہ وہ اس سے ہی اس کے ساتھ مارتھا کی بیٹا کی پر رخصت مند ہوتا۔ کو اس وقت تک اس کھیل پر غصہ رکھتا تھا جب راضی کرنے میں کامیاب ہو جاتی یا اپنے اندر اتنی ہمت کر لیتی کہ رچرڈ کی خاطر اس کی ناراضی سوں سے بڑھ کر رچرڈ میں انتہا کی تاب نہیں تھی۔ اس نے صبر کا پتہ نہ ہو رہا تھا۔

”تم کوئی نابالغ لڑکی نہیں ہو۔“ وہ اکثر اس سے کرتا، رچرڈ کے لہجے میں چھپی ہوئی مایوسی اسے بے چارہ کر دیتی تھی۔ ”تم چوبیس سال کی ہو چکی ہو۔ آخر وہ کب تک اس جریرے پر ایک راہبہ کی طرح قید کر کے رکھتا ہے۔“

اکتوبر کے آخری دنوں میں رچرڈ کا ضبط جواب دیا گیا۔ وہ بھی سال کی ان چند گرم راتوں میں سے ایک۔ جب درخت بالکل تنگے ہو جاتے ہیں اور سرد ہوا میں نسیم بھیرا کر لیتی ہیں۔ موسم کی تبدیلی کی وجہ سے انہیں کچھ بہار تک اس جگہ سے محروم ہونا پڑتا اور یہی بات رچرڈ ناراضی کا سبب بنتی۔ اسے اپنے آپ پر بھی غصہ تھا کہ اس نے اتنی دیر کیوں لگا دی لیکن مارتھا پر ان باتوں کا اثر نہیں ہوا۔ وہ اپنی ضد پر قائم رہی اور رچرڈ غصے میں چھوڑ کر چلا گیا۔ آج بھی وہ اسے غصہ دلا کر اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہ رہی تھی۔

کلہاڑی سے لکڑی چیرنے کی آواز آئی تو مارتھا نے حقیقت کی دنیا میں واپس آئی۔ رچرڈ درختوں کے تنے سے نکل آیا تھا اور اب کھلی جگہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مارتھا نے پچیس سال بعد پہلی بار اسے غور سے دیکھا۔ وہ چھوٹے ڈالینوں اور چھوٹی چھوٹی ٹہنیوں میں لینا ہوا تھا اور اسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ اس کی کھانسی ایک آہستہ مرغ کی طرح زرد اور سکڑی ہوئی تھی جسے چولہے میں جھانکے جانے وار ہو۔ مارتھا کے ذہن میں ایک خوب صورت اور مضبوط جسم والے رچرڈ کی تصویر تھی لیکن وہ اس کا ماضی تھا۔ اس نے اپنے گالوں پر نمی محسوس کی لیکن یہ اس کی آنکھ سے بہنے والے آنسو نہیں بلکہ بادلوں سے ٹپکنے والے قطرے تھے جو بارش کی آمد کا پتا دیتے ہیں۔ اس نے اپنے ہاتھ پشت سے چہرہ صاف کیا۔ پچیس چھپکا کیں تاکہ رچرڈ اس کی کلہاڑی پر نظر رکھ سکے۔ دلدل اس کے عقب میں

فصلے پر تھی لہذا وہ اپنے آپ کو اس جگہ پر محفوظ سمجھ رہی تھی۔
 ”رچڑ۔ اس طرف“ وہ راستہ بتاتے ہوئے
 ہوئی۔ وہ کیا تھا کہ وہ اپنی پہلی میں جان پیدا کرنے
 لیے مزید کچھ تھاق کا انکشاف کرتی۔ ”کی وہ جگہ ہے
 جہاں سے وہ غائب ہوئی تھی اور ہم اس سے کچھ زیادہ فاصلے
 نہیں ہیں، کیا تمہیں یہ جگہ جانی پہچانی نہیں لگ رہی؟“
 یہ کہہ کر اس نے رچڑ کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں
 جو غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

”جھوٹی“ وہ اپنی کلبازی فضا میں بہراتے ہوئے
 ”تم نے خود ہی اسے راستہ چھتے ہوئے دھکا دیا تھا۔
 میں یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں اور پھر جھوٹی گواہی دے
 کر مجھے اس کے مل کے الزام میں جیل بھجوا دیے۔“

یہ کہہ کر اس نے حملہ کرنے کے انداز میں کلبازی
 گھمائی۔ مارتھا پھرتی سے پیچھے ہٹی اور تیز قدموں سے
 اس سے چل دی، اس نے ایسے راستے کا انتخاب کیا جس
 پر چل کر اس کے حلقہ میں آنے والے رچڑ گمراہ ہو سکتا
 تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد اسے اپنے قدموں تلے زمین کی
 حالت میں تبدیلی محسوس ہونے لگی۔ اسے وہ جگہ محسوس ہونے
 سے بجائے نرم اور گیلی گم رہی تھی اور اس کی چال میں
 لڑکھڑاہٹ نمایاں ہوتی جا رہی تھی۔ چند منٹ چلنے کے بعد
 اس کے پاؤں نے زمین سے الگ ہونے لگے۔ اس کے قدم
 زمین میں اتر گئے۔ وہ زمین پر گر پڑا۔

کچھ لمحوں کے بعد وہ زمین پر گر پڑا۔

کچھ لمحوں کے بعد وہ زمین پر گر پڑا۔
 سے ہی چلنا ممکن تھا۔ اس کی چوڑائی پر مشکل دوقت تھی اور
 اس پر وہی لوگ برآسانی چل سکتے تھے جو اس کی جچیدگیوں
 سے واقف ہوں۔ مارتھا اور اس کی بہن لورین اس راستے
 ”چنے چنے سے اچھی طرح واقف تھیں اور انہیں معلوم تھا
 دلدل سے بچ کر وہاں سے کس طرح گزر جاسکتا ہے۔
 یہ سوچنا ہی غلط تھا کہ لورین اس راستے سے پھس کر
 میں جا گری ہو۔ وہ دونوں اس راستے سے رات میں
 کے اور نہ۔ یہاں تک کہ آنکھیں بند کر کے بھی
 انہیں راستہ یاد رہتا۔ وہ گھٹنے کے ساتھ

مارتھا نے اس راستے کی جانب قدم بڑھائے اور پانی
 کی آواز سن لی۔ اس نے اس کی کوئی پروا

نہیں تھی کیونکہ اس نے پیروں میں ربر کے انگوٹھے
 رکھے تھے لیکن رچڑ اس کے پیچھے آتے ہوئے پلچا
 ”تم مجھے کہیں بے جا رہی ہو؟“ اس نے
 پوچھا۔ اس نے ہر چیز میں دھنس رہے تھے اور
 لیے بھری ہونوں کی وجہ سے قدم بڑھانا مشکل
 ”اگر مارتم مجھ سے تو نہیں جاسوگی اور میں تمہیں
 میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ اگر تم اس راستے پر چل
 تو مجھے بھی مل سکتا ہے۔“

”لورین کے لیے بھی یہ راستہ اچھی نہیں
 نے اس کا غم بڑھایا۔ اس نے کہا ”اسی لیے
 غصہ آتا ہے۔ اب وہ کہتے ہیں کہ وہ غلطی سے
 جبکہ یہ حادثہ اس کی پہلی زندگی سے نہیں
 بات اچھی طرح جانتے ہیں۔“

”میں نے لورین کو کبھی مارا۔“ وہ دہرایا۔
 بولا۔ ”لیکن تم اس طرح شرمی رہی ہو جیسے میں
 اسے مارا ہو۔ میں ہمارے گھر میں بیٹا ہوں
 نے اس سے اس حد تک کہ وہ بے ہوش ہو گیا۔
 بھی نہیں۔ وہ بے ہوشی سے درخت پر لٹے ہوئے
 لیے خود ہی بے ہوش ہو گیا۔ مارتھا نے اسے
 حرم کی سہارا۔ ”پرانی میں گھر سے مجھ سے
 نہیں ہوا تھا۔ یہ بات تمہارے ماحول میں
 سے انکار نہیں کر سکتیں۔“

”اس کی حالت کے ذمے دار تم ہو۔ چاہے
 یہ تم نے کوئی بھی طریقہ اختیار کیا ہو۔ مارتھا نے
 آواز میں کہا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ رچڑ
 لانے کے لیے اسے کیا کرنا ہو گا۔ ”میں نے وہ غلط
 تھا لیکن مجھے اس کا ایک ایک لفظ نہ سمجھا۔
 نے لکھا تھا۔ ”پیر سے ڈیڑی اور میری بہن میں
 یہاں نہیں ہوں لیکن میرے بارے میں فکر مند ہو
 ضرورت نہیں۔ میں اور رچڑ شادی کرنے کے لیے
 جا رہے ہیں۔ میں اس سے پہلے ہی آگاہ ہو جاؤں
 وہاں سے ہم رچڑ کی سستی میں بیٹھ کر گاؤں میں
 رہیں گے۔ شادی کے بعد میں یہاں آ جاؤں گی۔
 سے ہوں گی۔“

خط ختم ہوتے ہی مارتھا نے بڑی پھرتی سے
 کو اس پتھر سے بچایا جو رچڑ نے اس کی جانب

مارتھا اس راستے پر آگے بڑھتی گئی۔
 دلدل چوڑی ہونا شروع ہوئی۔ یہاں
 آہستہ آہستہ درختوں کے نیچے
 اس کی سرحدیں پھلتی جا رہی ہیں۔ اس
 ابھی تک اپنی جگہ قائم تھے جبکہ وہ جھٹکتے
 کی جڑوں سے، کبھی تک زمین کو بڑھاتا تھا۔
 شخیں دلدل پر اس طرح پھیل گئی تھیں کہ دور سے دلت
 پر وہ جگہ ایک جزیرہ معلوم ہوتی تھی جہاں درختوں
 کا ڈھیر جمع ہو گیا تھا گو کہ اسے صحیح معنوں میں جزیرہ نہیں کہا
 جاسکتا تھا بلکہ ٹوٹ کر گر جانے والے درختوں پر مٹی کی تہ
 جانے کے سبب وہ جگہ خشکی کا ٹکڑا دکھائی دیتی تھی۔ اور اسے
 اس کی سطح سخت اور ٹھوس نظر آتی تھی لیکن اس کی تہ کھلی تھی
 اور اس پر قدم رکھنے والا زیادہ دیر اپنا توازن برقرار نہیں
 رکھ سکتا تھا اور جلد یا بدیر اسے بھی دلدل کی گہرائی میں دفن
 ہونا پڑ جاتا۔

اس سے پہلے صرف ایک مرتبہ مارتھا کی زندگی میں یہ
 واقعہ پیش آیا تھا جب وہ اس جگہ پر اپنا توازن برقرار نہ رکھ
 سکی تھی۔ اسے اتور کی وہ رات اچھی طرح یاد تھی جب وہ
 خوف زدہ اور پریشان ہو کر رچڑ کی گرفت سے آزاد ہو کر
 ہو گئی تھی۔ رچڑ اس کے جیسے بہنوں سے تنگ آچکا تھا۔
 رات دونوں میں زبردست جھگڑا ہوا تھا۔ رچڑ نے
 اسے بازوؤں سے پکڑ کر زمین پر لٹا دیا لیکن مارتھا کی بھرپور
 دقت کے آگے اس کی ایک نہ چلی۔ مارتھا کا ذہن تیزی
 سے کام کر رہا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر مٹی میں ریت بھری
 اور رچڑ کی آنکھوں میں جھونک دی۔ وہ اس اچانک جسے
 نے لیے تیار نہیں تھا، چنانچہ مارتھا کو اس کی گرفت سے نکلنے کا
 موقع مل گیا۔ رچڑ نے ایک بار پھر اسے پکڑنے کی کوشش
 کی لیکن اس بار مارتھا کے ہاتھ میں درخت کی ٹوٹی ہوئی
 شاخ آگئی۔ اس نے وہ شاخ اس کے چہرے پر دے
 دی اور وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ خوش قسمتی سے اسے
 یہ سیدھی اور مضبوط شاخ مل گئی جس سے اس نے چھڑی کا
 کام کیا اور اس کے سہارے وہ دلدل جیسے سے نکلنے
 میں کامیاب ہوئی۔

گھر پہنچ کر بھی وہ کافی دیر تک خوف کے مارے
 لپکتی رہی۔ اس نے خود کو کمرے میں بند کر لیا۔ لورین کا
 بڑھتی آتی کرے میں تھا لیکن اس وقت وہ وہاں موجود نہ
 تھی۔ اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا اور نہ اس کے
 لیے لورین کے سوالوں کا جواب دینا مشکل ہو جاتا۔ وہ نہیں
 مانتی تھی کہ لورین تجسس سے مجبور ہو کر اس کے تعاقب میں
 تہ گاہ تک گئی تھی۔ اس کی واپسی کافی دیر میں ہوئی۔ اس
 وقت تک سورج کی کرنوں نے رات کی سیاہی کو منادیا تھا۔
 لورین کا لباس ترتیب سے پہنا تھا اور وہ مافی کیفیت بھی ٹھیک نہ
 تھی۔ لورین نے کئی مہینوں تک اس بارے میں کچھ نہیں بتایا
 تھا۔ ایک وقت یہ آیا جب اس کے لیے کچھ بھی چھپانا ممکن
 نہ رہا۔

مارتھا اس راستے پر آگے بڑھتی گئی۔
 دلدل چوڑی ہونا شروع ہوئی۔ یہاں
 آہستہ آہستہ درختوں کے نیچے
 اس کی سرحدیں پھلتی جا رہی ہیں۔ اس
 ابھی تک اپنی جگہ قائم تھے جبکہ وہ جھٹکتے
 کی جڑوں سے، کبھی تک زمین کو بڑھاتا تھا۔
 شخیں دلدل پر اس طرح پھیل گئی تھیں کہ دور سے دلت
 پر وہ جگہ ایک جزیرہ معلوم ہوتی تھی جہاں درختوں
 کا ڈھیر جمع ہو گیا تھا گو کہ اسے صحیح معنوں میں جزیرہ نہیں کہا
 جاسکتا تھا بلکہ ٹوٹ کر گر جانے والے درختوں پر مٹی کی تہ
 جانے کے سبب وہ جگہ خشکی کا ٹکڑا دکھائی دیتی تھی۔ اور اسے
 اس کی سطح سخت اور ٹھوس نظر آتی تھی لیکن اس کی تہ کھلی تھی
 اور اس پر قدم رکھنے والا زیادہ دیر اپنا توازن برقرار نہیں
 رکھ سکتا تھا اور جلد یا بدیر اسے بھی دلدل کی گہرائی میں دفن
 ہونا پڑ جاتا۔

مارتھا اس جگہ سے ایک انچ کے فاصلے پر رک گئی
 جہاں سے اس راستے میں ایک موڑ آ جاتا تھا۔ جو لوگ اس
 راستے سے واقف تھے، وہ آگے بڑھنے کے بجائے اس موڑ
 سے واپس ہو جاتے تھے۔ مارتھا نے وہاں رک کر اپنا چہرہ
 اس تکی جزیرے کی طرف کر لیا اور قاصلے کا اندازہ کرنے
 لگی۔ وہ جگہ وہاں سے سات فٹ دور تھی۔ اس نے رچڑ
 کے آنے کا انتظار کیا جو بہت آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔
 ”کچھ لوگ کہتے ہیں کہ لورین یہاں آ کر بہت تیزی
 سے مڑ گئی تھی کیونکہ اسے راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔“ اس نے
 رچڑ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”جبکہ کچھ لوگوں کا کہنا ہے
 کہ اس نے دلدل عبور کرنے کے لیے چھلانگ لگائی تھی لیکن
 اسے اس کی چوڑائی کا اندازہ نہیں تھا۔“

”ممکن ہے کہ اس نے چھلانگ لگائی ہو۔“ رچڑ
 بولا۔ وہ اب اس سے صرف چند قدم کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔
 ”اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم نے اسے دھکا دیا ہو۔“
 مارتھا نے اس کے آخری جیسے کو نظر انداز کر دیا
 اور بولی۔ ”اب میں تمہیں چھلانگ لگا کر دکھاؤں گی۔“ پھر
 اس نے ایسا ہی کیا۔ اس نے اپنی چھڑی زمین پر مضبوطی
 سے جھکی اور پول والٹ کے کھڑکیوں کے انداز میں
 دلدل پار کر گئی۔ اب وہ اس ٹیلے پر پہنچ گئی تھی جو تکی
 جزیرے پر ابھرا ہوا تھا۔ اس نے رچڑ کی جانب دیکھا اور
 اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔
 ”کتنا!“ وہ دانت چبھتے ہوئے بولا۔ اسے غصہ آ رہا

تھا کہ مارتھا اس کی دسترس سے دور ہو گئی تھی، جانتا تھا کہ وہ اس کے ساتھ کھیل رہی ہے لیکن اسے یہ امید نہیں تھی کہ وہ دلدل کے اوپر سے چھلانگ لگا کر اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال دے گی۔ وہ جزیروں دیکھنے میں محفوظ نظر آ رہا تھا لیکن وہ اس انداز میں اس کا پیچھا کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس نے چلا تے ہوئے کہا۔

”تم مینڈک کی طرح چھلانگ لگا سکتی ہو لیکن میں تمہارا پیچھا کرتا رہوں گا۔ میں نے یہاں آنے کے لیے پچیس سال انتظار کیا ہے۔ اب تمہارا سا انتظار اور کرلوں گا۔ شاید اس وقت تک یہاں کھڑا رہوں جب تک تم واپس نہ آ جاؤ۔“

وہ اس جگہ پر کھڑے ہونے میں بے آرامی محسوس کر رہا تھا کیونکہ اسے اس راستے کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس راستے پر آگے جانا ہے یا نہیں سے مڑنا ہے۔ وہ اسی الجھن میں گرفتار تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے پھر اس نے وہی کیا جو کوئی بھی شخص بے چینی کے عالم میں کر سکتا ہے۔ اس نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ چھوٹا سا قدم آگے بڑھایا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں سے دلدل گہری ہونا شروع ہو جاتی تھی۔

اچانک ہی اس نے چلنا شروع کر دیا۔ ہر قدم اس کے چہرے پر خوف اور دہشت کے آثار دیکھے۔ وہ قہقہے لگانے لگی کہ اس کے اپنے پاؤں لڑکھڑانے لگے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ یہ ٹیلا زیادہ دیر اس کا بوجھ برداشت نہ کر سکے گا۔ اس نے دوسرے نیلے پر چھلانگ لگا دی جو پہلے کے مقابلے میں چھوٹا تھا، اور وہ زیادہ دیر تک وہاں نہیں کھڑی رہ سکتی تھی۔ وہ رچڑڈ کو دیکھ رہی تھی جو دوبارہ اس راستے تک پہنچنے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ اس کا نچڑ دھڑکچڑ سے آلودہ ہو گیا تھا۔ وہ بری طرح خوفزدہ نظر آ رہا تھا اور اس سے یہ آسانی نمٹا جاسکتا تھا لیکن مارتھا کے پاس بھی زیادہ وقت نہ تھا۔ وہ چھوٹا سا ٹیلہ بھی اس کے قدموں تلے کھسکا جا رہا تھا لہذا اس نے ایک بار پھر وہاں سے چھلانگ لگا دی۔

”تم پہلے بھی بزدل تھے اور آج بھی ویسے ہی ہو۔“ مارتھا نے اگلے ٹیلے پر پہنچتے ہوئے کہا۔ ”تم نے جو کچھ کیا۔ اس کی ذمہ داری قبول نہیں کی۔ لورین اس وقت پانچ ماہ کی حاملہ ہو چکی تھی۔ چند دنوں کی بات تھی جب سب لوگ اس بارے میں جان جاتے۔ وہ اپنے وجود میں تمہارا بچہ لیے پھر رہی تھی اور تم نے اسے مار ڈالا۔ تم نے لورین کو ہی

نہیں بلکہ اپنے بچے کو بھی قتل کر دیا۔“

”میں نے اسے قتل نہیں کیا۔“ وہ جلد سے ہی بول۔ وہ اب بھی محفوظ راستے تک پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ یہ جان کر خوفزدہ ہو گیا تھا کہ دلدل کی گہرائی میں جا رہا ہے۔ وہاں سے اسے مارتھا کا ٹیلا محفوظ طرز آ رہا تھا وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے نیچے کچھ نہیں ہے۔

”تم نے تو اسے اسی وقت مار دیا تھا جب اسے رات کو اس کے ساتھ زیادتی کی تھی۔“ وہ چلا تے ہوئے بولی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا کیونکہ وہ اپنی جگہ چھوڑ رہا تھا۔ وہ تقریباً گھنٹوں کے مل جھبکاتے ہوئے معلوم تھا کہ زیادہ دیر اس نیلے پر نہیں ٹھہر سکتا۔ چنانچہ اس نے ایک درخت کی شاخ کا سہارا لیا اور رچڑڈ سے ہاتھیں کھینچ لیں۔

”وہ بہ مشکل چودہ سال کی تھی اور تم اس سے دو دہائی بڑے تھے لیکن تم نے اس کی زندگی تباہ کر دی۔ تمہیں اس پر کبھی عداوت بھی نہیں ہوئی۔ شاید تمہیں اس کا دوبارہ خیال بھی نہ آیا ہو۔ تم نے تو اس کی برآمد ہونے سے پانچ مہینے پہلے ہی اسے مار ڈالا تھا۔ اس کے پاس اس دلدل میں ڈوبنے کے سوا کوئی چارہ باقی رہ گیا تھا۔ وہ یہ بات ڈینڈی کو سن سکتی تھی۔ خوفزدہ تھی کہ جب لوگوں کو معلوم ہوگا تو وہ اس کے بارے میں کیا سوچیں گے۔ اس نے مجھے بھی وقت بتایا جب بہت دیر ہو چکی تھی اور میں اس سے کچھ بھی نہ کر سکی۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے یہ مجھ پر ور نہ تم سزا پائی بغیر ہی آزادانہ گھبراہٹ سے موت سزا کے مستحق تھے۔ اگر میں جج ہوتی تو تمہیں پچیس سال قید کے بجائے موت کی سزا دیتی۔“

رچڑڈ نے وہاں سے چھلانگ لگائی۔ اس کی وجہ تو اسے اور غصہ و دلوں ہی تھے۔ اسے یہ اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ اب بھی سخت زمین پر کھڑا ہوا تھا۔ وہ پہلے نیلے تک بھی نہ لگا اور درمیان میں ہی دلدل میں گر گیا۔ اس کا بچہ کچھز میں لت پت ہو گیا۔ اس نے چند قدم پھٹنے کی کوشش کی لیکن زمین نے اس کے پیچ پکڑ لیے۔ وہ چپا اور جسم ٹھنڈے دے کر وہاں سے نکلنے کی کوشش کرنے لگا لیکن دلدل گرفت بہت سخت تھی، ادھر مارتھا بھی درخت کی شاخ لٹکی ہوئی تھی اور نہیں جانتی تھی کہ اسے کب تک اس میں رہنا ہوگا۔ وہ شاخ بھی اس کے وزن کی وجہ سے تھک چکی تھی اور رچڑڈ کو محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی طرف مارتھا

نکل میں ہے۔

”سپا“ وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔ ”تم بھی میرے ساتھ ہی اس دلدل میں دفن ہو جاؤ گی۔ تم نے اپنی طرف سے یہ نظام کر لیا تھا کہ زندگی میں ہم اکٹھے نہ ہوتے۔ تم نے ہماری موت ایک ساتھ واضح ہو گئی۔ میری بھی یہ زندگی تھی اور میں کس بری طرے لٹ پھوٹ گیا ہوں۔ یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا۔ امید ہے کہ مجھ سے یہ سزا کچھز میں دفن ہو جاؤ گی اور یہ منظر میرے لیے بڑا خوش کن ہوگا۔“

مارتھا کا چہرہ پسینے سے تر ہو چکا تھا اور وہ پوری قوت سے ساتھ درخت کو پکڑے ہوئے تھی۔ وہ جانتی تھی کہ دلدل کی پکڑ سے نہیں نکل سکتی لیکن اس کے لیے اس نے اپنے سے منصوبہ بندی کر رکھی تھی۔ اس کی نظر جوتوں پر گئی اور اس نے ان سے جان چھڑانے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر اس نے اپنے بدن کو تھوڑا سا اوپر اٹھایا تو اس کے پیروں کے اندر حرکت کرنے لگے۔ اس نے آہستہ آہستہ پیروں کو اوپر کی طرف کھینچنا شروع کر دیا جبکہ برکاٹلا کچھز میں دھنسا ہوا تھا۔ مارتھا اپنے آپ کو آہستہ آہستہ جوتوں کی قید سے آزاد کرانے کی کوشش کر رہی تھی اور اس کے لیے وہ اپنے جسم کو اوپر کی طرف کھینچتی رہی۔ بالآخر اس کی ٹانگیں لمبے جوتوں سے باہر آئیں اور اب وہ درخت کی شاخ پر چڑھ سکتی تھی۔ اس کے وزن سے شاخ میں چڑچڑاہٹ پیدا ہوئی اور ایک سے لے کر دس کے دلدل میں خوف پیدا ہوا کہ کہیں شاخ ٹوٹ نہ گئی ہو لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ سر سے پاؤں تک پسینے میں نہا تھی۔ اس نے دیکھا کہ سیاہ کچھز نے اس کے باپ کے جوتوں کو نکل لیا تھا۔ وہ درخت کے جھکے ہوئے تنے پر رہ سکتی ہوئی دوسری جانب زمین پر اتر گئی۔ اس کے جھکے پاؤں گھٹے ہو گئے تھے لیکن وہ بازی جیت چکی تھی۔

”خدا کرے تم جہنم میں جاؤ۔“ رچڑڈ نے اسے عقب سے بدعا دی۔ اب وہ کمر تک کچھز میں دھنس گیا تھا۔ دلدل نے اسے بری طرح اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ اس کی سانس اکھڑ رہی تھی اور کچھزوں نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ”تمہارا ٹھکانا جہنم میں ہوگا۔“

”تم مجھے مارنے کے لیے آئے تھے رچڑڈ جبکہ میں بھی تمہیں مارتھا چاہ رہی تھی۔“ وہ درخت کے تنے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ابھی تک اس کا چہرہ پسینے سے تر تھا۔ وہ بار بار

دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ پونچھ رہی تھی لیکن پسینا خشک نہیں ہو رہا تھا۔ ”میں تم سے محبت کرتی تھی، اتنی زیادہ کہ ساری زندگی تمہارے علاوہ کسی مرد کی طرف نہیں دیکھا لیکن تم نے میری چھوٹی بہن کو مار ڈالا اور میں انصاف چاہتی تھی اور تمہیں سزا کے بغیر آزادانہ گھومتا پھرتا نہیں دیکھ سکتی تھی۔“ وہ سے چلتا اور روتا پینٹا دھکتی رہی۔ یہاں تک کہ دلدل نے اسے پوری طرح نگل لیا۔ اس کا منہ سیاہ کچھز سے بھر گیا تھا پھر اس نے رچڑڈ کی آخری چیخ سنی اور اپنی جگہ سے اٹھ کر چل دی۔ گیلی زمین پر اس کے ننگے پیروں کے نشانات بنتے جا رہے تھے۔ اسے سردی بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس کا کام ختم ہو چکا تھا اور اب اسے رچڑڈ کے پارے میں سوچ کر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ اب اسے رات میں اچھی آواز سن نہیں سننا پڑی گی اور نہ ہی وہ ہر گزشتہ کو جزیروں پر آتے دیکھ کر حیران ہوتی رہے گی۔ رچڑڈ اب اس جگہ سے چند انچ کے فاصلے پر دلدل میں دفن ہو چکا تھا جہاں لورین نے چھلانگ لگائی تھی۔ وہ اتنی خوفزدہ تھی کہ باپ کے قہر کا نشانہ بننے کے بجائے اپنے آپ کو دلدل کے حوالے کر دیا۔

مارتھا پر سکونا ہو گئی۔ وہ گھر جا کر اپنے لیے چائے بنا سکتی تھی اور اس خط کو شعروں کی نذر کر سکتی تھی جس کی وجہ سے رچڑڈ کو پچیس سال پہلے نکل جانا پڑ گیا تھا۔ جب وہ اس خط کو آگ دکھا رہی تھی تو اس نے سوچا کہ رچڑڈ کی روح ہمیشہ اسی طرح جہنم کی آگ میں جلتی رہے گی اور ایک دن اس کی روح بھی وہیں پہنچ جائے گی کیونکہ وہ بھی گناہ گار تھی۔ وہ خط اس نے خود لکھا تھا لیکن حج کے سامنے حفیہ بیان دیا کہ یہ تحریر اس کی بہن کی ہے۔ وہ ایسا کرنے پر مجبور تھی۔ لورین کی موت کا انتقام لینے کا کوئی اور طریقہ نہیں تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو رچڑڈ بری ہو جاتا کیونکہ اس نے لورین کو قتل نہیں کیا تھا۔ اس نے لورین کے ساتھ جو زیادتی کی تھی، اس کا کوئی معنی شہ نہیں تھا اس لیے قانون اسے کوئی سزا نہیں دے سکتا تھا لیکن مارتھا کی نظر میں لورین اسی رات مر گئی تھی جب رچڑڈ نے اس کے ساتھ زیادتی کی۔ لہذا اس کے کیے کی سزا ضرور مٹی چاہیے تھی۔ وہ مطمئن تھی کہ اس نے رچڑڈ کو جیل کی دیواروں کے پیچھے بھیج کر انصاف کے تقاضے پورے کیے۔ رچڑڈ نے اس سے بے وفائی کی تھی۔ وہ زندگی میں اسے حاصل نہ کر سکی لیکن مرنے کے بعد شاید وہ ساتھ ساتھ ایک دوسرے کا ہاتھ تھا سے جہنم کی آگ میں جلتے رہیں۔



ماہنامہ

مسافر

قسط نمبر: 17

ان کے ساتھ ساتھ ایک اور بڑی بات

وہ ایک حقیقت ہے کہ اس سال مسافر... زندگی مسافت... اور اعمال زاد سفر ہوتے ہیں۔ کسی کو احساسات کے لہجے سے نکل کر پتھر کی صورت ڈھل جانے میں صدیاں بہت لگتی ہیں... ورنہ انکھوں میں اشک نہ ہوئے کہ بارِ جود پرانا، ہر چہرہ اشکیار ہوئے گا احساس دلاتا ہے... وہ بھی ایک خاموش خراب، بے سہرا اور ابلہ پانی کے غذاب میں مبتلا مسافر تھا... جو دنیا کے چلنے سے آگاہ تھا، جسے ہتھیاروں کے اوچھے ہتھکنڈوں کا ادراک تھا مگر پتھر بھی مثل نہ تعبیر تھا کیونکہ وہ جانتا تھا... جب بند آنکھوں سے آنسو رواں ہو رہا ہو تو سناکت ہو تو ایسے میں ان سناکت ہونٹوں کے درمیان دل کی لرز سے مچلا کرتی ہے... خاموش قصائے میں طوفان چھپے ہوتے ہیں... دریا کی روانی سنی کہاں ہو تو بہا لے جاتی ہے... اسے میں مسافت طویل... بہت طویل ہو جاتی ہے مگر مسافر ہر موڑ پر ایک نئی داستان رقم کر کے بڑھتا جاتا ہے... کبھی کردار اس کے تعاقب میں ہوتے ہیں اور کبھی وہ خود اپنی تلاش میں گم ہو جاتا ہے... کبھی مل جانے کی خوشی، کبھی احساس زیاں... سوختہ حدبات میں تلاطم برپا کر دینے والے واقعات اور معاشرتی سرد رویوں پر مشتمل حیرت انگیز انکشافات کا طویل سلسلہ۔

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

روشنی کے سفر پر ہم سب مسافر راہ کی کٹھنوں سے بھرپور ہوں گے۔ میرا نام شہر یار سے بیار سے شہر کہتے ہیں۔ میرا گھر ایک نسب غریب حیات تھا جو چار فرد میں، والد، ام، بن عرف، ہما حیات، دو مدد و فیہ بی بی عرف، جو در چھوٹی، ایک پروین پر مشتمل تھا۔ در چھوٹی کے قہقہے پور میں تھیں جب میری عمر پانچ برس تھی۔ والدین کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا جس کے بعد میرے چچا نے ان کو اپنے ہاتھ لے کر اپنے گھر میں رکھ لیا۔ گاہ میں پھولی سڑی رہتی تھی جنہوں نے مجھے بھی میں ہی گھر سے میرا رشتہ بنے کر رہا تھا۔ میں نے ملتان سے گریجنگش کیا اور ای دور میں ایک سی سی پارتی کے سٹوڈنٹ ہو گیا۔ ایک امجد سے پرکار رہا۔ در چھوٹی نے دستاویز دیکھ کر عہد میں مہارت حاصل کی۔ پھر وہیں آگیا۔ گاؤں کے دوستوں میں میرا نور بھی شامل تھا جو کہ گاؤں کے بہتر اور حیات حال کا بیٹا تھا۔ میں نے حیات کی مٹی گیری و دیگر جیسے سونے کام کر دیا کرتا تھا۔ میرا دوسرا دست انداز بھی لوہا کا بیٹا خالد عرف تھا لاکھ جو عظیم فائدہ تھا۔ حیات کی دیکھ بھال تھا، جبکہ قہقہے دوست ڈاکٹر سہیل شاہ بھی تھے جو گاؤں کے سرکاری اسپتال میں ڈاکٹر کی حیثیت سے تعینات تھے۔ وہ ایک سچے سچے شخص تھے لیکن بڑے پتھر پتھر میں اس سے ملنے کی تربیت بھی حاصل کر رہا تھا۔ خالد عرف کھانا لاس واد حیات حال کی بیٹی تھی۔ پتھر و شش میں حیات کو بیا میں سے اسے کھانا پینے کی روٹی نہ مل رہی تھی۔ گاؤں کے بچوں میں میرا بہتر و حیات حال کے علاوہ اس کا بھائی اور بہن

۱۰۰۔ رات سے تھم گئی تھی تو کاپٹن علی نے میں
جاسم ملک میں کمراتے ہوئے مسیوہا ہاوس میں بھریا
کھانے کے لیے پانی پر لے گیا۔ وہ صبح کے بل جینی، رخصی
تاکا کی طرح تڑپ کر ہلچل پڑائی اور پھر ہار کر منت سماجت
پرا تر آئی۔ اس کی ہر کوشش ہوس کے بے لگام گھوڑے کے
آگے دم توڑ گئی۔ ایک گھوڑا دم لینے کو ہٹ گیا، تازہ دم گھوڑا
اب سب سے تازے کے لیے آگے بڑھ آیا۔ نایاب
جون، نایاب غنیمت بن کر ہاتھ لگی تھی۔ چوری کا تھا، تھ جسے
رات بھر ڈنگوں کے گز سے ہاپا گیا۔ ان کے سغلی سبجان نے
سے بہت جلد بے ہوش کر دیا تھا۔ بے ہوشی میں آنکھیں
نہ ہوجاتی ہیں مگر اس کی آنکھیں خروار کی طرح کھلی تھیں۔
جستہ کی طرف سے ہار کر منت سماجت تھیں۔ اُس کی طرح پارل

دالوں پر ہاتھ مارے اور سر پہوڑا کر دوتے لگی۔ زندگی اتنی بد صورت بھی ہوتی ہے؟ اس نے زندگی بھر یہ نہیں سوچا تھا۔ جانو دروازے میں آکر زور سے ہنسا۔ چندو نے سر اٹھا کر دھندلائی نظروں سے اسے دیکھا۔ بکھرے بالوں میں اس کا روتا ہوا چہرہ کسی پتھر کی طرح بے جان تھا۔

جانو نے اسے سر تاپا گھورا ڈانٹنے کے سے انداز میں کہا۔ ”اٹھو! تمہارا کپڑے پہن لو۔ کھانا تیار ہے۔“ وہ خاموشی سے اسے گھورتی رہی۔ بدن کے کسی ننگے عضو پر اپنی ہی نگاہ پڑا کرتی تھی تو پورا بدن گدگدائے لگتا تھا۔ آج بھانک چہرے والا جانو دیر سے پھاڑ پھاڑ کر پورے بدن کی برنگی کو اپنی شیطانی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا مگر چندو کے دہن میں شرم کا رتی بھر حس پیدا نہیں ہو رہا تھا۔ بد وقت تمام اپنے بکھرے ہوئے اعضا کو سمیٹ کر اٹھی اور دروازے کی طرف بڑھی۔ قریب آئی تو جانو نے ہانپوں میں بھر لیا۔ جھک کر زینس بٹائیں اور چہرہ چھو، میانہ انداز میں پیچھا، مگر وہ بے حس کھڑی رہی۔ آنکھوں میں مزاحمت کا کوئی تاثر پیدا نہ ہوا۔ جانو کی کبھی کبھو دیر تک اسے روکے رہی، پھر راستہ دے گئی۔ وہ روٹ کی سی مشینی چال چلتی ہوئی محسن سے گزر کر ہاتھ روم میں چلی گئی۔ بے جان ہاتھوں سے گھنٹا بھر اپنے وجود پر پانی ڈالتی رہی مگر بدن تھا کہ زندگی کی ہروں کو پیچن ہی نہیں رہا تھا۔ اس کی روت پر بندھی ہوئی پٹی بری طرح جھیکتی تھی اس نے پروانگی۔ جانو نے دروازے پر دستک دی۔ وہ نیلے بدن ہی باہر آگئی۔ جانو بول۔ ”ایک ہی رات میں بڑی بے شرم ہو گئی ہو۔“

دیکھا جائے تو ایک رات کا قصہ کئی سادوں پر محیط تھا۔ ایسی رات گزرتی نہیں، گزرتی جاتی ہے۔ چندو بے شرمی کے بارے سوچتے ہوئے کمرے میں آکر کھڑی ہو گئی۔ جہاں زکی وہاں چندو کی محسوس میں فرش پر پانی کھڑ ہو گیا۔ بالوں سے ننھے ننھے دھارے گر رہے تھے۔ جانو نے ایک بڑے توبے میں سے لپیٹ دیا اور چپکتے ہوئے آفتابی بدن پر لٹکائیں جیکٹ پہنائیں میں چھائی گیا۔ جب وہ کھانا اٹھا کر کمرے میں آیا، چندو پڑے لیٹ چکی تھی۔ اس نے بال سنو نے سے بچنے تو یہی میں لپیٹ رکھے تھے۔ ہر ہاتھ کھانا دھاتی رہی بعد جانو اس سے خش چیخڑ چھانڈا اور ناق باخت باتیں کرتا رہا۔

اس نے اس کے بعد اس سے اپنی گہنی پٹی کھوی۔ کئی دفعی تھر تھر کرتے گاتے شام تک کئی دفعی۔

انداز میں بیٹھی رہی۔ شام دکھانے سے بعد چاند کی روشنی بھڑک اٹھی اور وہ تپتہ شیش بنی اپنے نصیبوں کو کھانے لگا۔ ہاتھ بٹانے والا لالو لکھیں گیا ہوتا تھا، شاید یارن کا سا پان۔ کیونکہ وہ بہتی ہوئی گنگا میں ہاتھ دھوئے کھن آتا تھا۔

چاند میں آتا گیا جو بدن جتن بھی خوب صورت ہو، آگرم اور زندہ نہ ہوتا مردانگی کو شبہ نہیں دیتا اور جیتا۔ جانو نے اسے سج پا ہو کر مایا پینا گون۔ منہ نہ متعدد بار جسم کی ہر غصے میں سج پا ہو کر دو تیس مرتبہ نہ کر بیج بھی دیا۔ مگر چندو کا جسم رفت کی طرف خاموش رہا۔

خیریت رہا۔ آنکھیں غروں کی طرح نہایت رتیں تن میں جھانکنے سے خوف محسوس ہوتا تھا۔ رات کے گہرا ہونے تک جانو اس پر لعنت بھیج کر کمرے سے نکل گیا۔ چاند سے دروازہ بند کرنا بھول گیا۔ گھنٹا بھر کے بعد چندو کو دروازے کے کھلے رہ جانے کا احساس ہوا۔ اٹھی، بندی بندی اپنی پھین کر برہنہ پا پا برنگل آئی۔ جانو ایروازے کمرے میں رہا تھا۔ حوصلی کا بڑا دروازہ بند تھا۔ شاید منتقل بھی تھا۔ وہ پورے چڑھ کر دیو کے پادریٹ پر کود گئی۔ تاحہ نگاہ چاندی میں پلٹے، دسے نیلوں پر اگے ہوئے جھاڑ جھنکار اور درختوں پر جانوروں اور دشمنوں کا مان سوتا تھا۔ وہ سر ہٹا کر رات پرمان کی سیدھ میں چلی گئی۔

اسے خبر نہیں تھی۔ وہ نہیں تھی اور اسے کھانے چاہیے تھا۔ فائنل کے، نگارنے کے بعد مہر حیات کی زندگی کا رو زوا اس پر ہوا تھا۔ وہ وارہ بند ہوا، پانچ کے دروازے بند ہو گئے۔ دروازوں کو قسمت کھل سکتی تھی جو ابھی اس پر مہر بان نہیں ہوئی تھی۔ وہ پت کر، لیکھے حیر چلتی گئی۔ ریت میں سج دھن رہے تھے اور چھاندا رتج، بکھر ہوا جاتا تھا۔ شاید ایک کلونیٹر کا فصد طے کر پائی تھی۔ اچانک سر میں زوردار اصرار ہوا۔ پھر وہ پرتے کی نسبتا شدت واسے کئی اصرار کے ہوئے۔ یہ مسلسل بے آراہی اور ختم ہونے والے، خطر اب کا شائبہ نہ تھا۔ وہ آواز پر تھر تھر رہ پائی اور اپنا سر دواں ہاتھوں میں کھینچ کر تھکوں کے بل ریت پر گر گئی۔ اس نے خود کو سنبھالنے کی جتنی کی جتن کی مگر ٹافا مری اور بے مدد ہو گئی۔ بے جان اصرار کی طرح اس ریت پر بکھر گئے اور اور زندگی اور موت کی خود کار چال سے بے نی ہوئی۔ یہی وجہ تھی کہ جب اسے ہوش آیا اور اس سے خود ویش میں پادریٹ سے لے کر پانی۔ وہ تھی۔ بے ہوش رہی تھی۔ بے ہوشی میں اس پر پادریٹ چھو رہی تھی۔

تین گولی مار کر میٹھا۔ یہ آواز کو ریا کر کے پڑی۔ دوسری مرتبہ ترس کیں آ۔ فاس یہ ہے آپ پر دم کرنا ہوگا۔“

اس نے بھرا ہوا رندگی۔ مہرانی ہو کر جسم میں جانو کی ہشک دل پر کیا اکرتی شرم کو ادا کیا۔ اس نے بازی کی خوشی چہرے پر سجائے خیریت۔ جانو کی موجودگی کی پروانہ کرتے ہوئے جانو کو بتایا۔ جانو نے اس سے چار۔ کھ میں سوداٹے سر۔ آگرم رتج میں کھن کر آیا تھا۔ یارن خان سے ہونے والی گفتگو کا حوالہ دیا۔ ”تم یارن خان کے آدمیوں کے ساتھ جانو کے ساتھ یارن خان نے یہ شرط مہرانی ہے کہ ہم میں سے ایک آدمی اس کے کارندوں کے ساتھ نو۔ پرنک باے جانو کی بھی اس سے تعذات کی شروعات میں۔ وہ ہم سے نہیں بند کرے بھر دوسرے کرنے کی پوریشن میں نہیں ہے اس سے اس نے یہ شرط مہرانی ہے۔ ایک کی شرط یہ ہے کہ اسے بھر دوسرے میں صاحب سے کہہ دوں گا۔ تم میرا آدمی کے تعذب میں گئے ہو یہ وہ نہیں ہیں اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ ٹھیک ہے؟“

جانو نے کچھ سوچا پھر تائید میں سر ہلا دیا۔ دونوں نے قربانی۔ بقیہ رقم رات کو مال کی ڈیوری پر ملنی تھی۔ ان کو پانچ کھ کی توقع تھی۔ ایک ما کھم سو گئی تھا مگر چوری کا مان پیتے ہوئے دل کھا کرنا پڑتا ہے۔ بھوم کر بولا۔ ”آؤ! اس کا مال کی کا شش مناتے میں پھر اس جھوٹ کر کو روپو تپا جا دیتے ہیں۔ چار ما کھ کامل دس۔ کھ کا نظر آ۔ تو خریدار کا دل خوش ہو جاتا ہے۔“

دوسرے کمرے سے سستی شراب کی بوتل اٹھ لیا۔ دونوں نے چندو کے قید خانے میں بیٹھ کر جشن کا ہتھام کیا۔ جام سے جام کرانے اور چندو کے غیر معمولی سرد جسم سے اپنی پھری ہونے والی وقوت۔ پینے کی نامراد کوشش کی۔

جانو نے براہ منہ بنا کر کہا۔ ”اگر رات کو اس کی رخصتی نہ ہو تو اس کے بدن میں بھی شراب کی آگ اٹار دیتا۔“

اس نے پوتے چائے کا خاک حرا ہے۔“

جانو نے چندو کے سینے پر اٹے ہاتھ کا چاند رسید کیا۔ رات سے تحوک دیا۔ دس بج گئے۔ دونوں چندو کو غلط گایاں دیتے ہوئے ہٹ گئے۔ جانو نے کمرے میں ٹوٹے میں مان وکل چھائی اور سر بھی سے کہا۔ ”پانچواں سے صلاہ۔“

اس نے لپیٹ پٹی کر دیا اس کتی کے چہرے پر۔ یارن خان نے اسے اپنے سینے کی تھپ پٹی سے۔

تین گولی مار کر میٹھا۔ یہ آواز کو ریا کر کے پڑی۔ دوسری مرتبہ ترس کیں آ۔ فاس یہ ہے آپ پر دم کرنا ہوگا۔“

اس نے بھرا ہوا رندگی۔ مہرانی ہو کر جسم میں جانو کی ہشک دل پر کیا اکرتی شرم کو ادا کیا۔ اس نے بازی کی خوشی چہرے پر سجائے خیریت۔ جانو کی موجودگی کی پروانہ کرتے ہوئے جانو کو بتایا۔ جانو نے اس سے چار۔ کھ میں سوداٹے سر۔ آگرم رتج میں کھن کر آیا تھا۔ یارن خان سے ہونے والی گفتگو کا حوالہ دیا۔ ”تم یارن خان کے آدمیوں کے ساتھ جانو کے ساتھ یارن خان نے یہ شرط مہرانی ہے کہ ہم میں سے ایک آدمی اس کے کارندوں کے ساتھ نو۔ پرنک باے جانو کی بھی اس سے تعذات کی شروعات میں۔ وہ ہم سے نہیں بند کرے بھر دوسرے کرنے کی پوریشن میں نہیں ہے اس سے اس نے یہ شرط مہرانی ہے۔ ایک کی شرط یہ ہے کہ اسے بھر دوسرے میں صاحب سے کہہ دوں گا۔ تم میرا آدمی کے تعذب میں گئے ہو یہ وہ نہیں ہیں اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ ٹھیک ہے؟“

جانو نے کچھ سوچا پھر تائید میں سر ہلا دیا۔ دونوں نے قربانی۔ بقیہ رقم رات کو مال کی ڈیوری پر ملنی تھی۔ ان کو پانچ کھ کی توقع تھی۔ ایک ما کھم سو گئی تھا مگر چوری کا مان پیتے ہوئے دل کھا کرنا پڑتا ہے۔ بھوم کر بولا۔ ”آؤ! اس کا مال کی کا شش مناتے میں پھر اس جھوٹ کر کو روپو تپا جا دیتے ہیں۔ چار ما کھ کامل دس۔ کھ کا نظر آ۔ تو خریدار کا دل خوش ہو جاتا ہے۔“

دوسرے کمرے سے سستی شراب کی بوتل اٹھ لیا۔ دونوں نے چندو کے قید خانے میں بیٹھ کر جشن کا ہتھام کیا۔ جام سے جام کرانے اور چندو کے غیر معمولی سرد جسم سے اپنی پھری ہونے والی وقوت۔ پینے کی نامراد کوشش کی۔

جانو نے براہ منہ بنا کر کہا۔ ”اگر رات کو اس کی رخصتی نہ ہو تو اس کے بدن میں بھی شراب کی آگ اٹار دیتا۔“

اس نے پوتے چائے کا خاک حرا ہے۔“

جانو نے چندو کے سینے پر اٹے ہاتھ کا چاند رسید کیا۔ رات سے تحوک دیا۔ دس بج گئے۔ دونوں چندو کو غلط گایاں دیتے ہوئے ہٹ گئے۔ جانو نے کمرے میں ٹوٹے میں مان وکل چھائی اور سر بھی سے کہا۔ ”پانچواں سے صلاہ۔“

اس نے لپیٹ پٹی کر دیا اس کتی کے چہرے پر۔ یارن خان نے اسے اپنے سینے کی تھپ پٹی سے۔

جانو نے چند کو چار پائی سمیت بھجوا کر۔ میں ختم کیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ یارن خان کے کارندے جب چند کو لینے کے لیے مکان میں آئیں تو انہیں لاٹو کی لاش نظر آئے۔ چند اُس کی حرکات و سکنات کو بے حس نظروں سے دیکھ رہی تھی اور سمجھ رہی تھی کہ اس درندہ صفت انسان نے، نو کے حصے کے دو لاکھ روپے ڈکارنے کے لیے اُسے گولی ماری تھی۔

اس لاپٹی روپے پر اُسے زیادہ حیرانی نہیں ہوئی کیونکہ وہ عشق کا دعویٰ کرنے والے ایک دیوانے کو دیکھ چکی تھی۔ عمر حیات کا دل اگر جانو کی طرح سیاہ نہ ہوتا تو وہ اُسے برا سمجھنے کے باوجود بھانک شیطاں نہ بنتا۔ غصے میں آئے اُسے باہر ہو کر اُسے حویلی سے نکال دیتا، مار مار کر اُدھ موار کر دیتا یا حد کرتا تو گولی مار دیتا مگر بھیڑیے کی طرح بے رحمی اور سفاکی سے اُسے پاس کرتے ہوئے اپنی نامراد مردانگی کو سیراب نہ کرتا۔

جانو اُس کے لیے چائے کا پیالہ بھر لایا۔ وہ سر ہٹکائے بیٹھ رہی اور دانستہ طور پر اپنے بدن سے خیریں چراتی رہی۔ اپنے آپ سے محن آنے لگی۔ اُس ظالم شخص پر دل اٹھ جو اُسے جتنی گنہ گار و محبت کی نشانی بنا کر کسی کو کھ میں ڈال کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اُس جوانی کے منہ زور جذبات کی بحیثیت چڑھنے والی عورت پر نگہ ہوا جو اُسے پیدا کرنے کے بعد مارنے کے بجائے زندہ دریا میں پھینک گئی تھی۔ اُسے گامس بھی اُس گھڑی برا لگا۔ وہ اگر اُسے پانی کی منہ زور لہروں سے چھین نہ لیتا، بے نام وجود کو چند مایہ نہ بنا دیتا تو وہ ادب گئی ہوتی، مرکب گئی ہوتی اور زندگی کو آغاز میں موت کا ڈانٹ کچھ زیادہ برا نہیں نہ لگتا۔ اب وہ نہ تو مر سکتی تھی اور نہ ہی دنیا کی کمی گئی تھی اُسے زندہ رہنے کے قابل چھوڑا تھا۔

اس کے برابر چار پائی پر بیٹھا ہوا جانو دیکھ تو اُسے ربا تھا مگر اُس کی چشم تصور میں چار لاکھ روپے کے نوٹ چمک رہے تھے۔ لوٹوں کی مخصوص خوشبو اُس کے چہرہ خوبصورت ہوئی تھی۔ اس خوشبو میں اُس کے یار بشیر علی عرف لاٹو کی ویرینہ دوستی کی لاش سے اٹھنے والا لعن و ب گھس گیا تھا اور قسمت اُسے دھولی کا کتابا کر گھر اور گھاٹ میں چکرا لے کر مجبور کرنے والی تھی مگر وہ نہیں جانتا تھا۔ نوٹے اُس سے بھی کچھ نہیں چھپا تھا۔ اُسے جگری یار سمجھ کر اپنی یاری کی رنج پاتا چلا آیا تھا مگر کسی وجہ کے بغیر اُس نے یہ بات چھپائی تھی کہ یارن خان کے دست راست استاد رنگو سے اُس کا ریکی

تعلق نہیں تھا بلکہ وہ اُس کا لنگوٹیا یا ر تھا۔ دونوں کا بچپن ہی گلی میں کھیلتے کودتے گزرا تھا۔

وہی استاد رنگو اپنے پاس یارن خان کا پنڈر لے لے دو لاکھ کے گرم گرم نوٹ اٹھائے صحرا کے دل میں بندھا ہوا تھا۔ رات نصف سنے طے کر چکی تھی جب خوشگام کے گھر میں کسی گاڑی کے انجن کی گھر گھر اہٹ ابھری۔ جانو سمجھتا تھا کہ در کمرے سے نکل گیا۔ جاتے ہوئے دروازہ بند کر گیا۔ چند جاگ رہی تھی مگر آنکھیں مہلہ سے بند تھیں۔ اُسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ اُسے والا جانو اور استاد صاحب ملک نے اسباب تھا یا نور پور کے یارن خان کا لاپٹو غنڈہ۔ وہ بچنے کی کوشش کرتی بھی تو اُسے دروازہ ملتا۔ قفس سے نکل کر دیکھ چکی تھی کہ صحرا کے گوشوں میں اس کے لیے سہا بنی نہیں تھی۔

آنے والے قحط میں تین تھے جو جانو کے پیچھے چلے آئے اس کمرے میں داخل ہوئے۔ جس میں جانو نے چار نوٹ تیار کر رکھے تھے۔ چند نے آنکھیں کھولیں۔ سر ہٹائی کے ساتھ تشویش کے انداز سے آنکھوں میں تیرے آئے والوں میں سے ایک نے سفید رنگ کا اور آں بٹکر رہا تھا۔ گلی میں ایشیتھو سکوپ لٹکا رکھی تھی۔ حیرت کی بات تھی کہ یہاں کسی ڈاکٹر کی آمد کا حوالہ نہیں تھا ورنہ نہ ہی کرنا پڑا کسی سینا کا چہرہ دیکھ دیتا تھا۔ اگر اُس کا سفید بے باس نہ لیکن رحما ہوتا تو جانو اور لاٹو کے قہقہوں کا ہی فرائض آتا۔ دوسرے دونوں اپنی وضع قطع سے چپے چپے بدحواس نظر آ رہے تھے۔ اور آل والے نے جانو کے افسر سے کرنی نظر دل سے گھورا اور جانو سے مخاطب ہوا۔ نام بتا دیا ہے تم نے اپنا؟ ہاں رمضان علی۔ جانو نے؟ وہ نظر نہیں آ رہا۔

جانو نے کن آنکھوں سے چند کو دیکھا، کہا۔ ”میں سے ملک صاحب نے ہنگامی طور پر لاہور بلایا تھا۔ چلا گیا۔ تم فکر نہ کرو۔ مجھے اُس نے تمہارے ساتھ چلنے کا کہا تھا۔ میں تیار ہوں۔“ ”رمضان علی! ہمارے دھندے میں جھوٹ نہیں چلتا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہاری آنکھیں تمہاری زبان کا ساتھ نہیں دے رہیں۔ سچ بتاؤ! کیا تم دونوں نے اس لڑکی کو ہتھ لگایا ہے؟“

اس کے لہجے سے یہی مترشح تھی۔ جانو اُس کا مطلب سمجھ کر جلدی سے بولا۔ ”نہیں تا رنگو! ہم نے تو کیا کسی نے بھی اسے نہیں چھوا۔“ ”پھر یہ میسج کیوں ہے؟“ اس نے اپنے گلے میں جھپٹ

بین ایشیتھو سکوپ کو آہستگی سے گھماتے ہوئے درشتی سے کہا۔ جانو کے بولنے سے قبل ہی اس نے اور آل کے نیچے سے بی تال والا پستول نکال کر تان لیا، غراپا۔ ”لگتا ہے کہ تم کچھ زیادہ ہی بگڑے ہوئے ہو۔ خیر! کوئی بات نہیں۔ ابھی رہا کا۔۔۔ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ اوئے جید یا۔۔۔ مکان کی بددستی ہو۔ میرا خیال ہے کہ اس خبیث نے تیرے پیٹ کو کھانے لگا دیا ہے۔“

”نو! زبڈ! جید سے بولا۔“ ”یامعذب! میں نے جبرن یار کو کیوں کھانے لگا دیا؟“ ”کہا تو یہ کہ وہ پور گیا ہے۔ تم یہ تلاش و لاش کا چکر نہ چدو، باقی رہ کر اور پانی دھواں کر کے چلتے ہو۔“

جید اچو کس انداز میں پلٹا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ جانو نے اُسے روکنے کے لیے سرعت سے پیچھے چاہا مگر تو نا جسم والے استاد رنگو نے اس کے سینے پر پستول کی بال ٹکائی۔ ”بھیکارو! یہیں کھڑے رہو۔ زیادہ چلا کہ نہ بنو ورنہ گولی مار دوں گا۔ ہمارے خان نے زیر و میسر مال کا ہم چاہا ہے۔ سینڈ ہنڈ مال کا نہیں۔ اگر لو بتا دیتا کہ تمہارا مال کون کھاتا ہے تو خان بھی ہڈی نہ چھینکتا۔ تم میری آنکھوں میں سوال جھونک کر شکل و سوا بنا کر دکھا رہے ہو۔ واہ بھئی! واہ کیا نہیں! شیعہ علی نے میرے بارے کچھ نہیں بتایا؟“

جانو کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ کھلے دوزخ کو خوف بھری آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ کافی دیر سے اس کمرے میں قید ہے۔ اس کی وجہ سے یہ پڑ گئی ہے۔ کھلی ہوئی جانے گی تو دو چار دن میں ہی شیک ہو جائے گی۔ تمہیں اگر مجھ پر یقین نہیں تو اسی سے پوچھو۔“

استاد رنگو کے اشارے پر اس کا نوکیلی مونچھوں والا ماسی چندو کے قریب آیا۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ ”اے چھوری! کیا اس بے غیرت نے تیرے ساتھ منہ کا کیا ہے؟“

چندو دال کر رہ گئی۔ سوال شرمناک تھا۔ جواب اس سے بھی زیادہ دلت آمیز تھا۔ جھوٹ بول کر مقدس نہیں ہو سکتی تھی۔ سچ بولنے پر زیادہ سے زیادہ گولی مار دی جاتی۔ یہ بالی بات نہیں تھی کیونکہ زندگی اُس کے نزدیک بے وقعت ہو گئی تھی۔ سوچا۔ اسی لمحے جانو اور لاٹو کی بربریت یاد آگئی۔ جسم بھر جھرا گیا۔ دانت چیں کر بولی۔ ”ہاں! یہ دونوں بہت خبیث ہیں اور نہ سے ہیں۔“

جانو نے بھڑک کر گالی دی۔ استاد رنگو نے زب خند لہجے میں کہا۔ ”نہیں! جن انصاف کھانے کی ضرورت نہیں۔ یہ

چھوری نہ بولے تب بھی اس کے منہ ہاتھ سے ہی تمہارے کیے دھرے کا پتا چلتا ہے۔ لاٹو ایڈوانس میں دو لاکھ روپے لایا تھا، وہ کہاں ہیں؟“

جانو سمجھ گیا۔ میل کا پانسٹ پٹ چکا تھا۔ اُسے توقع نہ تھی کہ آئے دن اتنی صدی معاشے کی تہ تک پہنچ جائے گا۔ کچھ کہنے ہی کا تھا کہ جید سے نہ کرے میں، کر سکتی آ میرے انداز میں کہا۔ ”ستار! ستار! یار ساتھ دے کرے میں مردہ پڑا ہے۔ ادھر گونگی ہے! ات! جید سے نہ پیشانی پر انگلی رکھی اور جانو کو خوشخبریاں رطروں سے گھورا۔ ”دو لاکھ روپے بھی مل گئے ہیں جنہیں گاڑی میں رکھ آیا ہوں۔ اور کوئی خاص چیز نہیں ملی۔“

”اچھی طرح دیکھ لینا تھا۔ کوئی اور خبیث چھپا ہوا نہ ہو۔“ ”نہیں! استاد! میدان صاف ہے۔“

استاد رنگو نے سر ہلایا۔ جانو کی طرف متوجہ ہوا۔ ”ہاں اوئے بے غیرت آدمی! تم نے اپنے ساتھی کو مار دیا۔ میرے سنگی لاٹو کو مار دیا۔ ہیں؟ صرف دو لاکھ روپے کی خاطر۔۔۔ نو کے ساتھ بہت اچھا ہوا۔ جس آدمی کو یار دشمن کی پہچان نہ ہو، اُسے اسی طرح کتے کی موت ہی مرنے پڑے تھے۔ مگر کیا۔۔۔ تم؟ تمہیں تو ان کی پہچان ہے۔ یار کی نہیں۔ تمہیں بھی اس کے پیچھے چلے جانا چاہیے۔ کیا خیال ہے؟“

”جانو کا دماغ گھوم گیا تھا۔ وہ لالچ میں۔۔۔“ ”نہیں! جن! اب تم تو بے پرہیز کر چکے ہو تب بھی نہیں مانوں گا۔ اگر وہ لاپٹی ہوتا تو اس کی جگہ پر تمہاری اش پڑی ہوتی۔ تم رحم کے لائق نہیں ہو۔“ استاد رنگو کی آنکھیں شعلے اگلنے لگیں۔

جانو نے تھوک نکل۔ ”مگر یہ ہمارا مسئلہ ہے استاد! تم اپنے کام سے کام رکھو اور تانکا پکی پر چڑھاؤ۔“ استاد رنگو نے قہقہہ لگایا، سفاکی سے بولا۔ ”تانکا پکی پر چڑھاؤ۔ واہ بھئی! واہ! کیا ڈانڈاگ مارا ہے تم نے مگر میں نہیں! یہ کام تم کرو گے۔ گھوڑے کو شائنا، رو اور تانکا اسی پکے پر چڑھاؤ جس پر لاٹو گیا ہے۔“

اس کے ساتھ ہی اُس نے ہلبی دبا دی۔ گولی خوفناک آواز کے ساتھ گلی اور جانو کے سینے میں دھنس گئی۔ اس کے حق سے دبی دبی چٹائی۔ ڈگمگایا۔ دیوار سے پشت ٹکا کر ایک ذرا سنبھل۔ پستول نکالنے کے لیے ہاتھ مارنے لگا۔ استاد رنگو نے اس کا ارادہ بھانپ لیا اور نشانہ لے کر دوسرا فائر داغ دیا۔ گولی سیدھی جانو کی رخرے میں لگی۔ خون کا فوارا پھوٹا، مردہ پڑ پڑا۔ دیوار کی جڑ میں ڈھس گیا۔ تیسری گولی

اس کے چہرے پر غصے زخموں اور خراشوں کے نشان باقی تھے مگر یارن خان کی ہلکی ہوئی آنکھوں کو دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ اس کے کچھ کہنے سے بیشتر پھر بولا۔ ”رنگو نے تمہارا نام چند بتایا ہے۔ کیا یہی تمہارا اصل نام ہے؟“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اُس پر پھیلی ہوئی آنکھیں مرکز کر کے بولی۔ ”تم دیکھنے میں انسان ہو مگر تمہاری آنکھیں بتاتی ہیں کہ تم ان سے بڑے کتے ہو جنہوں نے مجھے اب تک نو چاکھینٹا۔ اگر ایسا نہیں ہے تو مجھے یہاں سے جانے دو۔ میں تمام عمر تمہاری احسان مند رہوں گی۔“ یارن خان چند لمحوں تک اُسے سپاٹ چہرہ لیے دیکھتا رہا پھر ہنس کر بولا۔ ”تمہارا اندازہ درست ہے۔ میں سب سے بڑا کتا ہوں۔“

اس کے ساتھ ہی اُس نے چندویں کلائی تھامی اور اپنی جانب کھینچ لیا۔ اس نے درست کہا تھا کہ وہ اچلے لباس اور خوش رو شخصیت کے لہادے میں چھپا ہوا سب سے بڑا کتا تھا جس نے ایک ماہ تک چند کو اپنی حویلی کے تہ خانے میں اپنے نوکیلے ہتھوں اور خوش چڑے سے نو چاکھیر اُس پاسی ڈبل روئی کو اٹھا کر اپنے دیرینہ رفیق ملک تھن کے ڈیرے پر پھینک دیا جو چندرہ تیس دن بعد اُسے سردار حیدر خان کی جھولی میں ڈال آیا۔ اس کا دل بھی ہنستے بھر میں بھر گیا تو چند و ماہی کو میاں دلبر حسین کی تحویل میں دے کر موچھوں کو مل دینے لگا۔

بھرے ہوئے پیٹ والوں نے اس کا پچکا ہوا پیٹ بھردیا تھا جو دیکھنے والوں پر آشکار ہونے لگا تھا۔ میاں دلبر حسین نے اُسے پہلی نظر میں تاز لیا تھا مگر دو تین راتیں دار عیش وصول کرنے کے بعد اپنے کارندے پر پل پڑا۔ خوب برا بھلا کہنے کے بعد حکماً نہ لچھے میں بولا۔ ”اس حرام زادوی کو اٹھا کر باہر پھینک دو۔ کہیں دور لے جا کر۔ بلکہ یوں کرو کہ اسے لنگ کینال میں ڈال دو۔ نہ رہے بانس، نہ بیجے گی بانسری۔“

میاں دلبر کے اس درندہ صفت کارندے کا نام مظہر علی تھا جو چند کو یہاں لایا تھا۔ چونکہ وہ چالیس کے سن میں پہنچنے کے باوجود ابھی تک کنوارا تھا، اس لیے چند کو دیکھ کر اُس کی رال ٹپکنے لگی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر مؤدبانہ انداز میں کہا۔ ”صاحب جی! اگر اجازت ہو تو میں اسے اپنے گھر سے جاؤں۔“

”اوائے گدھے کے بیچ! تم اس کا کیا کرو گے؟“ میاں دلبر حسین چمک گیا۔

مظہر کے درشت اور بھیاں تک چہرے پر اس نے آ کر گزر گیا۔ عجیب انداز میں شرما کر، سر جھکا کر، صاحب جی امیری ابھی تک شادی نہیں ہوئی تار۔ لے جا کر دو بول پڑھوا لوں گا۔ اور نہیں تو میری بندہ کی روئی تک پکارا کرے گی۔“ دلبر حسین نے اُسے دلچسپی آمیز نظروں سے منظر کر رکھا۔ ”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، جو جی میں۔“ مگر اس کی زبان بند رہی چاہیے۔“

مظہر نے سینے پر ہاتھ رکھا اور یقین سے کہا۔ ”نہ کریں صاحب جی۔ اس کی پوتی ہے بندہ کر۔ اس کا عمر دانتوں تلے زبان دبا دے برتن پانچتی رہے گی۔“ یہ ساری گفتگو چندویں مچواری میں ہو رہی تھی۔ دلبر حسین نے پیٹ کر کمرے ت جاتے ہوئے یہ زب کر پوچھا۔ ”مگر اس کا کیرا دے گے؟“

اس نے چندویں طرف دیکھ کر اپنا پیٹ چھپایا۔ ”یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے صاحب جی! اگر کارن اسپتال میں لیڈی ڈاکٹر ہے۔ وہ اس قے کر سے پاک کر دے گی۔“

”جو ڈاکٹر زندگی دینے کے بجائے مرد کی اس کی بھاری قیمت بھی وصول کرتا ہے۔ کیا تم اتنی تم ہے؟“

”آپ سے ہوتے ہوئے مجھے کیا فائدہ ہو گا صاحب جی! مسہر میں۔“ جاہلی سے

”بہت کہتے ہیں۔“ پوچھنے سے صاحب جی نے ہنس کر لوہا لیا۔ ”تجربہ ہاتھ نہیں ایک مہینے کی بھی ہوں۔ جو چار مہینے کرو۔“

”میں آپ کا حسن عمر بھر نہیں جھلوں گا۔“ اس کی بات کا اثر مظہر علی نے سوجھا کر مسرت سے میں بیٹا۔

چند پھٹی پھٹی نظروں سے دونوں کو خاموشی سے رہی تھی۔ میاں دلبر حسین نے اپنے والٹ سے کچھ نوٹ اور مظہر علی کی طرف اُچھال دیے۔ وہ نوٹ جیب کے ادھر ادھر ہاتھ مارنے لگا۔ میاں دلبر حسین اُس کی حرکات کو دیکھ کر ہنستا ہوا رخصت ہو گیا۔ مظہر علی نے فرار کر جانے والے نوٹ اٹھائے، ہونٹوں سے لگا کر جب ڈالے اور خوشی سے جھومنا۔ ”میاں صاحب! ازندہ! زور مسرت سے اس نے بند پر سر جھکا۔ پیشانی

بانس میں سر اٹھا کر بڑبڑاتا ہوا۔

عجب صورت چھو کر کی کو مارنے کا کیا فائدہ۔ میاں صاحب بھی نکال کرتے ہیں۔“

چندو کے لیے زعمہ بیچ جانا اور مظہر علی جیسے ساڈ کے ہاتھوں میں پھسل جانا زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ وہ بے بسی کے میں مظہر علی کی ہانہوسا میں ٹھہری بنی اپنے پھوپھوے پیٹ کو دیکھتی رہی جس میں نہ جانے کس اوپاش کا گناہ موباکر اُس کی تمام تر زندگی کو بچس کر گیا تھا۔ نصف شب کا عمل تھا جب مظہر علی نے اپنے ایک ساتھی کی مدد سے اُسے میاں دلبر حسین کے فارم ہاؤس سے نکالا اور کار میں سوار کر کے تیس چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر موجود ایک ویران ڈیرے پر منتقل کر دیا۔ یہ ڈیرا بھی میاں دلبر حسین کی وسیع و عریض زمینوں کے بیچ میں تعمیر کیا گیا تھا اور مظہر علی اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ یہاں مقیم تھا۔ مظہر علی کا ساتھی ان دونوں کو ڈیرے پر اتار کر کار میں واپس چلا گیا تو مظہر علی اُسے کلائی سے تمام کر کھینچتا ہوا اپنی ماں کے پاس لے آیا۔ وہ بہت ضعیف تھی۔ دیکھنے سے پتا چلتا تھا کہ اس کے بدن کی آخری بیماری میں زندگی کا پانی دوڑ رہا تھا۔ چند دوشیزکیں نظروں دیکھ کر اپنے بیٹے سے کہنے لگی۔ ”اوائے موئے مردوار! یہ تو کس گناہ کی پوٹ کو اٹھا لیا ہے؟“

چندو نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔ ”جی سے بولی۔“ میں گناہ کی پوٹ ہوں تو میرا پتر کیا مسجد میں جھاڑ دینے پر لگا ہوا ہے۔“

مظہر نے اُسے تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا، پھر رخصت کر گیا، بولا۔ ”یہ میری ماں ہے، اس کے ہاتھ اب سے رات کو روٹ جڑی ہوئی ہو گی۔“

”وہ ماں کوئی۔“ تیس سے جھٹکے کو غم دینے والی نے ہاتھ سے ہی دپ سے بات کر سکتی ہوں۔“

”ظہر نے۔“ اس وقت تمام اپنے غصہ دیا اور ماں و چھوٹ میں ہاتھ آئے وہاں چندو کے بارے میں بتانے لگا۔ اس نے بیٹے کے خاموش ہونے پر اپنے سینے پر ہاتھ مار کر غم کرنے کے انداز میں کہنے لگی۔ ”تو کیا اب تو میاں صاحب کی چٹکی ہوئی روئی کھائے گا؟“

اس نے کندھے اُچکائے۔ ”تیری عقل میں کچھ نہیں آتا ماں! ساری عمر بھوکا رہنے سے چٹکی ہوئی کھانی بہتر ہے یا نہیں؟ تجھ سے تو آج تک میرے لیے کوئی ٹکڑی لولی لڑکی بھی ڈھونڈی نہ جا سکی۔ میں لے آیا ہوں تو غرے اٹھانے ہی ہے۔“

”نہایت سے مر بھیجے۔“ ہاتھ سے ہاتھ میں نہ

اٹھا کر تھوکنے کی سکت نہیں تھی وگرنہ وہ چندو کے پیٹ پر تھوک دیتی۔ رات کے دوپہر باقی تھے جو بڑھیا نے کھائے، مظہر علی نے ہانچے اور چندو نے حسب معمول کانٹوں پر لوٹ پوٹ ہوتے گزارے۔ صبح دیر سے جاگی۔ کافی دنوں سے نہیں نہاتی تھی۔ جن ہاتھوں میں کھلونا بن رہی تھی، ان کا میل صاف کرتے کرتے اُس کے ہاتھ تھک گئے تھے۔ پے در پے کی پالی نے اُس کی رگوں سے خون پھوڑ ڈالا تھا۔ وہ تیز چپتی تو سانسیں اکھڑنے لگتی تھیں۔ کئی مہینوں سے وہ بس موت کی دعا مانگتی چلی آ رہی تھی کیونکہ اُسے گناہ کی دمدن سے نکلنے کی ہر وہ سداورد دکھائی دے رہی تھی اور تجربات سے ثابت ہوا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے موت کو بھی گلے نہیں لگا سکتی تھی۔

مند ہاتھ دھو کر بوڑھی کے قریب چو لھے پر آ بیٹھی۔ اس کی بوڑھی آنکھوں میں تجسس بلکورے لیتا دکھائی دیتا تھا۔ پوچھنے لگی کہ مظہر علی اُسے کہاں سے اٹھا کر لایا تھا۔ وہ بولی۔ ”تیرا پتر بے غیرت ہی نہیں، بے حیا بھی ہے۔ کیا تو اتنی سی بات بھی نہیں جانتی؟“

اسے بیٹے کی بد خوئی بری لگی، بولی۔ ”میرا پتر ایسا کیا گزرا بھی نہیں ہے۔ ضرور تم نے ہی کوئی جادو ٹونا کیا ہو گا شودھے پر۔“

وہ زہریلے انداز میں فسی، بولی۔ ”میرے پیٹ میں کسی کی غلامت بھری ہوئی ہے۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں مجھے ایک گندگی کے ڈھیر سے اٹھا کر اپنے باپ میاں دلبر حسین کی غلیظ گود میں ڈالا۔ وہاں سے بیوی بنانے کی نیت سے مجھے اٹھا کر یہاں لے آیا۔ نکاح سے پہلے ہی مجھے باجر (بھیڑے) کی طرح رات بھر نوچتا کھینچتا رہا۔ آج یا کل مجھے اسپتال میں لے کر جائے گا۔ میرا پیٹ چھوٹا کروائے کے بعد پھلا دھلا کر دلہن بنالے گا۔ تو پھر بھی کہتی ہے کہ میرا پتر ایسا گیا گزرا نہیں ہے؟ تجھ پر اور تیرے مردوار خور پتر پر خدا کی مار ہو۔“

مظہر کی ماں برواشت کرنے والی عورت نہیں تھی مگر بیٹے نے جاتے ہوئے اُسے درشت لچھے میں سمجھایا تھا کہ اس کے آنے تک کوئی لڑائی جھگڑا نہ کرے۔ اس لیے خاموش تھی وگرنہ منہ توڑ جواب دیتی۔ چندو نے مہینوں بعد کھلا آسمان دیکھا تھا۔ لمبی لمبی سانسیں لینے کے درمیان اُس کے دل میں بھاگ نکلنے کی ایک مرتبہ پھر خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے محتاط نظروں سے چہار سو دیکھا۔ گھر چھوٹا اور رخت حالت میں تھا۔ چونکہ میاں مظہر علی کی ماں اکیلی رہتی تھی اس

یہ میری بوسہ نام تھا۔ چار دیواری یہ ہرک دی
 تھی تھی، اُسے معلوم نہیں تھا۔ وہ اٹھنا چاہتی تھی کہ بوزھی
 نے چائے کا پیالہ بڑی حقارت سے اُس کے سامنے رکھ
 دیا۔ اس کی تو جھبٹ تھی۔ چائے پیتے ہوئے میرا پرہیز کا
 پانہ بیٹے تھی۔ اس سے لڑائی ہوئی دیوار کے ساتھ بائیں دس
 مریاں بندھی تھیں جو رات سے اب تک مسلسل سننا
 رہی تھیں۔ ساخت و نوعیت کے متبار سے یہ گھر بابا کا گھر
 کے گھر سے پچھوڑا وہ مختلف نہیں تھا چندو کے دل سے
 نکلی کہ یہ سیب رو دیا پر اس کی ہوا کے قریب ہوتا۔ اُسے
 یہاں سے نکلتے ہی کوئی جاسے ہناؤں جاسے۔ چونکہ اس کی
 حالت ناگفتہ بہ تھی، دل کمزور ہو چکا تھا اس لیے وہ زیادہ
 دور اور دیر تک بھاگ نہیں سکتی تھی۔

مظہر علی نظر نہیں آ رہا تھا۔ موقع اچھا تھا۔ اس نے
 چائے کا آدھ پیالہ زمین پر رکھا اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر
 کھڑکی ہوئی۔ بوزھی نے کریدتی نظروں سے گھرا۔
 "اے اتو کہاں جا رہی ہے؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور زمین سے گر کر سرونی
 دروازے کی طرف بڑھی۔ اس کی توقع کے برعکس مذہم کا
 ہڈیوں بھرا اٹھ نہ بھگی کی نہ مستعدی سے اُس کی راہ میں
 حائل ہو گیا۔ کھڑکی ہوتی آواز میں نکلتی۔ "نا مرادے ا
 رک چا، میں تجھے بھاگنے نہیں دوں گی۔"

اس نے بوزھی کی ناتواں گرفت کو جھٹکا دیا۔ وہ توازن
 برقرار نہ رکھتے ہوئے زمین پر گری۔ بلند آواز میں چیخنے
 چلانے لگی۔ یوں لگا کہ اُس میں اٹھنے کی سکت نہیں رہی تھی۔
 چندو دھڑکتے دل کو سنبھالتی ہوئی حویلی سے نکلی۔ یہ دیکھ کر
 اُس کی جان ہوا ہو گئی۔ مظہر علی کے اس بد شکل ڈیرے کے
 آس پاس کوئی آبادی نہیں تھی۔ دور اور تک کوئی گھر دکھائی
 نہیں دیتا تھا۔

دور درے کے سامنے فصلوں کے سبز ایک پتہ مذی تھی
 جو گھوم کر پچھلے اڑے میں غائب ہو رہی تھی۔ وہ دروازے کے
 سے انداز میں پھٹی ہوئی مکان کے پچھلے اڑے میں تھی۔
 بوزھی کی چیخ و پکار مسلسل اس کا تعلق کر رہی تھی مگر وہ پرو
 کیے بغیر بڑھتی گئی۔ چھوٹے قد کی فصلوں کے تاج پر گاہ سے
 کے آخر میں اُسے سرخ اور سفید پلاکس والی چار دیواری اور
 سرکاری طرز کی سرخ شپ شدہ عمارت دکھائی دی تو اس کے
 دل و لپک اور اتھوڑت ملی۔ فاصلہ زیادہ تھا مگر اُسے وہاں پہنچ
 کر باہر مل سکتی تھی۔ اس کے دوڑنے کی رفتار تیز ہو گئی مگر ابھی
 کہ نہ آست میں نہ نہیں تھی۔ اس کے عقب میں وہ ڈرتے

قدموں کی چاپ بھری ۱۰۱ دہشت سے رک کر نکلی
 عقب میں دیوار دروازے ہوئے مظہر علی کو دلچسپ
 پرنا تھی۔ وہ کی اور رستے سے گھر پہنچتا تو
 حوش میں بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ اس غیر معمولی دیر کی
 سے لپک لپک رہتا تھا۔ اس کا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔
 چندوں میں ہی چندو کے سر پر پہنچ گیا۔ آست اور
 سے گالیوں سے اسے گھسیٹ کر مکان کی طرف
 جاسے گا وہ بدلتے ہی چلی۔ مظہر علی نے اس کے
 زوردار تھپڑ رسید کیا۔ دونوں کے گھٹنوں سے خون رست
 رہی تھی سکت بھی آتوڑائی تھوڑی دیر بعد جب وہ دروازے
 شل وہاں بڑھنے کے سامنے سے جا کر پھٹ گئی تو اس کی سانس
 پری طرح اکھڑ رہی تھی۔ مظہر علی نے پھاڑا ہانے واس
 انداز میں کہا۔ "تو تم بھاگ رہی تھیں؟ ابھی نہیں
 ہوں۔"

اس نے چندو کو باؤں سے پکڑ کر اٹھایا اور چندوں
 میں سے اس کی طرح حاکم کر رکھ دیا۔ مظہر علی جسم در
 ہو۔ گھر کا مالک تھا۔ اس کی ضربوں کے مقابلے میں چند
 رپا وہ دیر ہوش میں نہیں رہ سکتی تھی۔ بے ہوش ہو گئی۔ مظہر
 پانی چھڑکا۔ وہ ہوش میں آگئی مگر اسے ام پڑی تھی۔ آتو
 چپاتی میں پھر ایک طرف گردن ڈال گئی۔ وہ اسے گھسیٹ
 چارپائی تک دیا اور اس کے پاس پکڑ گیا۔

ماں ہاتھ اٹھا کر بولی۔ "پترا اس کم ذات کو سنا
 اٹھا کر لایا ہے، وہیں پھینک آ۔ یہ گھر میں نکلے اور نہیں
 وہ پھولی ہوئی سانسوں میں بولا۔ "تو دیکھتی رہا
 میں اس کا وہ شکر کروں گا کہ یہ زندگی بھر یہاں سے نہ
 سو پگ بھی نہیں۔"

"میں اس کی ایک ٹانگ کاٹ بیچوں گا۔ پھر
 گا کیسے بھاتی ہے۔"
 دے بھیا میں اپنے ٹنگ پانی سے عاجز ہو گیا۔
 چارپائی پر پڑتی تو میں اس موٹی مردار کو کیسے عاویں
 کی "میری ماں تو اس مذہبی پوت کو اور پھینک آ۔ بوزھی
 کے ساتھ رہتا تھا پر شکوں میں اس کا ہونا۔

من چڑھے چندوں کی سرت چلی۔ اس نے سر
 پٹی۔ چارپائی پر اٹھ بیٹھے کی دوش کی مگر بدن کا عضو
 رہا تھا۔ منہ سے مسلسل لڑائی خاری ہو رہی تھی
 بعد ہی سے قریب سے پانی کے ہاتھ میں چندا پھیل
 دل کو خیر خواہ ہو گیا۔ بوزھی نے اس کی

من و دل میں سو۔ میاں صاحب نے تمہیں بڑی سہر میں
 سے لے کر لایا تھا۔ جیسا کہ تاجو میاں صاحب کا سہرا سا
 میں نے اس کی عزت کی رہی ہے۔ چوتھو تھا تمہیں
 دے رہا ہے۔ بھگت رہی تھیں۔
 میں نے گھٹنوں میں خواب بھر گیا۔ خواب نکال کر ہوں۔
 دروازے میں زندہ ہیں۔ رہا چاہتی۔

مہر نے دونوں ہاتھوں سے کھڑکی تھنی۔ رست
 کے پر۔ "انہیں۔ انہیں مرنے نہیں دوں گا۔ اس
 طرح رہا۔ کھانے کا تمام عمر سستی تو پتی رہو مگر یہاں سے
 رگت کی کوشش نہ کر سکو۔ آج ایک ٹانگ کاٹ رہا ہوں۔
 "تم ایک ٹانگ سے بھاگنے کی کوشش کرو گی تو دوسری بھی
 کاٹ دوں گا۔"

چندو چہرہ دے دہشت کے سفید ہو گیا اور انہیں
 دے دہشت میں پھیل گئیں۔ اس نے تمام تر قوت سے چیخا
 آواز دینے میں ہی پھڑپھڑا کر رو گئی۔ مظہر نے جڑ
 کی زور اور کان دی اور کھڑکی کو پشت کی طرف
 ہر یا۔ اس کی کھڑکی کا تیز اٹھا۔ پھل چندو کے گھٹنے کے
 زور و پشت سے نہا تھا۔

ایسے ہی وقت میں چندو کی قسمت بیدار ہو گئی۔ مظہر کی
 بوزھی میں سچ کر اٹھی اور بیٹے کو اس کے مکروہ ارادے سے
 پر رختے سے بے دوڑی۔ چارپائی کی پانچھی کے قریب پہنچی
 تو بھڑکی بتی ہوئی دوری سے گھو کر کھا کر چارپائی پر آن
 گئی۔ میں اسی لمحے مظہر کے ہاتھ پر کی قوت سے نیچے
 ت۔ اور چندو کے گھٹنوں پر اوندھے منہ سری بوزھی کی
 کھڑکی کے قریب جسے میں کھڑکی کا پھل نصف تک دھس
 گیا۔ بوزھی کے حلق سے خرخر ہٹ نکلی اور اس کا بچھا دھڑ
 اپنے لگا۔ باائی دھڑ بالکل ساکت ہو کر رہ گیا۔ مظہر کے
 وہاں جھاس گئے۔ اس نے کھڑکی کو کھینچ کر نکالنا چاہا مگر
 آ کی پھل پڑی کی بڑی میں پھنس گیا تھا۔ اُس نے دو تین
 نکتے اب مگر کام ہو کر پھٹی پھٹی گھٹنوں سے اس کے سر
 سے نکلے نہیں بل کرتے خون کو دیکھنے لگا۔

چندو نے جو بھی کھڑکی کے پھل کو اپنی ٹانگوں کی
 طرف آتے دیکھا تھا، اس نے آنکھیں غیر معمولی سختی سے
 بند کر لی تھیں۔ بوزھی کی خرخر اہٹ سننے کے بعد اُسے صورت
 کی کھینچنے اور خود وسیع ہونے میں کچھ وقت لگا۔ پھر ٹانگیں
 کی ریز تھیں۔ آتوڑائی وجوہ تلے سے نکلی اور رتی
 عقلم سے چارپائی سے اتر کر دیوار تک چلی گئی۔ وہ
 سے اس کی ہاتھیں یوں دھکی جا آئیں۔

چارپائی پر تھا جبکہ اس کی ٹانگیں دروازے تک پہنچی ہوئی
 تھیں۔ مظہر ابھی ہوش میں نہیں تھا مگر وہ جو بھی دروازے کا
 رخ کرتی، وہ اُسے دیوچ لیتا۔ ماں کے غیر متوقع اور غیر
 "اس کی قوت کے بعد اس کی ہاتھیں سست ہو گئی تھیں۔ اس
 سے یوں تھی کہ اس کی توقع نہ تھی۔

چانک۔ ہوش میں نہ آیا۔ اس کی چپٹی پھٹی ز
 حلق سے آواز رستے سے چارپائی کی دھکی پڑی۔
 مگر کیا۔ اس نے ہوش کو اسے اور سانس محسوس کرنے کی
 زحمت نہیں کی تھی۔ یا تو اسے وحیان نہیں رہا تھا یا اس نے
 رنوداں کی موت کا یقین کر لیا تھا۔

چندو نے خوفزدہ نظروں سے ارد گرد دیکھا۔ وہ غیر
 اختیاری طور پر کسی ایسی چیز کو کھوج رہی تھی جسے اپنے بچاؤ
 کے لیے ہتھیار بنا سکے۔ اس کی کوشش اکارت نہیں تھی اور
 اسے اپنے دابے ہاتھ پر دیواری جڑ کے ساتھ پڑا ہوا چوبلی
 ڈنڈا نظر گیا۔ اس ڈنڈے کو مٹی زبان میں منہ کھجاتا
 سے اور کم و بیش ہر دیہاتی گھر میں موجود ہوتا ہے۔ اس کی
 مدد سے چپٹی کوئی جاتی ہے یا ہڈیاں ڈالنے کے لیے گرم
 مسالہ اور سرخ مرچیں پٹکی جاتی ہیں۔

اس نے چوبلی ملنا اٹھایا، دونوں ہاتھوں میں سختی سے
 پکڑ کر سر سے بند کی اور باقی سوچے بکلی کی سی مستعدی سے
 قدم بڑھا کر مظہر کے سر پر دے مارا۔ دھماکے کی آواز
 کمرے میں گونجی۔ مظہر نے سر اٹھایا۔ اُسے دہشت ناک
 نظروں سے دیکھا اور کھڑا ہوا چاہا مگر تب تک چندو مظہر کے
 تالو پر دوسرا کارگر وار کر چکی تھی۔ دوسرا دھماکا پہلے سے بھی
 زیادہ خوفناک تھا۔ خون کا فوارہ اُبل رہا تھا۔ چارپائی کی بانہ
 پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہونے کی کوشش میں لہراتا ہو دیواری جڑ
 میں ڈھے گیا۔ چندو کے پیروں اور بانہوں میں بھی بھر گئی۔
 چارپائی کا چکر کاٹ کر اس کے سر پر پہنچ گئی۔ چوبلی ملنا ہوا
 میں بند کیا تو مظہر نے مدافعتی انداز میں اپنے دونوں ہاتھ
 فوری طور پر سر پر رکھ لیے۔ منہ ایک ہاتھ پر لگا۔ ہاتھ کی کئی
 ہڈیاں پھٹ گئیں۔ چندو نے پد پد پیسوں وار کر کے اس
 کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔ اس پر دہشت سوار تھی۔ اس
 کے سر سے کے بعد بھی وہ کافی دیر تک جڑ سے پھینچے، حشہ نہ
 انداز میں اس کی کھڑکی کو پتی رہی پھر ڈنڈا ایک طرف
 پھینک کر دیوڑے ٹنگ لگا کر بیٹھ گئی۔ ہاتھ ہاتھ پتے
 نکلی۔ اس سے پہلے اس کی کھڑکی سے درخت ہونے لگے
 تھا۔ آج اپنے ہاتھوں کی کر کے مار رہی تھی۔ یہ سب بھینچ
 سے اس کی ہاتھیں یوں دھکی جا آئیں۔

مگر وہ کیا کرنے لگی ہے تو شاید زندگی کا پہلا قتل سرانجام نہ دے پائی۔

خوف اور ڈر انتہائی حد پر پہنچ کر انسان کا بچھا چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ آنکھیں پھاڑے دونوں لاشوں کو باری باری دیکھتی رہی۔ روتی رہی۔ پھر ڈرنے لگی۔ گھٹنوں میں سر ڈال کر بیٹھ گئی۔ اس کے بدن میں جتنی سخت بھی نہیں رہی تھی کہ اٹھ کر کمرے سے یا زیرے سے نکل جاتی۔ اس کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا مگر قسمت اپنا کام کر رہی تھی۔ اُسے بڑا مردہ اور نڈھال بیٹھے ہوئے ایک گھنٹا تر رگی تو شریک کی مہیب سکوت والی فضا میں موٹر سائیکل کے انجن کی پھٹ پھٹ گونگی۔ وہ بے حس بیٹھی سٹی رہی۔ موٹر سائیکل دروازے پر آن رکی۔ تھوڑی دیر بعد قدموں کی چاپ کمرے کے دروازے تک آئی۔ چندو نے آنسوؤں سے تر چہرہ اٹھایا۔ ایک اجنبی چہرہ نظر آیا۔ دروازے تک آن پہنچے والا اپنی آنکھوں میں حیرت اور خوف کا ملا جلا تاثر لیے منظر علی اور یوژمی کی لاشوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے چندو کو نہیں دیکھا تھا یا دیکھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔

وہ علیے سے کسی بھی طور منظر علی کے قبل کا شخص دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس نے سادہ شلوار میں بکین رکھی تھی جبکہ گلے میں سیاہ نالی والی اسٹیتھو اسکوپ لٹکا رکھی تھی۔ ایک ہاتھ میں بلند پریشر چیک کرنے والا آپریٹس جبکہ دوسرے میں ننھا سا ونڈ بیگ تھا یا ہوا تھا۔ وہ ڈاکٹر تھا۔ چندو سراسیمگی سے اُسے دیکھ رہی تھی کیونکہ اس جگہ پر کسی ڈاکٹر کی آمد نہایت غیر متوقع تھی۔ ڈاکٹر نے مختصر نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ اُسے دیکھا اور کچھ پوچھے بغیر باری باری دونوں لاشوں کا معائنہ کیا۔ لمبی سانس پھینچوں میں اُتار کر کھڑا ہوا اور سخت لیچ میں بولا۔ "اے لڑکی اتن کون ہو اور ان دونوں کو کس نے قتل کیا ہے؟"

چندو نے کھڑا ہونے کی کوشش کی۔ دیوار کا سہارا بھی لے مگر ٹانگوں نے ساتھ نہ دیا۔ بے بسی سے دیکھنے لگی۔ ڈاکٹر نے اپنا سوال اہرایا۔ وہ تب بھی خاموش رہی تو وہ پتے تلے قدم اٹھتا ہوا اس کے قریب آ کر بیروں کے بل کیے فرش پر بیٹھ گیا۔ آنکھوں میں جھانک کر بولا۔ "میں یہاں کبھی بھی آیا کرتا ہوں۔ اس یوژمی کو جو اس وقت مردہ حالت میں چار پائی پر پڑی ہے، نیو رویان (طاقت کا ٹیکہ) لگانے کے لیے۔ تمہیں آج سے پہلے کبھی یہاں نہیں دیکھا۔ جلدی بولو۔ تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہی ہو؟"

اس نے منہ کھولا۔ "میں۔۔۔ میں چندو ماہی۔۔۔"

ڈاکٹر بھنب گپ کہ خوف اور ہشت کی شدت اس کے حواس بحال نہیں تھے۔ پانی بھر لایا۔ پلا۔ بعد بولا۔ "انہیں کس نے قتل کیا ہے؟" یہ کلب لڑی سے میری ٹانگ کاٹا چاہتا تھا۔ مجھے بچانے کے لیے آئی تو اس کے سر میں کھانڈی لگ گئی۔ پھر۔۔۔ پھر میں نے اسے۔۔۔ اس کی آواز پھر روند رندی دوچکیاں لے لے کر لے گئی۔

"تم منظر کی بیگنی ہو؟"

"نک۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔ وہ مجھ غوا کر کے رہا۔۔۔ کبوں۔۔۔؟"

"مم۔۔۔ مجھے ہیٹ خیر پور سے۔۔۔ وہ گریڈ انگی۔۔۔ بتانا چاہتی تھی کہ اُس کے ساتھ کیا ہوا مگر اس کی کہانی یہ جملے میں سمیٹی جانے والی نہیں تھی۔ ڈاکٹر چندو کوں تک اگھو تار رہا، پھر بولا۔ "تم شادی شدہ ہو؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "تو پھر یہ کیا چل رہے؟" ڈاکٹر نے اُس کے پیٹ طرف اشارہ کیا۔ وہ کٹ کر رہ گئی۔ ایک بار شمشیں آنکھیں پھیلانے پر بڑے منظر علی کو دیکھا۔ ہونٹوں کو غیر معمولی سختی سے چسپاں کیا، بولی۔ "مجھے یہاں سے نکال لیں۔ میں آپ سب کچھ تفصیل سے بتا دوں گی مگر۔۔۔ خدا کے لیے جتن لیں۔ یہ بہت عالم تاہر (بھیڑیے) ہیں۔"

وہ جہانم دیدہ آدمی تھا۔ سمجھ گیا کہ وہ ابھی کچھ بتانے پر زور میں نہیں تھی۔ اٹھا، اُسے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے باہر جانے کا حکم دیا، کہا۔ "خود کو سنبھال کر اٹھو اور پو۔ گھر کی تدبیر لو۔ تمہاری کوئی نشانی یا سامان گھر میں نہیں چاہیے ورنہ تم پولیس کے ہتھے چڑھ جاؤ گی۔"

"جب یہ مجھے اٹھا کر یہاں لایا، میں خالی ہاتھ تھی۔ وہ اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ پولیس کا آتے ہی اس کی حالت خاصی دگرگوں ہونے لگی تھی۔ وقت تمام کھڑی ہوئی۔ ڈاکٹر اس دوران گہری سوجن میں مستغرق رہا۔ جونہی وہ خود کو رگیدتی ہوئی چار پائی کے پانچنی، ڈاکٹر نے شانوں سے پکڑ کر یوژمی کی لاش کے قریب چار پائی پر بٹھا دیا۔ جلدی سے اُس کے بیروں سے چیلنگ لے لی۔ چندو نہ سمجھتے ہوئے خالی خالی نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔ ڈاکٹر نے برق رفتاری سے چندو کی چیل یوژمی بیروں میں ڈال دی اور اُس کی چیل اٹھا کر چار پائی نیچے رکھ دی۔ اُس نے کمرے کے سامان میں

جدیدیں کیں۔ مطمئن ہو کر بولا۔ "اے لڑکی میں تمہیں اٹھا کر سرے چاؤں گا۔ تم یہ خیال رکھو گی کہ تمہارے ہر کپڑے میں سے نہیں نکلنے چاہئیں۔ اوکے؟"

وہ لڑکی بات سمجھتی مگر یہ نہ سمجھ پائی کہ وہ ایسا کیوں کر رہا تھا۔ وہ کسرتی بدن کا مضبوط اور کسے بدن کا مالک تو منہ شخص تھا۔ اس نے اپنا ونڈ بیگ اور آپریٹس چندو کو تھمایا اور اُسے اپنے ناف سے وہ سات آٹھ سال کی بچی رہی ہو۔ مکان سے ہر لڑکے اُسے موٹر سائیکل کی پچھلی سیٹ پر بٹھا کر بولا۔ "زمین کو چوئے بغیر اپنے پاؤں فٹ ریٹ پر رکھ لو۔"

وہ ہدایت پر عمل کرتے ہوئے موٹر سائیکل پر احتیاط سے بیٹھ گئی۔ اس دوران ڈاکٹر نے ایک ہاتھ سے موٹر سائیکل کو سنبھالے رکھا پھر خود بھی بیٹھ گیا۔ نک مارنے لگا۔ "میں نہیں چاہتا تمہارے بیروں کے نشان پولیس دیکھ تک پہنچا دیں۔ ٹھیک سے بیٹھ گئی ہو ناں؟"

اس نے "جی" کہا۔ موٹر سائیکل اسی پگڈنڈی پر چل پڑی جس پر وہ صبح بھاگی تھی۔ تھوڑی دیر بعد موٹر سائیکل سرخ اور سفید پلاکوں والی چار دیواری کے متوازی کیے راستے پر پہنچ گئی۔ چار دیواری کے تقریباً وسط میں پہنچ کر دائرے نے دیوار کے ساتھ موٹر سائیکل روکی۔ اپنا پاؤں دیوار سے باہر کوٹلی ہوئی بنیاد پر بٹھایا، تھوڑا پہلو بدلا اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا۔ "دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف کود جاؤ اور وہیں رک کر میرا انتظار کرو۔ میں مین گیٹ کی طرف سے آتا ہوں۔"

چندو کا جسم نوٹ پھوٹ کا شکار تھا مگر پولیس کے خوف سے اُس نے اپنی تمام تر توانائیوں کو نکال دیا اور ڈاکٹر کی مدد سے ایو۔ پمپنڈی جبکہ ڈاکٹر نے موٹر سائیکل آگے بڑھادی۔

چندو کم بلند دیوار اور سرخ اینٹوں والی بلند درخت کے درمیان اینٹوں کی روش پر گری تھی۔ ننگے بیروں میں اینٹوں کے ٹکڑے اور وہ پروانہ کرتے ہوئے سب سے انداز میں اور گرد دیکھنے لگی۔ اطراف میں سوائے جنگلی گھاس، کبیر کے اڑی رنگت والے پودوں اور پجری کے بلند ڈھیر کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ اس کے ہاتھوں قتل ہوا تھا۔ بے اوقات اور بے سہارا تھی۔ دور دور تک عافیت کا کوئی گوشہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بھی اس سرکاری عمارت کو دیکھ کر مزید سہم گئی تھی کیونکہ ڈاکٹر سرکاری آدمی تھا اور سب اُسے پولیس کی تحویل میں دینے کے لیے یہاں لایا ہو۔۔۔ دل دھک سے رہ گیا۔ چار دیوار پھانڈ کر نکل بھاگے۔ سوچ آئی کہ اُسے تو یہ تک علم نہیں کہ وہ اس وقت کس علاقے میں تھی، یہاں سے کس

طرف جاسکتی تھی اور اُسے کدھر کا رخ کرنا چاہیے تھا۔ ایسے میں اُسے قتل گاہ سے نکال کر لانے والا ڈاکٹر بلند عمارت کی بائیں کٹھ سے نکلا اور ہاتھ کے اشارے سے اُسے اپنی جانب بلانے لگا۔ وہ میکاٹکی انداز میں آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے قریب پہنچی۔ اس نے ہاتھ تھاما اور کھینچتا ہوا عمارت کے دروازے کی راہداری کے آخری کمرے کا دروازہ کھول کر ایک طرف کھڑا ہو گیا، بولا۔ "تم اس کمرے سے تب تک باہر نہیں نکلو گی جب تک میں واپس نہیں آ جاتا۔ کمرہ اٹھچھ ہاتھ ہے اور فریج میں کھانے پینے کا سامان پڑا ہے۔"

وہ خاموش رہی مگر اُس کی آنکھوں میں کئی اندیشے سرسرا گئے۔ وہ اس کے چہرے پر رقصاں پر چھائیوں کو بہ غور دیکھ رہا تھا۔ درشت لیچے میں بولا۔ "دیر سے قتل کا معاملہ ہے۔ پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے مجھے ایڑی چونی کا زور لگانا پڑے گا۔ ایسے میں اگر کوئی تمہیں یہاں دیکھ لے گا تو سارا معاملہ بگڑ جائے گا۔ اگر تم مجھ پر اعتماد نہ کرو تو مجھے باہر نکل جانا پڑے گا۔ مجھے پروا نہیں کہ تمہارے ساتھ کیا ہوتا رہا ہے اور کیا ہوگا۔"

وہ سہم گئی۔ جھٹ سے بولی "نہن۔۔۔ نہیں۔۔۔ مجھ پر رحم کریں۔"

"میں رحم کرنے والا کون ہوتا ہوں؟ وقت ضائع نہ کرو، جو کہہ رہا ہوں، وہ کرو۔ اگر تم رحم کے کونسلٹ کو سمجھتی ہو تو جاؤ، وضو کرو، ضرورت سمجھو تو غسل کرو اور رحم کرنے والے سے رحم کی اپیل کرو۔" ڈاکٹر کے لیچ کی خشکی اپنی تمام تر سنگینی سمیت چندو کی سماعت میں اتر گئی۔ اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی سنجیدگی اور سختی کو ایک نظر دیکھتے ہوئے کمرے میں گھس گئی۔ اپنی ہوس کی آبیاری کرنے والے لوگ ہمیشہ انسان کو راہ سے گمراہ کرتے ہیں مگر وہ چندو کو بھٹکانے لگا۔ اُسے خدا کی طرف راغب کر رہا تھا۔

وہ بھی کبھی نظروں سے اس بڑے سے کمرے اور بے ترتیب پڑے ہوئے سامان روزمرہ کو دیکھنے لگی۔ بڑی سی دنڈو، جس کے کئی شیشے نوٹ گئے تھے اور وہاں گتے چکائے گئے تھے، کے قریب چوبی میز پڑی تھی جس پر مختلف ادویات بکھری ہوئی تھیں۔ ایک ساٹھ روہ کرسی بھی قریب پڑی تھی۔ مریضوں کا اسپرنگوں والا بیڈ کتابوں سے بھرا ہوا تھا۔ برقی کوندے کی طرح ماموں رضوان کی بات یاد آئی۔

"مطالعہ کرنے والا بے ایمان اور عالم نہیں ہوتا۔"

زندگی کی کہانی دہرائے چناب کی لہروں سے چھیڑ کر ڈاکٹر منور علی سے جانی، اوقات تک بیان کر دی۔ ڈاکٹر منور شاہ کا حوصلہ ساج دیدی تھا۔ وہ جب تک بولتی رہی، وہ گود میں رکھی ہوئی کتاب سے کھینتا رہا اور لب لبالی کے عالم میں پورے انتہاک سے سنتا رہا۔

رات وقت کے بدن پر تاریخ کی چولی بدل رہی تھی جب وہ دونوں چاندنی کا غسل کرتے ہوئے لب بستہ بیٹھے اپنی اپنی سوچوں سے غرق آواز تھے۔ خاموشی کا طویل دورانیہ ڈاکٹر منور کی بھاری اور قدرے بے تاثر آواز کے ظلم سے ٹوٹا۔ "ہوں! تو تم واقعی دہلی ہو۔ عورت زمانے کو اور زمانہ مرد کو ڈستا ہے جبکہ تمہیں ساتھ جیسے مردوں نے ڈس لیا۔ مگر خیر! یہ کوئی ایسی نئی کہانی بھی نہیں کہ اس پر ماتم کیا جائے۔ تم نے جو غلطیاں کیں، وہ اس عمر کی لڑکیاں عمومی طور پر کرتی رہتی ہیں اور خیال دے سکتی رہتی ہیں۔" چندو نے پھٹکی کی پشت سے آنکھوں کی نمی پونجی۔ امید بھرے انداز میں پوچھا۔ "سرا! کیا آپ میری مدد کریں گے؟"

وہ چونکا۔ "آں۔۔۔ ہاں ہاں! کیوں نہیں۔ مگر مدد کا تعین تمہیں کرنا ہوگا۔" "میں سمجھی نہیں رہی!"

"نہی کہ میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔" "مم۔۔۔ مجھے بھالیں سر۔۔۔ وہ مٹھکائی۔" "کس سے؟" ڈاکٹر کی کڑی نظریں اس پر جم گئیں۔ وہ گڑبڑا کر خالی خالی نظروں سے ڈاکٹر کو دیکھنے لگی۔ "مردوں سے۔۔۔ یہی کہنا چاہتی ہوں؟" ڈاکٹر نے تائید طلب کی۔

اس نے سر ہلایا تو وہ بولا۔ "سنجھتے ہی مرد مرد کرنے لگو گی، پھر؟"

وہ نہ سمجھتے ہوئے حیرانی سے دیکھنے لگی۔ ڈاکٹر نے منہ بنایا، کہا۔ "مگر یہ ممکن نہیں ہے۔ یہاں قدم قدم پر عورتیں اور مرد موجود ہیں۔ سانپوں، کتوں اور بھیڑیوں سے بچا جاسکتا ہے مگر انسانوں سے نہیں۔"

وہ مایوس سی ہو گئی، بولی۔ "مگر جو کچھ میرے ساتھ ہو رہا ہے، ایسا دوسری سب عورتوں کے ساتھ نہیں ہو رہا سر!" "تم کیا یہ سمجھ رہی ہو کہ تمہارے ساتھ لوگ اس لیے کھیلتے رہے کہ تم لاوارث تھیں؟"

اس نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔ "یعنی تم کسی مرد کی پناہ چاہتی ہو؟"

اس نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔ ڈاکٹر کے لبوں سفاک سی مسکراہٹ تیر گئی، بولا۔ "جس سے ڈرتی ہو اس سے تحفظ مانگتی ہو؟"

وہ رو ہلائی ہو گئی۔ "سرا! میں مرنا نہیں چاہتی ہوں۔ زندگی گزشتہ چند مہینوں سے گزار رہی ہوں، اس سے مزید بدرجہا بہتر ہے۔ میں بابا کا گھن کے پاس جانا چاہتی ہوں جانتی ہوں کہ وہ مجھے ایک مل کے لیے گھر میں رکھ لے گا۔ وہ مجھ سے حسنی محبت کرتا تھا، اس سے نہیں رہا۔ نفرت کرنے لگا ہے۔ دنیا میں لوہی ایسا گھر نہیں ہے جسے پناہ مل سکتی ہو۔ میری کوئی بہن نہیں، کوئی بھی نہیں۔ بڑھنا چاہتی ہوں مگر میں بڑھ بھی نہیں سکتی۔ میں گندہ نہیں اچھی لڑکی بنتا چاہتی ہوں مگر لگتا ہے کہ یہاں موت نہیں ہے۔ آپ ہی بتائیں، میں کیا کروں؟"

ڈاکٹر منور علی کی سفاک مسکراہٹ اسے بدن چر ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ سر جھکا کر رونے لگی۔

ڈاکٹر نے غصے بھرے لہجے میں کہا۔ "اے لڑکی! بزدلی ہے۔ بزدل اپنی زندگی بھی گزارنے کے قابل نہیں ہوتے، کسی کے لیے کیا کر سکتے ہیں۔ میں نے تمہارے بارے میں کچھ سوچا ہے۔ ابھی بتاؤں گا۔ پہلے یہ سنو کہ اس کے بارے کیا کرنے کا ارادہ رکھتی ہو؟"

اس نے چندو کے پیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ وہ شرم سے زمین میں گر گئی۔ کمزوری آواز میں بولی۔ "جس طرح یہ اغلیظہ جو کسی عورت کے پیٹ میں رہتا تھا، ایسے ہی میرا پیٹ بھی کسی حرام زادہ کے دل میں بھر دیا گیا ہے۔ جو زندگی میں گزار رہی ہوں، چاہتی ہوں کہ ایسی زندگی کوئی اور نہ گزارے اور سانس لینے سے پہلے ہی مر جائے۔"

"یعنی اب ارش کرنا چاہتی ہو؟" ڈاکٹر کا لہجہ ہر چند سوت بہتر ہے۔

اس نے سر ہلایا۔ "جی سر!" "یہ تو قتل ہوگا۔" ڈاکٹر نے قتل لفظ پر خصوصاً زور دیا۔ "جی سر! مگر میں سوچتی ہوں کہ میرے جیسی زندگی موت بہتر ہے۔"

ڈاکٹر نے پوری شدت سے نفی میں سر ہلایا۔ "میرا اندازہ ہے کہ تمہاری پریکٹسی کی عمر بہ مشکل چار پانچ ماہ ہے۔ اس موقع پر کہے جانے والے ڈی این سی سے، یہ کی پیچیدگیوں پیدا ہوتی ہیں۔ بعض اوقات یہی پیچیدگیوں ہمیشہ کے لیے بانجھ کر دیتی ہیں۔ نہیں لڑکی! میں کسی بھی معروضی حادثات میں اس فیصلے عمل کے حق میں نہیں ہوں۔ جبکہ

تو یہ ہے کہ یہ قتل ہے اور ایک انسان کا قتل پوری حیثیت کے قتل کے مترادف ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ بچے خطا کار نہیں ہے۔ خطا کا رتم ہو یا تمہاری لاش بروجڑانے والے گندہ ہیں جن کے جرم کی سزا بچے کو نہیں دی جاسکتی۔ تیسری بات یہ ہے کہ یہ بچے نہیں کہ جو تم نے گزار دی، وہ اس بچے کا مقدر بھی ہو۔ میری بات سنو گی ہونا؟"

"جی سر! میں سمجھ رہی ہوں مگر لوگ نہیں سمجھتے۔ وہ بچے قتل کے مترادف ہے۔ بچے کی پھولی کہہ کر مذاق اور تہنیک ہے۔ زمانہ اس پر بھی قہقہے لگائے گا۔ لفظ بدل بدل کر بچے کو مارا جائے گا اور میں ایسا نہیں چاہتی۔"

"تم بڑھ کر چاہو، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ گارگر میں غلطی سے روکنے کا ارادہ نہیں ہوں۔" اس کے بچے کی نشی میں بے حد اضافہ ہو گیا۔ "اور تم جہاں جانا چاہتی ہو، وہاں جاؤ۔"

وہ کہہ گئی۔ چند ثانیوں میں وہ کبھی چہرے نظروں میں غم گئے ان سے پیچھا چھوٹ گیا تھا مگر ان کا خوف ابھی تک ان پر مسلط تھا۔ "تم میری مدد چاہتی ہو تو تمہیں وہی کچھ کرنا ہوگا، جو میں چاہوں گا۔"

اس نے کاغذی آواز میں پوچھا۔ "آپ کیا چاہتے ہیں سر؟" ڈاکٹر منور علی کے لبوں پر پھر سفاک مسکراہٹ دکھائی دی۔ "یہاں! میں چاہتا ہوں کہ تم اس بچے کو جہنم دو۔"

چندو کی رگوں میں خون ٹپکھ بونے لگا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سر؟ میرا وجود مجھ پر بوجھ ہے۔ کوئی ٹھور ٹھکانا نہیں ہے۔ میں کیسے۔۔۔"

"میری بات پوری ہونے دو۔ اگر تم میری مرضی پر چلنا چاہو تو میں مدد کروں گا ورنہ نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس بچے کو جہنم دو۔ رہی بات کہ اسے معاشرہ حرام زادہ نہ کہے، تو میں اس کا بندوبست بھی کر سکتا ہوں۔ دنیا والوں کو اس کے بے میں تم سے عقد کر لیتا ہوں۔ گواہوں اور گواہوں کو یہ بتانے کی ضرورت ہی نہیں کہ تم حاملہ ہو۔ اس کے وہاں نام اے دیتا ہوں۔ نہیں نہیں۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم عملی یا شرعی طور پر میری بیوی نہیں ہو گی۔ انہوں اور غیروں کے طعنوں سے بچنے کے لیے یہ جعلی شادی ہوگی۔ جب تک بچہ پیدا نہیں ہو جاتا، ہم خود کو میاں بچی ظاہر کریں گے۔ ڈیووی کے بعد میں تمہیں یہ ظاہر طلاق دے کر آزاد کروں گا۔ اس طرح بچے کو میرا نام مل

جائے گا اور یہ راز میرے سینے میں دفن ہو جائے گا۔ جانتا ہوں کہ تم اس آن دیکھتے بچے سے نفرت کرتی ہو اور ایسا ہونا غیر فطری بھی نہیں ہے مگر قتل غیر فطری اور غیر انسانی عمل ہے۔ میری باتیں سمجھ رہی ہوں؟"

وہ خالی الذہنی کی کیفیت میں اسے دیکھ کر اثبات میں سر ہلانے لگی۔ وہ سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولا۔ "اگر تمہاری نفرت قائم رہے گی تو میں بچہ کی بانجھ گود میں ڈال کر تمہیں اس کے ترس سے نجات دوں گا۔ میرا ایک دوست کی سالوں سے بچہ ایڈاپٹ کرنے کے چکر میں ہے مگر اسے کامیابی نہیں ہو رہی۔ تم سے ملنے کی کے بعد کسی ترسنگ، سکون میں دغہ دلا دوں گا۔ ترسنگ کے کورس کے دوران سرکاری وظیفہ ملتا ہے جس سے زندگی کی گاڑی یہ آسانی چلتی رہتی ہے۔ محفوظ رہاؤں اور چار سالہ کورس کی تکمیل کے بعد یہ آسانی تو کوری بھی مل جاتی ہے۔ جب تم کوئی مناسب سائز کا دیکھ کر شادی کر لینا۔ چونکہ تم اچھی زندگی کی خواہاں ہو، محفوظ رہنا چاہتی ہو اس لیے میں اس طریقے سے تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ چاہو تو ٹھیک، نہ چاہو تو تمہاری مرضی۔"

وہ بھونچکی رہ گئی۔ اسے ڈاکٹر منور علی کی معاملہ فہمی اور منصوبہ بندی پر حیرت آمیز خوشی ہوئی، بولی۔ "سر! آپ بہت اچھے ہیں۔ میں آپ کا احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔" ڈاکٹر نے جواباً آنکھیں موند لیں۔ ایسے میں چندو کی نگاہ اس کی بند آنکھوں پر پڑی۔ بائیں آنکھ نے چونکا دیا۔ جسم کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس نے آنکھیں مل کر دیکھا۔ جو دیکھا تھا، وہی سچ تھا۔ سچ کیا تھا؟ وہی، جو اسے عمر حیات کی حویلی میں ماموں رضوان نے بند آنکھ پر انگلی رکھ کر بتایا تھا۔ یکبارگی چندو کا دل دھڑا اطمینان سے منور ہو گیا۔ لمبی سانس بھینچ چڑوں میں اتاری اور دل میں سر اٹھانے والی تشکیک کے ننھے ننھے کانٹوں نے دم توڑ دیا۔

ڈاکٹر منور علی شاہ نے ایک ذرا توقف کے بعد کہا۔ "تم میرے احسان کو یقیناً بھول جاؤ گی کیونکہ میری زندگی میں تم سے پہلے کئی لوگوں نے احسان فراموشی کی روایت قائم کر رکھی ہے۔ مگر مجھے یہ طلب نہیں ہے کہ تم تمام عمر مجھے جھک جھک کر ملتی رہو یا احسان مندی کے کھوکھلے اظہار میرے منہ پر مارتی رہو۔ میں تمہیں ترسنگ اسکول جوائن کرنے تک اپنے گھر میں برداشت کروں گا اور پھر بھی تمہاری شکل تک دیکھنا نہیں چاہوں گا۔ اگر تم نے اپنا آپ سنبھال لیا تو ٹھیک ورنہ پلٹ کر یہاں آتے کی مہلت نہیں دوں گا۔ تمہارے

ڈاکٹر منس کماں ہیں۔

وہ پوچھی۔ "وہ رات ٹارڈ"

سوچ میں پڑ گئی۔ عمر حیات کی جو بی سے نکلتے ہوئے اس کا جینڈ ایک اس کے ہاتھ میں تھا۔ درست کارڈ اسی پر بیگ میں تھا جو جانے کہاں رہ گیا تھا۔ اس نے فوری طور پر یاد کرنے کی کوشش کی مگر نا کام رہی۔ بے چارگی سے "ن۔" "بٹرک ہارلٹ کا رہا تھا۔ وہ بھی ٹھوکیا۔"

وہ بول۔ "روں مہر یاد ہے؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "جی سہا نہیں سو اکیلوے"

"میں کل اسپتال کو بھیج کر بورڈ سے ڈیپلیٹ کارڈ نکلا، لوں گا۔ اب کمرے میں جا کر سو جاؤ۔ چھوٹے کمرے میں بستر چڑا ہے، ناک۔ وہ رات کے پچھنے پہر میں خاصی سردی ہو جاتی ہے یہاں۔ جب تک میڈ نہ آئے، تب تک میری پیشکش کے بارے میں سوچتی رہنا۔ اور اس اتم بڑھی لکھی ہو۔ اپنے فائدے اور نفع کے بارے میں سوچ سکتی ہو اس سے فیصلہ کر دو گی۔ اس خوف میں مبتلا نہ رہنا کہ میں ان مردوں جیسا ہوں جن سے اب تک تمہارا واسطہ پڑا ہے۔ آئی ایم ڈیفرنٹ میں"

وہ اٹھی۔ چند قدم چل کر رز کی۔ مستفسر ہوئی۔ "سرا میں چائے بنا لوں؟"

"ہاں! مگر صرف اپنے لیے۔" اس نے کہا اور پائنتی پر تکر کے رکھ ہو کھینچ کر تان لیا۔

وہ کچن میں آ کر چائے تیار کرنے لگی۔ اس کا ذہن گنبد بے روزن بنا ہوا تھا جس میں ڈاکٹر منور علی کی بھاری مگر دل میں اترنے کا وصف رکھنے والی آواز چکرار رہی تھی۔ چونکہ اس کے پاس اس پیشکش کو قبول کرنے کے مادہ کوئی رستہ نہیں تھا، اس لیے اس نے کھن میں بیٹھے بیٹھے ہی دل میں اس کو بات ماننے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مگر وہ بچہ چھنے کے حق میں قطعی طور پر نہیں تھی مگر ڈاکٹر منور علی کا عمل رویہ دیکھ کر ناچار آمادہ ہو گئی تھی۔

اس کے ذہن کے نہاں خانوں میں تشکیک سنہو سے کی طرح طہر رہی تھی کہ مباد ڈاکٹر منور علی اس سے شادی کا خواہش مند نہیں۔ اس نے سوچا کہ اگر اب تھا بھی تو کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ وہ وجہ پر کشش اور میرٹھ نہیں تھا۔ بدبو دار لوگوں کے ہاتھوں میں مٹلونا بن کر چکرانے سے اس کا قرب بہتر اور محفوظ تھا۔ وہ بستر میں گر کر جب تک جاگتی رہی، اس نے وہ دنوں میں پیش بندی کرنے کے لیے

نذر سے ہوئے یا مری تخیوں پر کڑھتی رہی۔

اس کو جلد ہی اپنی تنہیک پر شرم آئے تھی۔ والے چند ہی دنوں میں ڈاکٹر منور علی کی نہایت نچوڑاں اس پر آشکار ہونے لگی۔ وہ تھکی ہوئی رہی، اسات تھا۔ اس کے باوجود کہ چند ماہی سے اس دیرس کو رٹر کا نقشہ بدل دیا، لیکن سندھیا یا اور رات سوانی ترتیب سے آراستہ کر دیا، اس نے ایک کچھ کو بہ نظر غور دیکھا اور نہ ہی اس کے انداز آراستہ سے اس کی زحمت کی۔ وہ سپتال سے آ کر سو جاتا یہ مٹائے میں کھن ہو جاتا پھر کھانا کھا کر گئے بندھے اور کے مٹائی ہو جاتا۔

چند ہجرتی دور، ہنی طور پر زخمی تھی۔ ڈاکٹر نے مندرجہ حالت کے پیش نظر چند قوت آور ٹیکے کا وقت کھانے کی گولیاں دیں۔ ڈاکٹر منور علی تو در کچھ داتی استعموں کی اشیاء کی فہرست سے کر بورڈ اسٹینڈ پر اس کی ممبر سائیل ریڈی میڈ میوسات مختلف انواع کے سامان سے لہدی تھی۔ کھن میں مورس اسٹینڈ کرنے کی مخصوص جگہ پر رک کر اس نے چند دفعہ بغیر کہا۔ "میں جعلی نکاح کا بندوبست کر آیا ہوں۔ کچھ جلد ہی یعنی پانچ بجے کے لگ بھگ، شہر جانے کے لیے ہو جانا تاکہ ہمیں اسپتال سے نکلنے کوئی نہ دیکھے۔ ہاں! اٹے! تھو دل دوسرا کمرہ اپنے بے مخصوص کر لو۔"

اس نے جی اچھا کہہ کر موٹر سائیل سے سامان اور شرواع کر دیا۔ پھر گھنٹ بھر حکم کی تعمیل میں جتی رہی۔ کمرہ کی صفائی ستھرائی میں کچھ زیادہ دیر لگ گئی۔ فارغ اور سامان چیک کرنے لگی۔ بالکل اسی انداز میں عمر حیات کے لیے سامان خرید کر شہر کے مکان میں لایا تھا۔ ایسے ہی کورٹ میرج کا بندوبست کرنے گیا تھا۔ وہ صدقیت تھا مگر اس کی ماں نے عین موقع پر پہنچ کر اس کی پانچ گھنٹہ نہیں کر دی تھی۔ عمر حیات نے اسے بڑے ظالمانہ انداز میں پامال کیا تھا مگر آنکھوں کی نمی نے آشکار کر دیا کہ وہ کب تک اس کے دل میں جاگزیں تھا۔ اس کی ادا نہیں پانچ آ دل میں جس پیدا کرنے لگیں تو وہ سفید جھارواں سے سٹ کو سینے سے بھینچ کر سسک پڑی۔ عمر حیات نے آنکھوں سے گولی کھا کر گرتے دیکھا تھا۔ اس کے زمانہ جانے کی کوئی امید نہیں تھی۔ اس وقت اس کی آنکھوں سے کسی طاری تھی مگر آج اس کی آنکھیں کوئی اور وجود کرنے لگی تھیں اس نے۔ وقت تو مہرہ جھنک کر عمر

کی یادوں سے چھپا چھڑا کر سامن کو اشاریوں میں رکھنا شروع کیا۔

اگلے دن وہ ڈاکٹر منور علی کی ہدایت پر علی، اصباح محسن کر کے، نیا لباس زیب تن کر کے شہر جانے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔ ابھی اندھیرا اچھٹ ہی رہا تھا کہ ڈاکٹر اسے موٹر سائیکل پر بٹھ کر اسپتال سے نکل کھڑا ہوا۔ دس پندرہ منٹ کے سفر کا اختتام ایک جدید وضع کے مکان پر ہوا۔ مکان کے باہر ڈاکٹر نور الامین کی سنہری نیم پیٹ نصب تھی۔ کال بیل پر ایک پست قامت مگر فریبی مائل شخصے سروالے شخص نے مین گیٹ کا بگلی دروازہ کھولا۔ ڈاکٹر اور چند کوڈ کچہ کر بقیہ کچہ کے پلٹ گیا۔ چند لمحوں بعد اس نے مین گیٹ کا ایک طاق کھول کر موٹر سائیکل اندر لانے کا اشارہ کیا۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر منور علی اور چند وہی اس کے آراستہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔

میزبان دس پندرہ منٹ بعد چائے کی ٹرے اٹھائے ڈرائنگ روم میں آیا۔ ٹرے میز پر رکھ کر سنجیدگی سے بولا۔ "ڈاکٹر شاہ! تمہیں ایک گھنٹا انتظار کرنا پڑے گا۔ مجھے اسپتال جانا ہے۔ حاضری لگاؤں گا اور واپسی پر تمہارے مطلوبہ افراد کو اٹھا لاؤں گا۔"

ڈاکٹر منور علی نے بھی انداز میں سر ہلایا، کہا۔ "اس بات کا دھیان رکھنا کہ یہ شادی آج ہی ہوگی۔ مگر سرکاری ریکارڈ میں اندراج پانچ ماہ پہلے کی کسی تاریخ میں ہونا چاہیے۔" "مجھے اچھی طرح یاد ہے ڈاکٹر اتم فکر نہ کر دو، وہ اپنی گنجی کھوپڑی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے منہ بنا کر بولا۔

"کام ہونا چاہیے بس" اور ہاں "اس وقت میرے پاس رقم کم ہے کیونکہ خواہ بھی نہیں ملی۔ یہ خیال رکھن۔" ڈاکٹر منور علی کی آواز میں ہلکی سی تشویش کا عنصر شامل تھا۔

وہ سر ہلاتا ہوا ڈرائنگ روم سے نکل گیا۔ ڈاکٹر منور علی نے چائے کا کپ اٹھایا، کہا۔ "یہ میرا کلاس فینو ہے۔ ڈاکٹر نورال امین۔ ہمارا گھوٹا واقعہ حال۔ اسپتال سے واپسی پر نکاح رجسٹرار اور سیکریٹری کو اٹھالے گا اور ہمیں میاں بیوی کے رشتے میں پرو دے گا۔"

یہ جانتے ہوئے بھی کہ ڈاکٹر منور علی محض بچے کو دنیا میں جا ز مقام دینے کے لیے شادی کا سوانح رچا رہا تھا، اس کا چہرہ گل گوں ہو گیا۔ جذبہ تنکر سے معمور نظروں سے انسانی شکل میں بیٹھے ہوئے دیوتا کو دیکھنے لگی۔ وہ بیٹھ بچے میں بولی۔ "کیا دیکھ رہی ہو؟ میں نے کہا تھا میں یہ محض ڈاکٹر ہو گا، تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے بھی

حاصل کے دوران نکاح نہیں ہو سکتا۔"

اس نے آنکھیں جھکا لیں۔ دل میں کہا۔ "سراپہ بہت عجیب انسان ہیں۔ بغض دیکھ کر جسم کے سات پر اس میں چھپی ہوئی باری کو دیکھ لیتے ہیں مگر آنکھوں میں جھپٹ کر دل میں بکھورے۔ سینے والے جذبے کو پہچان نہیں لیتے۔ نصف گھنٹے بعد مین گیٹ کھلنے، دروازہ کی ٹنگ کی سنائی دی۔ ڈاکٹر نور الامین جا رہا تھا۔

ڈاکٹر منور علی نے بارہا واضح کیا تھا کہ یہ شادی محض کاغذی ہوگی، پھر بھی چند کادول تیزی سے دھڑک رہی تھی۔ اس نے کن آنکھوں سے ڈاکٹر کو دیکھا۔ وہ سامنے والی دروازے پر آویزاں لینڈ اسکیپ کی آڑے آڑے رنگوں والے پینٹنگ پر نظریں جمائے کسی سوچ میں مستغرق تھا۔ اس نے کہا۔ "سر! ایک بات پوچھوں؟"

اس نے چند کوڈ کچہ اور آنکھوں سے اجازت لی۔ وہ بولی۔ "آپ کی شادی نہیں ہوئی؟"

اس نے عام سے انداز میں سر ہٹائی میں ہلایا۔ "یوں سر! "اُسے حیرت ہوئی۔ ڈاکٹر کی عمر خاص تھی۔ چند کے نقطہ نظر سے اس کی شادی کم و بیش پانچ سال پہلے ہو جانی چاہیے تھی۔

"اس لیے کہ میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتا۔" ڈاکٹر منور کا لہجہ کسی جگہ سے رکی تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے چند کے اگلے ٹمک سوال کی راہ مسدود کر دی۔ "نوائی ماہ آن دس ٹاپک!"

چند مجبوراً خاموش ہو گئی۔ وہ ڈاکٹر منور علی کی ٹھہر میں مسلسل دلچسپی لے رہی تھی اور اس کے رویے میں جانا دکھائی دینے والا تغیر اُسے حیران کر رہا تھا۔ وہ بیک وقت مہربان اور نہایت خشک طبع انسان تھا۔ چند لمحوں میں آپ مدد کے لائق سمجھ کر پولیس سے بچانے کا فیصلہ کرنا اور فوراً

بہرہ ہو جانا، بچے کی پیدائش پر مصروف ہونا، دنیا میں آنے، بچے کو اپنی شناخت دینے کا تہیہ کر لینا اور بے باغ منصوبہ تیار کر کے عمل پیرا ہو جانا۔ یہ سارے فیصلے اُس کی مصدقہ قوت ارادی کو ظاہر کرتے تھے جبکہ اس کا بے اعتنا رویہ ظاہر کرتا تھا کہ اس کے نزدیک چند مادی کی اہمیت نہ ہو۔

کے برابر تھی۔ یہ تمام واقعات خواب کی طرح چند کوڈ حویل میں ایسے آگے کی طرف سرک رہے تھے، دور دورہ اختیارانہ جیتی جا رہی تھی۔ جن حالات سے دوچار ہو کر ڈاکٹر منور علی تک پہنچی تھی، ان حالات کا تقاضا تھا کہ ڈاکٹر منور اس پر بھروسہ نہ کرتا مگر وہ عمداً کر چکا تھا۔ یہی وجہ

تھی کہ ڈاکٹر منور کی باوقار اور سنجیدہ شخصیت کے حصار سے ٹکٹن کے پس سے باہر ہو گیا تھا۔

ڈاکٹر نور الامین کا، نظر خاصا، اعصاب شکن واقع ہوا تھا جس کا ختام مین گیٹ پر رکنے والی گاڑی کی آواز پر ہوا۔ اتنے چند کوڈ نکاح کی لڑی میں پروئے پر کمر بستہ تھا اور دھڑکتے دل اور جلی ذہن سے ڈاکٹر منور علی کو دیکھ رہی تھی۔ جوتھیں موندے کی گہری سوچ میں مستغرق تھا اور اس کے جب دس کے اعصاب جلد میں تھرک رہے تھے۔

بہت مصروف دن شہر میں گزارنے کے بعد جب وہ اپنے ہنڈیگ میں نکاح نامہ سنبھالے ڈاکٹر منور علی کے ہمراہ کوہر میں داخل ہوئی تو اس کے ذہن میں ڈاکٹر نور الامین سے چند لمحے مسلسل ضربیں لگا رہے تھے۔ اس نے ڈاکٹر منور علی کی عدم موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے رازدارانہ انداز میں سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔ "میں ڈاکٹر شاہ کا ہم راز ہونے کے نامے جانتا ہوں کہ نکاح کے باوجود اُس کا تمہارے ساتھ کوئی رشتہ استوار نہیں ہوا۔ وہ عجیب شخص ہے۔ جو نمی تم کو اس سے ٹکڑی، وہ تمہیں اپنی زندگی سے نکال دے گا۔ میں تمہیں اپنی چھوٹی بہن سمجھ کر سمجھانا چاہتا ہوں کہ تمہیں ڈاکٹر منور سے اچھا انسان اور باوقار سماجی دنیا میں ڈھونڈنے سے نہیں ملے گا۔ بھلے وہ تو نا پھوٹا انسان ہے، انسانوں کا ڈسا ہوا ہے مگر وہ پانی بھی پیتا نہیں چاہتا۔ اگر تم سے ممکن ہو تو اُسے پانی پلا دینا۔ اُسے انسانوں کی دنیا میں لوٹنے پر مجبور کر دینا۔ نہ صرف تمہاری زندگی خوب صورت ہو جائے گی بلکہ دنیا کے اس عظیم مسیحا کو بھی قرار آ جائے گا۔ میری بات سمجھ رہی ہونا؟"

اس نے نہ سمجھتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ وہ مزید قریب ہو گیا، بولی۔ "میرے کہنے کا مطلب ہے کہ تم اس کاغذی شادی کو حقیقی شادی میں بدلنے کی کوشش کرنا۔ اگر وہ تمہیں اپنی بیوی کے طور پر قبول کر لیتا ہے تو سمجھو، تم دنیا کی خوش قسمت لڑکی ہو۔"

وہ شاید کچھ اور بھی کہتا مگر ڈاکٹر منور علی لوٹ آئی۔ منس کر بولی۔ "تمہاری شکل چٹلی کرتی ہے کہ تم میرے خلاف کوئی سازش تیار کر رہے ہو؟"

ڈاکٹر نور الامین جھپٹ کر مسترایا ور کھانا گانے کا کہہ کر موندے سے اٹھ گیا۔

فوری طور پر چند مادی نے اُس کی باتوں کو دل پر نہیں دیا مگر اسے ہر میں مسلسل یہی سوچتی آتی تھی۔ اُسے

ڈاکٹر منور الامین کا مشورہ اچھا لگا۔ ڈاکٹر منور علی جیسے خوش رو اور صاحب مقام شخص کے پاس تا عمر محفوظ اور مطمئن رہ سکتی تھی۔ اچھی زندگی گزار سکتی تھی۔ اس نے بے اختیار عمر حیات اور ڈاکٹر منور کی شخصیات میں موازنہ کیا۔ سوائے جوانی کی شوخیوں کے ڈاکٹر کی شخصیت کا پلڑا بھاری تھا۔ جسکی شدت کے بحرن سے ٹکٹن اور ڈاکٹر منور علی کے سنجیدہ رویے کی بدولت اُس کا اعتماد لوٹ رہا تھا اور وہ صحت مند انداز میں سوچنے لگی تھی۔ چونکہ وہ دنیا میں تہہ تھی، کوئی سہارا نہیں تھا، اس لیے اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ ڈاکٹر منور علی کی زندگی سے طبع سے کر نہیں نکلی گی۔ مجبوراً کی گئی شادی کو ازدواجی خوشیوں میں تبدیل کرے گی۔ چونکہ وہ ڈاکٹر منور علی کے پس منظر اور عادت کی کٹنگنی سے ناواقف تھی، اس لیے اُسے یقین تھا کہ وہ ڈاکٹر کو شوہر بنانے میں کامیاب ہو جائے گی۔

چونکہ وہ شام کا کھانا ڈاکٹر نور الامین کے ہاں کھا کر آئے تھے، اس لیے موٹر سائیکل اسٹینڈ پر گاتے ہی ڈاکٹر اپنے کمرے میں چد گیا۔ چند نے اپنے کمرے کا رخ کیا۔ تھوڑی دیر بیٹھی رہی۔ پھر چائے تیار کرنے کے لیے کچن میں آگئی۔ ٹرے میں دو کپ رکھ کر دھڑکتے ہوئے دل کو سنبھالتی ہوئی ڈاکٹر کے پاس آئی۔ وہ اس کے چائے تیار کرنے تک اپنی چارپائی اور بستر مکن میں نکال چکا تھا اور اب بلب کی بجلی روشنی تھے اپنے مخصوص انداز میں تہ بند اور جین پہنے چارپائی پر نیم وار میٹریا میڈیکا کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اس کے قدموں کی چاپ پر متوجہ ہو کر بولا۔ "گڈ گرل! میں تمہیں چائے کا کہنے ہی والا تھا۔"

چند کو اس کے رویے میں نرمی کا احساس ہوا۔ اس نے تہائی گھنٹی، نرمی اور ایک کپ اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔ اُسے توقع تھی کہ وہ اُسے بیٹھنے کے لیے کہے گا مگر جب وہ اس پر توجہ دے بغیر چائے پینے لگا تو، یوں ہو کر بولی۔ "سر! بیٹھ جاؤں؟"

"اوہ ہاں! کیوں نہیں۔" ڈاکٹر نے پانچ کی طرف اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گئی، بولی۔ "سر! آپ بہت اچھے ہیں۔"

"ہوں!" اس نے چائے کا گھونٹ حق سے اٹا رہا۔ نظریں بہ دستور میٹریا میڈیکا پر مرکوز رکھتے ہوئے بولا۔ "انسان اپنے لباس میں رہے تو ہر دیکھنے والے کو اچھا لگتا ہے۔ جانور بن جائے تو غلط اور بد صورت دکھائی دیتا ہے۔" "سر! آپ اتنے سنجیدہ کیوں رہتے ہیں؟" وہ پوچھنا تو یہ چاہتی تھی کہ "آپ ہر وقت تنے جلے بھنے کیوں رہتے

ہیں؟" مگر حرائت نہ کر پائی۔

وہ چونکا۔ خشک آنکروں سے اسے دیکھ کر بولا۔ ”کیا
میں اس عمر میں بچوں کی طرح اچھل کود کروں؟ بات بے
بات تہقہ نگاہوں؟“

وہ قدمے سہم گئی۔ اس سے باتیں کرنا چاہتی تھی۔
اُسے اپنی جانب راغب کرنا چاہتی تھی مگر شرم سے اندر ہی
اندر کھلنے لگی۔ باوجود کہ یارن خان اور حیدر خان کی بخشش
گفتگو نے اُسے خاصا منہ بھٹ بنا دیا تھا اور اس کے جو جی
میں آتا، بغیر جھجکے بولتی رہی تھی مگر ڈاکٹر منور علی کے سامنے
اُس کا دم گھٹنے لگتا تھا۔ وہ کہنا چاہتی تھی۔ ”سر! اگر مجھے خدمت
سے آپ کی تہذیبی بنائی دیا ہے تو آپ مجھ پر احسان کریں
اور قبول کر لیں۔ میں تمام عمر آپ کی خدمت کروں گی۔“
اس نے کئی مرتبہ اپنے آپ کو پیش کرنے کی کوشش کی
مگر لفظ ہوتوں پر آ کر دم توڑ گئے اور وہ زخ پھیر کر اپنے
چہرے کی غیر معمولی سرخی کو چھپا گئی۔ ڈاکٹر چائے کی تھپے
تھپے گھونٹ حلق میں اتارتے ہوئے اُس کی پل پل بدلتی
ہوئی کیفیت کو تازہ کیا۔ قدرے ترشی سے بول۔ ”چند۔ م
کچھ کہنا چاہتی ہو؟“

وہ سر جھکا کر آہستگی سے بولی۔ ”وہ دراصل۔۔۔ میں
جب سے یہاں آئی ہوں، آپ کو چنتے مسکراتے نہیں دیکھا
اس لئے۔۔۔۔۔“

ڈاکٹر منور کا لہجہ یہ دستورِ ترش تھا۔ ”یہ بات تو میں بھی کہہ سکتا ہوں کیونکہ میں نے بھی آپ تک نہیں مسکرائے تھے دیکھا۔“
وہ گڑبڑائی۔ ”مم۔۔۔۔ میں ایسی نہیں تھی؛ جیسی آپ ہوں۔“
مقدور نے مجھے بے گھر کر دیا ہے۔ بے گھر انسان بے عزت ہو جاتا ہے۔“

”میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کا ہر انسان پیدائشی طور پر بے گناہ ہوتا ہے۔“

”مگر آپ تو بے گناہ نہیں ہیں۔“ چندو نے جاننے کے سے انداز میں کوشش پر طائرانہ نظر ڈالی۔

”یہ گورنمنٹ کی ملکیت ہے۔ جب میں گورنمنٹ کے کام کا نہیں رہوں گا، مجھے نکال یا ہر کر دیا جائے گا۔ جس طرح تمہیں ناکارہ ہو جانے پر پہلے تمہارے باپ کا منہ نے پھر دل پھینک میرا دے فے اٹھا کر یا ہر پھینک دیا۔“ ڈاکٹر منور کا لہجہ بتدریج بے رحم ہو گیا۔ ”مجھے چھوڑو، اپنی فکر کرو۔ تم جب تک یہاں رہنا چاہو، بے شک رہو۔ اینٹوں کے اس ڈھیر کو اپنا گھر سمجھو۔ ہنسو، کھیلو اور موج کرو۔ بوجھ کم نہونے اور اگلا سفر آسان دکھائی دینے تک خود کو مضبوط

کرنے کی کوشش کرو۔ رئیس میں وہی گھوڑا حاضر۔
جو تازہ دم اور صحت مند ہو۔ مطالعہ کا شوق رکھتی
بڑھا کرو، شاعری پڑھ لیا کرو۔ ڈاکٹری ریسرچ
کے علاوہ کچھ بھی نہ کرنا۔ سب سے زیادہ اہم ہے۔ میں سمجھتی
ہوں کہ یہ نکتے ہی تمہیں وہی ماحول ملے گا جس سے
تمہیں کچھ دنوں کے لیے نکال کر لایا تھا اور ایسے کو یہ
ماحول میں اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لیے تمہیں
یا مخصوص مرد کی فلاحی اور سماجی کو سمجھنا ہوگا۔ یہ بات
ذہن میں رکھو کہ کیا آدمی دنیا کو فتح کر سکتا ہے جبکہ
کے چکر میں پڑنے والا ہر موڑ پر ٹک جاتا ہے۔“
وہ یہ ظاہر بڑے اچانک سے ہنسنے لگیں۔
مگر حقیقت وہ نہ توں سمجھ رہی تھی، نہ یہ کہ اس میں
رہی تھی۔ یہ تو کہ یہ مریض نہ سمجھتا اس کے سوال کا جواب
تھی۔ وہ اندر ہی اندر ڈاکٹر نور الدین کے مشوروں پر
رہی تھی اور ڈاکٹر منور کے سامنے اپنا آپ پیش کرنے
لیا۔ مناسب علاج اور ہستیاں ایک بار کر رہی تھیں۔ شاید
نرس کے ہاتھ سے لکھ کر بولی۔ ”سرا کیا اس گھر میں مجھے ہمیشہ
پناہ مل سکتی ہے؟“

”کیا مطلب؟“ ڈاکٹر کا پارہ ایک دم چڑھ گیا۔
 وہ بڑھ کر اٹھی۔ ”چند قدم دودھ ٹوک کر لے آؤ۔“
 ہوس کا پتہ آواز میں ہوا۔ ”مم“ میں تھک جاتی ہوں۔
 میری جی پی ہوتا ہے کہ میں آپ سے پاؤں دھو کر
 ہمیشہ کے لیے مم میں جاتی ہوں کہ میں آپ سے
 قابل نہیں ہوں مگر آپ مجھے سب سے قابل سمجھتی ہیں۔
 ”تم احسان کا بدلہ اس طرح دیکھنا چاہتی ہو؟“
 ”ہیں سر!“ اس کی غیر معمولی آواز سن کر وہ ہلکی
 ”تو پھر اپنی وقت سے نکل کیوں رہی ہو؟“

”مجھ پر رحم کریں سر“ اس کی آواز مدھنی۔
 ”رحم ہی تو کر رہا ہوں جو تمہیں سبھنے کا موقع دے
 ہوں ورنہ اس وقت تم اہرے قتل کے جرم میں قائل ہو۔
 کہو کہ پلو گراماری ہو تیں۔ رحم کرتے ہو۔
 تمہیں اپنے بچے کے قتل جیسے قتل تہا ہے۔
 تمہارے بچے کو دنیا میں اپنا نام دے کر معترف کر رہا ہوں
 تمہیں محفوظ مستقبل دینے کا وعدہ رکھتا ہوں اگر شاید تم
 کلکتہ سے قتل رکھتی ہو، اس کلکتہ کی عورتوں کا مدد
 یہاں موش میں رہ سکتا۔ وقت ناوقت ہونے لگتا ہے۔
 کی رات شاید تمہاری نکلیوں میں بھی پستے ٹپکتے ہیں۔
 مجھ سے وہ سبھا گھنے ٹپکتے ہیں۔“

رہتا۔ جاؤ! جا کر سو جاؤ۔“ ڈاکٹر منور علی کے لفظ لفظ سے آدمی کی گلیں برآمد ہو رہی تھیں اور وہ شرم کے مارے زمین پر گرا رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ساتھ ہی اس نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے کمرے میں جانے کا اشارہ کیا۔

چند دنوں کے شکوہ بھری نگاہ ڈالی پھر احساسِ تفتیک میں
دوب کر نڈھال قدموں سے محسن عبور کر کے برآمدے میں
آگئی۔ چند لمبے ستونوں کے ساتھ کندھا ٹکا بے کھڑی تھیلی کی
پشت سے آنکھیلی پوچھتی رہی پھر آہ بھر کر کمرے میں چلی
گئی۔ جب تک جاگتی رہی، روتی رہی۔ اس دوران ڈاکٹر
منور علی کی غیر معمولی سرد اور نفرت بھری آواز اس کے ذہن
میں چمکاتی رہی اور اسے شدید نوع کی ندامت سے دوچار
کرتی رہی۔ اُس نے سوچا تھا کہ وہ اُس کی پیشکش کو بخوشی
مندی، مجبوراً ہی سہی، قبول کر لے گا مگر اُس کی توقع شیشے کی
طرح ٹوٹ کر آنکھیں زخمی کر گئی۔ اس ناتوانی میں ایک
کمزور سی ڈھارس اُسے سنبھالنے کی کوشش کرتی رہی کیونکہ
ڈاکٹر نورانی نے اُسے یہ بھی کہا تھا کہ وہ آسانی سے
ساتھ لے کر شخص نہیں۔ پتھر دل ہے۔ اس لیے چندو کو بوند
نہیں، پانی کی دھار بننا تھا جو رفتہ رفتہ پتھر کی سل میں سوراخ
کرنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔

زندگی رات گئی بات گئی اس کے فارمولے پر چلتی ہے مگر
 اس کی زندگی اس شام میں بے دردی سے ٹھکرائے جانے
 کے واقعے پر ٹھہری گئی۔ ڈاکٹر منور علی کی دھڑکنی اور سنگ
 دانہ گفتگو جذبات کی بجلی۔ روکے سامنے مزاحم بھی مگر وہ اپنی
 پیش قدمی روکنے کے حق میں بھی نہیں تھی۔ کانگری دہن دینے
 ہی اسے کوشی سے نکلنے اور اسپتال کے احاطے میں گھومنے
 پھرنے کی اجازت مل چکی تھی۔ ڈاکٹر منور نے اس کا تعارف
 سے نہ صرف کر دیا تھا اور مہینے جھڑا دمیوں پر مشتمل

ہسپتال کے عملے نے اُسے اپنے آفیسر کی بیوی کے طور پر قبول بھی کر لیا تھا۔

ڈاکٹر کی ہدایات کے مطابق اس نے بڑے بچے سے
انداز میں عمر رسیدہ ایل ایچ وی اور اس کے شوہر، جو
اسپتال کے مصفااتی حلقے میں ویکسی نیٹر کے فرائض سرانجام
دیتا تھا، کو اپنے بارے میں بتا کر مطمئن کر دیا۔ وہ بدتر بیمار
جسمی اور جسمانی تشدد سے گزر کر یہاں تک پہنچی تھی مگر وقت
بھر میں جسمانی طور پر فٹ ہو گئی مگر روح پر لگے چڑکوں
سے جان چھڑانے میں کچھ زیادہ وقت درکار تھا۔ ماہ بھر
میں معروضی حالات کا تغیر اس کی گم گشتہ قدرتی آب و تاب
کو لوٹانے لگا اور آئینہ اُسے بھر سے خوبصورتی کی بھول
بھیبوں میں ڈالنے لگا۔

اُس نے از خود ڈاکٹر کے قہر میں یوں ملامت کو سمجھ لیا اور اس کی لگن نے کوشش کو گھربنا کر ایسا ماحول تخلیق کر دکھایا کہ کوئی بھی دیکھنے والا بغیر بتائے انہیں میاں بیوی قرآن دے سکتا تھا۔ آدھا دن اسپتال میں اسٹاف کے ساتھ گزارنے کے نتیجے میں ماحضتوں کے دلوں میں ڈاکٹر منور علی شاہ کے بارے پیدا ہوتے والی بدگمانیاں بھی آپوں آپ رفع ہو گئیں مگر چندو کو ہر آنے والے دن میں اپنی ریاضت کے اکارت جانے کا احساس ستانے لگا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ اس کا تمام تر احساس ذمہ داری، محبت آمیز رویہ اور اپنی پرانی روش پر لوٹا ہوا حسن دل کشا ڈاکٹر منور علی کی بے پروائی اور درستی کے محاذ پر نہ صرف پسپا ہو رہا تھا بلکہ اُس کا حوصلہ رفتہ رفتہ مارے تھک کے دم توڑنے لگا تھا۔ وہ نہ جانتے کس ڈھیٹ مٹی کا بنا ہوا تھا کہ اُس پر نہ تو چندو کی جذباتی ٹوٹ پھوٹ کا اثر ہوا اور نہ ہی اُس کے نہ دُکھنے والے آنسوؤں نے اُسے نرم کیا۔ چندو نے اُن گنت مرتبہ ہتھ میں جو تک لگانے کی کوشش کی مگر کئی ذلت آمیز ناکامیوں پر دل برداشتہ ہو کر اُس نے ہتھیار ڈال دیے اور خود کو وقت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

موسم بدلنے ہی ڈاکٹر نے اس کی حالت کے پیش نظر اُسے اسپتال کی عمر رسیدہ اور تجربہ کار اہل ایچ وی صفیہ پروین کی نگہداشت میں دے دیا۔ صفیہ پروین کی معاونت سے وہ اپنی ذات کے نئے داخلی تجربے سے بہ آسانی گزرتی چلی گئی۔ انہی دنوں شہر سے ڈاکٹر نور الدین وقت نکال کر ڈاکٹر منور علی سے ملنے آئے۔ چونکہ ڈاکٹر منور ڈیوٹی پر تھا، اس لیے اس کو چندو سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع مل گیا۔ اُسے دیکھتے ہی وہ رونے لگی۔ ناکامی

پندرہ پر تم ہو گئی۔

وہ بولا۔ ”تمہارا رونا بتا رہا ہے کہ تم ڈاکٹر شاہ کو رام کرنے میں ناکام رہی ہو۔ میں درست کہہ رہا ہوں ناں؟“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ نظریں جھکا کر بولی۔ ”ان کے سینے میں دل نہیں، پتھر رکھا ہوا ہے۔“ ڈاکٹر نور الامین نے اپنے بے بال سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”خیر ایسی بھی بات نہیں مگر..... مگر مجھے حیرت ہے کہ اس پر تمہاری محسوس صورت کا جادو بھی کارگر ثابت نہیں ہوا۔ بتاؤ: تم نے کیا کچھ کیا؟“

چند دنوں نے اپنی کوششوں سے آگاہ کیا، وہ بولا۔ ”تم نے بہت محنت کی مگر یہی کافی نہیں۔ ابھی تم دو چار ماہ ادھر ہی ہو۔ ڈاکٹر شاہ نے مجھے بتایا تھا کہ تمہارے دورانیہ تیسویں ہفتے میں جا رہا ہے۔ ایک ماہ بعد تم زچگی کے مراحل طے کر چکی ہو گی۔ یعنی تم پھر لڑکی بن جاؤ گی۔ تب شاید تم زیادہ بہتر طور پر ڈاکٹر شاہ کو سنبھال سکو گی۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں سر! مجھے اُن سے کوئی توقع نہیں ہے۔“

”مگر میری امید ابھی زندہ ہے۔ تم اگر بہت سے کام لو گی تو مجھے یقین ہے کہ آخر کار کامیاب ہو جاؤ گی۔“ ڈاکٹر نور الامین نے اُسے دلاسا دیا اور ڈاکٹر شاہ پر زیادہ توجہ دینے کی ہدایت دی۔ اس کے جانے کے بعد چند خواہش کے باوجود ڈاکٹر منور علی سے کچھ نہ کہہ پائی۔

ایک ماہ بعد اُسے قدرت نے ایک صحت مند اور خوب صورت بیٹی کی ماں بنا دیا۔ تخلیق کے کرب سے نکل کر ایک ذرا سنبھلی تو پہلو میں لیٹی ہوئی گلا میں بیٹی کو دیکھ کر رونے لگی۔ صفیہ پروین اور ساجد کے گاؤں سے بلائی گئی دانی (دایہ) نے اُسے خاموش کرانے کی کوشش کی، بولی۔ ”بیٹی تو اللہ میاں کی رحمت ہوتی ہے۔ اسے مسکرا کر خوش آمدید کہو ورنہ اللہ میاں ناراض ہو جائے گا۔“

وہ آبدیدہ رہی۔ دایہ نے گال سہلائے، سمجھایا۔ ”ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے؟ اس بار اللہ نے رحمت کی ہے۔ اگلی بار بیٹے کی صورت میں انعام دے کر جوڑی بنا دے گا۔ دیکھو تو سکی! چاند کا گھڑا تمہارے پہلو میں پڑا ہے۔“

تب بھی اس کی آنکھوں میں پیار کی جوت نہ جا گی تو صفیہ پروین نے ہاتھ دھوئے ہوئے حیرت سے کہا۔ ”چندو لی لی! ڈاکٹر صاحب بڑے دل والے آدمی ہیں۔ وہ بیٹی کو دیکھ کر ہرگز ناراض نہیں ہوں گے بلکہ دیکھا، وہ اتنے خوش ہوں گے کہ پھولے نہیں سائیں گے۔ ویسے بھی مردوں کو بیٹی

اچھی لگتی ہے۔ بے وقوف حوریں جرم سمجھ کر بیٹیاں یہ کرتی ہیں۔ یہ رونا دھونا بند کرو اور اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں چاند سی بیٹی دی۔ وہ بھی بے عیب، عطا کر دی ہے۔“ ڈاکٹر منور علی کے دوران کوئی بھی پیچیدگی پیدا نہیں ہوئی۔ اس نے تم آنکھوں سے پہلو میں لیٹی ہوئی بیٹی دیکھا۔ ایسے ہی وقت میں ڈاکٹر منور علی کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے نوزائیدہ بیٹی کو شہر چنایا۔ کن آنکھیں سے، اور ایل ایچ وی کو دیکھا، بولا۔ ”مبارک ہو چندو ماں! ابھی بیٹی بہت پیاری ہے۔ اللہ اس کا نصیب بھی اس کی صورت کی طرح روشن کرے۔“

وہ خالی خالی آنکھوں سے سفید و سیاہ بالوں والے منوجیبہ انسان کو دیکھنے لگی حواس کا محسوس تھا۔ غصہ تھا۔ بیٹی زندگی دلانے والا شخص تھا۔ اس نے چندو کے لیے جو کچھ کر دیا تھا، شاید دنیا کا کوئی مرد بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اُس نے اپنی سادہ، اعتبار اور شخصیت تک کو داؤ پر لگانے سے دریغ نہیں کیا تھا۔ اس کے بدلے میں اُس نے قدرت کے کھسے سے باوجود کچھ بھی حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی حالانکہ چندو اُسے اپنا آپ سونپنا چاہتی تھی۔ وہ بڑی محویت سے بیٹی کو چھو رہا تھا۔ چندو کے ہونٹ لہڑے مگر دل کی بات دل میں ہی چکر کر رہ گئی۔ ”سر! آپ کے سینے میں دل کی جگہ کیا ہے۔“

چندو تب تک ڈاکٹر شاہ کے پروقار، درد دل کش چہرے کو پھل پھل پھل نظروں سے دیکھتی رہی جب تک کہ وہ صفیہ پروین کو دو چار دن تک چندو کا خصوصی خیال نہ کئے، حکم دے کر کمرے سے چلا نہیں گیا۔ دایہ نے اُسے تین دنوں تک سیدھا لیٹے رہنے کا مشورہ دے کر کہا۔ ”لی لی! تین دن اوکھے سوکھے گاں لو اور ایسے ہی لیٹ رہو۔ اگر اٹھ گی، چو پھر وگی تو پیٹ بڑھ جائے گا۔“

دونوں اپنے کام میں بہت تجربہ کار تھیں۔ ڈاکٹر منور علی کا دل سے احترام کرتی تھیں اس لیے انہوں نے تین چار روز تک نہ صرف چندو کی خوراک، دوا اور آرام کا خیال رکھا بلکہ بیٹی کو بھی سنبھالا۔ چوتھے دن شام کو جب اپنے معمول کے مطابق ڈاکٹر شاہ چندو کے کمرے میں آیا۔ دایہ کو ہاتھ کے اشارے سے باہر بھیج دیا اور خود چندو کی چار پائی پر بیٹھ گیا۔ اُس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے نرمی سے بولا۔ ”چندو، ماما! مجھے صفیہ نے بتایا ہے کہ تم بیٹی سے پیار نہیں کرتی ہو۔ شکر ہے کہ وہ انداز نہیں کر سکی کہ تم اپنی بیٹی سے شدید نفرت کرتی ہو ورنہ گریز ہو جاتی۔ پیٹھ پیچھے باتیں بنائی جاتیں اور

پھر اسے مشکل پیدا ہو جاتی۔ تمہیں احساس ہونا چاہیے۔ یہ ان بچوں ہے۔“ اس نے سر جھکا لیا۔ دس میں ایک کنبہ اُنھی۔ ایک بیٹے کے گردن موڑ کر بیٹی کو دیکھا جو برابر میں لیٹی ناٹھیں چلا رہی تھی۔ بولی۔ ”سر! مجھے اپنے آپ سے نفرت ہے، اس کے پیار ہو گی۔“

اس نے جو نہیں دیا۔ ڈاکٹر نے اُس کا دوسرا ہاتھ بھی دھرا۔ بولا۔ ”مجھے یقین ہے کہ تم نے مجھ سے کوئی عہد نہیں کیا تھا۔ تم بڑی نہیں ہو! میں سمجھتا ہوں تم مجھے تمہارے پیار سے ناگوار رہا ہے۔ اسے اٹھاؤ اور پیار کرو۔ یہی سچ ہو کہ تمہارے پاس چند دنوں کی مہماں ہے۔ آج بغیر کھانے چلی جائے گی۔“

وہ چندو تک بیٹھی ڈاکٹر کو دیکھتی رہی پھر ہاتھ پھیرا کر بیٹے کو دیکھنے لگی۔ جھولی میں رکھ کر دیوانہ وار چومنے لگی۔ اس کی ورسٹل دیوانگی میں بدست تھی تو ڈاکٹر نے دھک بھری جھانک پڑائی در کہ۔ ”چندو! ہوش میں آؤ۔ دیکھ نہیں رہی کہ بیٹی رونا رو کر ہلکان ہو رہی ہے۔“

وہ ہوش میں آئی۔ پچھلی پچھلی غمروں سے بھی اپنی بیٹی اور بھی ڈنکڑ کو دیکھنے لگی۔ پچھ تو وقف کے بعد یوں۔ ”سر! میری طرح اس کی تمام عمر بھی۔ وتے ہی گزرتی ہے۔ آج دن رات دیکھ رہی ہوں۔“

ڈاکٹر نے ملتی ہوئی بیٹی کو اُس سے چھیننے کے انداز میں ہاتھ پھیرا کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ ضروری نہیں کہ تمہیں جن حالات سے گزرنا پڑا، وہی حالات اس گڑبگ کو بھی درپیش ہیں۔ بہر حال اس نے تخلیق اس لیے حاصل کیا ہے کہ ہم نوزائیدہ کے بارے میں کچھ بات چیت کر لیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک بے دلا جوڑا ایک بچے کو گود لینا چاہتا ہے۔ وہ میرا دوست ہے۔ میڈیکل کالج میں میرے ہاتھ پڑھتا تھا۔ اللہ نے اُس کی شدید خواہش کے باوجود اس کی دولت سے محروم رکھا۔ چونکہ وہ خود ہی باپ بننے کے قابل نہیں تھا، اس لیے دوسری شادی بھی اُس کے مسئلے کا حل نہیں تھی۔ دو ماہ پہلے اُس نے اپنا تبادلا ملتان سے لاہور کروا کر میرے ساتھ اُس نے رابطہ بحال رکھا۔“

ڈاکٹر نے سر لیٹنے کے لیے رکھا۔ چندو کے چہرے کے کنارے ہاتھ دیکھے اور اپنی بات بڑھائی۔ ”چندو! تم اس بیٹی کا نام ہو۔ ارٹ ہو۔ اس کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا چوراہہ ملتا ہے۔ اس لیے میں تمہارے فیصلے کا خطر ہوں۔ تم

میرے دوست کی ضرورت کو مد نظر رکھ کر نہیں بلکہ اپنے آپ کو سامنے رکھ کر آزاد فیصلہ کرو۔ میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ ہاں! یہ بتانا ضروری خیال کرتا ہوں کہ میں مزید دو تین ماہ تک تمہاری یہاں موجودگی کو برداشت کروں گا۔ تب تک نہ صرف تمہیں پوری طرح سنبھلنا ہے بلکہ نرسنگ اسکول میں ایڈمشن بھی لینا ہے۔ چونکہ نرسنگ کلاس کے دھننے کے لیے شادی شدہ عورتیں یہاں نہیں آتی، غالی نہیں کرتیں، نہ ہی وہاں دودھ پینے کی گنجائش ہے، اس لیے اگر تم ابھی اور خود بخود زندگی بسر کرنا چاہتی ہو تو تمہیں اس ماستا کی قربانی دینا پڑے گی جو ابھی پوری طرح بیدار نہیں ہوئی۔“

وہ مستحیجہ انداز سے ہی طلب ہوئی۔ ”سر! میں آپ پر بوجھ تو ہوں مگر۔“

ڈاکٹر نے بات کاٹ دی۔ ”ہاں چندو! تم مجھ پر بوجھ ہو، یہی سچ ہے کیونکہ مجھے تمہاری موجودگی میں اطمینان ہونے لگتی ہے۔ میں اپنی محدود دنیا میں کسی وجود کو برداشت نہیں کرتا۔ پہلے کی طرح اکیلا رہنا چاہتا ہوں اس لیے تمہیں یہاں سے جلد یا بدیر جانا ہی ہو گا مگر میں چاہتا ہوں کہ میرا تعاون رانگاں نہ جائے اور تم ایک اچھی زندگی گزارنے کے لائق ہو جاؤ۔ تم چاہو تو کسی کالج میں بھی پڑھ سکتی ہو مگر کالج میں پڑھنے کے لیے معقول ماہانہ رقم درکار ہوتی ہے جو میرے بس سے باہر ہے۔ ویسے بھی کالج کے ہاسٹل میں رہائش کا مسئلہ حل تو ہو جائے گا مگر لمبی تعطیلات کے دنوں میں ہاسٹل بند ہوتے ہی تمہیں پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لے دے کے ہمارے پاس صرف نرسنگ کا شعبہ ہی چلتا ہے۔ ایک تو چار سالہ کورس کے دوران معقول ماہانہ وظیفہ ملتا ہے، ہاسٹل کی سہولت حاصل ہے اور کورس کی تکمیل پر سرکاری نوکری بغیر کسی تردد کے مل جاتی ہے۔ مریضوں کے درمیان زندگی کے چین کو قریب سے دیکھو گی تو یہ اعتنا اور مضبوط ہو جاؤ گی۔ پھر اپنے لیے کوئی مخلص سانچا تلاش کر لینا۔“

چندو آنکھوں میں مایوسی کی دیوار چادر سمیٹے ڈاکٹر منور علی کو ایک ننگ دیکھ رہی تھی۔ وہ نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے اٹھا۔ کمرے میں ایک دیوار سے دوسری دیوار تک ٹھٹھا گیا۔ پھر پشت پر ہاتھ باندھ کر ڈاکٹر اور بھاری آواز میں بولا۔ ”مجھے ایسے مت دیکھو۔ تم نے مجھے جتنا سخت مزاج پایا ہے، یقین کرو میں اس سے کہیں زیادہ بد مزاج اور سخت مزاج ہوا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم اس کاغذی رشتے میں حقیقی رنگ بھرنا چاہتی ہو۔ تم یہ بھی سوچتی ہو کہ میں تمہیں تمہاری گناہ

گار زندگی اور اس معصوم بچی کی وجہ سے جی بنانے پر تیار نہیں ہوں مگر یہ سچ نہیں ہے۔ تمہاری جگہ پر کوئی بھی ہوتی تو مجھے ایسا ہی پائی۔ چونکہ میرے نزدیک تمہارا ہونا یا نہ ہونا ایک برابر ہے، اس لیے مجھے اب بھانک حالات سے بھی سروکار نہیں ہے جنہوں نے اس ننھی سی گڑیا کو جہنم دیا۔ ہاں! یہی سچ ہے کہ میں اکیلا رہنا چاہتا ہوں۔ بس!"

وہ آہستہ سے بولی۔ "اگر میں آپ سے کچھ نہ مانگوں اور آپ کو کوئی تکلیف نہ دوں تو؟"

"کہا ناں! یہ ممکن نہیں ہے۔ تم خاموش رہو گی تو تمہاری آنکھیں پونے پونے کیس کی۔ تمہاری جوانی اپنی پذیرائی کا قصہ کرنے لگے گی۔ نہیں چندو! میں سب کچھ انورڈ نہیں کر سکتا۔"

ڈاکٹر منور علی کا بوجھ بے تاثر مگر قدرے اکتا ہوا تھا۔ وہ جواب میں کچھ کہنا چاہتی تھی مگر ڈاکٹر نے اسے کچھ کہنے کی مہلت نہ دیتے ہوئے سلسلہ کلام جوڑ لیا۔ "اس موضوع پر ہم بہت ساری باتیں کر چکے ہیں، اس لیے اب تم صرف یہ فیصلہ کرو کہ بچی کو اپنے پاس رکھنا چاہتی ہو یا گود دینے پر تیار ہو؟"

وہ کچھ دیر تک سوچتی رہی، ذہن لائی ہوئی نظر سے اپنی بچی کو دیکھتی رہی پھر دل پر ہاتھ رکھ کر سسکی۔ "میرے ساتھ کیا ہوگا، میں کن حالات سے گزروں گی، علم نہیں۔ ایسے میں اس ننھی سی جان کی خاک پرورش اور تربیت کروں گی۔ ہم دونوں کے لیے یہی بہتر ہوگا کہ اسے کوئی معقول انسان ایذا پہنچ کر لے تاکہ کم سے کم یہ تو میرے جیسی زندگی گزارنے سے بچ جائے۔ میرا اللہ وارث ہے۔"

ڈاکٹر نے بھی انداز میں سر ہلایا۔ پلٹ کر چندو پر ایک نگاہ ڈالی۔ وہ غم و اندوہ کی تصویر بنی ساکت بیٹھی تھی۔ اس نے قریب آ کر چندو کا آنسوؤں سے تر چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیا۔ اوپر اٹھایا۔ آنکھوں میں جھانک کر پیار سے سمجھایا۔ "چندو مائی! زندگی کسی خوب صورت تخیل کا نہیں بلکہ تکلیف دہ عمل کا نام ہے۔ لہذا پر یکینکل پھڑ ہے جسے حوصلے سے گزارنا ہوتا ہے۔ اب یہ روٹا دھونا بند کرو اور اپنے مستقبل کے لیے بہترین لائحہ عمل تیار کرو۔ دیکھو! میں تمام عمر کا سا مگی ہوں نہ اتنا امیر کہ تمہیں ہر غم سے آزاد کرنے کے لیے نوٹوں میں چھپا کر کہیں رکھ دوں۔ میں مدد تو کر سکتا ہوں مگر میدان میں تمہیں ہی ٹھکانا ہوگا، مجھے نہیں۔ کیا سمجھیں؟"

اس کی آنکھیں بولیں۔ "آپ بہت ظالم اور پتھر دل ہیں۔" لیوں سے لرزتی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔ "سرا! مجھے آپ کی آدمی باتوں کی سمجھ آتی ہے، آدمی کی نہیں اور میں

کبھی آپ کو عقیم انسان سمجھے جاتی ہوں تو کبھی نہیں۔ اور جسک مزاج کٹنے لگتے ہیں۔"

ڈاکٹر کے لیوں پر مخصوص ذہنی منظر ابھرنے لگا۔ دیر کو ابھری پھر معدوم ہو گئی اور وہ کچھ کچھ جھیر نکل گیا۔ چندو نے سنا کہ وہ کیلری میں ڈب ڈب رہا تھا۔ "تم کل تک یہیں رہو گی۔ کل ب شام کی چائے کے لیے آ جائے گی اور تمہارا کام ختم ہو جائے گا۔" دیکھ کر حیرت بھری آنکھیں لگی۔ "یہ بات شرمناک ہے۔" یہ غیر یقینی کا نام ہے۔ نا تجربہ کاری کی وجہ سے عائشہ کو سنسنی نہیں سکتی اس اپنی بڑی بہن کو بیانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ پانچ ماہ بعد میں اپنے پاس لے جائے۔ پانچ ماہ بعد میں آؤں گا۔"

دایہ کی تنکری بھری آواز چندو کے کانوں میں گونجنے لگی۔ آپ کی کر رہے ہیں صاحبہ بی؟ پہلے بچے کی پر ہر عمرت نا شجر۔ کار ہوئی ہے۔ اگر آج وہ بچہ سنبھلے گی تو اگلے بچے کی باری پر پھر نا تجربہ کاری عذاب سے گزرے گی۔

"تم ٹھیک کہتی ہو مگر میں وہی کچھ کروں گا جو مجھے محسوس ہوگا۔" ڈاکٹر کی آواز میں اس کی غصہ محسوس کر آئی۔

"تو کیا بچی ڈبے والا دودھ پے گی؟"

"ہاں! اور میرے خیال میں کوئی حرج نہیں ہے۔" ڈاکٹر نے کہا پھر اس کے قدموں کی چاب پائی۔ کی کہ وہ گھیری سے نکل گیا تھا۔ اس نے اپنے پیچھے پھر سے تو عجیب لگتا ہے۔ وہ تمام دن عورتوں کو دوسرے کہ ماں کا دودھ پینا بچے کا بنیادی حق ہے۔ محروم کیا۔ خدا سخت ناراض ہوتا ہے۔ دایہ حیران تھی کہ اتنا کچھ ہونے کے باوجود ڈاکٹر منور علی خدا کو ناراض کیوں کر رہا تھا۔ تھوڑا سوچا، کچھ میں سمجھ نہ پاتا تو سر جھٹک کر اسے کاغذ مشغول ہو گئی۔ بڑے لوگوں کی اکثر باتیں غریبوں کی باتوں میں نہیں آتی کرتیں۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی عائشہ کے لیے گرم کرنے لگی۔

گرمے میں لیٹی ہوئی چندو مائی نے چور نظر کیا۔ اپنے خفیہ وجود کو دیکھا۔ دل میں چار کی توانا بیدار رہی لیوں سے بے ساختہ سرگوشی برآمد ہوئی۔ "عائشہ! عائشہ! کتنا پیارا نام ہے۔"

اس کی تکیہ دینے والے نے خود بھی تکیہ پڑھا۔

جس جگہ رہتے ہوئے اس سے کوسوں دور تھا۔ وہ قریب کرتے کرتے تھک کر دور ہو رہی تھی۔ یکبارگی ڈاکٹر منور علی کو روک دے کہ وہ اس کی عائشہ کو کسی ن کو دینا نہ ڈالے۔ کوئی آپ اپنی بہن کو نہیں چھوڑے گا۔ پھر خیال آیا کہ اس کے لیوں سے نکلنے والا ایک بعد ڈاکٹر منور علی کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روک دے گا اور وہ بہت بڑے نقصان سے دو چار ہو جائے گی۔

ڈاکٹر منور علی اپنی موٹر سائیکل پر پورے ڈالا گیا۔ ڈاکٹر اللہ امین نے ملنے کے بعد اس نے فون پر اپنے دوست سے رابطہ کیا اور اسے خوش خبری سنائی۔ اس نے اگلے ہی دن اپنے کا اعلان کیا۔ ڈاکٹر منور علی نے مطمئن ہو کر غلام عائشہ کے لیے ڈیویر ساری شاپنگ کی اور لدا پھندا چندو مائی کے کمرے میں داخل ہوا۔

اس دن چندو نے عائشہ کو سینے سے لگا کر خوب پیار کیا۔ بہت سی باتیں کہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ چندو کی بچی اس باتیں کہنے سے سمجھے گی، اس نے اپنا دل کھل کر اس سے سنا سنے رکھ دیا اور اپنی سیاہ بختی پر آخری ٹھک سے۔ عائشہ کو وہ بچے کی باتیں پڑتے، کئی اتارے اور بہت کچھ اس کی خبیث تصویر کی صورت ہمیشہ کے لیے محفوظ کرنے کی کوشش کی۔

جدی فیصلہ نہیں، مرحلہ ہوتی ہے جس سے چندو مائی دو مرتبہ زرخیز تھی۔ گائمن وراثت سے جدا ہونا اس کے لیے نہایت تکلیف دہ تھا مگر وقت کی گزرنے سے دونوں انھوں نے کمر باندھا دیا ہے تھے۔ وہ دونوں یاد دلاتے تھے مگر کھانسی میں پہلی سی چان نہیں رہی تھی۔ عائشہ کی جدائی اس کی زندگی کا تیسرا مرحلہ بن کر ڈاکٹر نفیس بخاری اور نیکم کلقتہ عائشہ کی نسل میں دبیز پڑا گیا۔ وہ شہنشاہی کے لیے تیار تھی۔ ڈاکٹر منور اس معصوم نکل جوڑے کو بے رحم چندو نے سرے میں آ گیا۔ تعریف کے دوران ہی نیکم کلقتہ بخاری نے تحسین اور خواہش کے ہاتھوں مجبور ہو کر عائشہ کو نکال دیا۔ اس کی آنکھیں دھڑ دھڑاتے چمکنے لگیں۔

ڈاکٹر منور علی نے کہا۔ "کلقتہ! یہ میری بیٹی ہے۔ میں ان باتوں کو کہ کس حوصلے سے تمہارے حوصلے کر رہا ہوں۔ یاد رکھو کہ میری چوٹ پر تم اسے ماں بن کر لینے کی۔ عائشہ کی حقیقی ماں بن کر دکھاؤ گی تو مجھے زندگی میں کئی نظریں ہوگا۔ اگر کوئی بھرے پروا کی کا مظاہرہ کرو گی تو خوف میں آؤں گا۔"

نیکم کلقتہ نے کالی حجاب پہن لیا۔ کون نفیس بخاری

نے نہ صرف شکر یہ ادا کیا بلکہ یقین دلایا کہ وہ دونوں ڈاکٹر منور علی کو زندگی بھر شکایت کا موقع نہیں دیں گے۔ چندو سائیں سائیں کرتے دماغ کے ساتھ باری باری کبھی چہروں کو دیکھ رہی تھی، ان کی گفتگوں رہی تھی۔

عائشہ کے سنے والدین اسے بہت اچھے لگے تھے مگر اپنے حلیے سے خاصے امیر اور کلقتہ مزاج دکھائی دینے والے۔ مہمانوں سے ڈاکٹر منور علی کا رویہ واضح طور پر کھنچا کھنچا سا تھا۔ اس نے اپنے مخصوص مدار میں نیکم کلقتہ بخاری کو مخاطب کیا۔ "کلقتہ! میں نے اس کا نام غلام عائشہ رکھا ہے۔ اگر تمہیں پسند ہو تو ٹھیک ورنہ بدل لیتا، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

وہ بولی۔ "یہ نام بہت پیارا ہے مگر میں نے اس کا نام بہت پیسے سے ہی شہرہ رکھ دیا تھا۔ شہرہ بخاری۔"

چندو کا دل مسکائی میں آ گیا۔ آنکھیں جھٹک رہیں۔ کائنیتی ہوئی آواز میں بولی۔ "عائشہ ہو یا شہرہ۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مگر نیکم صاحبہ! میری بیٹی محفوظ رہے گی ناں؟"

نیکم کلقتہ بخاری عائشہ کو ہاتھوں میں اٹھائے اس کے پیلو میں آن بیٹھی۔ عائشہ کو گود میں رکھ کر اسے پیار کرنے لگی۔ کال چوم کر بولی۔ "لوگ تو دعا دینے سے کتراتے ہیں جبکہ تم نے مجھے وہ دوا دی ہے، جسے دینے کا حوصلہ کسی کے پاس نہیں ہے۔ میں اسے زمین پر نہیں، ابھی تنہیوں پر چھوڑ دی۔ اسے تنہیوں سے میں نہیں، اپنی چھاتی پر مارتا گی اور تم دیکھنا، میں اپنی ذات کے روم روم سے چھاتی نکال کر ان پیارے پیارے بچوں پر پھرا کر دوں گی۔"

وہ احسان مندی کے جذبات سے مضطرب ادار میں بول رہی تھی۔ ڈاکٹر منور سے غیظ ہو کر بولی۔ "منو! تم بڑے انسان ہو، ہمیشہ کی طرح تم نے پھر مجھے متروک کر دیا مگر اب کے وہ قرض، جسے میں تو کیا، میری سات پشیمانی بھی اتارنے کے قابل نہیں ہو سکتیں گی۔ کیا اب میں جاؤں؟"

چندو نے اس کا ہاتھ تمام لیا۔ ملتجیانہ انداز میں عائشہ کو اٹھا کر اپنی گود میں ڈالا۔ جی بھر کر یہ رکیا۔ پیدائش سے پہلے عائشہ کا وجود اس کے لیے نہایت تکلیف دہ اور قابل غرت تھا۔ اس نے چوریک دن سے دیکھنے سے گریز کیا تھا مگر چندو نے اس کی جگہ سے اس کے دل میں ایسی جگہ بنا لی تھی۔ بات بات کی تھی۔ چندو نے بڑی سختی سے اپنی آنکھیں بند میں اور بولی۔ "آپ اپنی بیٹی کو کھنچ رہی ہیں۔ قہر سے ہوئی، رشتہ میں اس کی ایک آدھ جھٹک دیکھ لوں گی، ورنہ

اسے یاد کر کے اپنی ماحول کو بے چین کیے رکھوں گی۔“
چاروں کچھ دیر تک عائشہ کے موضوع پر باتیں کرتے رہے، پھر عائشہ کو لینے کے لیے اتنا طویل سفر کرنے والے چند کو تنہا کر کے لوٹ گئے۔

چندو مانی کو ڈاکٹر منور علی کا رویہ بڑا عجیب لگا۔ اس نے نہ تو انہیں کھلے دس سے خوش آمدید کہا تھا اور نہ ہی پھولے مندرات رہنے یا کچھ وقت مزید بیٹھنے کا کہا تھا۔ حد تو یہ تھی کہ اس نے مہمانوں سے چائے پانی تک کا نہیں پوچھا تھا۔ ان کے رخصت ہونے کے بعد ڈاکٹر منور چندو کے کمرے میں آیا۔ اس پر کریدتی ہوئی نگاہ ڈال کر بولا۔ ”چندو! میں نے کچھ غلط تو نہیں کیا؟“

اس نے ہونٹ بھیج کر نفی میں سر ہلایا۔ ڈاکٹر نے دایہ کو اس کے کمرے میں چھوڑا اور چلا گیا۔

چندو کو نیکم شگفتہ بخاری سے رو رو کر کھے جانے والا ڈاکٹر کا رویہ اچنبھے سے دوچار کر رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے بتایا تھا کہ ڈاکٹر نفیس بخاری اس کا دوست اور کلاس فیلو تھا۔ اگر یہ درست تھا تو پھر اس کی بیوی ڈاکٹر منور سے کیوں بے تکلف تھی؟ ڈاکٹر دونوں سے خفا تھا کیوں تھا؟ اگر ڈاکٹر کے دل میں کوئی رنجش تھی یا ان سے کسی معاملے میں اختلاف تھا تو اس نے عائشہ کو ان کی تحویل میں کیوں دیا تھا؟ ان سوالوں کے جواب اسے ڈاکٹر منور ہی دے سکتا تھا جس سے بعید نہ تھا کہ وہ جواب دینے کے بجائے درستی سے جھٹک دیتا۔ عائشہ کی معصوم سی شکل اور رونے کی باریک آواز اسے بے چین کرتی رہی۔ رات کا تنوں پر لوٹ پوٹ ہوتے گزری مگر جب پچھلے پہر سونے کے بعد دن چڑھے جاگی تو حیرت انگیز طور پر مطمئن اور پرسکون تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے دلی طور پر عائشہ کی جدائی کے دکھ سے مفاہمت کر لی تھی۔ آنے والے چند دنوں میں اس کے رویے سے ظاہر ہونے لگا کہ وہ اپنی بیٹی کی حادثاتی جدائی کو ذہن سے محو کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

چاق و چوبند ہوتے ہی اس نے ایک مرتبہ پھر ڈاکٹر منور علی کو اس کی خود ساختہ چٹائی سے نکالنے اور اپنی جانب راغب کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ وہ صدقِ دل سے ڈاکٹر منور کے پاس رہنا چاہتی تھی کیونکہ گزشتہ دورانیہ میں ڈاکٹر کی پروکار شخصیت نے اس کے ذہن پر بڑے گہرے اثرات مرتب کر دیے تھے۔ وہ سوتے جاگتے اسے ہی سوچتی رہتی تھی۔ اس کی یہی ترجیح یہی تھی کہ ڈاکٹر اسے اپنی حقیقی بیوی کی حیثیت دے کر عدم تحفظ کی سلٹی ہوئی آگ سے نکال

لے کر وہ اسے کوئی اہمیت دینے پر تیار نہیں تھا۔ اس میں چندو کا پہلا مسرور کن روپ لوٹ آیا اور سرچڑھ کر کہنے لگا۔ ”حسن! ڈاکٹر کو سنے در سے مضطرب کرنے کا یہ سہوہ۔“
تھی کہ ڈاکٹر کی فصیح جاب میں درازیں نمودار۔ اس نے ڈاکٹر اور وہ چندو سے نظر میں چمکانے اور دور رہنے پر ٹیڑھ لگا تھا۔ کھینچ تانی کا یہ اعصاب شکن سلسلہ تین بار چکر لگا چکا تھا۔ ڈاکٹر کی سنگدل جیت گئی اور چندو اس کے روبرو میں جھلا ہو کر ٹوٹ گئی۔

ڈاکٹر منور علی نے اپنے چلان کے تحت اس کے اشتہارات شائع ہوتے ہی میں مختلف نرسنگ اسکولوں میں چندو مانی کی درخواستیں جمع کرادیں۔ چونکہ اس نے نرسنگ میں پوزیشن لی تھی اس لیے اسے تینوں اسکولوں میں ہی اسے آسانی مل سکتا تھا۔ بغیر کسی تنگ و دو کے ملتان کے نرسنگ اسکول میں بیڈ مشن مل گیا اور ڈاکٹر منور علی اسے لے کر چلا گیا۔ چندو کو ہاسٹل چھوڑ کر اس کے لیے ضروری سامان خریدنے شہر چلا گیا۔ دو تین دن شہر میں رہتے ہوئے اس نے چندو کا اصل اقامتی بندوبست کیا اور ہر طرح سے مطمئن ہونے کے بعد آخری ملاقات کے لیے ہاسٹل پہنچ گیا۔ اس نے ڈھنسی ہوئی شام میں دونوں نرسنگ اسکولوں سے چندو کے ہسپتال کے بڑے سے ان میں آتے سے ملے ہوئے تھے۔ چندو کا چہرہ حزن و ملال سے رقم تھا جبکہ ڈاکٹر منور اور سرخرو دکھائی دے رہا تھا۔ یوں جیسے اس سے سرت کی بوجھ اتر گیا ہو، بولا۔ ”چندو مانی! میں تمہارے لیے ہسپتال سکھاتا تھا، مگر گررا۔ کاش! میرے پاس دینے سے پہلے میں کچھ ہوتا تو دروغ نہ کرتا۔ تمہاری طلب پوری کرے۔“
چندو نے ہوتا تو تمہیں مایوس نہ کرتا۔ بس اب تم دس کو ہر قسم کے شکوک اور میل سے پاک کر کے مجھے الوداع کہو۔ مجھے ڈاکٹر کو دیکھتے ہوئے توقع ہے کہ ہم آئندہ کبھی نہیں ملیں گے۔ اگر قسمت نے کہیں ملایا بھی تو دنیا ہمیں بس وقف کارہ سبھی کی۔ ٹھیک ہے نا؟“

چندو کا گلہ زندہ گیا، بولی۔ ”سرا مجھے پتا ہے کہ تم آپ کے لائق نہیں ہو مگر ایسا بھی کیا ہے کہ آپ نے ہمیشہ کے لیے چھوڑنے لگے ہیں۔ میں آپ سے ملنے چاہتی ہوں۔ مجھے قیسی اجازت تو آپ دے ہی سکتے ہیں ناں کہ کبھی بھی آکر یک نظر دیکھ لیا کروں؟“
ڈاکٹر کا چہرہ ہاتھ اگیا۔ آنکھیں بے تاثر ہوئیں، بولی۔ ”نہیں لڑکی! تم نے میرے ساتھ لگ بھگ ایک سال کا عرصہ گزارا ہے۔ تمہیں یہ خوش فہمی ہے کہ تم مجھے سمجھتی ہو مگر حقیقت

یہ ہے کہ تم مجھے بالکل سمجھ نہیں پاتی ہو۔ تم اچھی لڑکی ہو مگر میں اچھا آدمی نہیں ہوں۔ شاید انسان بھی نہیں ہوں۔ تم میرے ساتھ نہ رہنا چاہتی ہو اور نہ ہی خوش رہ سکتی ہو۔ تم بہت خوب صورت لڑکی ہو۔ ایک تانناک مستقبل جس میں پھول، خوشبو، رحمت شامل ہیں، تمہارا منتظر ہے جبکہ میرے پاس صرف تنہائی ورتند ہوا کے پتھر بھی نہیں ہے۔“

”میں اگر یہ کہوں کہ مجھے تانناک مستقبل نہیں آتا۔ اب ضرورت ہے تو؟“ اس نے ہمت کی اور ڈاکٹر کی آنکھوں میں۔ اور اسے استہزاء تک کر پوچھا۔
ڈاکٹر نے عجیب سے انداز میں مسکرا کر نفی میں سر ہلایا۔
”نہیں چندو! میں تمہارا نہیں بن سکتا، کسی کا بھی نہیں شاید نہ بھی نہیں۔ کوئی اور بات کرو۔“

”سرا میں آپ سے بحث نہیں کر سکتی مگر التجا کرتی ہوں کہ آپ مجھے قبول نہ کریں مگر مجھ سے مل لیا کریں۔“
ڈاکٹر نے پھر نفی میں سر ہلایا، کہا۔ ”نہیں! کہاں ناں کہ چھوڑو اس تہ کرے کو۔ یہ ایک لاکھ روپے کا چیک بکرا۔ قرب و جوار میں کوئی بینک، کچھ کر اپنا اکاؤنٹ کھولا لیتا اور یہ چیک اس میں جمع کروا دیتا۔“

”ماہ زحمت بقیر چندو نے عجیب سے پوچھا۔“ یہ کیا سرا میں اتنی بڑی رقم کا کیا کروں گی؟“
ڈاکٹر نے چیک اس کی جیبلی میں رکھ دیا، کہ۔ ”رکھ لو! تمہارے کام آئے گی۔“
چندو کی آنکھیں ایک لمحہ کے لیے دیوانہ ہوئیں پھر یوں پڑیں۔ کیا یہ عائشہ کی قیمت ہے؟“
ڈاکٹر اس کی آنکھوں سے پھوٹتا ہوا عجب عجب کرلفی میں سر ہلانے لگا۔ سمجھانے لگا۔ ”چھوٹی باتوں سے صرف نظر کر کے بڑی باتوں پر توجہ دینا دانش مندی کہلاتی ہے۔ چونکہ میرا ذاتی خرچ نہ ہونے کے برابر ہے، اس لیے میری ہر تنخواہ سے اچھی خاصی رقم بچ جایا کرتی ہے۔ یہ شاید میرے کسی کام نہیں آئے گی۔ اس میں سے میں نے ایک لاکھ روپے تمہیں دینے کا فیصلہ کیا ہے۔“

”نہیں سرا میں جو مانگ رہی ہوں، وہ دے سکتے ہیں تو میں ورنہ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔“
”کہا ناں! بے وقوف مت بنو اور وہی کچھ کرو جو میں یہ رہا ہوں۔“ ڈاکٹر نے ڈانٹ کر کہا۔ ”کاغذی بیوی کاغذی حقوق بھی رکھتی ہے۔ یہ کاغذ کا ٹکڑا ہے۔ اپنا حق سمجھ کر سنبھالو۔ میں تمہیں کوئی لمبی چوڑی ہدایات نہیں دینا چاہتا۔ اتنی ہی ہدایت کافی سمجھو کہ یہاں تمہارا قدم قدم

پر مردوں سے واسطہ پڑے گا۔ یہ بھی میرے یا ڈاکٹر نور ال من جیسے لوگ نہیں ہیں بلکہ ان میں اکثریت ان کی ہے جن کے چنگل سے نکل کر تم میرے پاس پہنچیں گے۔ وہ ڈاکٹروں کے بہروپ میں بھی ہیں، اسکول انتظامیہ اور مریموں کے روپ میں بھی ہو سکتے ہیں۔ ان سے محتاط رہنا۔ تمہیں چند دن سے سیٹ آپ میں ایڈجسٹ ہونے میں لگیں گے پھر تم اپنی زندگی سے مطمئن ہو کر ماضی کو بھول جاؤ گی۔ یہ دنیا تمہیں پھر سے چھی گئے گی کیونکہ یہ خوبصورت ہے۔ انسان کو لہجہ کر اپنے پیچھے لگا لیتی ہے۔ اب مجھے ہنسی آنکھوں سے گڈ بائے ہو۔

ڈاکٹر ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ چندو کا دل دھک سے رہ گیا۔ سمجھ گئی کہ ڈاکٹر اسے اپنی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکالنے جا رہا تھا۔ ایک کر قریب آئی اور بے ساختہ ڈاکٹر کے چٹائی و جود سے چٹ کر سکنے لگی۔ وہ اتنا نوٹ کر روئی کہ اگر ڈاکٹر منور علی کی جگہ پر کوئی پہنچا ایسا وہ ہوتا تو پچھل جاتا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اسے خود سے علیحدہ کر کے، آنسو پونچھ کے بائے کہتا ہوا تیزی سے لان سے بھٹکا پڑ گیا۔

وہ یہ وقت تمام اپنے کمرے میں آئی۔ منہ ہاتھ دھو کر اپنی روم میٹ ڈریس سے باتیں کرنے لگی۔ دل کو سنبھالنے کے لیے جیو ڈاکٹر منور کی جدائی پر ٹوٹنے لگا تھا۔ ڈاکٹر منور علی نے بالکل درست کہا تھا۔ وہ ڈیڑھ ماہ میں اس ماحول میں رچ بس گئی۔ اسے دنیا اچھی لگنے لگی اور اپنا آپ بھی۔ ڈیڑھ ماہ بعد اس نے اپنے اکاؤنٹ سے کچھ رقم نکال کر ڈاکٹر منور علی سے ملنے کے لیے یورپ والے عازم سفر ہوئی۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر جب چک ستائی کے سرکاری اسپتال میں پہنچی تو یہ روح فرسا خیر اس کی منتظر تھی کہ ڈاکٹر منور علی شاہ اس اسپتال سے اپنا پورا یا بستر لپیٹ کر کسی اور اسپتال سدھار چکا تھا۔ اس نے ڈاکٹر کے نئے ڈیوٹی اسٹیشن کا پتا چلانے کی کوشش کی مگر عملے نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ صفیہ پروین نے صرف اتنا بتایا کہ ڈاکٹر نے چھ ماہ کی چھٹی بھی لی ہے۔ ان چھ ماہ میں وہ کہاں ہوگا؟ یہ اس سمیت کسی بھی شخص کو معلوم نہیں تھا۔

ڈاکٹر منور علی کی جگہ پر آنے والے میڈیکل آفیسر کی رہائش یورپ والے شہر میں تھی اور وہ ڈیوٹی آف ہوتے ہی اپنی کار پر گھر لوٹ جاتا تھا، اس لیے وہ کبھی جس میں چندو نے ڈاکٹر کے ساتھ کم و بیش ایک سال کا عرصہ گزارا تھا۔ مفضل رہتی تھی۔ سرخ اینٹوں، ان کوٹھی کے سامنے روش پر کھڑے ہو کر اس نے حسرت بھری نظروں سے درود پورہ دیکھا اور آہ بھر کر اسپتال سے نکل آئی۔ یہ صورت حال

چندو کے لیے بڑی حوصلہ شکن اور مایوس کن تھی کیونکہ ڈاکٹر منور علی نے اپنے کپے پر عمل کرتے ہوئے اُس سے ہر قسم کا ناتا توڑ لیا تھا۔

اس نے چندو سے ناتا جوڑا بھی کیا تھا؟
محض ایک جھوٹے کاغذ کا رشتہ..... دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکتی ہوئی ایک فرضی دستاویز اور بس.....
اُسے دوسرا دھچکا لگا جب ڈاک کے ذریعے طلاق کا پہلا نوٹس ملا۔ ایک ایک ماہ کے وقفوں سے پتھر نوٹس بھی مل گئے۔ ڈاکٹر منور علی نے اپنا نام اُس کی ذات کی سلیب سے مٹا کر سمجھا دیا تھا کہ وہ بھی ڈاکٹر منور کو یاد نہ کیا کرے۔ یاد کرنے کا حق بھی کھو بیٹھی تھی۔ ڈاک کے لفاظوں پر واپسی کا پتا درج نہیں تھا۔ یونین کونسل وہی تھی جس کے دائرہ کار میں چلک ستاسی آتا تھا۔ چندو جانتی تھی کہ ڈاکٹر چک ستاسی سے رخصت ہو گیا تھا۔ اس لیے وہاں ڈاکٹر منور علی کے پیچھے اس یونین کونسل یا اسپتال میں جانا ضرور نہیں ہو سکتا تھا۔
وہ اگر کسی طرح کھوج نکال کر ڈاکٹر تک پہنچ بھی جاتی تو کیا کرتی؟ وہ ڈاکٹر کو ایک نظر دیکھتے، چندو بھی باتیں سننے اور ناکام لوٹنے کے سوا کچھ نہ کر سکتی تھی۔ پھر وہ بھی بابا کا غمناک اور عمر حیات کی طرح خاص موقعوں پر یاد آنے والا کردار بن گیا اور چندو کا سفر نرسنگ کے مخصوص ماحول میں بغیر کسی زکادٹ کے چلنے لگا۔ اُس کی روم میٹ ذرینہ اختر کی ترغیب پر اُس نے نرسنگ کے ساتھ ساتھ انٹرمیڈیٹ کی تیاری کی۔ میڈم جوزفین نے دونوں لڑکیوں کی مدد کی۔ پھر انہوں نے پرائیویٹ امیدوار کے طور پر امتحان دیا اور اچھے نمبروں میں پاس ہو گئیں۔ ذرینہ ملتان کی ایک مضائقہ جاتی ہستی سے تعلق رکھتی تھی۔ بہت سادہ مزاج مگر پر اعتماد لڑکی تھی۔ وہ حق دیتی نبھاتے ہوئے اُسے چٹیلوں میں اپنے گھر لے جایا کرتی تھی جہاں اُس کا وقت مکمل فضاؤں اور سرسبز کھیتوں میں بہت اچھا گزر رہا تھا۔

چالیس سالہ اسٹاف نرس مس جوزفین اپنی غیر معمولی سیاہ رنگت اور بے ڈیل ڈول جسامت کی وجہ سے ابھی تک کنواری تھی۔ اس کے بقول اُس کی پتھلیوں پر شادی کی دیکھا سیر سے موجود ہی نہیں تھی۔ وہ بہ ظاہر خاصی اکٹڑ مزاج تھی مگر فطریاً انسان دوست واقع ہوئی تھی۔ چندو پر خصوصی توجہ دیتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اُس نے دوران تربیت انٹرمیڈیٹ کی تیاری کرنے میں چندو اور ذرینہ کی مدد کی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ دونوں لڑکیاں اس سلسلے کو آگے

بڑھاتے ہوئے نرسنگ کورس مکمل ہونے تک گرے۔ ڈگری بھی حاصل کر لیں۔

انسان خطا کا پتلا ہے۔ اسے سمجھائے تو اپنائیاں خرچ کر کے برسوں میں کوئی ایک گتہ سمجھ جائے۔ جبکہ بے وقوف بنانے والا چندو کھوں میں اُس نکلتے کوہن اُلوسیدھا کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر منور علی نے چندو کی ذہنی کرتے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا تھا۔ معشرے میں پینے کی کئی باتیں سمجھائی تھیں مگر مس پریشانی چند تھیں باتوں نے چندو کو آپ سے باہر کر دیا۔ اُس فاش غلطی کرتے ہوئے جوزفین پر پناہ ماضی آکر گر رہی تھی۔ اہردی سینے کی احتقانہ خوشی سے مغلوب ہو کر وہ سب بتا دیا جسے اپنے سائے تک سے چھپنے کا حکم ڈاکٹر منور نے دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جوزفین نے اُسے اپنے قریب کر لیا۔ گاہے گاہے اپنی مہربانیاں دکھاتے۔ جوزفین نے کہا کہ گریجویٹیشن کی تیاری کرو۔ نصاب کی تخرید رو۔ چندو نے بلاچوں چراں حکم کی تعمیل کی اور کتب خانے کے لیے شام کو اس کے روم میں پہنچ گئی۔ جب معمول جوزفین کمرے میں ایک نیم دراز تھی۔ اپنے ہنڈ میں بٹھا کر سرسری انداز میں کتابوں کا جائزہ لیتے گی۔ ہر کر یوں۔ ”ہاں! یہی ہماری یونیورسٹی کا نصاب ہے۔ اسے میں انگریزی کے سیکٹ پر ہے۔ اگر تم اس مضمون پر قابو پاؤ تو بھجوز ڈگری ہاتھ لگ گئی۔ زیادہ تر اسٹوڈنٹس ہی مضمون میں پس ہو جاتے ہیں۔ باقی تمام کورس اتنا سہا ہے کہ اس کا ہونا یا نہ ہونا ایک برکت ہے۔“
”مگر یہ آپ شیل سیکٹ؟“ چندو نے ایک کتاب ہاتھ کر دکھاتے ہوئے حشکرانہ انداز میں پوچھا۔
”عربی؟“

”جی میڈم! میں نے تو عربی پڑھی ہی نہیں ہے۔“
”تمہیں گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ مضمون مضمون نہیں ہے۔ اس میں صرف وہی امیدوار ملے گا۔ جو کمرائے امتحان میں غیر حاضر ہوتا ہے۔“
”پچانوے نمبر پہ آسانی مل جاتے ہیں۔“ جوزفین نے دال دیا۔ کچھ دیر اُسے بڑی دلچسپی آمیز نظروں سے دیکھتی رہی پھر قدرے آہستہ آواز میں یوں۔ ”شکر ہے کہ آج تمہارے ساتھ رہ رہیں گی۔ تم نے مجھے اپنی زندگی کے بارے میں بنا کچھ چھپائے بتایا تھا۔ تب سے میں اپنی چھپائی بہن سمجھنے لگی ہوں۔ بہت سی باتیں تم سے چھپتی تھیں مگر موقع نہیں مل رہا تھا۔ آج مل گیا ہے۔“

”جی میڈم! میں نے تو عربی پڑھی ہی نہیں ہے۔“
”تمہیں گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ مضمون مضمون نہیں ہے۔ اس میں صرف وہی امیدوار ملے گا۔ جو کمرائے امتحان میں غیر حاضر ہوتا ہے۔“
”پچانوے نمبر پہ آسانی مل جاتے ہیں۔“ جوزفین نے دال دیا۔ کچھ دیر اُسے بڑی دلچسپی آمیز نظروں سے دیکھتی رہی پھر قدرے آہستہ آواز میں یوں۔ ”شکر ہے کہ آج تمہارے ساتھ رہ رہیں گی۔ تم نے مجھے اپنی زندگی کے بارے میں بنا کچھ چھپائے بتایا تھا۔ تب سے میں اپنی چھپائی بہن سمجھنے لگی ہوں۔ بہت سی باتیں تم سے چھپتی تھیں مگر موقع نہیں مل رہا تھا۔ آج مل گیا ہے۔“

جوزفین نے غیا موضوع چھیڑا تھا۔ چندو دیدے پازے اُسے دیکھ رہی تھی جو کل تک نرس، دین کے کردار کی تشریفیں کرتے نہیں تھکتی تھی۔ آج تصویر کا بھیا تک زرخ بڑی بے دردی سے دکھا رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں اُس کی زبان کا ماتھو دے رہی تھیں۔ چندو نے استعجاب آمیز سہجہ میں کہا۔
”میڈم! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ اگر آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ میں نرسنگ کا شعبہ چھوڑ دوں تو میرے لیے یہ ممکن ہی کس طرح ہوگا؟“
جوزفین کچھ دیر سوچتی رہی۔ کہہ نہ کہے، فیصلہ کرتی رہی پھر یوں۔ ”چندو مائی! ہر ہاتھ ملانے والا دوست نہیں ہوتا اور جو دوست ہوتا ہے اُسے ہاتھ ملانے کی احتیاج نہیں ہوتی۔ ایسا ہی ایک دوست مجھے بھی قسمت نے دے رکھا ہے۔“
”جس گیلانی۔“ مجھ سے آٹھ دس سال چھوٹا ہے پر حیثیت میں بہت بڑا ہے۔ پارس ہے۔ جانتی ہو کہ پارس کیا ہوتا ہے؟ نہیں..... بتاتی ہوں۔ پارس اُس پتھر کو کہتے ہیں جسے چھوٹے والا ہر دو جوان بن جاتا ہے۔ اجمل جس کو چھوٹا مسافر کہتے ہیں۔ میں کافی دنوں سے تمہیں اُس

”جی میڈم! میں نے تو عربی پڑھی ہی نہیں ہے۔“
”تمہیں گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ مضمون مضمون نہیں ہے۔ اس میں صرف وہی امیدوار ملے گا۔ جو کمرائے امتحان میں غیر حاضر ہوتا ہے۔“
”پچانوے نمبر پہ آسانی مل جاتے ہیں۔“ جوزفین نے دال دیا۔ کچھ دیر اُسے بڑی دلچسپی آمیز نظروں سے دیکھتی رہی پھر قدرے آہستہ آواز میں یوں۔ ”شکر ہے کہ آج تمہارے ساتھ رہ رہیں گی۔ تم نے مجھے اپنی زندگی کے بارے میں بنا کچھ چھپائے بتایا تھا۔ تب سے میں اپنی چھپائی بہن سمجھنے لگی ہوں۔ بہت سی باتیں تم سے چھپتی تھیں مگر موقع نہیں مل رہا تھا۔ آج مل گیا ہے۔“

اپنی بات دیواروں سے بھی چھپانا چاہتی تھی جی رازداری سے بولنے لگی۔ چند دماغی ایک ایک لفظ سنبھال کر ذہن میں محفوظ کرنے لگی۔ چند منٹوں کے لیے آئی تھی۔ سوا گھنٹہ گزار چکی تھی۔ ابھی کچھ دیر اور بیٹھنا تھا۔ جب مس جوزفین کی اجازت پا کر کمرے سے نکلی تو اس کے پاؤں گیلری کے پھسلو فرش پر نہیں پڑے تھے بلکہ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ہواؤں میں اڑنے لگی تھی۔ اپنے روم میں پہنچی تو زور سے براہیچہٹ پایا۔ وہ برہمی سے پوچھنے لگی۔ "کہاں چلی گئی تھیں تم؟ آج پھر ہم بیس میں دیر سے بیٹھیں گے اور ٹھنڈا کھانا زہر مار کریں گے۔"

وہ کتابیں الماری میں رکھتے ہوئے بولی۔ "میں میڈم کے کمرے میں گئی تھی، کتابیں چیک کر داتے۔"

"پھر کیا کہا اس نے؟"

"سوائے ٹیسٹ پیپر کے، سب 'او' کے ہیں۔ ٹیسٹ پیپر بدلوانے کے لیے ہمیں پھر گھنٹا گھر بازار کا چکر لگانا پڑے گا۔"

چند دنوں نے منہ بنا کر کہا۔

"نہیں۔ اور قریب میں ایک بک سینٹر ہے۔ وہاں سے بدلوا لیں گے۔" زور نے کہا۔ "فی الحال حیرت وقت ضائع کیے بغیر کمرے سے نکلو۔ برا حال ہے کیونکہ آج دوپہر کا کھانا بھی گول ہو گیا تھا۔ یقین کرو، بھوک کے مارے میرے سر میں شدید درد ہونے لگا ہے۔"

دونوں کمرالاک کر کے بیس کی طرف چل پڑیں۔ کھانے کے دوران چند عدم تواجہی سے زور نے کی باتیں سن رہی تھی اور "ہوں" اور "ہاں" میں جواب دینے پر اکتفا کر رہی تھی۔

اس کے ذہن میں جوزفین کی باتوں نے جو طوفان بپا کیا تھا، وہ اسے پوری طرح اپنی تندی کے حصار میں جکڑ چکا تھا۔ اسے سوچنے اور فیصلہ کرنے کے لیے ایک رات کی سہلت ملی تھی جو یقیناً بہت مختصر تھی۔ جوزفین نے سختی سے کہا تھا کہ اگر وہ علی الصباح اسے کوئی جواب نہیں دے گی تو وہ انکار سمجھتے ہوئے اس موضوع کو پیش کے لیے بغیر رشوت کی قابل کی طرح داخل دفتر کر دے گی۔ انسان کی سرشت میں رنج اور آگے بڑھنے کی طلب کسی نہ کسی حد تک موجود ہوتی ہے۔ باوجود کہ چند دماغی کو کوئی مالی پریشانی لاحق نہیں تھی، مستقبل بھی محفوظ دکھائی دے رہا تھا مگر جوزفین کی دکھائی ہوئی راہ پر چل کر وہ راج کمار بننے کے لیے پوری سنجیدگی سے توجہ رہی تھی۔ وہ عدم تحفظ اور احساس کمتری کے حصار میں گھس گھس چکی تھی مگر راج کی مدد کا اس کا دل بھی نہیں

چھوڑتا۔ ڈاکٹر منور علی شاہ نے اسے سختی سے سنبھال کر ناک کی سیدھ میں چلتی رہے اور کبھی امیر ہونے سے شادیت کٹ راستہ اختیار نہ کرے مگر جوزفین کی پیشکش ڈاکٹر کی تمام چند نصائح پر پانی پھیر دیا تھا۔

روم میں پہنچ کر اس نے سردرد کا بہانہ کیا اور سر پر کمر باندھ کر لیٹ گئی۔ دل ہی دل میں میڈم جوزفین کی ہوتی کہانی کو دہرائے لگی۔ کہانی کی جزئیات کو ذہن میں کر وہ اس اوکھلی میں سردینا چاہتی تھی کیونکہ جانتی تھی کہ ایسے بل پر سے گزرنا تھا جو اس کے پار اترتے ہی ہو جائے گا اور واپسی کا راستہ مسدود ہو جائے گا۔

گیلائی طور مل کا مالک اکمل گیلانی سیلف سیز تھا۔ اندرون شہر کی تنگ و تاریک گلیوں سے اپنی محنت و مافی صلاحیتوں کے بل بوتے پر نکلنا اور ٹھوکر کھانے شہر کے کاروباری حلقے میں اپنا اعتبار قائم کرنا کامیاب ہو گیا۔ اس نے عملی زندگی کا آغاز غنہ مندوں سے قریب اجناس کی پھڑی لگا کر کیا۔ تول اور قیمت میں مارے ہوئے فخر سے اسٹھ کر ایک چھوٹی سی کال میں بیٹھا اور بروکر بن گیا۔ زیادہ پڑھا لکھا نہ ہونے کے باوجود خاصا حرب زبان واضح ہوا اور اس کا کاروبار بڑھ پانی میں کی بنیاد پر روز افزوں ترقی کرتا گیا۔ دولت کی برکھابست لگی۔ چند ہی سالوں میں وہ نہ صرف غلہ منڈی کا مسرور آڑھتی بن گیا بلکہ اس نے ملتان کے ایک مضائقاتی میں اپنی فلور مل بھی لگائی اور آٹے والے چند روموں میں نے خاصی شہری جائیداد بھی بنائی اور پچاس ایکڑ زرعی اس کا مالک بھی بن گیا۔

اکمل گیلانی کی شادی اس کی چچا زاد سے ہوئی تھی۔ بچے بھائیوں سمیت اس کا پورا خاندان، بھی تنگ اندرون کی عسرت زدہ گلیوں کی کوٹھڑیوں میں مقیم تھا اور محنت مزدور کے ساتھ ساتھ چھوٹی موٹی واردتیں کر کے پیٹ پاتا تھا۔ اپنی تمام تر بد قسمتی اور محرومی کو اکمل گیلانی نے غرتہ انتقامی سوچ کی مالا میں پروتا رہتا تھا۔ اکمل کے سر پر بھی کم و بیش یہی حال تھا۔ اس نفرت کو ہمیز کرنے میں گلی کے کوتاہیوں بھرے مزاج کا بھی برابر کا حصہ تھا۔ دولت ن رمل چل میں وہ آگے بڑھتا گیا اور اس نے پیٹ کر چا خاندان اور بہن بھائیوں کی خبر تک نہ لی۔ اگر کوئی اس سے ملنے کے لیے اس کی تین کنال کی جہڑی سڑک کی کوٹھی پہنچ بھی تو اس کے ہات آ میزروب کی بدست اس کا گھر میں گرے۔ رفتہ رفتہ وہ نہ صرف اپنے گھر سے

پس اس کا نام سننے ہی رشتہ داروں کا خون یکبرگی کھول اٹھتا

دور دور سے بھر کر اسے مغالطات سے نوازتے۔

پس اس کا اٹھوتا بیٹا تھا۔ باپ کی مدیم الفرستی اور اس کی بیماری نے اسے بچپن میں ہی تنہائی پسند، مغرور اور منہ مزاج بنا دیا تھا۔ جیب خرچ کے نام پر اس کی جیبیں ہاتھوں سے بھری رہتی تھیں۔ نوٹوں کا شہرہ پر سوار رہتا جس کی وہ بے وہ دن بدن بگڑتا چلا گیا۔ بسٹر کے دور ن ہی اس نے خیم کو خیر باد کہہ دیا اور ادواش دوستوں کی محبت میں شراب نوشی کا عادی ہو گیا۔ باپ نے چہا کر فلورسز کے معاملات میں بیٹے کی معاونت حاصل کرے اور اسے کاروباری رموز و قواعد سے روشناس کرے مگر اجمل نے چند دنوں میں ہی اس کا کٹا کر ٹھیکہ دکھا دیا اور اپنے من چاہے معمول میں چلا گیا۔

دولت اور جائیداد کی ہوس شر کا باعث بنتی ہے۔ شر کا سودا اکمل گیلانی کے بھائیوں اور پیدا اس قسم کے سببوں کے سروں میں ساگر پروان چڑھ چکا تھا۔ اکمل گیلانی اور اس کی بیوی اور بیٹے کی موت سے وہ تینوں خاندان کروڑ پتی ہو گئے تھے۔ موت اپنے وقت پر آتی ہے مگر آنکھوں پر ہوس کی پٹی باندھ لینے والے فطرت کے قوانین سے ٹکرانے سے بھی باز نہیں آتے۔ ان تینوں نے اکمل گیلانی، جواں سال بیٹے اجمل گیلانی اور بستر نشین بیوی کو ٹھکانے لگانے کا منصوبہ بنایا۔

وہ اپنے خویش منسوبے پر عمل پیرا ہوئے اور چاند رات کو سلاخ ہو کر گیلانی ہاؤس پر حملہ آور ہو گئے۔ چونکہ چاند رات کو گھر کے بھی ملازمین اور چوکیدار چھٹی پر تھے، اس لیے ان کے پاس سے ہتھیاروں کو خون مل گیا۔ اکمل گیلانی اور اس کی اہلیہ کو بے بسی کی موت مارنے کے بعد انہوں نے اجمل کی تلاش میں پوری کوٹھی چھان ماری مگر وہ نہ ملا۔ وہ اپنے ادواش دوستوں کے ہمراہ شاٹنگ سینٹروں کی آوارہ گردی پر نکلا ہوا تھا۔ چاند رات میں اکمل جیسے بھڑوں کی چاندی ہو جاتی ہے۔ چاندی اس کی جان بچانے کا سبب بن گئی۔

اجمل زندہ تو بچ گیا مگر اپنے مشن میں جزوی طور پر ناکام ہونے والوں نے مدی بن کر اسے اپنے ماں باپ کے ہمہ تن مل کے الزام میں حوالات بھجوا دیا۔ پولیس کا ہیٹ بھرا تو انہوں نے اجمل کی پولیس فائل پر قے کر دی۔ چونکہ دھرمے مل کی اس بھیا تک واردات کا کوئی معنی شاہد نہیں تھا، اس لیے جمل کو ہی اپنے والدین کا قاتل قرار دیا گیا۔

موقف اختیار کیا تھا کہ اجمل کا باپ اسے ہر وقت برے کاموں سے روکتا تو کتنا تھا اور ان دنوں اس نے اس کا جیب خرچ بند کر دیا تھا جس پر اجمل نے مشتعل ہو کر دونوں کو ٹھکانے لگا دیا۔

اس کے جمل جاتے ہی تینوں حصہ داروں نے تمام جائیداد اور کاروبار کے حصے بانٹ لیے۔ دور کا وہ دور ہو گئی تھیں۔ ایک رکاوٹ باقی تھی۔ اگر اجمل باہر ہوتا تو اسے بھی ٹھکانے لگا دیا جاتا مگر وہ قانون کی تحویل میں تھا اور اسے قانون کے ہاتھوں مروانا ضروری تھا کیونکہ اجمل کی زندگی میں وہ لوٹی ہوئی دولت کے مالک نہیں بن سکتے تھے۔ اجمل کو سزائے موت دلوانے کے لیے انہوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ بیسایانی کی طرح بہایا اور قانون کو ٹھکی میں لیے کر اسے تختہ دار کا حق ثابت کر دیا۔ اجمل کے پاس نہ تو پیسا تھا، نہ جائیداد اور نہ ہی اس کے گیس کی پیروی کرنے والا کوئی غم خوار تھا، اس لیے وہ مقدمہ ہار گیا۔

وہ بچپن سے ہی منہ مزاج تھا۔ ناکر وہ جرم کی یادداشت میں ملنے والی بدنامی اور موت کی سزائے اس کا خون کھوٹا دیا اور اس کے روم روم میں انتقام کی آگ بھردی جو نکلنے کا راستہ تلاش کرتی رہتی تھی۔ وہ جیل سے نکل کر اپنے ماں باپ کے قاتلوں کے گرد نہیں مایا چاہتا تھا مگر سمجھ رہا تھا کہ ان تک پہنچنا ناممکن کی حد تک مشکل تھا۔ جانتا تھا کہ اسے مختصر عرصے میں وار پر لٹکا دیا جائے گا۔ اچھے وقتوں کے دوست آڑے وقت میں کنارہ کر گئے تھے۔ سارا پیسا مقبول باپ کے اکاؤنٹس میں جمع تھا۔ اس سمیڑی کے سبب وہ ہائی کورٹ میں اقل بھی دائر نہ کر سکا۔

ہر جانب سے مایوس ہو کر وہ سلاخوں سے سر ٹکرانے لگا تھا، چہنچے جلانے لگا اور بعید نہ تھا کہ بلیک وارنٹ آنے سے قبل ہی پاگل ہو جاتا یا مرجاتا مگر انہی دنوں اس کی ملاقات جیل میں عمر قید کاسٹے والے ایک نامی گرامی ذکیت سے ہوئی۔ وہ ہر کسی رنگ آلود قفل کھولنے میں مہارت رکھتا تھا۔ اس نے اجمل کی ملاقات جیل سے کروادی۔ جیلر اس گاؤں کا رہنے والا تھا جس گاؤں میں اجمل گیلانی کی پچاس ایکڑ اراضی واقع تھی۔ وہ بہت ذرخیر اور مہنگی زمین تھی۔ ذکیت سے ملنے والی معلومات نے جیلر کی آنکھیں چند میا دیں۔ اسے اجمل کے معروضی حالات سے کوئی سروکار نہیں تھا بلکہ اس کی ہوس بھری نگاہیں اس کی زرعی اراضی پر جم گئیں۔ ذکیت نے تھرڈ مین کا کردار ادا کیا اور ان کے درمیان قے کے عوض اجمل کو آزادی دلانے کا معاہدہ طے

کہیں آپ زندگی کی حقیقی خوشیوں سے

دور تو نہیں، انسان کے پاس سب کچھ ہوا اور ساتھ ہی خاص پوشیدہ پیچیدہ اعصابی کمزوری میں مبتلا ہو۔ ایسی زندگی صرف بے رونق، بے لطف، ناممکن ہی ہو سکتی ہے۔ زندگی کا اصل مزہ اور لطف حاصل کرنے کے لیے خاص پوشیدہ طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ شادی شدہ ہیں یا غیر شادی شدہ، آج ہی ہم سے فون پر بات کر کے بذریعہ وی پی پارسل

خاص اعصابی کورس

منگوائیں یا خود تشریف لائیں

الرحمن غوثیہ دواخانہ

168A - بلاک 1، گلی نمبر 1، شہباز ٹاؤن، فیصل آباد

0322-6506989

وقات فون دلائقات 10 بجے تا رات 8 بجے

مستقل بیمار تھی، اس لیے اُسے اپنی زندگی کو سیراب کرنے کے لیے جو زمین جیسے تھوڑا کرکٹنگ کی احتیاج تھی۔ وہ بھاری بھاری زمین خرید کر رازداری سے محبت کے چند لحظات خرید کر عیدنی کی گود میں ڈال دیتی تھی۔ اجمل کیلانی سے تعلق کی رعیت تھی جیونہ بھی تھی۔

چند کو اُس کے کردار پر مہمن آ رہی تھی مگر اس کی پیشش درمنسوے کی طرف دل کھینچ رہا تھا۔ جو زمین نے اُسے کہا تھا۔ "پندو اتم کتنے مردوں کی خواب گاہ میں جا چکی ہو؟ یاد کرو، تمہارا کیا بگڑ گیا؟ کچھ بھی تو نہیں۔ اور تو اور؟" تم بڑی اور ایک بچی کی ماں بھی بن چکی ہو مگر تمہاری معصوم عقل دیکھ کر کوئی بھی یہ بات سچ ماننے کو تیار نہیں ہوگا۔ پہلے کی طرح یہ شادی بھی محض کاغذی کارروائی ہے۔ وہ مرنے والا ہے اور تمہیں اپنی مرضی سے چھوٹنے کی قدرت بھی نہیں رہتا۔ فرض کیا وہ تمہاری ایک رات حاصل کر بھی لیتا ہے تو کیا بگڑ جائے گا؟ وہ کوئی گناہ تو نہیں کرے گا، نہ تم۔ اور یوں یہ سودا گھٹنے کا نہیں ہوگا۔ بنا ہاتھ پیرو ہائے کروڑوں کی جائیداد تمہاری جھولی میں آج کرے گی۔ ہے ناں؟" جب اُس نے یہ باتیں سنی تھیں، جب اُسے بڑی لگی تھیں مگر رات کے اس پہر میں اُس کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ جو زمین نے کچھ بھی غلط نہیں کہا تھا۔ واقعی قسمت ایسے سہرے مواقع بار بار نہیں دیتی۔ اُسے بھی پناہ منشی جھوٹ گئے گا۔ عمر حیات کی حویلی خواب تھی۔ حویلی میں چند دن کا مہمان بن کر آنے والے ماموں رضوان خواب تھا، خواب گر تھا، چد گیا۔ اس نے چندویں دنیا میں تبدیلی لانے والے جس رات کر کا تذکرہ کیا تھا، وہ ڈاکٹر منور علی تھا۔ آیا اور آ کر چد بھی گیا۔ جاتے ہوئے زندگی گزارنے کا ہنر دے گیا۔ وہ ہنر آ رہا تھی مگر اب سبز باغ دیکھتے ہوئے بھٹکنے لگی تھی اور جو زمین کے صاف و شفاف تعلق کو مد نظر رکھ کر مرنے ہوئے شخص کی انتہائی سوچ سے قائمہ اٹھانے کا سوچ رہی تھی۔ ماموں رضوان نے جس شخص کا تذکرہ کیا تھا، شاید وہ اجمل کیلانی ہی تھا۔ بستر پر کروٹیں بدل رہی تھی۔ نیند کوسوں دور تھی۔ خوابوں کا دل افزاء سلسلہ جاری تھا اور پھر اُس نے دولت کے حصول کے لیے شاربث کٹ اختیار کرنے کا آدھا فیصلہ کر لیا۔ بقیہ آدھے فیصلے کا انحصار اجمل کیلانی سے ہونے والی ملاقات پر تھا۔

۱۹۵۱ء سے سوئی تھی۔ دیر سے جاگی۔ زورینہ یونیفارم پہن کر جا چکی تھی۔ اُس پر کسٹمدی سوار تھی۔ انگڑائیاں لیتی ہوئی گاڑی چلی۔ آگے تھیں۔ دروازے میں جانے کو جی نہ چاہا

ڈرتا نہیں تھا مگر احتیاطاً ن سے بچ کر چلتا تھا کیونکہ ان سے خون سے ہاتھ نہیں رنگنا چاہتا تھا۔ کچھ ہی عرصہ میں اس سے نام کی دھاک شہر میں پھیل گئی مگر تب تک مسلسل شراب نوشی کی عادت نے اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا تھا۔ اُسے مردوں کا ضعف لاحق ہو گیا تھا جس نے سال بھر میں ہی اُسے تھوڑا سا رکھ دیا تھا۔ اس نے ابتدا میں اس بیماری کو اہمیت نہیں دی مگر جب گردوں کا جال بواور داس کی برداشت سے باہر ہو گیا، کمزوری نے اعصاب میں شدید شکست و ریخت بھروسہ تو وہ شہر کے جدید بچی اسپتال منتقل ہونے پر مجبور ہو گیا۔

وہ دیکھنے میں تندرست، مضبوط قد کا ٹھٹھا، کھانسی پر کشش مرد تھا مگر شراب نوشی نے اُسے اندر ہی اندر مہلکی طرح چاٹ لیا تھا۔ دو تین مرتبہ ڈائلاسر کے مرحلے سے گزرنے کے بعد مزید نحیف ہو گیا۔ اس کے متوالوں نے گردوں کے حصول کے لیے بہترے ہاتھ پاؤں مارے۔ مگر والہ شکی جس پر اجمل کا علاج کرنے والے ڈاکٹر نے اس کی زندگی کے سوال پر فنی میں سر ہلا کر دعا کا مشورہ دے دیا۔ ان دنوں وہ بستر مرگ پر اپنی آخری سانسیں نکالنے پر مامور تھا اور ڈاکٹر کی رائے کے مطابق وہ ہفتے بھر سے زیادہ عرصہ نکالنے والا نہیں تھا۔

جو زمین نے اجمل کیلانی کی رام کہانی تمام تر جزئیات سمیت سنانے کے بعد اُس کی طرف دیکھا اور کہا تھا۔ "چند ماہ میں اُسے بچپن سے جانتی ہوں۔ وہ شہزادوں کی طرح زندہ رہا۔ بہادری کی طرح قانون کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولتا رہا چرجیل سے نکلنے کے بعد بجلی کی طرح اپنے دشمنوں پر ٹوٹا۔ وہ مر رہا ہے۔ اُسے بچا نہیں جا سکتا۔ یہ بات وہ خود بھی جانتا ہے بھی شان سے مرنے چاہتا ہے۔ موت کی دہلیز پر کھڑا ہے مگر تم جیسی کسی خوب صورت لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اب تم یہ پوچھو گی کہ مرنا ہوا شخص ایسا کیوں کرنا چاہتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اپنی تمام تر جائداد، جو بلاشبہ اس وقت کروڑوں میں ہے اس کی زندگی سے بھرپور ایک رات خریدنا چاہتا ہے۔ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے خاندان کا کوئی شخص اس کی جائداد سے ایک دھیلا بھی حاصل نہ کر سکے میں نے تمہیں بتایا ناں کہ وہ بہت متمتع مزاج و رفیوس بنیاد پر زندگی بسر کرتے رکھنے والا انسان ہے۔"

چند دنوں جو زمین سے یہ لمبی پوچھا تھا کہ اس کا جو زمین سے کیا تعلق تھا؟ جو زمین نے بتایا کہ وہ اُس کے باپ کا عیدنی کی دوست تھی۔ چونکہ اُس کی بیوی

یا گیا۔ قانونی موٹو کاغذوں کا احیان رکھتے ہوئے پہلے تو اجمل کی سزائے موت کے خلاف اپیل ہائی کورٹ میں دائر کر لی گئی، جیلر کے کسی رشتہ دار کے نام اجمل نے زمین حق کرانی پھر اُسے بیمار ظاہر کر کے ڈی ایچ کیو اسپتال میں ریفر کر دیا گیا۔ یہیں معاہدے کی دوسری شرط پوری کرتے ہوئے اجمل کو اسپتال سے زندگی اور دشمنوں کے پیچھے بھاگنے کا موقع دے دیا گیا۔

وہ خطرناک اشتہاری مجرم تھا۔ موت کے منہ سے نکل کر کھلی فضا میں سانس لے رہا تھا اور دل ہی دل میں اپنے رشتہ داروں کو مخاطب کر کے کہہ رہا تھا۔ "ایک ذرا انتظار۔ پھر ایک الٹا کچھ بھی زندہ نہیں بچے گا۔" اُسے پہلے شک تھا کہ اس کے ماں باپ کے قتل کے پیچھے اس کے چچاؤں اور ماموؤں کا ہاتھ تھا کیونکہ اس کے مقدمے میں وہی تینوں مدعی بنے تھے۔ پھر جب اسے پتا چلا کہ اس کے باپ کے ترکے پر انہی لوگوں نے قبضہ کر لیا ہے تو اس کا شک پختہ یقین میں بدل گیا۔

چونکہ وہ مفرد مجرم تھا؛ قانون کو مطلوب تھا اس لیے چھپ کر زندگی گزارنے پر مجبور تھا۔ اپنے دشمنوں پر شب خون مارنے کے لیے جرائم کی دلدل میں اتر گیا۔ وہ غیر معمولی ذہین اور دلیر تھا۔ اس نے چند ہی دنوں میں اپنے ارد گرد جرائم پیشہ لوگوں کا ایک گروہ مجتمع کر لیا جو کوئی نوع کی وارداتیں کرنے میں مہارت رکھتا تھا۔ اس نے ان مختلف ہنر میں یکساں لوگوں کو ایک تنظیم کی شکل دے کر جدید طرز کا کریمنل گینگ بنایا پھر ایک ماہ کے قلیل عرصے میں ہی اُس نے تینوں رشتہ داروں کو ایسی منصوبہ بندی کے تحت زمین میں اتار کر وہ قانون کے شکنجے میں آنے سے بچ گیا۔

اپنے خاندان کے قاتلوں کو ٹھکانے لگانے کے بعد اُس نے در پردہ رہتے ہوئے اپنا کاروبار، فلور مل اور تمام جائداد کو اپنے منجھر کی تحویل میں دیتے ہوئے ایک طرف وارداتوں کا سلسلہ جاری رکھا جبکہ دوسری طرف اپنے کیس کی قانونی پیروی شروع کر دی۔ اب وہ نہتا نہیں تھا، اس لیے جب دونوں ہاتھوں میں نوٹوں کی گندیاں اٹھائے انصاف کے بازار میں نکلتا تو اُسے ہر کوئی پرسان حال اور معاون ملا۔ ہر دفتر کا دروازہ اُس پر کھلتا گیا، ہر ماتھے کی چورباں کھلتی گئیں اور وہ چھ ماہ کی جدوجہد کے بعد مکمل بریت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

اجمل نے اپنے جن چچاؤں اور ماموؤں کو قتل کیا تھا، ان کی والدین تک کی ناپ اُس کے خون کی پیاسی تھیں۔ وہ

ایسے میں سوچ کی سوئی اچھل گیلانی پر جا اٹکی۔ وہ کیا تھا؟ کیا وہ واقعی مرنے جا رہا تھا؟ ان سوالوں کا جواب اچھل سے ملنے لگا۔ جوزفین نے اسے بتایا تھا کہ وہ آنے والے دو تین دن ڈیوٹی پر نہیں جائے گی بلکہ اچھل کو زیادہ سے زیادہ وقت دینے کی کوشش کرے گی۔ چند دنوں کے بعد مقرر کیا اور جوزفین کی طرف چل دی۔

جوزفین نے دیکھا کہ سوچی ہوئی آنکھیں اور ستا ہوا چہرہ چندوں کی تفکرات بھری شب کی کھٹ سنا رہا تھا۔ اس کے استفسار پر چندوں نے اچھل گیلانی سے شادی کی تیم رخصت مندی ظاہر کی تو اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ فوراً مسرت سے چندوں کو بانہوں میں بھر کر چومنے لگی۔ اس کی معاملہ بھی اور قوت فیصلہ کو سراہتے ہوئے حوصلہ افزائی کرنے لگی، بولی۔ "چندو جانا! تم مقدور کی سکندر ہو۔ یقین کرو! اچھل دل کا بہت اچھا ہے۔ ہائے کاش اس کی موت نہ مل جائے، کسی دشمن کو آجائے اور اسے تمہارے حسن کی پذیرائی کی مہلت مل جائے۔ وہ زندہ رہے گا تو تمہیں دس کے سنگھاسن پر بٹھائے گا۔ مر جائے گا تو تمہیں ملکہ بنا کر اپنی راج دھانی سوئپ جائے گا۔"

چندو مایہ سر تمام کر بیٹھ پر بیٹھ گئی۔ جوزفین کی شرارت بھری باتیں سن کر ان سنی کرتے ہوئے بولی۔ "مگر میں اسے دیکھنے کے بعد حتمی فیصلہ کروں گی۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہمارا نکاح عدالت میں ہوگا اور اس سے پہلے اچھل کی جائیداد میرے نام منتقل ہوگی۔ یہ نہ ہو کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے رشتہ دار اور وراثت کے حقدار مجھ سے سب کچھ چھینیں۔ میں کوئی بھی رسک لینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔"

جوزفین نے اسے گہری نظروں دیکھا پھر پر جوش انداز میں یقین دلایا کہ وہ جیسا چاہے گی، ویسا ہی ہوگا۔ کچھ دیر کی باتوں کے بعد جب چندو کمرے سے نکلنے لگی تو جوزفین نے پیار سے روکا، مسکرا کر کہا۔ "ہم سہ پہر کو اچھل سے ملنے کے لیے جا رہے ہیں۔ ویسے تو تم اتنی حسین ہو کہ تمہیں کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں مگر ہلکا پھلکا میک اپ کر لینا۔ اور ہاں! تمہاری روم میٹ کو اس معاملے کی بھنگ نہیں ملنی چاہیے ورنہ گڑبڑ ہو جائے گی۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اپنے کمرے میں آ کر بغیر ناشتا کیے بیڈ پر بیٹ گئی۔ اس نے زندگی میں معمولی نوعیت کی غلطیاں کی تھیں جن کی بھیا تک سزا پائی تھی۔ دودھ کی چٹائی تھی اور چھاپا چھوٹا پھونک مارنے پر مجبور تھی۔ ایسے میں اس کے خوبصورت ہونٹ نفرت سے سکڑ گئے۔ بڑبڑانے

لگی۔ "میری ہر غلطی کی زیادہ سے زیادہ سزا وہی ہے۔ میری پہلی مرتبہ عمر حیات نے دی تھی۔ میرے ساتھ زیادہ سے زیادہ وہی ہو گا جو یارن، افراسیاب اور جانوہر بھیڑیوں نے کیا تھا۔ تب کیا ہو گا؟ اب کیا ہو گا؟ پانچویں نہیں پہنچے میں کمزور تھی۔ جس کا بس چلا، اس نے آواز موز کر رکھ دیا۔ اب میں نادان ہوں نہ ہی کمزور۔ گزشتہ برسوں میں تو اچھل اور میڈم جوزفین پر حسرت میں واپس آ جاؤں گی۔"

پہلی اڑان بھرنے والے ہر بوٹ میں سچی چھلانگ لگاتا ہے مگر پھر زندگی بھر جھوٹے میں اوستہ کی طاقت نہیں رکھتا۔ اس نے بھی آنکھیں بند کیں اور غمو سے سے چھلانگ لگا دی۔

پانچ بجے جوزفین کے ہاتھ شہر کی مصروف شاہراہ آسماں کو چھوٹی ہوئی نئی اسپتال کی عمارت کے بارکنگ میں رشتہ سے اتری تو اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ یہی لمبی سانسیں لے کر خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس نے زندگی میں دوسری بار اسپتال دیکھ رکھے تھے۔ سہ ماہی کرتی تھی کہ دنیا کے سبھی اسپتال ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اسپتال کے آؤٹ ڈور کاؤنٹر پر رگ کر ارد گرد، کیسٹن سے بہ خیال بدس پڑا۔ یہ اسپتال ٹی وی اور فلوئورسٹک دکھائے جانے والے فایو اسٹار ہوٹلوں سے کسی طور پر نہیں تھا۔ یہاں مڈلی درآؤٹس کا معیار بہت ہی تھا۔ اچھل گیلانی کا وی۔ ٹی پی کمرہ اچھی منزل پر تھا۔

نفت کے ذریعے فوراً فلوئور پر پہنچیں۔ میڈیسن کے آؤٹ کمرے میں آئیں۔ مردے کی طرح بیڈ پر لیٹے ہوئے پچھلے چہرے والے مریض کے دونوں اطراف دو بزمیں اور یہ ڈاکٹر کھڑے تھے۔

وہ جوزفین سے جڑ کر چھٹی ہوئی بیڈ کے قریب آئی۔ متذبذب انداز میں مریض کو دیکھنے لگی۔ وہ یقینی طور پر اچھل گیلانی ہی تھا۔ اس کے چہرے پر موت کی رونا چھائی ہوئی تھی۔ ایک نظر دیکھتے ہی چندو کو جھجھکی آئی اور اس نے غیر ارادی طور پر رخ پھیر لیا۔ ایسے ہی جوزفین کی متشکر آواز کانوں میں پڑی۔ "ڈاکٹر صاحب کیا یہ ہوش میں ہے؟"

"ہیں مگر اس کی حالت مسلسل بگڑ رہی ہے۔" ڈاکٹر نے پیشہ دارانہ بے تاثر لہجے میں کہا۔ زندگی اور موت کا کھیل چندو مایہ کے لیے نہیں تھا۔ اس نے کئی انسانوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے مل

دیکھا تھا۔ نرسنگ کے شعبے میں آتے ہی اسی کھیل سے اس کا مستقبل واسطہ پڑا تھا۔ اس کے سامنے جیتا جاگتا انسان زندگی زندگی پارتا ہو موت کی تھک گھبراہٹ چلا جاتا تھا۔ مرنا ہو شخص اچھا تک سنبھل کر موت کے غم میں نہ جھجھکا۔ وہ جاتا تھا۔ میڈیسن کی کا پیشہ انسان کو غیر معمولی طور پر مضبوط و رستہ دل کر دیتا ہے۔ وہ بھی مضبوط بن کر آئی تھی مگر اس کمرے کے درود یوار سے سیب کی طرح ٹوٹی ہوئی موت نے اس کے عصاب کو جھنجھکا کر رکھ دیا تھا۔

یہ وقت تمام اس نے اپنی ہمتیں یکجا کیں۔ کھیل کمرے میں گردن تک چھپے ہوئے اچھل کو دیکھا۔ اس کی ادھ بھلی آنکھیں جوزفین پر جمی ہوئی تھیں اور ہوں پر شکست خوردہ سی مسکراہٹ تیر رہی تھی۔

ڈاکٹر نے نرسوں کی معاونت سے اپنا کام مکمل کیا اور جوزفین کو ہمدردی بھری نظر سے دیکھ کر چلا گیا۔ جوزفین نے نرسوں کو کچھ دیر کے لیے باہر بھیجا۔ پھر اچھل پر جھکی اور پیشانی پر بوسہ ثبت کرتے ہوئے پیار سے بولی۔ "کیسے ہو میری جان؟"

"تم آگئی ہو تو دو چار گھنٹہ یاں اچھی گزر رہی ہیں گی۔" "ہوں۔ آج میں تمہارے لیے بہت بڑی خوشخبری لائی ہے۔ تمہاری بہن، صوفیائی ہوں۔ دیکھو۔ اسے چند سبب آفتاب کو یا چند سبب مہتاب دیکھنے سے میلی ہوئے تھی ہے۔ اس شہر میں تو کیا، پورے ملک میں حتیٰ خوبصورت لڑکی نہیں ہوگی۔"

یہ کہہ کر جوزفین نے چندو کا ہاتھ پکڑا اور کھینچ کر اچھل کے سامنے کر دیا۔ اس کا دعویٰ بجا ثابت ہوا۔ اچھل کی آنکھیں یکبارگی کھل گئیں۔ ایک ٹک دیکھتے ہوئے اپنی دہلیز جاں تک آنے والی موت کی صدا کو بھول گیا۔ کمزوری اور میں بولا۔ "آں ہاں! اتنا تم ٹھیک کہتی ہو جوزی ڈیئر۔ مجھے اسکی ہی لڑکی چاہیے تھی۔ دودھ کی طرح پاکیزہ پھول کی طرح تازہ مگر کیا یہ مجھ سے شادی پر تیار ہے؟"

"تو کیا ایسے ہی اٹھالائی ہوں اسے؟" جوزفین نے ہنسنے لگا۔ "یہ بہت مغرور ہے۔ کسی کو منہ نہیں لگاتی۔ ڈاکٹر تو رہے، ایک طرف، نرسیں بھی اس سے بات کرنے کو ترستی تھیں اور بڑی مشکل سے تمہارے لیے رام کر رہی ہیں۔"

چندو اور اچھل ایک دوسرے کو پکلیں جھپکے بغیر دیکھ رہے تھے۔ چندو اسے پچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ غیر ارادی طور پر اس کے تھوڑا سا قریب ہوئی۔ بائیں آنکھ کو دیکھا۔ اچھل

کی نیم باز آنکھیں ایک لمبے کو بند ہوئیں۔ اپنی آنکھ پر ماموں رضوان کی انگلی کا مس جاگا اور اسے اچھا ٹک تیزی سے پہلو میں دھڑکنے لگا۔ موت کی بانہوں میں جھونے والے کی ہائیں آنکھ پر ایک ننھا سیاہ تل جھنگار پڑا تھا۔

ماموں رضوان نے کہا تھا کہ ایک بادشاہ اس کی زندگی میں گھڑی، دھڑکی سے لیے آئے گا ورنہ سہارا دے کر چلا جائے گا۔ مرنا اور جانا ایک برابر ہوتا ہے۔ یعنی ماموں رضوان کا کہا پورا ہونے والا تھا۔ اس نے خوشانی بتائی تھی۔ وہ موجود تھی۔ اس نے اپنی آنکھ پر انگلی رکھ کر سرگوشی کی طرح سب غلطیوں اور کیا تھا۔ اس لفظ کی بازگشت ذہن میں ہتھوڑے مارنے لگی۔ دل یقین کے ساتھ اسے سمجھنے لگا کہ وہ جسے دیکھ رہی تھی، وہ اس کو ہر فکر سے آزاد کرنے والا ہی تھا۔ اچانک اس کی سوچ کی تابانی فرد ہو گئی۔ دس اندیشوں سے بھر گیا۔ ڈاکٹر منور علی کا چہرہ جسم تصور میں سج گیا۔ اس کی بند آنکھ پر ایسا ہی تل تھا۔ ماموں رضوان نے ایک شخص کا کہا تھا۔ اگر وہ ڈاکٹر منور تھا تو وہ اپنے جسے کام کر کے منظر سے ہٹ گیا تھا۔ اگر وہ مطلوبہ شخص نہیں تھا تو اس نے کیوں سہارا دیا تھا؟ اگر وہی تھا تو پھر اچھل کی آنکھ پر تل کا نشان کیوں تھا؟ شش دہائی میں بڑھے ہوئے قدم بے جان ہونے لگے۔ دو قدم پیچھے ہٹ کر یہ غور جھل دیکھا۔ اس کے چہرے کا غیر معمولی پیلا پن دیکھ کر اس پر ترس آیا۔ جوں عمری میں موت کو گلے لگانا دیکھنے والوں کے لیے تکلیف رساں ہوتا ہے۔

ایسے میں اچھل نے آنکھیں کھول دیں اور بے چارگی سے معمور لہجے میں چندو سے مخاطب ہوا۔ "میں اچھل گیلانی ہوں۔"

"جی امیں جانتی ہوں۔" وہ آہستہ سے بولی۔ "کیا تم یہ بھی جانتی ہو کہ میں دو چار دنوں یا دو چار

نہوں کا مہمان ہوں؟" "مجھے میڈم نے آپ کے بارے میں تفصیلات سے بتا دیا ہے۔" اس نے کہا۔ اچھل کے پہلے چہرے پر زیادہ دیر نظر میں ثبت رکھتا دل گردے کا کام تھا۔ "اخبار میں آئے روز گردوں کی غیر قانونی منتقلی اور چوری کی خبریں چھپتی ہیں۔ کئی گروہ یہ کام باقاعدگی سے کر رہے ہیں۔ آپ اتنے میرے ہوتے ہوئے بھی ایک گروہ خرید نہیں پائے۔ حیرت کی بات ہے۔"

اچھل کے بجائے جوزفین نے جواب دیا۔ "ہاں! اس معاملے میں میرا دوست بدقسمت ثابت ہوا۔ اس

یہ ہے کہ وہ ایک نیا پاکستان بنائے۔

کی جی ہو جائے۔ سیکسیا ہے۔

ہو اور ایڈووکیٹ کے طور پر جانے پہچانے والے ہیں۔

خوزمین کے تحت کردہ اصل ۱۰ دھاپا چکر بورڈ میں لکھیا گیا تھا۔

ادھوری سے یونٹہ اکل اکل کر پیدار کے نام سے جلیقہ خان ہے۔

لوالف وارا خانہ عالی ہے۔

کراؤ گھروں کے لیے بہت قابل ہیں۔ یہ ہیں۔

1978

1993/94

[illegible]

1997, 1998, 1999, 2000, 2001, 2002, 2003, 2004, 2005, 2006, 2007, 2008, 2009, 2010, 2011, 2012, 2013, 2014, 2015, 2016, 2017, 2018, 2019, 2020, 2021, 2022, 2023, 2024, 2025, 2026, 2027, 2028, 2029, 2030, 2031, 2032, 2033, 2034, 2035, 2036, 2037, 2038, 2039, 2040, 2041, 2042, 2043, 2044, 2045, 2046, 2047, 2048, 2049, 2050, 2051, 2052, 2053, 2054, 2055, 2056, 2057, 2058, 2059, 2060, 2061, 2062, 2063, 2064, 2065, 2066, 2067, 2068, 2069, 2070, 2071, 2072, 2073, 2074, 2075, 2076, 2077, 2078, 2079, 2080, 2081, 2082, 2083, 2084, 2085, 2086, 2087, 2088, 2089, 2090, 2091, 2092, 2093, 2094, 2095, 2096, 2097, 2098, 2099, 2100, 2101, 2102, 2103, 2104, 2105, 2106, 2107, 2108, 2109, 2110, 2111, 2112, 2113, 2114, 2115, 2116, 2117, 2118, 2119, 2120, 2121, 2122, 2123, 2124, 2125, 2126, 2127, 2128, 2129, 2130, 2131, 2132, 2133, 2134, 2135, 2136, 2137, 2138, 2139, 2140, 2141, 2142, 2143, 2144, 2145, 2146, 2147, 2148, 2149, 2150, 2151, 2152, 2153, 2154, 2155, 2156, 2157, 2158, 2159, 2160, 2161, 2162, 2163, 2164, 2165, 2166, 2167, 2168, 2169, 2170, 2171, 2172, 2173, 2174, 2175, 2176, 2177, 2178, 2179, 2180, 2181, 2182, 2183, 2184, 2185, 2186, 2187, 2188, 2189, 2190, 2191, 2192, 2193, 2194, 2195, 2196, 2197, 2198, 2199, 2200, 2201, 2202, 2203, 2204, 2205, 2206, 2207, 2208, 2209, 2210, 2211, 2212, 2213, 2214, 2215, 2216, 2217, 2218, 2219, 2220, 2221, 2222, 2223, 2224, 2225, 2226, 2227, 2228, 2229, 2230, 2231, 2232, 2233, 2234, 2235, 2236, 2237, 2238, 2239, 2240, 2241, 2242, 2243, 2244, 2245, 2246, 2247, 2248, 2249, 2250, 2251, 2252, 2253, 2254, 2255, 2256, 2257, 2258, 2259, 2260, 2261, 2262, 2263, 2264, 2265, 2266, 2267, 2268, 2269, 2270, 2271, 2272, 2273, 2274, 2275, 2276, 2277, 2278, 2279, 2280, 2281, 2282, 2283, 2284, 2285, 2286, 2287, 2288, 2289, 2290, 2291, 2292, 2293, 2294, 2295, 2296, 2297, 2298, 2299, 2300, 2301, 2302, 2303, 2304, 2305, 2306, 2307, 2308, 2309, 2310, 2311, 2312, 2313, 2314, 2315, 2316, 2317, 2318, 2319, 2320, 2321, 2322, 2323, 2324, 2325, 2326, 2327, 2328, 2329, 2330, 2331, 2332, 2333, 2334, 2335, 2336, 2337, 2338, 2339, 2340, 2341, 2342, 2343, 2344, 2345, 2346, 2347, 2348, 2349, 2350, 2351, 2352, 2353, 2354, 2355, 2356, 2357, 2358, 2359, 2360, 2361, 2362, 2363, 2364, 2365, 2366, 2367, 2368, 2369, 2370, 2371, 2372, 2373, 2374, 2375, 2376, 2377, 2378, 2379, 2380, 2381, 2382, 2383, 2384, 2385, 2386, 2387, 2388, 2389, 2390, 2391, 2392, 2393, 2394, 2395, 2396, 2397, 2398, 2399, 2400, 2401, 2402, 2403, 2404, 2405, 2406, 2407, 2408, 2409, 2410, 2411, 2412, 2413, 2414, 2415, 2416, 2417, 2418, 2419, 2420, 2421, 2422, 2423, 2424, 2425, 2426, 2427, 2428, 2429, 2430, 2431, 2432, 2433, 2434, 2435, 2436, 2437, 2438, 2439, 2440, 2441, 2442, 2443, 2444, 2445, 2446, 2447, 2448, 2449, 2450, 2451, 2452, 2453, 2454, 2455, 2456, 2457, 2458, 2459, 2460, 2461, 2462, 2463, 2464, 2465, 2466, 2467, 2468, 2469, 2470, 2471, 2472, 2473, 2474, 2475, 2476, 2477, 2478, 2479, 2480, 2481, 2482, 2483, 2484, 2485, 2486, 2487, 2488, 2489, 2490, 2491, 2492, 2493, 2494, 2495, 2496, 2497, 2498, 2499, 2500, 2501, 2502, 2503, 2504, 2505, 2506, 2507, 2508, 2509, 2510, 2511, 2512, 2513, 2514, 2515, 2516, 2517, 2518, 2519, 2520, 2521, 2522, 2523, 2524, 2525, 2526, 2527, 2528, 2529, 2530, 2531, 2532, 2533, 2534, 2535, 2536, 2537, 2538, 2539, 2540, 2541, 2542, 2543, 2544, 2545, 2546, 2547, 2548, 2549, 2550, 2551, 2552, 2553, 2554, 2555, 2556, 2557, 2558, 2559, 2560, 2561, 2562, 2563, 2564, 2565, 2566, 2567, 2568, 2569, 2570, 2571, 2572, 2573, 2574, 2575, 2576, 2577, 2578, 2579, 2580, 2581, 2582, 2583, 2584, 2585, 2586, 2587, 2588, 2589, 2590, 2591, 2592, 2593, 2594, 2595, 2596, 2597, 2598, 2599, 2600, 2601, 2602, 2603, 2604, 2605, 2606, 2607, 2608, 2609, 2610, 2611, 2612, 2613, 2614, 2615, 2616, 2617, 2618, 2619, 2620, 2621, 2622, 2623, 2624, 2625, 2626, 2627, 2628, 2629, 2630, 2631, 2632, 2633, 2634, 2635, 2636, 2637, 2638, 2639, 2640, 2641, 2642, 2643, 2644, 2645, 2646, 2647, 2648, 2649, 2650, 2651, 2652, 2653, 2654, 2655, 2656, 2657, 2658, 2659, 2660, 2661, 2662, 2663, 2664, 2665, 2666, 2667, 2668, 2669, 2670, 2671, 2672, 2673, 2674, 2675, 2676, 2677, 2678, 26

[Faint handwritten notes at the bottom of the page]

1890

संस्कृत-विश्व-कोशः

2000

الماہوں۔ سیرے ارد گرد لکڑیوں کی طرح تھکے۔

تیسرا باب: اہل بیت علیہم السلام

ازمات کے لئے ہے۔ ان کے لئے ہے جسے دین الیہم بھروسہ

تجربہ کے لئے ہمیں قبول کرنا پڑے گا۔

١٤

... ..

... ..

"L'Espresso"

1963-1964

مساحت کل زمین ۱۰۰۰۰ متر مربع است.

کے لئے سب سے زیادہ

۱۔ پکے پکے حوالے سے انکار و چکر و دھڑکے

میں نے ان لوگوں کو دیکھا تھا جو کہ ان کے لئے تیار تھے۔

کے سے بکارا تھا۔ اپنی بے لٹاسی کا دواویا لیا تھا مگر کی بے

ساتھ ساتھ اس معاملے میں میری طرف سے بھی ایک وکیل شامل ہو۔“

”مگر تم فیس کی باتیں اتنی رقم کیوں ضائع کرنا چاہتی ہو؟“ جوزفین کو اس کی احتیاط پسندی کچھ بری لگی تھی جو اس کے چہرے پر عیاں تھی۔

بہال کے لیے ڈاکٹر اور نرس کی خدمات میں نے ماموں
 جی۔ خداوند اس کے حال پر رحم کرے اور یہ تمہیں
 دن خرید دیکھنے کے لیے زندہ رہے۔ اب میں چلتی ہوں۔
 وہ چند کو حیران و سراسیمہ چھوڑ کر چلی گئی۔ اچھل کر
 کر بے ہوش ہو چکا تھا۔ اس کی تیز سانسوں کی آواز کہ
 میں سپہ رانی تھی جبہ چند و کا داغ سا لگیں کر رہا تھا
 وہ زندگی کے عجیب و غریب دور نہ سمجھ میں آنے والے مریض
 سے خالی اندیشی کے عالم میں گزر گئی تھی۔ آگے کیا ہو
 والا تھا؟ یہ اس کی والدہ سے ماورا تھا۔ وقت ایسی ہی
 چلتا ہے۔ ایک خانماں خراب لڑکی کو اس نے غربت کی گود
 سے نکال کر نرسنگ کورس کے لیے اسپتال پہنچا دیا تھا۔ وہاں
 سے اٹھا کر ایک دن میں کروڑ پتی بنا دکھایا تھا۔ وقت
 نادیدہ اوراق پر لکھی ہوئی تحریر سے زندگی کے واقعات
 کھوجنے والا ماموں رضوان نہ جانتے کہاں تھا مگر اس نے
 حفظ لفظ چندو مامی کے ذہن میں تھا۔ اس نے غلطی کی تھی
 درست راستہ اختیار کیا تھا۔۔۔۔۔ یہ یقین بھی وقت نے ہی کر
 تھا اور وقت ابھی خاموش تھا۔

”کئے، کھونے، تھپڑ، ٹھوکر، لاتیں کھانے اور طعنے مارنے کی سب سے زیادہ گھریلو باتیں ہیں۔ پرچی لکھی ہو کر بھی شوہر کی زبان پر داری نہیں غلامی کرتی تھی تو پھر کاج جانے کی کیا ضرورت تھی۔ پڑھا لکھا ہونے کے باوجود اگر اس ظالم سے ٹکر نہیں لے سکتی تو تو تمہاری قسمت میں کچھ اور نہیں ہوگا۔“

وہ ہماری کلاس کی سب سے خوب صورت لڑکی تھی۔

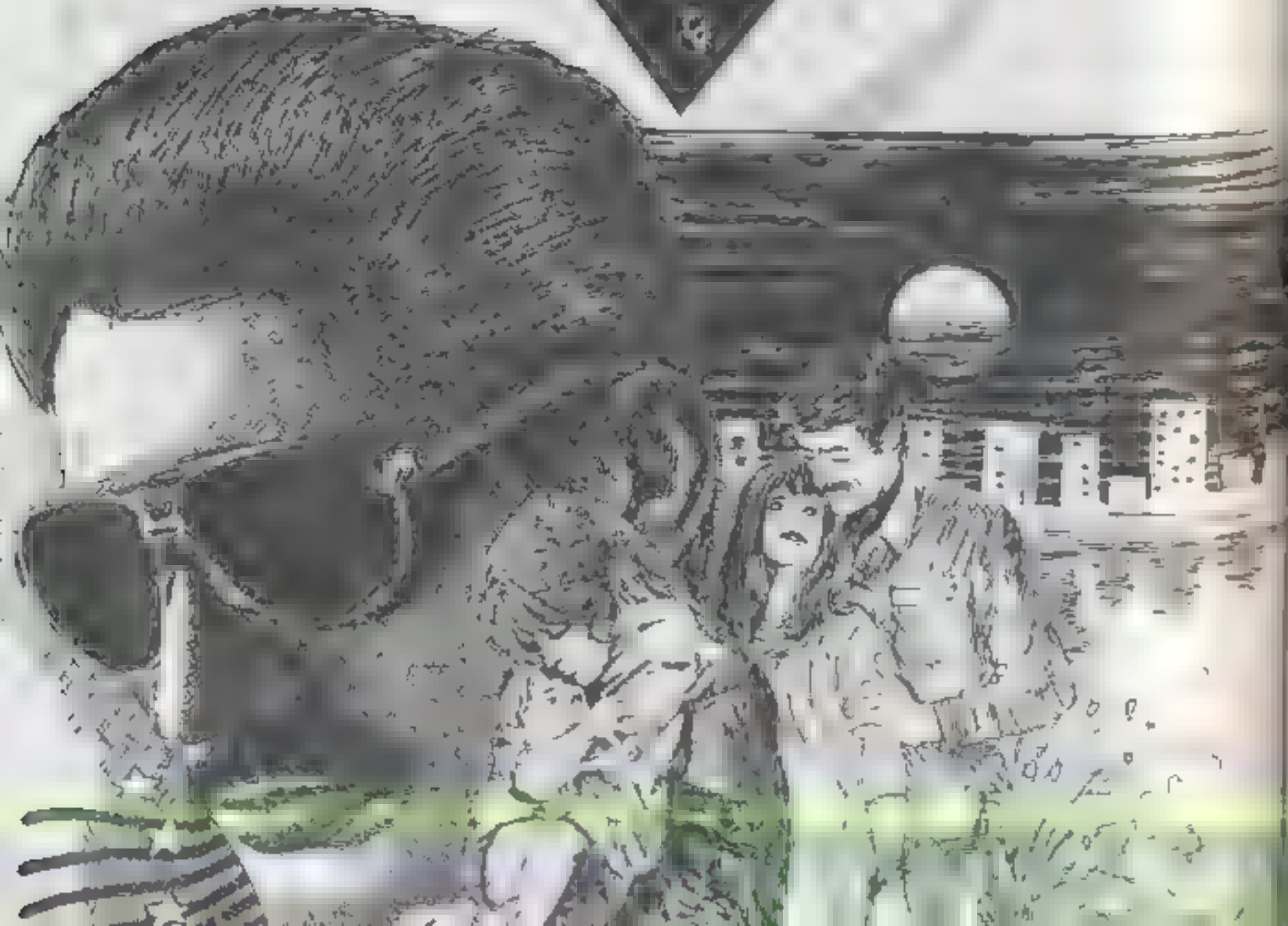
یہ کہ وہ خوب صورت بلکہ خوب سیرت محی تھی۔ غضب کی کشش تھی اس میں اس کی ساتویں کی وجہ سے۔ پڑھنے والی

بروقت مدد کرنے کو تیار رہنے والی سب میں سب سے نمایاں۔

ایک اور بات جس کا پتا بعد میں چلا وہ یہ کہ وہ ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اگرچہ غریب خاندانوں میں ایسا بہت کم دیکھنے میں آتا ہے کہ وہ خوب صورت بھی ہوں، ان میں اعتماد بھی ہو اور اتنی بولڈ ہوں جتنی وہ تھی۔ غریب خوب صورت خاتون کی شادی تو شاید سو سو ستر دہائی کی ہونے سے پہلے ہی کسی سے نہ کی جاتی ہے کیونکہ خاندان اور عزیز و اقارب

واپسی

سفر تو نام ہے آگے بڑھتے رہنے کا... اسان واپس آکر اپنے پہلے سفر کا آغاز نہیں کر سکتا بالکل ایسے جیسے بہتے پانی کو پلگانا نہ ممکن نہیں... جو گزر گیا سو گزر گیا۔ اسی کو جیون کہتے ہیں۔ وہ بھی ماضی کے دیپ جلائے کب سے آتی جاتی پڑ چھائیوں میں گم شدہ لمحات تلاش کر رہا تھا مگر اب اس کا ایسا سوچنا لا حاصل تھا جو زندگی کے ہر رستے پر واپس پلٹنا چاہتا تھا۔



کے لڑکوں کے ماں باپ کی نظر ایسی لڑکیوں پر ہوتی ہے، یہی لڑکیوں پھر تمام عمر اپنے سے بہت زیادہ عمر کے شوہروں کے ساتھ کسی نہ کسی طرح سے گزارہ کرتی رہتی ہیں۔

شاز یہ میرے گروپ میں تھی اور میرا خیال تھا کہ فاضل ایر کا امتحان ہونے کے فوراً بعد اس کی شادی کا پتہ شروع ہوگا۔ ہم دونوں کی ابھی دوستی تھی، خصوصاً بھرا حلق تھا ہم دونوں کے درمیان۔ ایک طرح سے عزت بھی کرتے تھے، لڑتے بھی تھے ایک دوسرے کے کام بھی آتے تھے۔ وہ دین تھی اور ہمارے گروپ کی لیڈر بھی۔ جیسا کہ لڑکیوں کی عادت ہوتی ہے وہ خیال بھی رکھتی تھی ہم لوگوں کا۔

عملی زندگی میں چیزیں اتنی مختلف ہوں گی، میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ جو میرے خیال و گمان میں بھی نہیں تھا وہ ہو گیا، فاضل ایر کے آخری امتحان کے دوسرے دن ہی میں نے اسی سے کہا تھا کہ مجھے ناہید سے شادی کرنی ہے اور انہیں اس کے گھر رشتے کے لیے جانا ہوگا۔

میں نے سوچا تھا کہ انہیں خوشی ہوگی لیکن جب میں نے بتایا کہ ناہید سود آباد میں رہتی ہے، کالج کی بس میں آتی ہے، غریب متوسط درجے کے خاندان سے تعلق ہے اس کا تو میں نے یہ محسوس کیا کہ ان کے جوش و خروش پہ کسی نے برف کا پانی ڈال دیا ہے۔

دوسرے روز ہی ابو اور امی نے رات کو مجھے بٹھا کر اچھا خاصا لیکچر دے دیا تھا۔ ہم لوگ ڈیفنس فیز فور میں رہتے ہیں وہ لوگ سود آباد کی جنگی کلبی میں اتنی گز کے مکان میں رہتے ہیں، یہ بڑا فاصلہ ہے بہت بڑا، اسے طے کرنا ناممکن ہے بیٹے۔ شادیوں ہم پہلے لوگوں میں ہی ہوتی ہیں اور ہم پولس میں ہی ہو سکتے ہیں۔ تم بھی بھی ملنے چنے والوں کو اپنے سسرال کا ہاتھ نہیں تھام سکو گے۔ یہ خیال اس سے نکال دو۔ ابونے بھی انداز سے کہہ دیا تھا۔

میں نے دونوں کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ بتایا تھا کہ وہ کتنی دینی سے، کتنی دوسرا ندرویہ ہے اس کا، غریب ہونے کے باوجود کتنی پر عقائد ہے وہ، سود آباد میں پیدا ہونے کے باوجود اس نے وہ سب دیکھ کر رکھا ہے جو ڈیفنس سوسائٹی، کارسار اور ناہید نامی رشتہ والی بہت ساری ہماری رشتہ دار لڑکیاں نہیں آسکتی ہیں۔ وہ بہت ملگن ہے ابو، بہت اگلی کی آپ میں سے تو فراموشی پسند کریں گے میری بات کو اہمیت تو دیں۔

مگر وہ اب بٹ میری بات کو اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ انہیں جوش اعلیٰ تھی مگر یہ ساری باتیں زندگی کے عملی مسائل سے انہیں دور کر دیتے تھے۔ یہ بہت بڑے

خواب دیکھے ہیں۔ بہت سے لوگ ہیں، کھاتے پیتے مھر کے جو تمہیں دماغ کر رہے ہوں گے تمہیں کیا ضرورت ہے۔ کچھ میں پھنسوں۔ ابونے سنجیدگی سے بڑے گہرے سچے میں تھا۔ مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ امی بھی لڑکیوں میں ہمارے تھیں۔

وہ مجھے سمجھا سکے اور نہ میں انہیں راضی کر سکا۔ ناہید سے کہنا ہے کار تھا۔ مجھے پتا تھا کہ وہ مجھے پسند کرتی تھی ایسے ہی جیسے میں اسے پسند کرتا ہوں مگر وہ میرے ساتھ بھاگنے پر راضی نہیں ہوگی، بغاوت وہ نہیں کر سکتی ہے۔ میں کر سکتا تھا، مگر یہ بھی تھا مگر وہ بھی تیار نہیں ہوتی۔ میں دچکا رہا اور وقت بڑی تیزی سے گزر گیا۔

ہمارا نتیجہ نکل آیا۔ معمول کے مطابق اس کی پوری ٹیم تھی اور ہم لوگوں نے مختلف وارڈوں میں ہاؤس جاب شروع کر دی۔ نئے نئے کاموں میں الجھے ہونے کے باوجود میں دندہ امی ابو کو سمجھانے کی کوشش کر چکا تھا جس کا کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا سکا۔ اس کے کہ میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ پاکستان چھوڑ کر ہی چلا جاؤں تو بہتر ہے۔ اپنی خیاالات اور اسی امید و ناامیدی کی کشمکش میں ہاؤس جاب کے فیصلہ کو گزر گئے تھے اور پتا چلا کہ ناہید کی شادی طے پاگئی ہے۔ دس دن میں وہ بیابان کے امریکا چلی جائے گی۔

مجھ پر جو گزری تھی اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے محنت کی ہے۔ کسی کو آہستہ آہستہ ایک روز دی کے ساتھ چاہا ہے، اسے خوابوں میں، آنکھوں میں نظروں میں رکھا ہے، یہ خبر بس بجلی بن کر ہی گری تھی۔

میں اس کی شادی میں شریک نہیں ہوا۔ اس نے حوالہ دیا کہ مجھے آنے کو کہا مگر میں تو اس سے صحیح طریقے سے دلتا ہوں نہیں کر سکا۔ اس کی آواز میں بھی کوئی کمی تھی۔ ناہید کی آواز نہیں تھی۔ اس وقت تو میں نے محسوس نہیں کیا مگر ساواں بعد وہ بھی جھکی پڑمروہ آواز میرے کانوں میں گونج گئی تھی۔ ڈاکٹر نار سے بارہ سال پہلے ڈاکٹر بنا تھا۔ امریکا میں اس کے مرنے کا پتہ تھا۔ اس کی بہن نے کہہ دی میں ناہید کو اپنے چھائی سے پسند کرتا تھا اور ناہید کے ماں باپ نے ہائی بھر لی تھی۔

ابتداء میں مجھے نفرت ہی ہوگئی، ناہید کے خاندان سے بالکل دو پیسے والی حرکت کی تھی ان لوگوں نے۔ ایک پتے والے بڑے عمر کے بندے سے شادی کر دی اپنی بیٹی کی تھوڑا سا رنج بھی نہیں کیا۔ اسے موقع تک نہیں دیا کہ وہ باپ جاب کرتی، امتحان دیتی مگر میرا غصہ بھانپیں تھا۔ وہ بہت تیز لوگ۔ اس کی لڑکی کی شادی ایک پڑھ لکھے

سے ہو رہی تھی جہاں امریکا میں سیٹ تھا۔ وہ بھی جا کر امتحان دے کر پاس ہو جائے گی اور پھر اس کا اپنا مقام ہوگا، یہی کہا تھا۔

ماں باپ اور کیا سوچتے ہیں متوسط اور نچلے گھرانوں میں بیٹوں کی شادی دیر سے ہوتی ہے والے نہ جانے کیا کہتے ہیں۔ وہ گھر سے گزرتے۔ مادر سے اچھا آدمی کہاں ملے۔ ناہید کے پاس امریکا موقع تھے۔ اس نے ہمیشہ ماں باپ کے فیصلوں پر عمل کیا۔

میں نے ہاؤس جاب چھوڑ دی اور لائبریری میں بیٹھ گیا۔ اب مجھے کچھ نہیں کرنا تھا۔ نہ ہاؤس جاب نہ پاکستان میں رہنا تھا اور نہ شادی کرنی تھی۔ امریکا کا امتحان میرے لیے ہوئی مسد نہیں تھا۔ وہ میں نے پاس کیا اور امریکا چلا گیا۔ میرے گھر دونوں کا خیال تھا کہ میں دس سال کے بعد واپس آ کر تین مہینے سے شادی کر لوں گا مگر میں نے ایسا نہیں سوچا تھا میری زندگی سے ناہید نکل ضرور گئی تھی مگر کوئی دوسرا میری زندگی میں نہیں تھا۔

کئی سال گزر گئے، مجھے پتا ہی نہیں چل سکا کہ وہ کہاں ہے، میں اس کے بارے میں اچھا ہی سوچتا تھا کہ اس نے بارہ امریکن امتحان پاس کر لیے ہوں گے۔ اسے فزیشن بنے کا شوق تھا وہ فزیشن بن گئی ہوگی۔ خوب صورت سے بچے ہوں گے اس کے۔ مادر کے ساتھ خوش ہوگی وہ۔ دیکھا سوچ سکتا تھا میں اس کے بارے میں۔

مگر اب نہیں تھا۔ سات سال گزر گئے تھے میں نے اپنے آپ کو اپنے کام میں مصروف کر لیا تھا، صبح و شام زندگی گزار رہی تھی۔ چونیورسٹی کے ساتھ کام کرنے میں یہ ہوتا ہے کہ آپ جتن چاہیں اپنے آپ کو مصروف رکھ سکتے ہیں۔

شکاگو کی کانفرنس میں میری ملاقات شاز یہ سے ہوئی تھی کئی سالوں کے بعد۔ وہ ہمارے ہی گروپ میں تھی، وہ بھی فزیشن تھی اور اس کا شوہر سرجن تھا۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ کانفرنس میں آئی تھی اور میرے لیکچر کے بعد سیدھی مجھ سے ملنے چلی گئی تھی۔

ہم دونوں ریسٹورنٹ میں جا کر بیٹھ گئے تھے۔ سات سال کے بعد ملاقات ہوئی ہے تو دنیا بھر کی بات ہوتی ہے۔ بات کی باتیں ہوئیں اس نے بتایا کہ ناہید کنساس میں رہتی ہے سپر شوہر کے ساتھ۔ تین بچے ہیں اس کے اور اس نے کوئی "تھانکس" دیا ہے صرف گھر اور شوہر کی ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کی زندگی میں کیا مادی محسوس کر لیا تھا میں نے، کچھ تو جو وہ مجھے

"وہ تو بہت ذہین تھی۔ شاز یہ ایسا کیسے ہو گیا وہ تو سب کچھ کر سکتی تھی۔ کیوں نہیں کیا اس نے؟" میں نے پوچھا۔

"کیوں نہیں کر سکتی تھی۔ ضرور کرتی۔ اگر شوہر نے چاہا ہوتا۔ مگر ناہید کا تو نہیں ہی کچھ اور تھا۔ یہ سب بات بتانا تم کسی کو۔ اس کا صرف مجھ سے رابطہ ہے، وہ یہ سب کچھ مجھے پتا ہے تمہیں صرف اس سے بتا رہی ہوں کہ ہم تم سب دوست تھے۔ بہت محسوس سارشتہ تھا ہمارا، اردو رشتہ، ابھی تک ہے۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی تھی۔

"بتاؤ مجھے اس کے بارے میں۔ میرے دل میں ابھی بھی صرف اس کے لیے ہی درد اٹھتا ہے۔ کئی لڑکیوں سے ملاقات ہوئی ہے امریکن اور پاکستانی لیکن وہ آئیں آ کر چلی گئیں میں ناہید کو تلاش کرتا رہا ان میں۔ کہاں ملتی مجھے، ناہید تو ایک ہی بنی گئی تھی۔"

اصل بات تو مجھے پتا نہیں ہے۔ وہ کچھ بتاتی بھی نہیں ہے۔ یہ مجھے ضرور پتا ہے کہ اس نے پڑھا نہیں۔ امریکن امتحان میں پیشگی تک نہیں۔ ماں میں بچوں کی ماں ضرور بن گئی ہے اور شاید اس نے اپنی زندگی ان ہی کے لیے وقف کر دی ہے۔ فون پر دنیا جہاں کی باتیں کرتی ہے مگر اپنے بارے میں اپنے شوہر کے بارے میں کوئی بات نہیں کرتی۔ شاز یہ نے بات کرتے ہوئے ناہید کو فون کیا۔

ناہید نے ہی فون اٹھایا۔ میں نے بھی بات کی تھی۔ "کیسی ہو ناہید، میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ تم سے اس طرح سے بات ہو جائے گی میں بول رہا ہوں خرم، بچپن لیا۔" میں نے بڑے جوش و خروش سے کہا۔

"کیوں نہیں پوچھ لوں گی۔ ٹھیک تو ہو۔" اس نے ہستہ آہستہ رک رک کر کہا تھا۔ اس کی آواز کی قدرتی شوخی کہیں کھو گئی تھی۔ اس نے کوئی زیادہ بات نہیں کی۔ ہوں ہوں میں جواب دیتی رہی۔ میرا دل جیسے ٹوٹ کر بکھر گیا تھا۔ یہ اسی کی آواز تھی مگر یہ وہ نہیں تھی۔ وہی تھی مگر وہ نہیں تھی۔

میں نے شاز یہ سے فون نمبر لے لیا۔ شاز یہ نے کہا تھا کہ اگر بہت ضروری ہو تو فون کرنا اور صبح کو کرنا۔ اس کے شوہر کو اس کا فون پر بات کرنا پسند نہیں ہے اور وہ بھی کسی مرد سے۔ اسے تو میرے بھی فون پر اعتراض ہے۔

"تم اس سے کہہ ملی ہو۔" میں نے سوال کیا۔ ہاں ٹی ہوں پچھلے سال "اپنا" کے جیسے میں۔ اس کا شوہر مذہبی آدمی ہے۔ چھوٹی سی ڈاڑھی کے ساتھ۔ میں نے اسے انداز کے وقت نماز کے لیے دوڑ کر جاتے ہوئے دیکھا۔ بات بھی ہوئی ناہید سے اسے مگر مجھے گا جیسے اس نے اندر کوئی

اور بھی چھپا ہوا ہے۔ کچھ عجیب قسم کی بے سکونی سی ہوئی اس سے بات کرنے میں۔ مجھے مصنوعی سا لگا تھا وہ۔ "شازیہ نے جواب دیا۔

"ناہید سے بات ہوئی تھی۔ وہ کیسی ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"کافی وقت گزرا اس کے ساتھ۔ وہ بالکل بدل گئی ہے، اسکا رقبہ بڑھتی ہے اس میں جو غضب کا اعتماد تھا۔ وہ بڑبڑا رہا ہو گیا۔ وہ کالج میں پروفیسروں سے بھڑکتی تھی اچھے خاصے لمبے چوڑے لڑکے اس سے گھبراتے تھے اور اب تو مجھے لگا جیسے اسے اپنے اوپر کوئی اعتماد نہیں ہے۔ ایسا کیسے ہو گیا میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے لڑکیاں دیکھی ہیں جو شادی کے بعد شوہر کے دباؤ میں سب کچھ کرتی ہیں مگر وہ لڑکیاں ناہید نہیں ہوتی ہیں۔ انہوں نے تو صرف شوہر کے ہی خواب دیکھے ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنے بارے میں نہیں سوچا ہوتا۔ وہ بیوی، دوست، سہیلی نہیں ہوتیں، خادما میں ہوتی ہیں، شوہر کو مجازی خدا سمجھتی ہیں۔ ناہید تو ایسی نہیں تھی۔ اس نے تفصیل سے بتا دی۔ مجھے یاد تھا کالج میں اس سے گرم گرم بحث ہوتی۔ عورتوں کے حقوق کے بارے میں، سماج میں ان کی حیثیت سے متعلق، عورتوں کو باعدی سمجھنے والوں کے خلاف اس کے خیالات سے میں آگاہ تھا۔ کاروکاری اور عورتوں کی حالت۔ حیثیت سے وہ نفرت کرتی تھی وہی ناہید ڈاکٹر بننے کے بعد امریکا جیسے ملک میں باعدی بن گئی میری سمجھ میں نہیں آیا۔ مجھے دکھ ہوا اور میں سوچتا رہا کاش میرے گھر والے راضی ہو جاتے، کاش میں اسے بغاوت پر آمادہ کر لیتا۔ کاش!

میں بڑے پوچھل دل کے ساتھ شکا کو سے واپس آیا۔ میں پہلے کون سا اسے بھولا تھا جواب بھول جاتا۔ اس کی ایک انگ تصویر سی میرے ذہن میں بن گئی تھی جو ہر وقت میرے ساتھ ساتھ رہنے لگی۔ فون کرے کے بارے میں، میں کشمکش کا شکار تھا کہ ایک دن شازیہ کا فون آگیا۔

بہت اداس تھی وہ اس نے بتایا کہ میں اس کی فون پر ناہید سے بات ہوئی تھی۔ ناہید پہلی دفعہ ٹوٹ گئی تھی فون پر۔ اس نے بتایا کہ زندگی آسان نہیں رہی ہے۔ اس کا شوہر ایک عزت دار ڈاکٹر، مانا ہوا کارڈیالوجسٹ اور ایک محرز شہری ضرور ہے مگر ایک ظالم آدمی ہے جو بیوی کو کسی قائل نہیں سمجھتا، اسے تشدد کا نشانہ بناتا ہے بے عزتی کرتا ہے، اس کی حیثیت ایک چھٹی خادمہ کی ہے جو اس کے بچوں کی ماں ہے۔ اسے اگر ڈراما تنگ سکھا کی ہے تو اس لیے کہ وہ بچوں کا سکول اور اسلامک سینٹر سے لاجائیکے، باقی کچھ حیثیت نہیں ہے اس کی۔ پہلی دفعہ اس نے

تفصیل سے بتایا کہ مادر اس کی تعلیم کے خلاف تھا اور اس کا خیال ہے کہ یہاں کی تعلیم کے بعد لڑکیوں کے دماغ پر ہوجاتے ہیں۔ پاکستان کی بات اور بھی اور یہاں کی یہاں اس کی آمدنی اتنی ہے کہ وہ سب کو پا سکتا ہے۔ ناہید بڑھنے کی ضرورت ہے، ورنہ ہی کام کرنے کی۔ یہی تم تھا اس کا حکم منوایا گیا۔

مگر شازیہ امریکا میں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ سٹوڈنٹ تھوڑی ہے۔ اس کا دماغ ہے۔ وہ فٹنس ہے۔ ہونے دیا اس نے ایسا؟" میں نے سوال کیا۔ "میں نہیں پوچھ سکتی یہ بات۔ یہ تو نہ جانتے کیسے اس نے کچھ ہوا ہوگا۔ میں ہی کچھ کرنا ہوگا اس سے اپنے خود کٹی کر لے۔ میں نے کہا تھا نا کہ وہ شخص مجھے عجیب سا کاز میں مطمئن نہیں تھی اس سے تم فون نہ کرنا ابھی۔ اس نے "مجھے فی الحال اس سے بات کرنے دو۔"

میرا دل چاہا کہ میں اس کے پاس چلا جاؤں۔ اس سے سنوں اس کی کہوں اپنی، کہ وہ اپنی زندگی کو ہیرا پیرا کر کے کرے، حالت سے ناہید بن رہا ہے۔ ناہید کی زندگی اس میں گزرتی اور نہ گزرتی چاہیے مگر میں کچھ کرنا نہ تھا۔ وہ شادی شدہ تھی نہ جانے اس کے کیا حالات تھے اس سے تو ابھی نہیں سکوں گا۔ یہ سلسلہ کچھ زیادہ دیر نہیں چلے گا۔ بہت مختلف تھے۔ مجھے شازیہ کے فون کا انتظار رہا تھا۔

دو دن بعد شازیہ نے بتایا کہ اس دن ناہید کے محل جانے کی وجہ یہ تھی کہ اس دن ہی اسے بتایا تھا۔ ناہید پہلے بھی ایک شادی کی گوری سے کی ہوئی تھی اس سے یہ بیٹا اور دو بیٹیاں تھیں اس کی۔ اتفاق سے اس کے ہاتھ یہ خط لگ گیا تھا جو شاید نادر کے کاغذات میں سے گر گیا تھا۔ میں اس کی سادہ بیوی کے وکیل کا خط تھا کہ وہ بچوں کے پاپابندی سے نہیں بھیج رہا ہے۔ نادر کو جب پتا چلا کہ اسے پھل گیا ہے تو بجائے شرمسار ہونے کے اور، اپنے بچے کو نام نہاد ہو کر معافی مانگنے کے بلکہ اس نے ناہید کو ہی تشدد کا نشانہ بنایا۔ اس نے روتے ہوئے کہا کہ بچوں کے سامنے چہرہ اور گھونٹوں سے پتا ہے اس نے۔ دنیا میں ایسا کیا ہے؟ شازیہ نے مجھ سے سوال کیا۔

میرے پاس کیا جواب تھا کچھ بھی نہیں، مگر مجھے اس بات کا تھا کہ یہ سب کچھ اس کے ساتھ ہو رہا تھا جو اس کی سب سے زیادہ ذہنی لڑکی تھی جو خوب صورتی میں تھی، جو بے باک تھی، اندر بھی مگر ایک سے ملک میں جو اس کو حقوق حاصل تھے وہ پناہ گزین تھی۔

میں نے شازیہ سے کہا کہ اس سے کہو کہ وہ 911 کو فون کرے پولیس کو بلائے، نادر کتنا بھی بڑا آدمی ہے اس ملک میں قانون سے نہیں بچ سکتا۔ اسے فیصلہ کرنا ہوگا اس جہنم سے نکلنے کے لیے۔ میں اس کے ساتھ ہوں ہم سب اس کے ساتھ اور ساتھ رہیں گے۔

کئی دن گزر گئے۔ شازیہ کی ناہید سے کوئی خاص بات نہیں آئی۔ اس کے کہ ناہید نے کہا تھا کہ وہ سوچ رہی ہے، بہت سوچ کچھ کر فیصلہ کرنا ہے اس کے بچے ہیں، پاکستان میں خاندان کے کئی گھریلو معاملات ہیں۔ وہ فیصلہ نہیں کر رہی ہے، ایک کشمکش کا عالم ہے مگر وہ اندر سے سوچی ہوئی کلر کی طرح چل رہی تھی۔ اسے یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ نادر نے اس سے، اس کے خاندان سے جھوٹ بولا تھا۔ اس نے سے بڑھنے نہیں دیا۔ اسلام کا حوالہ دے کر اسے تقریباً پردے میں بٹھا دیا۔ اسے گھر کے معاملات میں الجھا دیا۔ وہ دینے کی مسجد کشمکش کا بھی بہت کچھ تھا اور گھر میں ایک جھوٹا عالم مرد یہ سب باتیں شازیہ نے مجھے بتائی تھیں۔

"مگر شازیہ یہ کوئی نئی بات تو نہیں ہے، امریکا میں تو بہت سے لوگ ہیں جن کی دودنیا میں ہیں۔ ایک دنیا شادی سے پہلے کی اور ایک دنیا شادی کے بعد کی۔ شادی سے پہلے وہ سب کچھ کرتے ہیں، ان کی گمراہ فریڈ بھی ہوتی ہیں، وہ شادی کے بغیر بھی ساتھ رہتے ہیں، امریکی سفید، اسیٹیش اور ہندوستانی لڑکیوں سے شادی بھی کر لیتے ہیں۔ ان کے بچے بھی ہوتے ہیں پھر طلاق بھی ہوتی ہے، پھر وہ پاکستان جا کر بچ جھوٹ بول کر نئی شادیاں کر لیتے ہیں، انہیں کیا بچ اسلام اچھا لگنے لگتا ہے، بیویوں کو قید کر دیتے ہیں ان کی مرضی کے خلاف ان سے پردہ کرتے ہیں، انہیں وہ قرآنی آیات اذہر ہوتی ہیں جس میں مرد کے حقوق اور شوہر کی برتری کے تذکرے ہوتے ہیں۔ وہ وقت بھول جاتے ہیں جب وہ شرعے مہار کی طرح آزاد دنیا میں تھی آزادی سے رہتے تھے کہ وہ آزادی امریکیوں کو بھی میر نہیں ہوتی ہے۔"

"مگر اس قسم کے کام صرف اسلامی لوگ تو نہیں کرتے۔" شازیہ نے مجھے روک دیا تھا۔ "اور سارے پاکستانی بھی بت نہیں میں تمہاری باتوں سے مجھے تھوڑا اختلاف ہے۔" اس نے احتجاج کیا۔

"میں نے کب کہا کہ یہ کام سارے اسلامی لوگ کرتے ہیں، امریکی مثالی بھی ہیں۔ بہت سارے ایسے لوگ ہیں جن ہندو سب سے کوئی تعلق نہیں تھا انہوں نے بھی یہ سب کچھ کیا ہے میں نے دیکھا ہے کہ زیادہ تر ایسے لوگ "حر میں مذہبی ہیں

ہو جاتے ہیں، مگر چور و اس بات کو یہ بتاؤ کہ ناہید کو اس جہنم سے کیسے نکال جائے۔"

ایک ہفتے بعد شازیہ نے بتایا کہ اگلے مہینے نادر دودن کے لیے کسی میٹنگ میں دوسرے شہر جا رہا ہے۔ اس نے جنگ کرانی ہے اور وہ کنساس جا کر ناہید سے ملے گی۔

میں نے کہا کہ میں بھی چلتا ہوں مگر اس نے مجھے منع کر دیا کہ ایک دفعہ وہ ملے۔ سوچ حالات کا اندازہ ہو سکے گا، اس کی اپنی خواہش کیا ہے اور وہ خود کیا چاہتی ہے جب ہی ہم لوگ اس کی صحیح معنوں میں مدد کر سکیں گے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اگر وہ خود اس جہنم سے نہیں نکلتا چاہتی ہے تو ہم لوگ کیا کر سکیں گے۔ اس کی بات درست تھی۔ میں نے اس سے کہا "اس سے کہہ دینا کہ وہ اپنے آپ کو اکیلا نہ سمجھے۔ مجھے اپنے ساتھ سمجھے۔ میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ جب وہ کہے گی میں آسکتا ہوں۔ ڈالر کی ضرورت ہے تو وہ بھی ہیں اور بڑے سے بڑا دیکھ کر نا ہوگا تو وہ بھی کریں گے۔ اس سے کہنا کہ یہ صرف زبانی باتیں نہیں ہیں میں یہ سب کچھ کروں گا جب بھی ضرورت پڑے گی۔"

شازیہ کے واپس آنے کے دوسرے دن ہی حالات میں زبردست اور یکا یک تبدیلی آگئی، میں نے سوچا نہیں تھا کہ اس طرح سے صورت حال بدل جائے گی۔

شازیہ اس کے گھر کے قریب واقع میریٹ ہوٹل میں ٹھہری تھی، ناہید اس سے وہیں آکر ملی۔ چار پانچ گھنٹے میں ناہید نے اپنی زندگی اس کے سامنے کھول کر رکھ دی مگر وہ اس زندگی میں کسی بھی قسم کی تبدیلی کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس نے اسے اپنی قسمت سمجھ کر قبول کر لیا تھا اور اس کا خیال تھا کہ کسی بھی قسم کی تبدیلی لانے کی کوشش بہت تباہی لائے گی، میں نے حالات سے سمجھوتا نہیں کیا ہے بلکہ اسی حالات میں زندگی گزارنے کی عادت ڈالی ہے۔ ناہید نے شازیہ سے کہا تھا۔

"مگر ناہید یہ مار پیٹ، گالی گتھار تمہارے بچے کیسے بڑے ہوں گے، کیا کریں گے بڑے ہو کر؟" شازیہ نے اس سے پوچھا تھا۔ "یہ کوئی صحت مند حالات تو نہیں ہیں ایسے کیسے رہو گی تم۔"

"رہوں گی، سب رہتے ہیں پاکستان میں بھی تو رہتے ہیں نہ مجھے ہی صبر کرنا ہوگا، ہر بات مانتی ہوگی۔ کوئی سوال نہیں کرنا ہوگا پھر اب تو مار کی عادی ہوئی ہوں۔" ناہید نے کہا تھا۔ "لاکھوں توؤں کے خواب پرے نہیں ہوتے، ایک میں بھی سکی۔"

شازیہ نے یہی بتایا تھا مجھے فون پر اس کے جانے کے بعد، شام کے چار بجے شازیہ واپس آئی تھی۔ پیچھے جو ہو اس کا

شمع فروزاں

نسیم بلگرامی

ولید... اسی شمع ہوئی یہ کہ وہ عید سار ہو کر مہی کسی دنیاوی عید کے متعلق نہیں ہوتے۔ صحبت اور یواداری کا درس دیتے ہیں مگر کبھی احسان کے یوادار نہیں ہوتے... آپ کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا... جیہ کم سنی میں ہی آپ کو حج کرنے کا شوق ہوا اور ایک لمبا سفر اختیار کیا... اس کے بعد پھر آپ کو کسی ایک جگہ بیٹھنا بہت کم نصیب ہوا۔

شمع فروزاں



بارہ تیرہ سال کی عمری میں آپ نے خاموشی اختیار کر لی تھی، حصول علم کا بے حد شوق تھا۔ اسی دوران آپ نے حاجیوں کا ایک قافلہ دیکھا جو مکہ معظمہ کی جانب چلا جا رہا تھا۔ آپ نے دوڑ کر قافلے والوں سے ملاقات کی اور کہا: ”کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ لوگ ایک دن رگ جاگیر اور آپ کے قافلے میں، میں بھی شامل ہو جاؤں؟“ قافلے کے امیر نے بڑے کونوختہ دیکھ کر جواب دیا: ”میاں صاحبزادے! آپ کی بھی عمر ہی کیا ہے؟ آپ کے والد کیا

آگئی جو میرے شہر سے بھی صرف دو گھنٹے کے فاصلے پر ہیں ایک مکان میں رہ کر ناہید نے ڈیڑھ سال کے دور امریکن امتحان پاس کر لیے اور ہم سب کی مدد سے ریڈیو کی بھی مل گئی جو ہمیشہ کرنا چاہتی تھی۔ اس سارے وقت کا، خوب صورتی واپس آگئی تھی، وہ دن ناہید بھی جو کرنا چاہتے تھے سارے ساتھ ہوتی تھی۔

ایک دن میں نے دوبارہ اس سے اپنا سوال کر پایا۔ کیوں پڑھی لکھی ہو کر وہ گھونے لاتی، چھپڑ کھاتی رہی۔ آؤ اکثر کیوں بنی تھی وہ اگر اس کو یہی سب کچھ کرنا تھا۔

”بات یہ ہے کہ شادی کے شروع کے دنوں میں ہی پھر اس کے بعد بچے کے بعد دیگرے حل سے ہوتی چلی گئی۔ اور ناہید کی بھی خواہش تھی۔ اسے بچوں کا شوق تھا۔ پھر اس نے اپنے سال ہی پتا نہیں کیا کیا، کچھ بعد دیگرے میرے دور چھوٹے بھائیوں کو امریکا بلوا لیا اور ان کی پڑھائی کی ذمہ داری بھی لے لی۔ انہی دنوں میرے ابو بیمار پڑے تو ایک حلیہ ان کے علاج کے لیے اس نے پاکستان بھیج دی۔ یہ مارا احسان تھے یک کے بعد ایک۔ ایک طریقہ تھا جسے اس نے راضی کرنے کا کہ مجھے پڑھنے کی اور خود مختار ہونے کی ضرورت ہے اور اس جال میں، میں پھنسی چلی گئی۔ شکر۔ سب کچھ برداشت کیا نہ بردستی برقعہ، پردہ، مار پیٹ، چھٹی شادی کا دھوکا، جاسوسی، سب کچھ محض اس لیے کہ اس کے احسانات تھے میرے بھائیوں پر، میرے باپ پر، میرے خاندان پر۔ شاید میں یہ قیمت دیتی ہی رہتی اگر اس دن میرے بیٹے نے 911 کو فون نہ کیا ہوتا۔ اس دن میں نے قیصر ریاست شاز یہ صحیح کہتی ہے کہ میں اس جہنم سے نکلتا ہو گا۔ تم اب سمجھ گئے ہو گے۔“ میری بات اس نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

میرے کچھ کہنے سے قبل بڑی اداسی ہی اس کے چہرے پر آگئی اور وہ بولی کہ اس کے دونوں بھائی ابھی تک اس سے غافل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میں نے خاندان کی عزت امریکا میں بچ دی ہے۔ شکر ہے میں امریکا میں ہوں پاکستان میں نہیں۔ وہاں تو شاید یہ مجھے زندہ ہی جلا دیتے۔ اس کے چہرے پر اداسی گہری ہوتی چلی گئی تھی۔

”خدا کرے میرے بھائیوں کی شادی پاکستان میں نہ ہو۔“ اس نے پھر دہرایا۔

مجھ سے بچے نہیں با۔ میں سوچتا رہا عورت آخر تک لڑے گی دوسروں کے لیے؟ کب کبھی ہوگی اپنے لیے اپنی ذات کے لیے؟

پتا ہم لوگوں کو دو دن کے بعد لگا جب میں اور شاز یہ ہنگامی طور پر کتاس پہنچے۔ ہوا یہ تھا کہ اس دن ناہید اپنے تینوں بچوں کو اسلامک سینٹر کے مسجد کے گھر ان کی بیوی کے پاس چھوڑ کر آئی جس کے شوہر کو ناہید اس کی جاسوسی کے لیے کہہ کر گیا تھا۔ امام صاحب نے اپنے بچے کے ساتھ ناہید کا پیچھا کیا اور دیکھا کہ وہ تین تہا میرٹ ہوئی گئی جہاں سے چھ گھنٹے بعد واپس آئی تھی۔ ہوئی میں چار گھنٹے گزرنے کے ساتھ ہی انہوں نے ناہید کو فون پر یہ خبر دی کہ بچے ان کے گھر پر ہیں اور ناہید کئی گھنٹوں سے ہوئی کے اندر ہے۔

ناہید کے لیے یہ بڑی ہولناک خبر تھی۔ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر فوری طور پر جہاز پکڑ کر واپس آیا اور رات دس بجے غیر متوقع طور پر گھر پہنچ گیا تھا۔ ناہید کے حیرت کے اظہار پر اس نے اس وقت ناہید کی پٹائی شروع کر دی، طرح طرح کے الزامات لگائے، خرافات کہی، گالیاں دیں۔ ”عیاشی کرتی ہے ترا حرا دی۔ یہ مسئلہ دیا ہے میرے احسانوں کا“ کہہ کر نہ جانے کیا مارا تھا کہ ناہید کا چہرہ خونخون ہو گیا تھا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر ناہید کے 9 سالہ بیٹے نے ناہید کی خانے سے 911 پر فون کر دیا اور پولیس پہنچ گئی۔ ناہید کو سراسر اور منہ پرٹائے لگاتے کے لیے اسپتال لے جانا پڑا تھا۔ ناہید کو پولیس اپنے ساتھ لے گئی۔ مگر اچھا یہ ہوا کہ واپس آنے کے بعد ناہید نے جہنم سے نکلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے شاز یہ کو فون کر کے بتایا تھا۔ میں اور شاز یہ دوسرے دن ہی پہنچ گئے تھے۔

میرے سوال کا جواب مجھے اس دن نہیں دیا تھا اس نے کیونکہ اس دن وہ جہنم سے نکلنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ میں نے شہر کے مشہور یہودی وکیل سے بات کی جس نے عدالت سے ابتدائی فیصلہ کر لیا تھا کہ اس کا شوہر اس گھر میں نہیں رہ سکتا۔ پولیس کی زیر نگرانی وہ اپنا کچھ سامان لے گیا تھا۔ عدالت کے حکم کے ہی مطابق اسے ناہید کو گھر اور بچوں کے لیے مہیہ دیئے تھے اور اسے ہفتے میں دو دن سوشل ورکر کے سامنے آ کر بچوں سے ملنے کی اجازت ملی تھی۔ میں نے 20 ہزار ڈالر ناہید کے اکاؤنٹ میں جمع کرائے تھے تاکہ وہ یہ نہ محسوس کرے کہ اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ ناہید کے دونوں بھائی جو دوسرے شہروں میں تھے وہ بھی آئے مگر انہوں نے ناہید پر زور دیا تھا کہ وہ ناہید سے صلح کر لے، کراچی میں اس کے گھر والوں کا بھی یہی خیال تھا مگر میڈیکل کالج والی ناہید واپس زندہ ہو گئی تھی اس نے وہ کیا جس کا فیصلہ وہ کر چکی تھی۔

چھ مہینے کے اندر طلاق کی تمام شرائط طے ہو گئیں اور ناہید بچوں کو لے کر کتاس سے فلوریڈا شاز یہ کے گھر کے پاس

کرتے ہیں؟

لڑکے نے جواب دیا۔ "والدہ بقیہ حیات نہیں، ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ میں اپنی ماں کے ساتھ رہتا ہوں۔ میرا نام ابو بکر ہے۔ کتان فرشتی ان کا پیشہ تھا۔"

امیر قافلہ نے شور مچا دیا۔ "حب پھر تم ابھی ماں کو چھوڑ کر کہیں نہ جاؤ۔ وہ تمہیں اپنے پاس نہ پا کر بہت پریشان ہوں گی۔" لڑکے نے جواب دیا۔ "میں اپنی ماں کی اجازت کے بغیر آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ اسی لیے تو آپ سے یہ درخواست کر رہا ہوں کہ آپ لوگ ایک دن کے لیے ٹھہر جائیں تاکہ میں اپنی ماں سے اجازت حاصل کر لوں۔"

امیر قافلہ نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا تمہاری ماں تمہیں سفر کی اجازت دے دیں گی؟" "کیوں نہیں دیں گی، ضرور دیں گی کیونکہ میں جس مہترک سفر کی اجازت مانگوں گا وہ یہ نہیں ہے جس کی اجازت نہ ملے۔"

امیر قافلہ کو آپ کے شوق سے بڑی دلچسپی ہوئی اور رحم بھی آیا۔ اس نے قافلہ کو روک دیا اور قافلہ پڑاؤ ڈال کر روک گیا۔ آپ سیدھے اپنی ماں کے پاس پہنچے اور درخواست کی۔ "ماں! ایک قافلہ حج کو جا رہا ہے، میں نے ایک دن کے لیے سے روک لیا ہے۔"

ماں نے پوچھا۔ "تو نے اسے کیوں روک لیا؟"

آپ نے جواب دیا۔ "ماں! میں بھی حج کرنا چاہتا ہوں۔"

ماں نے کہا۔ "لیکن تیری ابھی عمر ہی کیا ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "آپ میری عمر کے بجائے میرے شوق دیکھیے۔"

ماں نے بیٹے کو بڑی محبت اور شفقت سے دیکھا، بویس۔ "اتنی سی عمر میں تو باتیں کیسی کرنے لگا ہے؟"

بیٹے نے جواب دیا۔ "ماں! میں باتیں کرتا نہیں ہوں، مجھ سے کوئی باتیں کر دیتا ہے۔"

انہوں نے محسوس کیا، ماں اداس ہو گئی ہیں اور ان کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے ہیں، آپ نے اپنے دامن سے ماں سے شک کرنے چاہے، بولے۔ "ماں! کیا میں معلوم کر سکتا ہوں کہ آپ کی آنکھوں میں یہ آنسو کیسے ہیں؟ خودی کے یا غم کے؟" ماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یہ خوشی کے آنسو ہیں میرے بیٹے! امیر! تم اس کم عمری میں حج کرنے جا رہا ہو۔ بس ابی خوشی میں آنسو نکل آئے۔"

ماں نے بیٹے کو حج پر جانے کی اجازت دے دی۔ آپ کسی انتظام اور اہتمام کے بغیر حج کے قافلے میں پہنچے اور امیر قافلہ سے کہا۔ "آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری خاطر یہاں پڑاؤ ڈالا اور میرا انتظار فرمایا۔"

امیر قافلہ نے شفقت سے کہا۔ "نہیں بیٹے! شکر ہے کی کوئی بات نہیں، میں تمہارے شوق سے خوش ہوں۔"

قافلہ حج رو نہ ہو گیا۔ دوران سفر کئی دن بعد آپ کو اچانک یہ احساس ہوا کہ ماں نے سفر کی اجازت یہ خوشی نہیں دی ہے، بیٹے کو خوش کرنے اور خوش دیکھنے کے لیے دے دی تھی۔ اس خیال کا آنا تھا کہ سفر سے طبیعت چاٹ ہو گئی اور راستے ہی سے واپس آ گئے۔ جب یہ اپنے گھر کے دروازے پر پہنچے تو انہیں دروازہ کھٹکنا نہیں پڑا کیونکہ ماں دروازے پر اس طرح کھڑی تھیں، گویا انہیں پتہ ہی سے معلوم ہو گیا تھا کہ ان کا بیٹا واپس آ گیا ہے۔ بیٹے نے ماں کو سلام کیا اور ماں نے بیٹے کو سینے سے گایا اور سر اور پشت پر محبت سے ہاتھ پھیرتی رہیں۔

بیٹے نے ماں سے پوچھا۔ "ماں! حج بتائیے کیا آپ نے مجھے سفر کی اجازت نہیں دی تھی؟"

ماں نے جواب دیا۔ "میں نے تمہیں سفر کی اجازت دے دی تھی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جب تم چلے گئے تو تمہارے خیمے میرا گھر میں جی نہیں لگتے تھا اور میں نے یہ عہد کر لیا تھا کہ جب تک تم واپس نہیں آ جاؤ گے میں اپنا زیادہ وقت تمہارے انتظار میں دروازے پر ہی گزار دوں گی۔"

آپ نے فرط خوشی میں ماں کو چمکایا اور کہا۔ "ماں! میں بھی آپ سے یہ عہد کرتا ہوں کہ جب تک آپ موجود ہیں میں واپس نہیں آؤں گا۔"

آپ نے کسی کے باوجود مہارت و ریاضت میں غیر معمولی محنت کی۔ درہندہ پشتر وقت خدا کی یاد میں گزارنے لگے۔

شعاع فروزان

آپ کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ یہ ایسا صدمہ تھا کہ بو بکر اس کا اثر ایک عرصے تک محسوس کرتے رہے۔ ان کا اپنے گھر سے دل اچاٹ ہو چکا تھا۔ آپ نے گھر کو خیر باد کہا اور سفر پر نکل کھڑے ہوئے۔ آپ بزرگان دین کے حزاروں پر حاضریاں دیتے رہے۔ آپ قبرستانوں سے گزرتے تو قبر میں سونے والوں کی بے بسی اور بے چارگی سے عبرت حاصل کرتے۔

آپ کی شکتی قبر پر فاتحہ پڑھنے کا تھا۔ تو دیکھا کہ قبر کا کچھ حصہ کھلا ہوا ہے اور اس کھلے حصے سے ایک برہنہ لاش صاف نکلی ہوئی ہے۔ آپ نے اکثر لاشیں دیکھی تھیں اور مردوں کا مشاہدہ کیا تھا، ماں سب کے چہروں میں ایک مشترک کیفیت محسوس ہوتی تھی، اسی کیفیت تھی ان کی بے بسی، اداہیت اور نزع کے وقت کا کرب، جو مرنے کے بعد بھی مرنے والوں کے چہروں پر باقی رہتا ہے۔ ان لاشوں کی صورتیں دیکھ کر آپ فاتحہ پڑھ چکے کے بعد اس مردے کو کچھ دیر غور دیکھتے رہے، پھر اپنے آپ سے سوال کیا۔ "خیر! یہ کون سی بات ہے کہ اس مردے کے چہرے پر کرب و ذلت کے بجائے مسکراہٹ پائی جاتی ہے؟"

آپ نے یہ سوال خود سے کیا تھا لیکن آپ کا جواب کسی اور نے دیا۔ کوئی کہہ رہا تھا۔ "مسکراہٹ میرے چہرے کی مسکراہٹ پر حیرت کیوں ہے؟"

آپ نے ادھر ادھر دیکھا کہ یہ جواب کس نے دیا۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو بہ آواز بلند سوال کیا۔ "تم کون ہو جو میری بات کا جواب دے رہے ہو؟"

آپ کو جواب ملا۔ "ذرا ادھر دیکھو میری طرف، میں جو شکتی قبر میں پڑا ہوں، تمہاری مات کا میں ہی جواب دے رہا ہوں۔" آپ نے ایک بار پھر حیرت سے شکتی قبر کے مردے کی طرف دیکھا۔ آپ کو جھرمیری سی آگئی، بولے۔ "اگر تم خود ہی میری بات کا جواب دے رہے ہو تو میں تم سے پوچھتا ہوں کہ تمہارے چہرے پر موت کا کرب و ذلت کیوں نہیں؟ یہ غلبہ و وقار مسکراہٹ کیوں پائی جاتی ہے؟"

مردے نے جواب دیا۔ "الحمد للہ! تعجب ہے کہ تم اللہ کی محبت کا دم تو بھرتے ہو لیکن اس رحمت سے واقف نہیں ہو کہ جو لوگ "عشق خداوندی" میں جلتے ہوئے ہیں وہ دنیا کی کسی بھی لذت و کرب سے لاعلم اور بے نیاز ہوتے ہیں۔ "عشق خداوندی" کی لذت انہیں حال میں بے نیاز اور خوش رکھتی ہے۔"

آپ حج مار کر رو دیے، تہذیبی کر تے ہوئے بولے۔ "اے اللہ! لیکن اللہ تعالیٰ میں ابھی تک اس راز سے ناواقف تھا کہ "عشق خداوندی" انسان کے تمام دکھوں کو بے اثر بنا دیتا ہے۔" وہ کتنا عبرت کا مقام ہے کہ میں راوی عشق میں ہنوز مبتدی، درنا تجربہ کار ہی ہوں۔" آپ کو جواب ملا۔ "یہ! تم کس کی شکایت کس سے کر رہے ہو؟ گلہ اور شکوہ سچے عاشقوں کا شیوہ نہیں۔ جو عاشق صادق ہیں وہ راضی برضاے محبوب ہوتے ہیں اور گلہ و فریاد سے انہیں ذرا بھی سروکار نہیں ہوتا۔"

آپ نے فوراً سکوت اختیار کیا، درود میں یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ آئندہ خاموش ہی رہیں گے لیکن پھر خیال آیا کہ انسان کو جو کچھ ملتا ہے اس میں توفیق ایزدی اس کے شامل حال ہوتی ہے اس لیے ضروری ہے کہ خدا سے یہ توفیق مانگ لی جائے۔ اس خیال کا آنا تھا کہ آپ نے آسمان کی طرف دیکھا اور دعا کی۔ "خدا یا! میں تیرا جزو درجہ بندہ تجھ سے اس توفیق کے سوا کچھ بھی نہیں مانگتا جس کا حظ تجھ سے ہے، تیری ذات سے، تیری مہربانیوں و دروازوں سے ہے۔ میں تجھ سے تیری توفیق چاہتا ہوں۔"

آپ کو سوتے میں روپائے صادق ہوئے، اس کی نے آپ کو مطلع کیا۔ "سن! تیری دعا قبول ہوئی، توبے فکر رہ۔"

آپ کی جیسے ہی آنکھ کھلی آپ نے فوراً ایک اور دعا مانگی، بولے۔ "میرے سوا! میری ایک، درود قبول فرمائے۔"

آپ کو رگ گلو سے جواب ملا۔ "بول، وہ کون سی دعا ہے؟"

آپ نے خوشی اختیار کی، بولے۔ "میرے سوا! میں جانتا ہوں کہ تو رگ گلو سے زیادہ قریب ہے، جب تو مجھ سے خود ہی غیض ستاؤ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تو عالم الغیب ہے اور دلوں کے حجب سے واقف ہے۔ میں اپنی دعا کو کیا بیان کروں تو خود ہی سمجھ لے گا۔"

جواب ملا۔ "ابھی۔۔۔ کیا تو مجھ سے یہ دعا نہیں مانگ رہا تھا کہ میں تیرے قص اور کردوں؟"

آپ کا دل بھر آیا، عاجزی سے جواب دیا۔ "بیشک خداوند بیگ، میں انسان ہوں اور انسان غلط و نیکی کا چمکنا ہے۔ میں تجھ سے دعا کرتا ہوں کہ تو میرے عیوب اور نقائص کو دور فرما دے۔"

آپ کو جواب ملا۔ "میں نے تیری دعا قبول کی، کچھ۔"

کر رہا تھا میں اس سے زیادہ تھک رہا تھا جب تو اپنی عبادت سے فارغ ہو جاؤ تو اس رقم کو مصلے کے نیچے سے نکال کر اپنے خرچ میں لے آنا۔ میں کوشش کروں گا کہ تیری اور زیادہ خدمت کر سکوں۔“

آپ یہ کہہ کر چلے آئے اور اپنی طبیعت میں ہلکا پن محسوس کیا۔ اس ان آپ کی خدمت میں معلوم نہیں کیا کیا باتوں سے لوگ آئے ہوئے تھے اور آپ سے طرح طرح کے سوالات کر کے روحانی تسکین حاصل کر رہے تھے۔ ان میں ایک خراسانی بھی شامل تھا۔ یہ آپ سے عجیب تھا کہ اپنے والے سوالات کر رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”حضرت! کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ ہمارے سب سے زیادہ سودمند کیا شے ہے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”زہد و سخاوت اور نصیحت۔“ سوال کرنے والے نے اس کی وضاحت چاہی، پوچھا۔ ”وہ کس طرح؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”زہد اس لیے کہ اس کے انتہا تک میں انسان سب کچھ بھوس چاتا ہے اور دنیا کی برائیوں کا موقع نہیں ملتا۔ عبادت اس لیے مفید ہے کہ انسان کے پاس کوئی چیز ذخیرہ نہیں ہوتی اور دوسروں کا اس سے کام نکلتا ہے، انسان، انسان کے کام آتا رہتا ہے اور جب کسی انسان کے پاس کوئی چیز ذخیرہ ہی نہیں ہوگی تو انسان اس کے حرص و طمع میں بھی مبتلا نہ ہوگا جو بہت ساری برائیوں کی جڑ ہے۔ اسی طرح انسان کا دوسروں کو نصیحتیں کرتے رہنا بھی بہت مفید ہے۔ جب یہ دوسروں کو کسی اچھی بات کی نصیحت کرے گا تو اس پر خوش ہو جائے گا اور کار بند رہنے کی کوشش کرے گا۔ گویا کوئی انسان جب کسی کو نصیحت کرتا ہے تو اپنے آپ کو اس نصیحت پر کار بند ہونے کا پابند سمجھتا ہے اور اس طرح یہ شخص شب و روز کے بیشتر اوقات میں خود اپنی اصلاح کرتا رہتا ہے۔“

اس شخص نے ایک اور سوال کر دیا، پوچھا۔ ”زہد کیا شے ہے اور آپ زہد کسے کہتے ہیں؟“ آپ نے جواب دیا۔ ”زہد کے بجائے میں زہد کی بابت بتاؤں گا، اسے شخص ازاد وہ ہے جو نہ ملنے پر بھی خوش رہے۔ زہد کی ہر ذرا لگی میں مشغول رہے۔ جب مصائب پڑیں تو صبر سے کام لے اور راضی ہو جائے الہی رہے۔“

اس شخص نے کہا۔ ”تو گویا آپ اس طرح تصوف کی تعریف فرما رہے ہیں؟“ آپ نے جواب دیا۔ ”ہاں، صوفی انہی باتوں پر قائم رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تصوف سرتاپا خلاق ہے اور جس شخص میں اخلاق کی عقل زیادتی ہوگی اس میں تصوف بھی اتنا ہی زیادہ ہوگا۔“

آپ ابھی ان سوالات کے جوابات سے بھی فارغ نہ ہوئے تھے کہ وہ شخص آگیا جس کے مصلے کے نیچے آپ دو سو درہم رکھ کر آئے تھے۔ اس نے آتے ہی دو سو درہم آپ کے آگے پھینک دیے اور ناخوشوار لہجے میں بولا۔ ”حضرت! آپ نے یہ کیا غضب کیا کہ میری عبادت کی لذت ہی چھین لی۔ میں گنتے خشوع و خضوع سے اللہ کے دربار میں کھڑا تھا کہ اچانک میرے کانوں میں آواز آئی۔“ ”اے شخص! مجھے افسوس ہے کہ میں دو سو درہم کی حقیر سی رقم ہی تیری خدمت میں پیش کر سکا ورنہ میں تجھے اس سے زیادہ دینا چاہتا تھا۔ جب تو اپنی عبادت سے فارغ ہو جائے تو اس رقم کو مصلے کے نیچے سے نکال کر اپنے صوفیوں میں لے آنا۔ میں یہ کوشش کروں گا کہ تیری روز زیادہ خدمت کر سکوں۔ ابو بکر! کیا تم جانتے ہو کہ تمہاری یہ آواز میرے حق میں کیا ثابت ہوئی؟ یہ ایک شعلہ تھا جس میں میری عبادت کی لذت جل گئی، پانی تھا جس میں میرے شوق کی آگ بجھ گئی۔ آہ، یہ تم نے کیا غضب کر دیا۔ کیا تم جانتے ہو کہ وہ پورے روز اور لہذات میں نے کتنے میں خریدے تھے؟“

آپ نے پشیمان ہو کر دریا ست کیا۔ ”تو نے وہ لذات کتنے میں خریدے تھے؟“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”ستر ہزار درہم میں، میرے پاس میرے کاروبار سے جو کچھ آتا تھا، یہ ستر ہزار درہم اس کے علاوہ

میرے پاس موجود تھے اور مجھ پر ان درہم کا جتنا نشر ہوتا تھا کچھ میں ہی جانتا ہوں۔ اس نشے سے شہ محبت الہی دور رہتا تھا۔ میں عبادت کرتا تھا لیکن عبادت کی لذت سے محروم رہتا تھا۔ آخر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ مجھے ان ستر ہزار درہم کی لعنت سے نجات حاصل کرنا ہے۔ چنانچہ میں نے انہیں خدا کی راہ میں اہل احتیاج میں تقسیم کر دیا اور اس کے بعد یاد الہی میں مشغول ہو گیا اور خوش قسمتی سے وہ لذت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا جس کی بہت دنوں سے آرزو کر رہا تھا۔ لیکن جب تم نے دو سو درہم میرے مصلے کے نیچے رکھے اور اس کی شے بہ آواز بلند اطلاع دی تو میں نے یہ محسوس کیا کہ میری آواز اڑی کے پر سکون تالاب میں دو سو درہم پھینک کر تم نے ارتقا ثما پیدا کر دیا ہے۔ آہ، یہ تم نے کیا کیا۔ یہ اپنے دو سو درہم سنبھالو، اگر یہ صورت برقرار رہی تو میں تمہاری محبت سے کنارہ کشی اختیار کر لوں گا۔“

آپ نے غریب جوش میں کہا۔ ”اس خداوند! اس۔ تیرا کس طرح شکر ادا کروں؟ میں نے جو انکا مجھے اس زیادہ ہی دعا۔ اس دعا کے بعد آپ پر بے خودی طاری رہنے لگی، بہت کم ہوش آتا اور جب ہوش آتا تو زبان سے اللہ اللہ کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ کافی عرصہ بعد کچھ ہوش آیا تو خیال آیا کہ۔ اسی بے خودی اور بے نیازی کس کام کی تھی۔ میں نے اپنے رب سے کچھ مانا ہے۔“

آپ نے کہا۔ ”خدا یا یہ مجھ کو کیسے ہو گیا ہے کہ میں تجھ سے کچھ مانگ ہی نہیں رہا۔“ آپ کو جواب دیا۔ ”ابو بکر! تمہیں یاد ہے کہ تم نے مجھ سے دعا مانگی تھی کہ میں تیرا نقشہ دور کروں اور تجھے یہ دیت بھی معصوم نہ میں نے تیری دعا قبول بھی کر لی تھی۔ چنانچہ ہر بار دوست طلب بڑھتا ہے یہ میں ایک شخص ہے۔ اور میں نے تیرے نفس تجھ سے کروا دیے ہیں۔ اس لیے تو مجھ سے اب کوئی دعا بھی نہیں مانگ رہا۔“

ابو بکر بے اختیار حد سے مل کر گئے، بولے۔ ”خدا یا! تو کتنا مدد نواز ہے۔ شدت جذبات سے میرا کھچا بھٹا جا۔ کاہر، شوق ہو جائے گا۔ تیری بندہ نوازیوں اور کرم فرمائیوں ایسی نہیں کہ انسان بے آسانی پشیمانی کر سکے۔“

آپ کو جواب دیا۔ ”ابو بکر! تم تیرے میں جب یہ بات نے پانگی کہ تم تیرے میں تو کچھ تجھے طلب کی ضرورت تھی۔ اور میں آپ کے ہم عصر ایک دوسرے بزرگ ابو حسن مزین نے اللہ کے توکل پر اپنا سفر شروع کیا تو انہیں ایسے ایسے واقعات پیش آئے اور کچھ ایسی واردات قلبی گزریں کہ انہیں خود پر زعم سا ہو گیا اور انہیں یہ فکر محسوس ہوا کہ میں اس دور کا تقسیم بزرگ ہوں۔ دوسرے نے اللہ کے بھروسے پر کسی زہد و سفر کے بغیر ہی سفر شروع کر دیا ہے اور کسی کے سامنے دست طلب نہیں دراز کر رہا ہوں۔ ابو حسن! دل میں یہ خیال گزر رہی تھا کہ کسی نے انہیں ڈنٹ دیا اور کراہت لگے میں کہا۔ ”ابو حسن! تو اپنے نفس کے ساتھ دروغ تو کہتا ہے کہ ہمت۔“

ابو الحسن مزین نے، زہد کی طرف مڑ کر دیکھا تو اپنے پاس ابو بکر کو بھڑکے ہوئے دیکھا، شرمندگی سے بولا۔ ”حضرت! میں نے جس شخص کے تکبر پر شرمندہ ہوں۔ واقعی یہ دروغ گوئی ہے مگر یہ دروغ گوئی میں نہیں میرا نفس کر رہا ہے۔“

آپ نے ابو الحسن کو نصیحت کی۔ ”ابو الحسن! یہ غلطی تھی کہ تم خود وہاں سے غصہ کر رہے ہو۔ تم در نفس تک اللہ میں، دہنوں تک ہی ہونی غلط تھی بھی نہیں مگر کہہ سکتی ہے۔ اس لیے تمہاری بھلائی ہی میں ہے کہ تم خود کو اپنے نفس اور اس سے الگ نہ تصور کرو۔“

آپ کی شہرت نے آپ کے ارد گرد مریوں، دربار، حرموں کا مجمع بنا دیا۔ یہ لوگ بے وقت آپ کو گھیرے رہتے، اس سے آپ کو بڑی زحمت پیش آتی اور پریشان ہو جاتے لیکن اس خیال سے لوگوں کو منع نہیں کرتے کہ کہیں کسی کی دل آزاری نہ ہو جائے۔ لوگوں میں ایک ایسا شخص بھی شامل تھا جس کی موجودگی آپ کو سب سے زیادہ گراں گزرتی لیکن اس سے منع نہ رہتا۔ یہ شخص بڑے مشغول و مشغوع سے رہتا اور اپنے زہد و تقویٰ سے دوسروں سے متن رہتا تھا۔

آپ کو یہ محسوس ہوتا کہ یہ شخص نام و نمود کا بندہ ہے اور اس طرح اپنی نمائش کرتا رہتا ہے۔ کچھ ارادت مند بھی اس کی عبادت نمود و نمائش تصور کرتے تھے۔ کسی مرید نے کہا۔ ”حضرت! یہ شخص عجیب غریب ہے، کم ہوتا ہے، کسی شخص کا کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ یہ انہیں ہے اس شخص کو اپنے رہد و رفتی پر بڑا تار ہے۔ آپ اس شخص کو کیوں گوارا کرتے ہیں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”اے شخص! یہ سو غشی ہے۔ کسی کے بارے میں بدگمان نہیں ہونا چاہیے۔ آدمی کے ظہور و باطن میں بہت مطابقت ہوتی ہے اور اس عدم مطابقت سے خدا خوب واقف ہوتا ہے۔ ہم اس قسم کا حساب کتاب کیوں کریں۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ دوسرے مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔“

مقرر خض چپ ہو گیا۔ لیکن ڈرامی ویر کے لیے آپ کو بھی یہ خیال آیا کہ یہ شخص نمائش ضرور ہے اور ہم سب پر چنی چاہا نہ ہو ڈالنا رہتا ہے۔ آپ اس دوسروں میں جہاں تھے کہ اندر سے آواز آتی۔ ”اے ابو بکر! تو یہ کیا سوچ رہا ہے؟ اگر دیکھنا ہی ہے تو اپنے منہ دیکھ، دوسروں کے عیب دیکھنے کی کیوں کوشش کر رہا ہے؟“

آپ کی حالت غیر ہونے لگی۔ یہ ایک تازیانہ تھا جس نے آپ کو مضطرب و بے چین کر دیا۔ آپ نے اس سوانحی کی تلاوی پڑھی کہ اپنی جہان کی کے دو سو درہم نے اس شخص کے پاس پہنچ گئے۔ اس وقت وہ مصروف عبادت تھا۔ آپ کچھ دیر اس سے کچھ دور سے رہے لیکن جب یہ محسوس ہوا کہ اس کا کوئی بھر دسا نہیں ہے کہ کب تک یونہی عبادت میں مصروف رہے، آپ نے وہ دو سو درہم مصلے کے نیچے رکھ دیے اور بہ آواز بلند کہا۔ ”اے شخص! مجھے افسوس ہے کہ میں یہ دو سو درہم کی حقیر سی رقم ہی تیری خدمت میں لے

آپ نے وہ دوسو درہم تو واپس لے لیے لیکن اس وقت آپ جیسی شرمندگی اور ندامت محسوس کر رہے تھے، کچھ وہی جانتے تھے ذرا دیر سر جھکا کے رہنے کے بعد آپ نے اس شخص کی طرف دیکھا اور وہ فوراً جذبات میں کہا۔ ”اے شخص! میں نے واقعی غلطی کی ہے مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس وقت میں خود کو بہت ہی ذلیل و خوار اور سوائے زمانہ سمجھ رہا ہوں تو، ایک عظیم انسان سے۔ اس غلطی کی عفت کا ذرا سا حصہ مجھے بھی مل گیا ہوتا۔“

آپ باب شیبہ سے نکلے تو دیکھا کہ ایک عمر رسیدہ شخص کھڑا ہے، آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ آپ جیسے ہی اس کے قریب پہنچے اس نے بے آواز بند کہا۔ ”السلام علیکم!“

آپ نے جواب دیا۔ ”وعلیکم السلام۔“ اس شخص نے کہا۔ ”جناب! آپ صورتِ شکل سے تو بڑے اچھے آدمی نظر آتے ہیں۔“

آپ نے عاجزی سے جواب دیا۔ ”اچھی اور بے عیب ذاتِ خدا کی ہے۔ میں انسان، مجسمہ، خطا و تسیان۔ آپ اپنی مثال آپ کریں۔“

اس شخص نے متبسم ہو کر عرض کیا۔ ”جناب! والد! مجھے معلوم ہوا ہے کہ مقامِ ابراہیم میں ایک بزرگ احادیث بیان فرما رہے ہیں، میری درخواست ہے کہ آپ بھی تشریف لے جائیں۔“

آپ نے پوچھا۔ ”کیا وہ بزرگ کوئی محدث ہیں؟“ جواب ملا۔ ”ہاں، وہ محدث ہیں۔“

آپ نے پوچھا۔ ”وہ بزرگ کس سند سے احادیث بیان کرتے ہیں؟“ ان بزرگ نے جواب دیا۔ ”حضرت عبدالرحمن، حضرت معمر، حضرت ذہری اور حضرت ابو ہریرہؓ کی اسناد سے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”لیکن بھئی میرے ایسے کسی اور سے حدیث سن کر کیا کروں گا کیونکہ خود میرا دل تو میرے رب کی سند سے احادیث بیان کرتا ہے۔“

ان بزرگ نے آپ کو سر سے پیر تک دیکھا اور پوچھا۔ ”یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟ اس کی کوئی سند؟“ آپ نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”آپ اس کی مجھ سے سند مانگ رہے ہیں واللہ! آپ یہ فرمائیں کہ کیا آپ حضرت خضرؑ یا اسلام نہیں ہیں؟ میں نے آپ کو کسی تعارف کے بغیر پہچان لیا ہے۔“

وہ بزرگ حیران اور ششدر رہ گئے، بولے۔ ”ابو بکر! بخدا میں آج تک اسی دہم میں تھا کہ اس دنیا میں ایک بھی ایسا آدمی نہیں ہے جو مجھے پہچان سکے اور میں اسے نہ پہچان سکوں۔ لیکن آج مجھے معلوم ہوا کہ یہاں ایسے بھی ولی موجود ہیں جن سے میں خود کو ناواقف ہوں۔ لیکن وہ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”جناب خضرؑ، میں نے خود کو پہچان کر آپ کو پہچاننا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جس نے خود کو پہچانا، اس نے مجھے پہچانا۔ میرے لیے آپ کی پہچان کوئی ایسا نازک مسئلہ نہیں ہے۔“

اس کے بعد حضرت خضر علیہ السلام آپ سے بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ آپ کا منہ اس پر چادر ڈالے کہیں تشریف سے جا رہے تھے، راستہ سنسان تھا۔ جب آپ ایک موڑ پر پہنچے تو ایک طرف سے ایک شخص اپنے چہرے کو چھپائے ہوئے نمودار ہوا، آپ کے کانہ سے چادر اتار کر فرار ہو گیا۔ آپ نے اسے بھاگتے ہوئے دیکھا مگر اس کا تعاقب نہیں کیا اور یہ دستور چلتے رہے۔ ظہر کا وقت تھا، آپ مسجد میں داخل ہوئے، نماز ادا کی اور دعا سے فارغ ہو کر پیسے مسجد سے باہر نکلے، آپ نے دیکھا ایک شخص آپ کی چادر لیے کھڑا ہے۔ آپ نے اس شخص پر کوئی توجہ نہیں دی اور اپنی راہ بولے۔ وہ شخص چادر لیے ہوئے آپ کی طرف دوڑا، بول۔ ”حضرت! آپ اپنی چادر تو لے لیجیے۔“

آپ نے پوچھا۔ ”کیا تیری ضرورت نکل گئی؟“ اس شخص نے حیرت سے کہا۔ ”میری ضرورت کیا معنی؟ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھتا؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”میرا مطلب صاف ہے۔ اگر تجھے چادر کی ضرورت نہ ہوتی تو تو کبھی میرے کانہ سے اتار کر فرار نہ ہوتا۔ میں نے اسی خیال سے تیرا پیچھا نہیں کیا کہ تو اس چادر کا مجھ سے زیادہ ضرورت مند ہے۔“

اس شخص نے شرمندگی سے گردن جھکا لی، دوتے ہوئے کہا۔ ”آپ خدا کے لیے اپنی چادر واپس لے لیجیے۔“

نے پھر سوال کیا۔ ”آخر کیوں؟ کیا تم واقعی اس چادر کی ضرورت نہیں محسوس کر رہے ہو؟“

اس شخص نے یہ دستور دیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اس چادر کی نہ تو پہلا ضرورت تھی اور نہ ہی آج اس کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔ میں نے آپ کی چادر عداوت پر اتاری تھی، حضرت! میں عادی چور ہوں۔“

آپ نے کہا۔ ”چلو، میں نے مان لیا کہ تم عادی چور ہو، ضرورتاً نہیں عداوت چوری کرتے ہو مگر میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم میری چادر واپس نہیں کر رہے ہو؟“

چور نے جواب دیا۔ ”مجھے آپ کی چادر چرانے کی یہ ترین مزا مل چکی ہے۔“

آپ نے کہا۔ ”یعنی؟ میں تمہاری بات نہیں سمجھا۔“

چور نے عاجزی سے جواب دیا۔ ”حضرت! آپ جو بل مار فائدہ سے کام لے رہے ہیں وہ نہ اصل واقعہ یہ ہے کہ آپ اس سزا سے، اچھی طرح واقف ہیں جو چادر چرانے کے سلسلے میں مجھے مل چکی ہے۔“

آپ نے چور کے ایک ہاتھ کی طرف دیکھا جو بالکل خشک، دریا کا پتھر جیسا تھا۔ آپ نے اس ہاتھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا تو نے اسی ہاتھ سے چادر چرائی تھی؟“

چور نے جواب دیا۔ ”جی جناب!“

آپ نے اس کا خشک ہاتھ پکڑ لیا اور اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا یہ پہلے بالکل درست تھا؟“

چور نے جواب دیا۔ ”جی جناب والا۔“

آپ نے مسکرا کر پوچھا۔ ”اب تو کیا چاہتا ہے؟“

چور نے جواب دیا۔ ”میں نے آپ کی چادر واپس کر دی ہے اور اب یہ چاہتا ہوں کہ آپ دعا فرمائیے کہ میرا یہ خشک ہاتھ دوبارہ ٹھیک ہو جائے۔“

آپ نے چور سے کہا۔ ”عظمتِ الہی کی قسم کہ مجھے چادر کے جانے کا ذرا بھی مدد نہ تھا اور نہ اس کے دوبارہ پانے کی خوشی ہے اس لیے تیرے ہاتھ کے خشک ہوجانے کا مجھے ملال تو ہے لیکن خوشی ذرا بھی نہیں۔ اس لیے میں بارگاہِ رب العزت میں دستِ بدعا ہوں کہ خدا تیرا ہاتھ درست فرما دے۔“

آپ نے چور کو یہ محسوس ہو گیا اس کے ہاتھ میں خون دوڑنے لگا ہے اس نے اپنے ہاتھ کو ادھر ادھر حرکت دی اور جب یہ اچھی طرح چھین ہو گیا کہ یہ ہر اس میں کوئی خرابی نہیں نظر آتی تو اس نے آپ کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور آپ کو دعا دیتا ہوا چلا گیا۔

آپ نے چادر دوبارہ اپنے کانہ سے پر ڈال لی۔ آپ نے دورانِ وعظ فرمایا کہ۔ ”لوگو! میں کئی مصیبتوں میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ مجھے ان سے بچاؤ۔“

اس وقت آپ کے آس پاس بہت سارے مرید جمع تھے۔ ایک مرید نے پوچھا۔ ”خدا خیر کرے، کیا آپ بتائیں گے کہ ان دلوں آپ کس مصیبت یا کن مصیبتوں میں گرفتار ہیں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”عذاب، مصیبت اور ذلت میں گرفتار ہوا ہوں اور ان تینوں سے سر دست نجات مشکل نظر آ رہی ہے۔“

اس مرید نے عرض کیا۔ ”حضرت! یہ مرید باتیں ہماری سمجھ میں بھی نہیں آتیں۔ آپ وضاحت سے بیان فرمائیے تو شاید آپ کے کام آجاسکے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”اے شخص! میں ان دنوں مخلوق کی محبت میں گرفتار ہو چکا ہوں اور مخلوق کی محبت میں گرفتار ہونے کا یہ مطلب ہے کہ میں ایک عذاب جھیل رہا ہوں۔ تم لوگ دعا کرو کہ کسی طرح اس عذاب سے نجات پا جاؤں۔ اس کے بعد ذرا سکون کی سانس لے سکوں گا۔“

مرید نے پوچھا۔ ”اور جناب! وہ کون سی مصیبت ہے جس میں آپ آج کل گرفتار ہیں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”جس طرح مخلوق کی محبت باعثِ عذاب ہے اسی طرح اس کی محبت باعثِ مصیبت ہے اور میں آج کل مخلوق کی محبت کی وجہ سے اس کی محبت میں بھی رہنے لگا ہوں اور اس کی محبت باعثِ مصیبت ہے۔“

مرید نے پوچھا۔ ”اور حضرت! یہ ذلت کیا چیز ہے؟ اور آپ کس قسم کی ذلت میں گرفتار ہو چکے ہیں اور کس طرح؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”بھائی میرے! جس طرح مخلوق کی محبت باعثِ عذاب اور اس کی محبت باعثِ مصیبت ہے اسی طرح

خلوق سے ربط مضبوط باعث ذلت ہے اور میں آج کل مخلوق سے ربط مضبوط پیدا کیے ہوئے ہوں جو میرے حق میں ذلت کا سبب ہے۔
مرید اپنا سامنے لے کر رہ گیا۔

اسی رات آپ نے خواب میں دیکھا کہ ایک نہایت حسین شخص آپ کے پاس کھڑا ہوا ہے۔ آپ نے اس سے پوچھا۔ "اے بھائی! خدا تم سے راضی ہو، آخر تم ہو کون؟ مجھے تو تم بہت اچھے لگتے رہے ہو۔"

اس خوب و شخص نے جواب دیا۔ "ابو بکر! میں تقویٰ ہوں اور مجھے خدا نے مقیم دیا ہے کہ میں آپ کے پاس آ جاؤں۔" ابھی ان دونوں میں یہ گفتگو ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ آپ نے اپنے بائیں طرف دیکھا ایک نہایت بد صورت عورت کھڑی تھی۔ اس کی صورت سے وحشی پن نکل رہا تھا۔ آپ نے اس عورت سے پوچھا۔ "اے بھائی! تم کون ہو اور یہاں میرے پاس کیا لینے آئی ہو؟" عورت نے جواب دیا۔ "ابو بکر! میرا نام مصیبت ہے اور میں ہمیشہ سے ان کے دوس میں رہتی ہوں جو اہل نشاء ہدایت سے ہیں۔ آپ نے خوب و شخص سے پوچھا۔ "اور تم کہاں رہتے ہو؟"

اس نے جواب دیا۔ "جناب! میرا مسکن غزدوں کے قلوب میں ہے۔" جب آپ بیدار ہوئے تو آپ پر اس خواب کا گہرا اثر تھا اور آپ نے یہ عہد کر لیا کہ جب تک زندہ ہوں ہمیشہ فگن زندگی بسر کروں گا۔ صبح جب آپ وضو کے لیے کھڑے ہوئے آپ کا دل بڑا گداز ہو رہا تھا۔ آپ نے لوگوں سے پوچھا۔ "لوگو! تم مجھے ان سمجھتے ہو یا آزاد؟"

آپ کو جواب ملا۔ "آزاد یہ ظاہر اور گرفتار باطن۔" آپ نے فرمایا۔ "نہیں۔ ولیہ اللہ ظاہر میں اسیر اور باطن میں آزاد ہوتے ہیں۔" اس کے بعد فرمایا۔ "لوگو! صوفی وہ ہے جو عبادت کو مشقت نہ سمجھے کیونکہ جب عبادت پر مشقت کا احساس ہوئے لگے تو گویا عبادت کی لذت اور حلاوت ختم ہو چکی ہے۔" جب عبادت میں لذت اور حلاوت ہی باقی نہ رہے تو گویا اس کی طبیعت تصوف پر مکمل نہیں رہتی۔ کسی نے پوچھا۔ "ایسی صورت میں، استغفار کا سہارا تو لیا جاسکتا ہے۔"

آپ نے کہا۔ "اے شخص! کیا تو استغفار کے معنی جانتا ہے؟" اس نے جواب دیا۔ "کیا استغفار۔" اس کے معنی اس کے علاوہ بھی کچھ ہیں، جن سے ہم سب واقف ہیں؟" آپ نے فرمایا۔ "استغفار کے کئی معنی ہیں۔ معصیت کے بعد ندامت کے ساتھ توبہ کرنا، یہ استغفار ہے۔ بعد از توبہ یہ کہ کبھی قصد نہ کرنا، یہ بھی استغفار ہے۔ مرنے سے پہلے حقوق اللہ کی تکمیل کر دینا، یہ بھی استغفار ہے۔ توبہ نے جس جسم کو ایسی مشقتوں میں رکھا جن کا جسم سے کبھی واسطہ نہ پڑا ہو اور ایسا لگے گویا جسم بہت آرام اٹھا چکا ہے، یہ سب استغفار ہے۔ اگر کوئی شخص مذکورہ ہمت کا سہارا لے گا تو وہ ضرور عبادت کی لذت اور حلاوت کو دوبارہ حاصل کر لے گا۔ کیونکہ جب اس طرح توبہ کی جاتی ہے تو فوراً دیر مشقت کھل جاتا ہے۔"

آپ سے پوچھا گیا۔ "اور جناب! یہ توکل کیا چیز ہے؟" آپ نے جواب دیا۔ "اتباع علم اور کامل یقین کا دوسرا نام توکل ہے۔" کسی اور نے سوال کیا۔ "جناب! میں اپنی چھوٹی چھوٹی حق باتوں کی تکمیل کے لیے بے چین ہو جاتا ہوں، اس پر کس طرح حاصل کروں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ جب تک فیندا چھی طرح غلبہ نہ حاصل کرے، ہمت سو۔ جب تک بھول پوری شدت سے نہ لگے، ہمت کھاؤ۔ جب تک بات کرنے کی شدید ضرورت نہ محسوس ہو، ہمت بات کرو۔" آپ نے مزید فرمایا۔ "جب تم ان تینوں پر قابو پا لو گے تو دوسری چیزیں بھی قابو میں آ جائیں گی۔"

کسی اور نے سوال کیا۔ "حضرت! دین کی اساس کون سی چیزیں ہیں؟" آپ نے جواب دیا۔ "تین چیزیں۔" پوچھا گیا۔ "کون کون سی تین؟"

آپ نے جواب دیا۔ "اول حق، دوم عدل، سوم صدق۔ حق کا تعلق اعضاء سے ہے یعنی اعضاء کے ذریعے ذکر الہی کرتے رہو۔"

شعب قرواں

عدل کا تعلق قلب سے ہے یعنی بذریعہ قلب نیک اور بد میں تمیز کرو اور صدق کا تعلق عقل سے ہے یعنی عقل کے ذریعے خد و بی خد پر ہر روز نیم حری دنیا میں پھر کر خدا کے بندوں کی گریہ و راری اور طلب معذرت اپنے دوش پر خدا کے حضور لے جاتی ہے۔" آپ نے رات کو رسول مقبول ﷺ کو خواب میں دیکھا۔ آپ نے بڑی بڑی سے درخواست کی۔ "یا رسول اللہ! مجھے کوئی ایسا عمل بتا دیجیے جس سے جس دھوس کا خاتمہ ہو جائے۔"

جواب ملا۔ "پھر سو! ہر روز چالیس بار دعا گو پڑھا کرو۔" "وما سبی ما فیہ ولا لہ من اسلک۔ بحسب فلسفہ سورہ معر فک ابدال۔"

آپ نے بیداری کے بعد اس پر عمل کیا تو اس کے حیرت انگیز اثرات ظاہر ہوئے۔

ایک دن آپ کے پاس ایک درویش آیا۔ آپ نے قدموں میں بیٹھ کر راز و قطار روئے لگا۔ آپ نے پوچھا۔ "اے شخص! کچھ پر کیا افتاد پڑی جو توبوں ذرا وقتدار ہو رہا ہے؟"

درویش نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "بابا! میں توبہ دہر پاد ہو گیا۔ اب میں کیا کروں؟" آپ نے دریافت کیا۔ "کچھ بتاؤ سنی، بات کیا ہوئی؟"

درویش نے روتے ہوئے کہا۔ "میں نے صبر اور قناعت کا راستہ اختیار کیا تھا اور اس میں تمام ثابت قدم رہا تھا کہ بڑے بڑے شخص اور سے گزر گیا اور اپنے صبر اور قناعت میں کسی قسم کا ضعف نہیں آنے دیا۔"

آپ نے کہا۔ "تو فضول باتیں زیادہ کرتا ہے اور کام کی کم، ہوا کیا؟ بس یہ بتاؤ؟"

درویش نے دم لیتے ہوئے کہا۔ "حضرت! اونی تو میں بتانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں نے صبر اور قناعت کی روش اختیار کی اور بڑے دشو ر مرحل سے بھر، بولی گر گیا۔ پھر میں فاقوں کی سمیٹ میں گھر گیا۔ فاقوں کی لذت میں مجھے یوں محسوس ہوئے گا گویا اب میں نام کام ہو چکا ہوں کہ آگے دست میں دروازے پر مجبور ہو جاؤں گا۔"

آپ نے لکھو اے پوچھا۔ "پھر تو نے کسی سے آگے دست طلب دراز تو نہیں کیا؟"

درویش نے ایک رقعہ بھری، بولا۔ "بس یہی افتاد تو ہے جس میں میں رقعہ رہو چکا ہوں۔"

آپ نے افسوس سے گردن جھکا لی، کہا۔ "اپنی بات پوری کر، پھر کیا ہوا؟"

درویش نے جواب دیا۔ "پھر یہ ہے کہ تھپ تھپ درپے میں فاقے گزر گئے اور فاقوں نے مجھے اشتباہ حواس اور پریشان کیا کہ میں کھانے کے لیے دست طلب دروازے پر پہنچا۔"

آپ نے سب جھنڈت پوچھا۔ "پھر پھر کیا ہوا؟"

درویش نے جواب دیا۔ "اس کا طعنہ یہ ہے کہ میں نے جس کے آگے دست طلب در کیا تھا اس نے بھی میرا ہاتھ نہ دیا اور حضرت کرلی۔"

آپ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا تھا۔ یہ رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا آپ نے پوچھا۔ "پھر کیا ہوا؟"

درویش نے جواب دیا۔ "جب بندے کی طرف سے انکار ہو گیا تو میں شرمندہ اور نامور ایک گوشے میں پڑ رہا اور اپنی بے صبری کا ماتم کرنے لگا۔ لیکن کسی پہلو چین ہی نہ آتا تھا۔ نا تھاں یہ محسوس ہوا، گویا کوئی کہہ رہا ہے، سے بے صبر ہے انسان! اٹھ اور بار کی رہے، خدا نے تیرے اٹھ کاہنہ کر دیا ہے۔ مجھے اس آواز پر چین نہیں آیا، پھر میں یہ سمجھا کہ شاید یہ آواز انیس لمحوں کی سے ہو مجھ جیسے انسان کو خوار و ذلیل کرتا پھرتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ دل یہ بھی کہہ رہا تھا کہ سے جس آدمی جیگہ بات نہیں ہزار کی رہے اور دیکھ کہ خدا تیرے لیے کیا کرتا ہے۔ چنانچہ میں باز رہا نہ تو یہ راستے میں مجھے چند درجہ جتنیں دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ گویا وہ نے بننا رہتے میں ذال دے گئے ہوں۔ میں بہت خوش ہوا کہ کسی انسان نے گرمیرے فاقوں کا نہیں نہیں یا تو کیا ہو، میرے رب کو تو میرے فاقوں کا احساس ہے اور اب میں ان درہموں سے کھانا خریدوں گا اور جوت کی اذیت سے بچ جاؤں گا۔"

چھ دنوں میں درہموں کو لے کر جب بازار پہنچا اور دلیپ خریدنا چاہا تو کانڈہ رنے طنز کیا۔ "اے شخص! اتوںے نفس سے روٹیوں مانس وراس سے اپنے میں فاقوں کا کر کیا کیا تو اس خدا کی میں جگہ ہو گیا تھا کہ خدا تیرے حال سے واقف نہیں۔ یہ تو اس جیگی کا تار تھا کہ بندہ اپنے بندوں کے حال سے واقف نہیں یہ کیا تو یہ سمجھتا تھا کہ خدا اپنے بندوں کی احتیاج اور ضرورت سے بے فکر رہے ہوتا ہے۔ افسوس کہ تو نے اس کی عنایت اور مہربانی کا انتہا کر کے بغیر اپنے میں فاقوں کا کر کیا انسان نے سامنے کر دیا۔ تو نے یہ

بھی دیکھ لیا کہ اگر اللہ کسی کو کچھ نہ دینا چاہے تو انسان کی یہ مجال نہیں کہ وہ اپنے ارادے اور اپنی کوشش سے کسی کو کچھ دیدے۔
 اتنا کہ کدرویش زار و قطار روئے لگا۔

آپ نے کہا۔ ”تجھ پر یہ طرز دکاندار نے کیا یا اللہ نے؟“

درویش نے جواب دیا۔ ”زبان تو دکاندار کی تھی لیکن بات خدا کی، آخر اس دکاندار میرے حال کا علم کیوں کر ہوا؟“ زیادہ دکاندار کوئی صاحب کشف نہیں تھا؟“

آپ نے درویش کو تسلی دی۔ ”اے درویش! جو کچھ ہوا، اس پر رونے دھونے سے حاصل؟ جا، ایک بار پھر میری توکل کی راہ اختیار کر اور اس سے زیادہ مشکل حالات کے مقابلے کے لیے تیار رہ۔ کیونکہ امتحان میں ایک بار ناکام ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہی ہمیشہ کے لیے امتحان میں ناکام ہو گیا ہے، دوسرے امتحان کی تیاری کر، خدا اس میں تمہیں کامیاب کرے گا کیونکہ تمہارا عرق انصاف اس بات کی ضمانت ہے کہ تم میں پیشانی کا جو ہر موجود ہے اور جب تک کسی انسان میں جو ہر موجود ہے وہ خدا کا محبوب نہیں ہو سکتا۔ درویش نے آپ کے پاس ہی قامت اختیار کی اور آپ کی رہنمائی میں اپنی منزل بس گئے۔

آپ نے مستطاف خانہ کعبہ کے پرنا لے کے نیچے قیام اختیار کیا۔ آپ کے مرید و رار دست مند یہاں بھی پہنچ گئے۔ یہاں ایک چھوٹی سی سستی قائم ہو گئی۔ آپ نے اس لوگوں کو وہاں سے ہٹ جانے کی ہدایت کی اور کہا کہ بہترین طریقہ یہ ہے کہ آؤں گے اس کے صدق و زہد میں اتنی قوت آجائے کہ وہ خانہ کعبہ کے پاس خود نہ آئے مگر خانہ کعبہ اس کے پاس پہنچ جائے۔

آپ کے مریدوں نے اس پر عمل کیا اور کئی سال تک یہاں رہے۔ ان میں ایک مرید نے اتنا کمال حاصل کیا کہ وہ اپنی جیب چاہتا جس پر کوہ کھینچا جاتا آنکھیں بند کر کے اپنے سامنے بل لیتا۔ اسی دوران اس کی طبیعت خراب ہو گئی اور روز بہ روز حالت غیر ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ وہ خود بھی زندگی سے یوں ہو گیا۔ آپ نے اس کی بیماری کا حال سنا تو اس کی عیادت کو پہنچ گئے اور پوچھا۔ ”تیرا کیا حال ہے؟“

اس نے کمزور آواز میں جواب دیا۔ ”بس چل چلاؤ ہے، اور اللہ کے بارگاہ کا انتظار کر رہا ہوں۔“

آپ نے پوچھا۔ ”تیری کوئی خواہش؟“

مرید نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں کمزوری کی وجہ سے چل پھر نہیں سکتا۔ مگر خیر، ہیش یہ ہے کہ ایک بار خانہ کعبہ کی زیارت کروں۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”کیا میں تجھے خانہ کعبہ تک پہنچا دوں؟“

مرید نے کہا۔ ”میں خانہ کعبہ کو نہیں ہوائے لیتا ہوں۔“

اس کے بعد اس نے آنکھیں بند کر لیں اور خانہ کعبہ کی زیارت کرنے کا اسی وقت ایک طرف سے ایک اونٹ بھاگتا ہوا آیا اور اس نے ایک زوردار لٹ اس شخص کی آنکھ پر رسید کر دی جس سے اس کی آنکھ کھل رہا تھا۔

مرید نے روتے ہوئے کہا۔ ”یا اللہ! یہ کس بات کی سزا ہے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”اے بد نصیب انسان! تو اگر ذرا صبر کرتا تو تجھے مکہ کا مقدس مقام حاصل ہو جاتا۔ چونکہ تو نے خانہ کعبہ کی زیارت کی خواہش کر کے کم پر قناعت کر لی اس لیے خدا کو تیری یہ بات پسند نہیں آئی اور اس نے تیری آنکھ کا ڈھیل ٹکوا دیا۔“

آپ تیس سال تک خانہ کعبہ کے پرنا لے کے نیچے ہی اقامت گزیر رہے۔ آپ سے آخری وقت میں کسی نے پوچھا۔ ”حضرت! آپ کو اتنا بلند مقام کس طرح حاصل ہوا؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں نے چالیس سال تک قلب کی یوں حفاظت کی ہے کہ اس میں کسی اور کو داخل ہی نہیں ہونے دیا۔ اس میں خدا کے سوا کوئی بھی نہ رہا اور اب یہ حال ہے میں نے خدا کے سوا ہر چیز کو فراموش کر دیا ہے۔“

آپ نے در اسکو اختیار فرمایا۔ پھر آخر جنگی لینے سے پہلے ارشاد فرمایا۔ ”اگر مجھے اس بات کا یقین نہ ہوتا کہ یہ میری آخری وقت ہے اور میں مزید زندہ نہیں رہوں گا تو میں یہ راز رازی رکھتا اور اس طرح انکشاف نہ کرتا۔“

اس کے بعد آپ کا انتقال ہو گیا اور خانہ کعبہ کے قریب ہی آپ کی تدفین عمل میں آئی۔

سبعینہ الاولیاء، شہزادہ مراد شاہ کوہ۔ طبقات حکمرانی، علامہ شعرانی۔

دکتر فاضلہ اشباح، مرید لدی، حضرت ابوامر و...، رئیس احمد جعفری۔

حریہ الاصفہاء، مفتی علامہ سید محمد لاہوری۔

محمد الیاس

عشق

بھلائے نہ بھولے

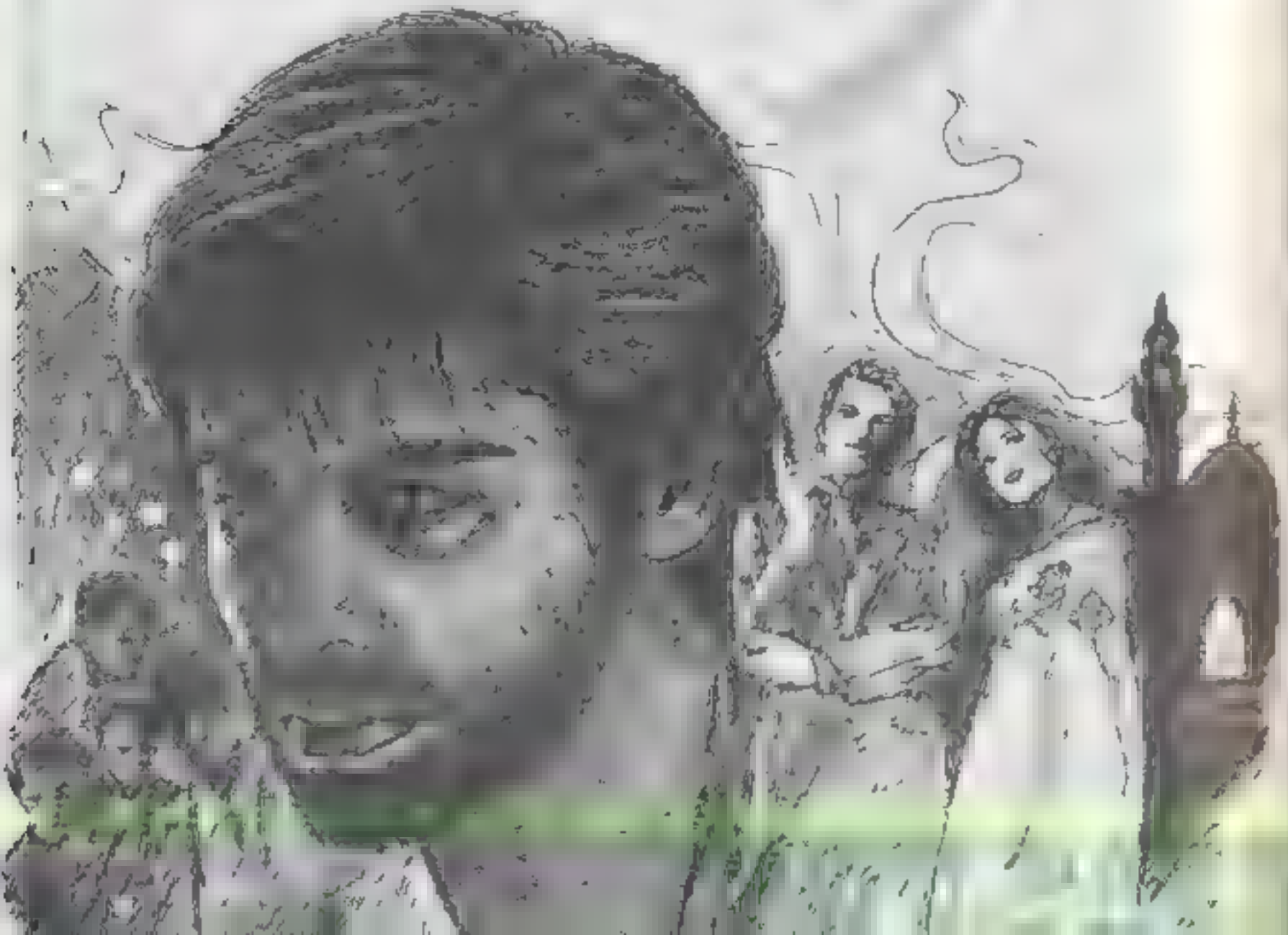
اندھ انسان ہو یا اعتماد... بعض اوقات بہت مشکل صورت حال سے دوچار کر دیتا ہے۔ اسے بھی کسی کے بڑے پن پر بہت باز تھا مگر رفتہ رفتہ حالات و واقعات نے ثابت کر دیا کہ بڑا انسان عمر سے نہیں طرف سے تسلیم کیا جاتا ہے... وہ جو خود کو بہت چھوٹا تصور کرتا تھا قدرت نے اسے ایسا اعلیٰ مقام عطا کیا کہ دنیا کے سارے رشتے اور جذبے اس کی عظمت کو سلام کر بیٹھے... بچہ میں کھیلے جانے والے کھیل تماشے کبھی کبھی سمجھداری کے زمانے میں بھی کھیلے پڑتے ہیں... نامساعد حالات کے باوجود اسے بھی بچپن کے اس کھیل سے بہت پیار تھا جسے وہ تمام عمر کھیلنا چاہتا تھا۔

کسی کے عشق میں اپنی ذات کو مٹانے والے ایک

سچے عشق کا قصہ

میری زندگی کی ہندو ایک کچی کے پچھلے سرے پر وہ بارے منظر روشن ہیں۔ میں بیٹا ہوا ایک ایک لمحہ بھی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ یہ بچپن، یہ میرا گھر، جس کے چوبارے کی چھت پر میں گھر گھر کیا کرتا تھا۔

چار پائیاں کھڑی کر کے چادروں سے ڈھانپ کر ہم گھر بتایا کرتے تھے۔ چو میری گھر والی بنا کرتی تھی۔ پتو چاچے تھے کی بنی۔ تمنا سے اسی سے کہا کرتے تھے کہ وہ بڑا کڑوا اور غصیل تھا۔ پتو اتنی خوب صورت تھی، گوری گلہبی، سنہری



بالوں اور نعلی آنکھوں والی۔ سبھی اسے چومنی کہتے۔ اس کا گھر والا بچے کے لیے مجھے بڑے پاڑ بیٹے پڑتے تھے۔ اماں سے چوری چوری، رسوئی سے دستیاب ہر وہ چیز جو کھانے پینے یا گھر گزرتی کے کام آسکتی تھی، بڑوں کی نظروں سے بچا کر اوپر لے جاتا میرے اولین فرائض میں شامل تھا۔ دسترخوان سجانے کے لیے روٹی، سالن، گڑ، جے، تل، سوٹف، کشمش، اجوائن کوئی چورن یا پھکی، جو کچھ بھی میسر ہوتا، مہیا کرنا مرد ہونے کے ناتے میرا اور دوسرا تھا۔ اماں کا دو پٹالا کر میں سر پر چوڑی باندھتا اور چار پائیوں سے بنے گھر کے دروازے پر لٹکی چادر کا پردہ اٹھ کر چہرے سے کہتا۔

”ہاں بھئی کرماں والی! کچھ ہے گھر میں کھانے کو؟“

آج بڑی بھوک لگی ہے۔“

کرماں والی کے گھونٹ میں سے دو ٹیلے روشن ستارے چمکنے لگتے اور گلاب پر سبھی پتھریاں حرکت کرتیں۔

”بسم اللہ کروں، تو بیٹھ تو کسی کرماں والیا! سب کچھ ہے اللہ کے فضل سے۔“

ان دنوں واقعی بڑا اللہ کا فضل ہوا کرتا تھا، جس قدر بھی گھروں میں ہوتا، وہ ”سب کچھ“ ہی ہوتا تھا۔ میری چھوٹی بہن، گڈی اور بھائی تھا ہمارے بچوں کا کردار ادا کیا کرتے۔ وہ دونوں میرے ہم شکل تھے اور ان دنوں بالترتیب تین اور پونے دو سال کے تھے۔ میں کہتا۔

”بیچو! دیکھ تو کسی، میرا بیٹا ہو ہو مجھ پر گیا ہے۔“

وہ جواب دیتی۔

”بھلے لوگو! بیٹا کس کا ہے؟“

میں گڈی اور ننھے کو گود میں لے کر بیار کرنے لگا اور پوچھتا۔

”کچھ پڑھا بھی ہے یا دن بھر کھیلتے ہی رہے ہو؟“ پھر میں جیب میں سے گڑ کے دو چھوٹے چھوٹے ٹکڑے نکال کر انہیں دیتا اور کہتا۔

”لو میری جان! منہ کی کھالو۔“

گھر والی ناک پر انگلی رکھ کر کہتی۔

”ہائے خائے، خود بھی کچھ کھالیا کرو۔ لڑکیوں کو مٹھائیاں نہیں کھلایا کرتے، بھولے بادشاہ! کل کلاں اس نے پرانے گھر جانا ہے۔ مت خراب کرو بیٹی کی عادتیں۔“

میں بڑا دانا بن کے ہوتا۔ ”انہوں نے کھایا میں نے کھایا۔“ پھر میں آدھ بھر کے کہتا۔ ”اللہ بیٹی کے مقدراچھے کرے۔“ جس روز گھر سے کوئی چیز ہتھے نہ چڑھتی، ہم محض اداکاری کر کے یعنی ہاتھ بلا ہلا کے منہ سے بچ بچ کی آوازیں نکال کر کام چلا لیتے۔ ہمارے سنگ اسی طرح کچھ دوسرے

بچے بھی گھر گھر کھیلا کرتے۔ ان میں سے ایک میری جان تھی جو اپنی ”گھر والی“ باجی حلیہ ”درا“ کے ہمراہ بہ طور مہمان ہمارے گھر آیا کرتے۔ ”درا“ کے اصل محل میں ہمارا سارا راشن چٹ کر جاتے۔ بھائی جان نے سات سال بڑے تھے۔ وہ ان دنوں چودہ سال کے باجی حلیہ گیارہ بارہ اور پچو چھ سال کی تھی۔ میری تمام بچوں کی یہ دلی خواہش ہوا کرتی کہ بھائی جان سے الگ سے کھیا کریں لیکن وہ ہمارے ساتھ ٹھیل میں ملتے ہی نہیں تھے۔ ایک طرف تو اس کھیل کے جمرے پورے کر کے یہ اپنے گھر کا بوجھ تیرے ماتوں پر پڑھتی لیکن دوسری طرف بھائی جان کی ضرورت پر فرہنگ کا کام بھی کافی حد تک میرے ذمے ہی تھا۔ وہ میرے چھوٹے کاموں کے لیے مجھے نہ علم دیتے۔ گھر سے چوری کر کے میں لاتاں یہ ڈانٹ بیٹ مجھے ہی سن پڑتی۔ دوسرا بھی بچے بھائی جان کی یہ وہ دستیوں کا کرتے۔ وہ سب کز میں سے بڑے ہوتے لے جاتے۔ حقوق اور اختیارات میں بے جا تبادلہ کرتے اور سب کو اپنے گھروں سے اشیائے خورد و نوش چوری کر کے اپنے قریب اور تربیت دیتے۔ جو بچے شروع میں نسبتاً نااثری تھے، ابھی بہت جلد اس فن میں مل جاتے ہو گئے۔

ہمارے ساتھ گھر گھر کھیلنے والوں میں زنگ کے میرا ایک ہم پرست تھا، منیر حسین بھی شریک ہوا کرتا تھا۔ کشمیریوں کی نگلی کے ہانگی منیر حسین کے دروازے پر عقبی دیوار میں باہم بیوست تھیں۔ اس کے اندر بلدیہ میں انسپکٹر بہ بازاری کے عہدہ پر فائز تھے۔ ٹھٹھ اور رعب والا عہدہ تھا۔ اپنے عہدے کے ہمراہ بارش تکتے تو آخر اتنی سی بچ جاب کرتی تھی۔ ننھے بھٹے، کان، ہاتھ اٹھا کر سلام کرتے۔ منیر حسین اپنی مومن اور ان کے ساتھ اپنے چوہارے کی چھت سے دیوار چھو کر ہمارے چوہارے کی چھت پر آ جایا کرتا تھا۔ آخر کار ہندو کو چوں تھا۔ منیر حسین اور میرے مسل کافی عرصے یکساں تھے۔ چو کی طرح آخر بھی غریب باپ کی بیٹی اس لیے ”گھر داری“ کے تمام انتظامات، منیر حسین اپنے مل بوتے پر کرنا پڑتے تھے۔ ویسے منیر دروازے جوڑی اور میری اور چو کی جوڑی میں ایک اور قدرتی مشاک تھی۔ وہ یہ کہ آخر خامی خوب صورت لڑکی تھی۔ ہمیں نہیں تاہم، ہم کشمیری لڑکیوں جیسی گوری اور شیش تھی۔ اللہ دتہ کو چوان ہوتے ہوئے بھی بڑا شریف، بد

ہائے ساری نگلی اور مجھے کی دیگر عورتوں کو جب بھی تانے پڑتا کرتا مگر یہ ہو جاتا تو اس کی خدمات حاصل کیا کرتیں۔ ”درا“ نے اپنی بیوی کے، کھلے کی ہر ہم عمر عورت کا بھائی، بڑی پر۔ میں کا بھانجا بھتیجی اور ہم سب بچوں کا ماچا تھا۔ اپنی جو بیوی کا مالک ہونے کے باوجود غریب بہت تھا۔ ایک نوکری اور اس پر مستزاد بیٹیوں کے علاوہ بیٹیوں کو بھی زور تعلیم سے آراستہ کرنے کا عزم کیے ہوئے تھا۔ بے چارے پر کوئی نہ کوئی اقتاد بڑی ہی رہتی۔ بیوی یا گھر کا کوئی فرد یا رہتا۔ بد قسمتی سے ایک دن گھوڑے کو دراز زور سے سائنا مار دیا تو وہ بدک کر پکی سڑک پر پھسلا اور سر کے بل گر گیا۔ تانے کے دونوں ہم ٹوٹ گئے اور ساری سواریاں لوٹیاں کھا کر گھوڑے پر جا گئیں۔ گردن ٹوٹ جانے سے گھوڑا سر گیا اور جا چا اللہ دتہ کے ہاں کئی روز تک یوں روتا بیٹنا پڑا رہا، گویا گھر کے کسی اہم فرد کے انتقال پر ملال کا ساتھ گزرا ہو۔ ادھار پر گھوڑا لیا اور تقریباً ایک تھائی کمانی اس کی ہر مہینہ قسط ادا کرنے پر نکل جاتی۔ منیر کی اس کچھ اپنے میاں کی اجازت سے اور کچھ اندر خانے بھائی کی مدد کر دیا کرتی تھی۔

سب بچوں کی ماؤں کو اپنی اولاد کی مہر اسرار مر میوں کے پس پردہ کار فرما ہاتھ کا علم تھا اس لیے جب بھی کسی بچے کی کوئی ایسی ہی حرکت قابل قبول حدود سے تجاوز ہو جاتی تو کوئی تانگی، چاچی، منائی، خال، پھوپھی یا امی جوتا، ڈوٹی یا سوئی ہاتھ میں لیے چوہارے کی چھت پر آ جاتی۔ بھائی جان آن واحد میں نگلی پھلانگ کر دوسری چھت پر چلے جاتے۔ وہاں مستیاں کرتے، اچھلتے کودتے، مایے گاتے اور بغلیں اس طرح سے بجاتے کہ ان کی تال پر منہ سے جیس جیس کی آوازیں نکالتے۔ طویلے کی بلا بندر کے سر۔ کر قوت ان کے سزا تھیں ملتی۔ لیکن وہ بے بسی اور بے رحمی سے ہماری توجہی و بربادی کا تمنا نہ دیکھتے۔ چونکہ حملہ آور خاتون اپنا غصہ فرو کرنے کے لیے نزلہ بر عضو ضعیف کے مصداق ہماری معصوم بستی کو تاخت و تاراج کر دیتی اور بھائی جان کی طرف منہ کر کے کچھ اس قسم کے کلمات ادا کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے پر اکتفا کر لیتی۔

”بڈھا چھ۔ بے شرم، بے حیا۔ بچوں میں کھیلا ہے۔ بد شکلا بندر (بندر) جا آ۔ دفعہ دور۔“

وائے حسرت، کوئی بزرگ خاتون یا مرد بھائی جان کو کارستانیوں کا مستقل سد باب نہ کر سکا۔ ہم سب کز کے ”میں“ میں یہ خواہش مل کر جوان ہوئی اور پھر بوز می ہو کر

باغ خر مروج و مغفور کہ بھائی جان کی بزرگ کے عین ہوتے غیظ قابو آئیں۔ لیکن اس کے برعکس بھائی جان اپنی گونا گوں دلچسپیوں اور روز افزوں خواہشات کی تکمیل کے لیے زیادہ سے زیادہ مہارت حاصل کرتے چلے گئے۔ سودا سلف لے جاتے تو ایک دو آنے کی ڈنڈی بہ آسانی مار لیا کرتے۔ دودھ اور دہی کی باڈی راستے میں ہی صاف کر آتے۔ ننھے والی بوتل دکاندار سے کھلو کر لاتے تاکہ گھر پہنچنے سے پہلے پہلے کسی حد تک اپنا کلیجہ ٹھنڈا کر سکیں۔ ننھی سبزیاں بھی انہیں پسند تھیں۔ خصوصاً گوبھی کو فوری انصاف مہیا کرنے کی غرض سے سر راہ کارروائی شروع کر دیتے۔ خشک میوہ جات انہیں بہت مرغوب تھے۔ جس دکان میں گھٹے دکاندار کو بھی ہول اٹھنے لگتا۔ سودا خریدنے سے زیادہ انہیں جموٹا لینے کی فکر ہوتی۔ کچھ دکاندار کی مرضی سے اور کچھ اپنی مدد آپ کے طور پر جہاں جہاں سے گزرتے جاتے، دائیں بائیں آگے پیچھے ہاتھ مارتے جاتے۔ متاثرین کو ہاتھ پاؤں پڑ جاتے۔ نگلی کے بیشتر رشتہ داروں نے کوئی چھوٹی موٹی چیز منگوانے کے سلسلے میں بھائی جان کی خدمات سے مستفاد دست کش ہونے میں ہی عافیت جانی۔ اماں نے بھی حتی الوسع یہی روش اختیار کرنے کی کوشش کی تاہم کامل اجتناب ممکن نہ تھا۔ صبح اسکول جاتے ہوئے بھی بچوں کو آنے دو آنے جیب خرچ ملتا تھا۔ بھائی جان کا جس پر بھی بس چلتا اپنی راہنمائی میں خرچ کروانے کی کوشش کرتے اور حصہ بقدر رجسٹر وصول کر لیتے۔

دوسرے بچوں کی نسبت میرے ساتھ کچھ زیادہ ہی بھائی بندی کا مظاہرہ کرتے۔ مجھے بہت دکھ ہوا کرتا۔ میرا الیہ یہ تھا کہ میری ”گھر والی“ کو اپنے گھر سے کوئی خرچ نہیں ملتا تھا لہذا مجھ پر دہری ذمے داریاں تھیں، جن سے عہدہ برآ ہوئے بنا مجھے چلن نہیں آتا تھا۔ بہت جلد میں نے اپنی حکمت عملی میں نہایت دانش مندی سے کچھ مناسب تبدیلیاں کر لیں۔ نوسر بازی اور سرقہ بالجبر کی ٹکنہ کارروائی سے محفوظ رہنے کے لیے اپنی جمع پونجی و حاضریہ صبح ہی صبح چو کی حویلی میں دے دیا کرتا۔ بھائی جان بھی کوئی ننھی گولیوں نہیں کھیلے ہوئے تھے۔ بہت جلد انہوں نے اس سرایت راز سے علی الاعلان پردہ اٹھا دیا لیکن انہیں اس وقت سخت مایوسی کا سامن کرنا پڑا جب اماں اور ابانے میرے اس فعل کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ میرے اور چو کے دماغی جدوجہد تھے ”مشتز کہ ضروریات کا دائرہ وسیع تر ہو رہا تھا۔ چار دنا چار مجھے گھر سے دور مصافقات کی خاک چھنا

پڑتی۔ کسی لاوارث درخت سے جاسن، میر، مشہوت یا کچے ہوئے سوڑے اکٹھے کر کے مناسب نان و نفقہ کا اہتمام کرنا ہوتا تھا جس میں سے نفقہ فی الوقت عطا ہی تھا، البتہ نان کسی نہ کسی طور چھندر مہیا کر لیتا۔ دسترخوان کی لذتیں دو بالا کرنے کی خاطر کھانے خود پکانے میں بھی مہارت حاصل کی۔ چھت پر اینٹیں رکھ کر چولہا بنانا، اس میں آگ جلا کر پکڑے اور جلیبیاں تیار کرنا ہمارا پسندیدہ مشغلہ بن گیا۔ باقی بچے بھی بھرپور مدد کرتے۔ رتن اور ضروری اجزاء ترکیبیں لانے میں ہر سا بھی مقدمہ و بھرتیوں کرتا۔ پکڑے اور جلیبیاں زیادہ تر آٹے سے ہی بنائی جاتی تھیں۔ آٹے، گڑ اور پانی کے آمیزے کو پکڑے کی سوراخ دار پوٹی میں ڈال کر گرم گھی میں چھپکی کی صورت حرکت دینے سے پوٹی کے پچندے والا سوراخ بھی بڑی فراخی سے آمیزہ خارج کرتا تو بھی انتہائی سنجوی کا مظاہرہ کرتا۔ نتیجتاً جلیبیوں کی دست جمعی کچھ ایسی بن جاتی کہ پکڑا نما گلیاں چھوٹے بڑے، موٹے پتے تاروں سے آپس میں منسلک ہو کر وجود میں آتیں۔ بہر حال جو اور جیسا پکنا ہم بغیر ناک بھوں چڑھائے تناول کر لیتے اور ہر لمحہ خدا کا شکر ادا کرتے۔

میرا یہ شوق اور دیوانگی ہی میری بیشتر مشکلات کی موجب تھی۔ میں کسی طور بھی یہ جتوں ترک کرنے پر خود کو آمادہ نہ کر پایا۔ رفتہ رفتہ میرا سارا جمع جتنا مال اسباب جو چھوٹی موٹی ہر طرح کی اشیاء پر مشتمل تھا، پتھر کے پاس منتقل ہو گیا۔ کوئی بھی چیز، قلم، پنسل تراش، شیشہ پلاسٹک کی بینک، سلیٹی، چاک، گیند، کھلونا اور تصویر، کسی ذریعے سے میرے ہاتھ لگتی، میں کرماں والی کے حوالے کر دیتا۔ پیسا لاٹری کا میں بہت دسیا تھا۔ ہر مرتبہ اس آس پر لاٹری ڈالنا کہ کوئی بڑا کھلونا، بناؤ سنگار کی چیز، مثلاً رولڈ کولڈ کاز پور جیتوں تو پتھر کے حضور خزانہ پیش کروں لیکن ہر مرتبہ پڑیا سے ایک پرہیز لگتی، جس پر یہ ہدایت درج ہوتی۔ "مایوس نہ ہوں، ایک بار پھر قسمت آزمائیں۔" میں واقعی بھی مایوس نہیں ہوا اور یہ دستور قسمت آزمائیاں رہا۔

اپنی گونا گوں خوبیوں کے باوجود میں پرلے درجے کا بے وقوف بھی تھا۔ جو بھی پٹی مجھے پڑھائی جاتی اس کا بے غل انکشاف کر کے حاضرین محفل کے لیے تفریح طبع کا سامان پیدا کرتا ہی تھا لیکن اپنے اور خصوصاً اپنی پڑھانے والے کے لیے خفت اٹھانے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہ چھوڑتا۔ بھائی جان نے دولت بخورنے کے اور بھی کئی گریسک لے تھے۔ بچوں کی دلچسپی کی کوئی بھی چیز کسی ذریعے سے ان کے

ہاتھ لگ جاتی، وہ اس پر نکٹ لگا دیتے۔ وہ صرف تفر اور بالی منصوبہ بندی کے ماہر ہی نہیں بلکہ ایک ایسے مینوفیکچرر بھی تھے۔ مالی منفعت کے حصول کے لیے ہر چیز میں خود بھی تیار کر لیتے۔ گتے کا ایک سلسلہ رقم کھانا جس میں آئینے کے عین عمودی ٹکڑے نصب کیے۔ پتھر میں رنگ برنگی چوڑ پوٹی کے ٹکڑے ڈالے ہوئے تھے۔ والے تنگ سوراخ سے ایک چشم ہو کر نگارہ کرنے سے طرح کے ڈیزائنوں میں پھول بنتے۔ ذرا پلا دینے ڈیزائن تبدیل ہو جاتے۔ بھائی جان نے اس آئینے سے خاصی کمائی کرنی۔ جب اس کی مقبولیت کم ہو گئی تو جو تو ایک خالی ڈبا، اوپر اور نیچے سرکندوں کے دو ٹکڑے دیے اور ان کے مابین کاغذ کا ایک خاصا طویل رول منسلک کیا۔ رول پر مختلف کہوں رسالوں سے کائی ہوئی تصویروں چسپاں کیں۔ اوپر والے سرکندے کے ٹکڑے کو کھل کر کھمڑے تو نچلے سے رول اتر کر اوپر والے پر لپٹ گیا۔ اس کے نتیجے میں ڈبے کی کھڑکی میں سے تصویریں نظر آتیں۔ اسے سینما مشین کا نام دیتے تھے۔ اپنے خاندان کے بچوں سے انہیں کوئی خاطر خواہ آمدنی نہ ہوتی تو دیگر گلیوں کے بچوں کو درخت کر لے آتے اور شو جلا دیتے۔ کبھی بچوں کو سچ کی دستاویزی یا شہری قلم شہر میں آجاتی تو چھپنے بچوں کو اپنی سرپرستی میں قلم دکھانے لے جاتے اور سیکھوں چارجر کے طور پر ان سے کچھ نہ کچھ بنور لیتے۔ آمدنی میں اضافے کی خاطر انہوں نے بڑی جدتیں پیدا کیں۔ نرالے انداز میں کئی کاروباری معرکے سرکے۔ وہ سے چھوٹے، ہم عمر کزنز کے مابین اکثر ویسٹر کشتی، موقع محل کے مطابق کسی بھی قسم کی شرط لگوا دیتے لیکن یہ کی رقم بہر صورت خود بختم کیا کرتے۔

ایک دور میں بھائی جان نے گلی میں ہا قاعدہ جمع کیا شروع کر دیا۔ فرش پر کھیل بچھا لیتے۔ بوٹ پالش کی مشینوں کے دونوں حصے اور کھلے منہ والی بوتلوں کے دھکے اچھی طرح دھو کر خشک کر کے کھل کے کنارے پر بظاہر میں بڑی مناسب ترتیب سے سجا دیتے اور ان میں مختلف اشیاء کی تنجی بھی ڈھیریاں بڑے سلیقے سے لگا دیتے۔ مثلاً پسینہ مارج، نمک، شکر، شمش، خشکاش، انار دانہ، چورن، سونف، اجوائن، تل، کال نمک اور نسوار وغیرہ۔ سر پر دادا جان کی سنہری کلاہ والی پٹاوری لگی (پگڑی) رکھتے۔ ہاتھ میں کی چھڑی سے کر بڑے اسٹیکل سے کھل پر ہر لمحہ ہوجاتے اور یوں سنار کرتے۔

یکھو بھائی یہ سلا جیت ہے (کسی بھی چیز کو چھڑی کی سے چھو کر) یہ مصحفی رومی ہے، یہ فر ہے، یہ بھلیا ہے، یہ ہے، اور یہ وغیرہ وغیرہ ہے۔ ایک دو اشیاء کے ساتھ بچے پکارتے تھے باقی سب منسل۔ پھر رات۔ یہ سلا جیت بڑی مشکل سے ملائے۔ ہمارا بھائی فکرت سے لایا ہے۔ اوپر اس کا شیر اور بھائی ہو گیا لیکن بھائی نے دونوں درختوں کو مار دیا۔ بھائی سوا۔ تم ہمارا یہ دہائی کھانے کا تو ایک مسینڈ کی موافق ہو یا نہ گا۔ دیکھو بھائی خدا کی قسم ہم نے یہ اگر ہم جھوٹ بولنا ہے تو اپنے پیٹ کی خاطر لیکن اگر تم ہمارا اعتبار نہیں کرے گا تو کافر کا بچہ ہوئے گا۔

بھائی کے اس اعتبار کا خاطر خواہ اثر ہوتا، چونکہ ہم میں سے کوئی بچہ کافر ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ایک یا دو بچے رات بھر چنچل چند شیدائیں کر بڑی مہارت سے پہنچی جیانا کر تھا دیتے۔ ایک مرتبہ انہوں نے ہماری دو سینر تیا دی بھولی راوی بھول کو دو مچے کے عوض تسوار کی ایک ایک چنگی دے دی اور ہم رہا یہ بھی مشورہ منت دیا کہ دونوں اپنے بچے تھکوں میں ساری خوراک ایک ہی بار لگائیں۔ پھر یہاں سے دونوں پر چھینکوں کا بیادورہ پڑا کہ ناکوں سے مں جاری ہو گیا۔ وہ یقیناً ٹکس ہی ہو گئی لیکن خون ایسا بازہ جیسے اس میں باریک تیر ملا ہوا ہو۔ کچھ ڈھنڈور بھی صحت بچوں کی وسعت سے۔ خبر اپنی گلی کے سب گھروں میں بنگن، آگ کی طرح پھیل گئی۔ تائی جان اپنی بیٹی سے کچھ زیادہ ہی چار تھا۔ انہوں نے موقع واردات پر پہنچ کر غوٹیاں منظر دیکھ تو آؤ، یکھانہ تاد، چھاتی پٹتے تیں۔

ت کی نزکت کو بھپتے ہوئے بھائی جان نے جدی بھائی دکان سمیٹنا شروع کر دی۔ تائی جان نے کھل کا ایک گنا پکڑ کر پوری قوت سے کھینچا تو بھائی الٹ گئے۔ کلاہ لڑھک گیا، چھڑی ہاتھ سے چھوٹ گئی اور تمام قیمتی جڑی بوٹیاں اور دوائیاں بکھر گئیں۔ یعنی آن واحد میں کل مال تجارت تباہ و برباد ہو گیا۔ لباس پر مارج مصالحوں نے بڑی تارت کے نمونے بنا ڈالے۔ تمام بچے ان کی دست دالی پر خوب ہنسے۔

جلد ہی بھائی جان میٹرو بننے کے خط میں جلا گئے۔ تیل کی مالش کر کے ورزش کرتے اور ڈنڈ پلٹے۔ اپنے حصے کی خوراک کھانے اور دوا پینے تک ہی محدود نہ رہا۔ تن سازی کے جنون نے ان کی غذائی ضروریات کئی بڑے بڑے اسٹیکل سے کھل پر ہر لمحہ ہوجاتے اور یوں سنار کرتے۔

غضب کر جاتے۔ مرن غذا میں انہیں پہلے ہی بہت مرقوب تھیں۔ حسب ضرورت ان کے حصول کی خاطر نت نئے منصوبے بناتے گئے۔ ماحول سازگار پاتے ہوئے امی کے روزرو اپنے چہرے سے بڑی تشویش ناک مردنی کا تاثر منکس کرنے لگتے۔ جوں ہی وہ ذرا فکر مند ہوتیں تو اپنی جان کو لگا کوئی فرضی روگ بیان کرتے۔ مٹا کھلنے پر ہر دم آمادہ ہوتی ہی ہے، جھٹ کسی سیانے یا حکیم سے مشوب کر کے ایک انتہائی تقویت بخش اور مفرح قلب طبی نسخہ گوش گزار کر دیتے۔ زیادہ تر وہ خود کو جس عارضے میں مبتلا کرنا مناسب خیال کیا کرتے، اس کے تیر بہدف علاج کے طور پر صبح نہار منہ بادام کی سردائی، دن میں ایک آدھ بار مرغ کی بخنی اور رات سونے سے پیشتر گرم دودھ کا گلاس نوش کرنا اکسیر قرار دیتے۔ بیماری کی علامات کچھ یوں بیان کرتے کہ دن بھر چکر آتے ہیں۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگتا ہے۔ اور رول ڈوب ڈوب جاتا ہے۔ مزید تاکید کرتے کہ علاج عرصے تک جاری رہے تو بیماری رفع ہو سکتی ہے۔ دیگر ٹکڑوں میں آباد روز و نیک کے رشتہ داروں کے ہاں صید بہانے جانے گئے۔ کئی مرتبہ کسی خاص مصحت کے تحت مجھے بھی ساتھ لے جاتے۔ میزبان گھرانے کی کوئی بزرگ حاتون ہم سے غیر متوقع طور پر شرف میر بانی بخشے کا سبب دریافت کرتیں تو بھائی جان جواب دیتے۔

"اماں نے کہا تھا کہ قالہ کا حال احوال پوچھ آنا۔" کہیں ہماری پذیرائی ہو جاتی اور کہیں ان سوال ہو جاتا۔

"آپ کی اماں کو آج ہم غریب مسکین کسے یاد گئے؟" اور اس کا منقش انجام یہ ہوا کرتا کہ بھائی جان جیسے مندر بچوں کے والدین کو خفیف ہونا پڑتا۔ ویسے تو بھائی جان کوئی نہ کوئی جواز گھڑیتے لیکن ان کی بدقسمتی یہ تھی کہ اپنا پرہیز بر کوئی ان کی بات پر اعتبار کرنے سے پہلے کئی بار سوچتا۔ کوئی بہانہ نہ سوچتا تو بھائی ماب مجھ معصوم پر ڈالنے لگتے اور بہانہ تراشتے۔

"میں اپنے کلاس فیلو کے ہاں پر کینیکل کی کاپی لینے جا رہا تھا تو راستے میں کا کے نے کہا کہ خالہ سے ملے چلیں۔" میں احتجاج کر کے صورت حال واضح کرنا، ابا جان بھی بڑے ریرک باپ تھے۔ بڑی محبت سے اپنے بڑے بیٹے کی حدیث کا پرچم بند کرتے درامی سے کہتے۔ "ابھی کیوں ڈانٹ رہی ہو میرے بیٹے کو؟" پھر وہ بیٹے کی جانب متوجہ ہو کر پچکار تے۔

”ادھر آؤ یا راز رکھل کے بتاؤ، ہوا کی تھا؟“

نزدیک آنے پر وہ بھائی جان کو قابو کر لیتے لیکن ایک آدھا جھانپڑی رسید کر سکتے کیونکہ انہیں ہاتھوں سے مارنا فی الحقیقت خود کو سزا دینے کے مترادف تھا۔ دس ضرب لگانے والے کے سامنے ایسی مہارت اور برق رفتاری سے اپنی کہنی کھڑی کر دیتے کہ مارنے والا اپنا ہاتھ تڑوا بیٹھتا۔

جوں ہی وہ معمول سے زیادہ شفقت برداری کا اظہار کرتے، بھائی... دوڑ لگا دیتے اور باہر نکل کر مجھے خوب سزا دیتے۔ لیکن ہر ماں کے دل میں کوئی ایسا آئینہ نصب ہوتا ہے کہ جس میں دیکھنے سے اولاد کے چہروں پر پڑے خوشی کے مصنوعی نقاب از خود سرک جاتے ہیں اور اصل تصویریں منعکس ہو جاتی ہیں۔ اماں دو چار سوال ہی کرتیں تو راز کھل جاتا۔ بھائی جان کی حسب حال اور حسب توقع کھٹی ہو جاتی۔ ایسے مواقع پر بھائی جان غم زدہ لہجے میں اپنا مخصوص شکوہ دہرانے لگتے۔

”کا کا ہی آپ دونوں کا بیٹا ہے۔ مجھے جہاں سے اٹھایا تھا وہاں ہی پیٹک آئیں۔ ورنہ میں خود ہی کہیں چلا جاؤں گا۔“

ماں رنجیدہ ہو جاتیں اور آنکھوں میں آنسو بھر کے کسی دوسری جانب رخ موڑ لیتیں لیکن باخم ٹھونک کر مٹا بیے پر اتر آتے اور بڑے انداز سے بولتے۔

”کب جائے گا میرا لعل؟“

جواب ملتا۔

”صبح ناشتا کر کے چلا جاؤں گا۔“

اب بڑی رمان سے کہتے۔

”ناشتے کے پیسے لے لے میرا چاند اور ابھی چل دے۔“

وہیے اب یہ سب کچھ اوپر اوپر ہی سے کہا کرتے۔ چونکہ بھائی جب بھی ایسے فیلاک تازہ تازہ ہوں کر گھر سے نکل گئے ہوتے اور ایک آدھ گھنٹے تک نظروں سے گھٹل رہتے تو بااچھے خامے تھکے ہونے کے باوجود ٹھہ کھڑے ہوتے اور اماں سے کہتے۔

”میں اس خبیث کو کہیں دیکھوں، پتا نہیں کہاں مارا مارا پھر رہا ہوگا۔“

مجھے ساتھ لے لیتے۔ سائیکل پر میں نے آگے بیٹھ بڑی مستعدی سے راز رکھ کر تاکتا اور خاص خاص جگہوں تک رہنمائی بھی کرتا جاتا۔ جہاں ہمیں وہ ”خبیث“ نظر آ جاتا، اب سائیکل پر بیٹھے بیٹھے زمین سے پاؤں کا کرنا نہ سمجھتے اور بڑی بے پروائی سے استفادہ کرتے۔

لگتے۔

”اوسے اتویہاں کیا کر رہا ہے؟“ میں نے پوچھا۔
”مکہ جا... میں اسے ضروری کام سے کہیں جا رہا ہوں۔“

”اچھا چلو، پہلے تم دونوں کو گھر چھوڑ آؤ۔“
”گھر کچھ گھر کر بڑے اطمینان سے بیٹھ رہے۔“
”کڑی کرنے لگتے۔“ اس وقت نہیں جایا جاتا، کام بھاڑ میں، اب کل دیکھا جائے گا۔“

اندروں شہر سے عزیز واقارب نے جب ہمیں کو ان کے مقصد کی تکمیل کے لیے رستہ نہ دینے کی نوبت تو چار و پانچ مسدودات میں پھنس جاتے۔ ہر مسدود قارب سے ہم نفسیں ہونے کے لیے تہہ بہ تہہ اٹھایا۔ راستے بھر تک سسٹ پڑھتے کہ کب گھرانے میں سے کوئی مرد و خاتون ازراہ شفقت پہنچے بطور نذرانہ پیش کرے تو فوراً قبول کر لوں۔ ہر روز انکار وہ اپنا تکلف دہرانا ضروری ہی نہ سمجھتے اور ہمیں جملہ شراعت سمیٹنے کا سہری موقع ہاتھ سے نکل جاتا۔

ایک ایسی ہی سیم پر جب ہم شہر سے درجناب کھڑے ہوتے تھے تو دور پار رشتے کی ایک عاتقہ غم متوقع رحمت کے فرشتے بن کر گئے تو دوایہ میں بالائی سے ہماری توجہ نہ گئی۔ یہ وقت رشتہ داروں سے اپنے دوپٹے کے پلو سے بندھا چاندی کا کلوا تارہیہ کا میرن ٹنگی میں تھمت سوئے ہدایت کی کہ میں اسے سمجھ کر لے جاؤں اور اپنی اماں کو دوں۔ ان اٹا میں نے مجھے اپنے ساتھ لپیٹ لیا اور، لیگ رسا پر پیٹ کر صواب دار بوسہ بھی ثبت کر دیا۔ بھائی جان کے بڑے بزرگانہ انداز میں مجھے ڈانٹ کر کہا۔

”اوسے ایسوں پر سے روپیہ چلو واپس کرو۔“
”میں زس سے ہی حق فرماتا، اس لیے بھائی جان نے ڈیپلومی سمجھ نہ پایا اور یہ تازہ بند بحث پر اتر آیا۔“
”پہلے خود ہی راستے میں کہا تھا کہ خالہ پیسے لے لے لیتا، اب کیوں ڈانٹ رہے ہیں؟“

خالہ ہنس پڑیں۔ انہوں نے بھائی کو پیار سے دایاں گال ابھی تک لپیٹا تھا۔ انہوں نے آؤ دیکھتے تو ہمو پہلے ہی جیسے ایک نم آلود بوسے کا ٹھپا میرے بائیں پر جڑ دیا اور بولیں۔

”میں صدقے، ماری جاؤں۔“
”گھر تک واپسی میری زندگی کا ایک دانا کھٹا تھا تھا ہوا۔“ گھر مجھ میں ماری بھی غفلت سوتی رہا۔

میں نے پہل جانے والا عاقبت نا اندیش انسان نہ بننے سے ایک واقعہ کی روشنی میں مستقبل کے حوالے سے سوچا۔ میری زندگی کے لیے کوئی من سب منصوبہ بندی کر لینا تھا۔ بھائی جان نے سب سے پہلے مجھ سے روپیہ لینے میں نے مزاحمت کی اور انہیں یاد دلایا کہ حال ہی میں بھائی کے مطابق یہ روپیہ گھر جا کر اماں کو دینا ہے۔ ہاتھوں میں ایک سینڈ وچ لٹکے کا مقصد نہ کرنا۔

میں نے میرا پاپاں باز و مرد کر پیٹھ سے لگا دیا۔ روپیہ گھر میں ڈالا اور سائیکل پر سوار ہو کر چل دیے۔ بھائی جان کی یاد اور دیکھ سے بلبل اٹھا اور چیخ چیخ کر کہنے لگا کہ میں گھر جا کر سب کچھ، جو مجھ پر بھتی ہوں، واپس آ کر بتا دوں گا۔ وہ واپس آئے، میرے انکی پر دو دو چائے رسید کیے جن پر خالہ نے بوسے دیے۔ میرے سپر ہاتھ میں بیسے اور سائیکل پر سوار ہو کر دوڑ لگے۔ میں بچی زمین پر تنگے پاؤں کھڑا تھا۔ میرے چپے چپے گئے تو پگھلنے لگے دووں کناروں پر انکی کی تھلک پر پاؤں رکھ بیسے۔ بارو کے درونے بدن سے رکی تو تپڑی لگی۔ پیسے سے جسم شرابور ہو گیا اور میں معصوم کے میں کب سب سدا ہو کر گر پڑا تھا۔ بعد میں پتا نہ نہ دے شہر سے واپس جاتے ہوئے مجھے کھیت میں کھڑے پڑے ایک تو گھوڑی پر سوار کر گھر چھوڑ دے۔

بھائی جان نے میرا بازو چڑھانے سے پہلے اپنی بات آزمائی تو مجھے بھائی جان کے ہاتھوں ٹھکی گئی۔

”بتھاؤں گی۔ اب مجھ سے فارغ ہوئے تو بڑے اطمینان سے جان کو پیڑا اور ہاتھ رسی سے باندھ کر چوبارے پر لے گئے۔“

”یہ جیوں کا دروازہ نہیں نے اندر سے بند کر دیا۔“

”میں نے کب جگہ ضربات پر بھائی کی چیخ دیکھا۔ چند

”اوسے ایسوں پر سے روپیہ چلو واپس کرو۔“

”میں زس سے ہی حق فرماتا، اس لیے بھائی جان نے ڈیپلومی سمجھ نہ پایا اور یہ تازہ بند بحث پر اتر آیا۔“

”پہلے خود ہی راستے میں کہا تھا کہ خالہ پیسے لے لے لیتا، اب کیوں ڈانٹ رہے ہیں؟“

خالہ ہنس پڑیں۔ انہوں نے بھائی کو پیار سے دایاں گال ابھی تک لپیٹا تھا۔ انہوں نے آؤ دیکھتے تو ہمو پہلے ہی جیسے ایک نم آلود بوسے کا ٹھپا میرے بائیں پر جڑ دیا اور بولیں۔

”میں صدقے، ماری جاؤں۔“

”گھر تک واپسی میری زندگی کا ایک دانا کھٹا تھا تھا ہوا۔“ گھر مجھ میں ماری بھی غفلت سوتی رہا۔

”بتھاؤں گی۔ اب مجھ سے فارغ ہوئے تو بڑے اطمینان سے جان کو پیڑا اور ہاتھ رسی سے باندھ کر چوبارے پر لے گئے۔“

”یہ جیوں کا دروازہ نہیں نے اندر سے بند کر دیا۔“

”میں نے کب جگہ ضربات پر بھائی کی چیخ دیکھا۔ چند

”اوسے ایسوں پر سے روپیہ چلو واپس کرو۔“

”میں زس سے ہی حق فرماتا، اس لیے بھائی جان نے ڈیپلومی سمجھ نہ پایا اور یہ تازہ بند بحث پر اتر آیا۔“

”پہلے خود ہی راستے میں کہا تھا کہ خالہ پیسے لے لے لیتا، اب کیوں ڈانٹ رہے ہیں؟“

خالہ ہنس پڑیں۔ انہوں نے بھائی کو پیار سے دایاں گال ابھی تک لپیٹا تھا۔ انہوں نے آؤ دیکھتے تو ہمو پہلے ہی جیسے ایک نم آلود بوسے کا ٹھپا میرے بائیں پر جڑ دیا اور بولیں۔

”میں صدقے، ماری جاؤں۔“

”گھر تک واپسی میری زندگی کا ایک دانا کھٹا تھا تھا ہوا۔“ گھر مجھ میں ماری بھی غفلت سوتی رہا۔

”بتھاؤں گی۔ اب مجھ سے فارغ ہوئے تو بڑے اطمینان سے جان کو پیڑا اور ہاتھ رسی سے باندھ کر چوبارے پر لے گئے۔“

”یہ جیوں کا دروازہ نہیں نے اندر سے بند کر دیا۔“

”میں نے کب جگہ ضربات پر بھائی کی چیخ دیکھا۔ چند

”اوسے ایسوں پر سے روپیہ چلو واپس کرو۔“

”میں زس سے ہی حق فرماتا، اس لیے بھائی جان نے ڈیپلومی سمجھ نہ پایا اور یہ تازہ بند بحث پر اتر آیا۔“

”پہلے خود ہی راستے میں کہا تھا کہ خالہ پیسے لے لے لیتا، اب کیوں ڈانٹ رہے ہیں؟“

خالہ ہنس پڑیں۔ انہوں نے بھائی کو پیار سے دایاں گال ابھی تک لپیٹا تھا۔ انہوں نے آؤ دیکھتے تو ہمو پہلے ہی جیسے ایک نم آلود بوسے کا ٹھپا میرے بائیں پر جڑ دیا اور بولیں۔

”میں صدقے، ماری جاؤں۔“

”گھر تک واپسی میری زندگی کا ایک دانا کھٹا تھا تھا ہوا۔“ گھر مجھ میں ماری بھی غفلت سوتی رہا۔

”بتھاؤں گی۔ اب مجھ سے فارغ ہوئے تو بڑے اطمینان سے جان کو پیڑا اور ہاتھ رسی سے باندھ کر چوبارے پر لے گئے۔“

”یہ جیوں کا دروازہ نہیں نے اندر سے بند کر دیا۔“

”میں نے کب جگہ ضربات پر بھائی کی چیخ دیکھا۔ چند

”اوسے ایسوں پر سے روپیہ چلو واپس کرو۔“

”میں زس سے ہی حق فرماتا، اس لیے بھائی جان نے ڈیپلومی سمجھ نہ پایا اور یہ تازہ بند بحث پر اتر آیا۔“

”پہلے خود ہی راستے میں کہا تھا کہ خالہ پیسے لے لے لیتا، اب کیوں ڈانٹ رہے ہیں؟“

خالہ ہنس پڑیں۔ انہوں نے بھائی کو پیار سے دایاں گال ابھی تک لپیٹا تھا۔ انہوں نے آؤ دیکھتے تو ہمو پہلے ہی جیسے ایک نم آلود بوسے کا ٹھپا میرے بائیں پر جڑ دیا اور بولیں۔

”میں صدقے، ماری جاؤں۔“

”گھر تک واپسی میری زندگی کا ایک دانا کھٹا تھا تھا ہوا۔“ گھر مجھ میں ماری بھی غفلت سوتی رہا۔

”بتھاؤں گی۔ اب مجھ سے فارغ ہوئے تو بڑے اطمینان سے جان کو پیڑا اور ہاتھ رسی سے باندھ کر چوبارے پر لے گئے۔“

”یہ جیوں کا دروازہ نہیں نے اندر سے بند کر دیا۔“

”میں نے کب جگہ ضربات پر بھائی کی چیخ دیکھا۔ چند

”اوسے ایسوں پر سے روپیہ چلو واپس کرو۔“

”میں زس سے ہی حق فرماتا، اس لیے بھائی جان نے ڈیپلومی سمجھ نہ پایا اور یہ تازہ بند بحث پر اتر آیا۔“

”پہلے خود ہی راستے میں کہا تھا کہ خالہ پیسے لے لے لیتا، اب کیوں ڈانٹ رہے ہیں؟“

خالہ ہنس پڑیں۔ انہوں نے بھائی کو پیار سے دایاں گال ابھی تک لپیٹا تھا۔ انہوں نے آؤ دیکھتے تو ہمو پہلے ہی جیسے ایک نم آلود بوسے کا ٹھپا میرے بائیں پر جڑ دیا اور بولیں۔

”میں صدقے، ماری جاؤں۔“

”گھر تک واپسی میری زندگی کا ایک دانا کھٹا تھا تھا ہوا۔“ گھر مجھ میں ماری بھی غفلت سوتی رہا۔

”بتھاؤں گی۔ اب مجھ سے فارغ ہوئے تو بڑے اطمینان سے جان کو پیڑا اور ہاتھ رسی سے باندھ کر چوبارے پر لے گئے۔“

”یہ جیوں کا دروازہ نہیں نے اندر سے بند کر دیا۔“

”میں نے کب جگہ ضربات پر بھائی کی چیخ دیکھا۔ چند

”اوسے ایسوں پر سے روپیہ چلو واپس کرو۔“

”میں زس سے ہی حق فرماتا، اس لیے بھائی جان نے ڈیپلومی سمجھ نہ پایا اور یہ تازہ بند بحث پر اتر آیا۔“

”پہلے خود ہی راستے میں کہا تھا کہ خالہ پیسے لے لے لیتا، اب کیوں ڈانٹ رہے ہیں؟“

خالہ ہنس پڑیں۔ انہوں نے بھائی کو پیار سے دایاں گال ابھی تک لپیٹا تھا۔ انہوں نے آؤ دیکھتے تو ہمو پہلے ہی جیسے ایک نم آلود بوسے کا ٹھپا میرے بائیں پر جڑ دیا اور بولیں۔

”میں صدقے، ماری جاؤں۔“

”گھر تک واپسی میری زندگی کا ایک دانا کھٹا تھا تھا ہوا۔“ گھر مجھ میں ماری بھی غفلت سوتی رہا۔

”بتھاؤں گی۔ اب مجھ سے فارغ ہوئے تو بڑے اطمینان سے جان کو پیڑا اور ہاتھ رسی سے باندھ کر چوبارے پر لے گئے۔“

”یہ جیوں کا دروازہ نہیں نے اندر سے بند کر دیا۔“

”میں نے کب جگہ ضربات پر بھائی کی چیخ دیکھا۔ چند

”اوسے ایسوں پر سے روپیہ چلو واپس کرو۔“

”میں زس سے ہی حق فرماتا، اس لیے بھائی جان نے ڈیپلومی سمجھ نہ پایا اور یہ تازہ بند بحث پر اتر آیا۔“

”پہلے خود ہی راستے میں کہا تھا کہ خالہ پیسے لے لے لیتا، اب کیوں ڈانٹ رہے ہیں؟“

خالہ ہنس پڑیں۔ انہوں نے بھائی کو پیار سے دایاں گال ابھی تک لپیٹا تھا۔ انہوں نے آؤ دیکھتے تو ہمو پہلے ہی جیسے ایک نم آلود بوسے کا ٹھپا میرے بائیں پر جڑ دیا اور بولیں۔

”میں صدقے، ماری جاؤں۔“

”گھر تک واپسی میری زندگی کا ایک دانا کھٹا تھا تھا ہوا۔“ گھر مجھ میں ماری بھی غفلت سوتی رہا۔

”بتھاؤں گی۔ اب مجھ سے فارغ ہوئے تو بڑے اطمینان سے جان کو پیڑا اور ہاتھ رسی سے باندھ کر چوبارے پر لے گئے۔“

”یہ جیوں کا دروازہ نہیں نے اندر سے بند کر دیا۔“

”میں نے کب جگہ ضربات پر بھائی کی چیخ دیکھا۔ چند

”اوسے ایسوں پر سے روپیہ چلو واپس کرو۔“

”میں زس سے ہی حق فرماتا، اس لیے بھائی جان نے ڈیپلومی سمجھ نہ پایا اور یہ تازہ بند بحث پر اتر آیا۔“

”پہلے خود ہی راستے میں کہا تھا کہ خالہ پیسے لے لے لیتا، اب کیوں ڈانٹ رہے ہیں؟“

خالہ ہنس پڑیں۔ انہوں نے بھائی کو پیار سے دایاں گال ابھی تک لپیٹا تھا۔ انہوں نے آؤ دیکھتے تو ہمو پہلے ہی جیسے ایک نم آلود بوسے کا ٹھپا میرے بائیں پر جڑ دیا اور بولیں۔

”میں صدقے، ماری جاؤں۔“

”گھر تک واپسی میری زندگی کا ایک دانا کھٹا تھا تھا ہوا۔“ گھر مجھ میں ماری بھی غفلت سوتی رہا۔

”بتھاؤں گی۔ اب مجھ سے فارغ ہوئے تو بڑے اطمینان سے جان کو پیڑا اور ہاتھ رسی سے باندھ کر چوبارے پر لے گئے۔“

”یہ جیوں کا دروازہ نہیں نے اندر سے بند کر دیا۔“

”میں نے کب جگہ ضربات پر بھائی کی چیخ دیکھا۔ چند

”اوسے ایسوں پر سے روپیہ چلو واپس کرو۔“

”میں زس سے ہی حق فرماتا، اس لیے بھائی جان نے ڈیپلومی سمجھ نہ پایا اور یہ تازہ بند بحث پر اتر آیا۔“

”پہلے خود ہی راستے میں کہا تھا کہ خالہ پیسے لے لے لیتا، اب کیوں ڈانٹ رہے ہیں؟“

خالہ ہنس پڑیں۔ انہوں نے بھائی کو پیار سے دایاں گال ابھی تک لپیٹا تھا۔ انہوں نے آؤ دیکھتے تو ہمو پہلے ہی جیسے ایک نم آلود بوسے کا ٹھپا میرے بائیں پر جڑ دیا اور بولیں۔

”میں صدقے، ماری جاؤں۔“

”گھر تک واپسی میری زندگی کا ایک دانا کھٹا تھا تھا ہوا۔“ گھر مجھ میں ماری بھی غفلت سوتی رہا۔

”بتھاؤں گی۔ اب مجھ سے فارغ ہوئے تو بڑے اطمینان سے جان کو پیڑا اور ہاتھ رسی سے باندھ کر چوبارے پر لے گئے۔“

”یہ جیوں کا دروازہ نہیں نے اندر سے بند کر دیا۔“

”میں نے کب جگہ ضربات پر بھائی کی چیخ دیکھا۔ چند

”اوسے ایسوں پر سے روپیہ چلو واپس کرو۔“

”میں زس سے ہی حق فرماتا، اس لیے بھائی جان نے ڈیپلومی سمجھ نہ پایا اور یہ تازہ بند بحث پر اتر آیا۔“

”پہلے خود ہی راستے میں کہا تھا کہ خالہ پیسے لے لے لیتا، اب کیوں ڈانٹ رہے ہیں؟“

خالہ ہنس پڑیں۔ انہوں نے بھائی کو پیار سے دایاں گال ابھی تک لپیٹا تھا۔ انہوں نے آؤ دیکھتے تو ہمو پہلے ہی جیسے ایک نم آلود بوسے کا ٹھپا میرے بائیں پر جڑ دیا اور بولیں۔

”میں صدقے، ماری جاؤں۔“

”گھر تک واپسی میری زندگی کا ایک دانا کھٹا تھا تھا ہوا۔“ گھر مجھ میں ماری بھی غفلت سوتی رہا۔

”بتھاؤں گی۔ اب مجھ سے فارغ ہوئے تو بڑے اطمینان سے جان کو پیڑا اور ہاتھ رسی سے باندھ کر چوبارے پر لے گئے۔“

”یہ جیوں کا دروازہ نہیں نے اندر سے بند کر دیا۔“

”میں نے کب جگہ ضربات پر بھائی کی چیخ دیکھا۔ چند

”اوسے ایسوں پر سے روپیہ چلو واپس کرو۔“

”میں زس سے ہی حق فرماتا، اس لیے بھائی جان نے ڈیپلومی سمجھ نہ پایا اور یہ تازہ بند بحث پر اتر آیا۔“

”پہلے خود ہی راستے میں کہا تھا کہ خالہ پیسے لے لے لیتا، اب کیوں ڈانٹ رہے ہیں؟“

خالہ ہنس پڑیں۔ انہوں نے بھائی کو پیار سے دایاں گال ابھی تک لپیٹا تھا۔ انہوں نے آؤ دیکھتے تو ہمو پہلے ہی جیسے ایک نم آلود بوسے کا ٹھپا میرے بائیں پر جڑ دیا اور بولیں۔

”میں صدقے، ماری جاؤں۔“

”گھر تک واپسی میری زندگی کا ایک دانا کھٹا تھا تھا ہوا۔“ گھر مجھ میں ماری بھی غفلت سوتی رہا۔

”بتھاؤں گی۔ اب مجھ سے فارغ ہوئے تو بڑے اطمینان سے جان کو پیڑا اور ہاتھ رسی سے باندھ کر چوبارے پر لے گئے۔“

”یہ جیوں کا دروازہ نہیں نے اندر سے بند کر دیا۔“

”میں نے کب جگہ ضربات پر بھائی کی چیخ دیکھا۔ چند

”اوسے ایسوں پر سے روپیہ چلو واپس کرو۔“

”میں زس سے ہی حق فرماتا، اس لیے بھائی جان نے ڈیپلومی سمجھ نہ پایا اور یہ تازہ بند بحث پر اتر آیا۔“

”پہلے خود ہی راستے میں کہا تھا کہ خالہ پیسے لے لے لیتا، اب کیوں ڈانٹ رہے ہیں؟“

خالہ ہنس پڑیں۔ انہوں نے بھائی کو پیار سے دایاں گال ابھی تک لپیٹا تھا۔ انہوں نے آؤ دیکھتے تو ہمو پہلے ہی جیسے ایک نم آلود بوسے کا ٹھپا میرے بائیں پر جڑ دیا اور بولیں۔

”میں صدقے، ماری جاؤں۔“

”گھر تک واپسی میری زندگی کا ایک دانا کھٹا تھا تھا ہوا۔“ گھر مجھ میں ماری بھی غفلت سوتی رہا۔

”بتھاؤں گی۔ اب مجھ سے فارغ ہوئے تو بڑے اطمینان سے جان کو پیڑا اور ہاتھ رسی سے باندھ کر چوبارے پر لے گئے۔“

”یہ جیوں کا دروازہ نہیں نے اندر سے بند کر دیا۔“

”میں نے کب جگہ ضربات پر بھائی کی چیخ دیکھا۔ چند

”اوسے ایسوں پر سے روپیہ چلو واپس کرو۔“

”میں زس سے ہی حق فرماتا، اس لیے بھائی جان نے ڈیپلومی سمجھ نہ پایا اور یہ تازہ بند بحث پر اتر آیا۔“

”پہلے خود ہی راستے میں کہا تھا کہ خالہ پیسے لے لے لیتا، اب کیوں ڈانٹ رہے ہیں؟“

خالہ ہنس پڑیں۔ انہوں نے بھائی کو پیار سے دایاں گال ابھی تک لپیٹا تھا۔ انہوں نے آؤ دیکھتے تو ہمو پہلے ہی جیسے ایک نم آلود بوسے کا ٹھپا میرے بائیں پر جڑ دیا اور بولیں۔

”میں صدقے، ماری جاؤں۔“

”گھر تک واپسی میری زندگی کا ایک دانا کھٹا تھا تھا ہوا۔“ گھر مجھ میں ماری بھی غفلت سوتی رہا۔

”بتھاؤں گی۔ اب مجھ سے فارغ ہوئے تو بڑے اطمینان سے جان کو پیڑا اور ہاتھ رسی سے باندھ کر چوبارے پر لے گئے۔“

”یہ جیوں کا دروازہ نہیں نے اندر سے بند کر دیا۔“

”میں نے کب جگہ ضربات پر بھائی کی چیخ دیکھا۔ چند

”اوسے ایسوں پر سے روپیہ چلو واپس کرو۔“

”میں زس سے ہی حق فرماتا، اس لیے بھائی جان نے ڈیپلومی سمجھ نہ پایا اور یہ تازہ بند بحث پر اتر آیا۔“

”پہلے خود ہی راستے میں کہا تھا کہ خالہ پیسے لے لے لیتا، اب کیوں ڈانٹ رہے ہیں؟“

خالہ ہنس پڑیں۔ انہوں نے بھائی کو پیار سے دایاں گال ابھی تک لپیٹا تھا۔ انہوں نے آؤ دیکھتے تو ہمو پہلے ہی جیسے ایک نم آلود بوسے کا ٹھپا میرے بائیں پر جڑ دیا اور بولیں۔

”میں صدقے، ماری جاؤں۔“

”گھر تک واپسی میری زندگی کا ایک دانا کھٹا تھا تھا ہوا۔“ گھر مجھ میں ماری بھی غفلت سوتی رہا۔

”بتھاؤں گی۔ اب مجھ سے فارغ ہوئے تو بڑے اطمینان سے جان کو پیڑا اور ہاتھ رسی سے باندھ کر چوبارے پر لے گئے۔“

”یہ جیوں کا دروازہ نہیں نے اندر سے بند کر دیا۔“

”میں نے کب جگہ ضربات پر بھائی کی چیخ دیکھا۔ چند

”اوسے ایسوں پر سے روپیہ چلو واپس کرو۔“

”میں زس سے ہی حق فرماتا، اس لیے بھائی جان نے ڈیپلومی سمجھ نہ پایا اور یہ تازہ بند بحث پر اتر آیا۔“

”پہلے خود ہی راستے میں کہا تھا کہ خالہ پیسے لے لے لیتا، اب کیوں ڈانٹ رہے ہیں؟“

خالہ ہنس پڑیں۔ انہوں نے بھائی کو پیار سے دایاں گال ابھی تک لپیٹا تھا۔ انہوں نے آؤ دیکھتے تو ہمو پہلے

ہوئے کہا۔
”دور دور کی ادا انت نکالتی ہے۔“

ساتھ ہی ایک زوردار دھچک مجھے اور کرار اسامکا چو کی کمر پر مارتے ہوئے بولے۔
”اٹھو کھوٹے کی تسلا۔۔۔ جان سے مار دوں گا دونوں کو۔“

میرا جوش اور خوشی ایک دم کافور ہو گئی۔ میں مشتعل رہ گیا کہ چاہے نے ہمیں کس جرم کی پاداش میں سزا دی ہے۔ بہر حال ہم باز نہیں آتے۔ چونکہ چاچا شام کے بعد کھڑیوں سے گھر واپس لوٹا تھا۔ اس اثنا میں چو اور میں اپنے بچوں کے سنگ خاصا وقت کھیل لیا کرتے تھے۔

وقت گزرتا گیا۔ بھائی جان اب پورے چار روپے کے کاربگر بن چکے تھے۔ میں چوکی جماعت میں وظیفہ کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کر کے اپنے اساتذہ کی داد و تحسین کے ڈوگرے اٹھائے پانچویں جماعت میں جا چکا تھا۔ میرے ساتھ میرے علاوہ دو اور لڑکوں نے بھی وظیفہ حاصل کیا۔ گرمیوں کی ایک صبح چو بارے کے گمن میں بستر سے اٹھ کر بیچے آتے ہوئے معامیری نظر اپنے گھر کی منڈیر میں سے باجی حلیہ کی چھت پر پڑی۔ ان کی چھت پر ایک بی کمر تھا۔ کمرے کے دروازے پر لوہے کی زنجیر لگی ہوئی تھی۔ ہماری چھت کی منڈیر ایک اینٹ کی بنی ہوئی تھی اور ہر اینٹ کے بعد آدمی اینٹ کے برابر مربع سوراخ تھے، جن میں سے بہ آسانی آر پار دیکھا جاسکتا تھا۔ اس وقت میری آنکھوں اور کمرے کے دروازے میں چند گز کا فاصلہ تھا۔ بھائی جان کا ایک ہاتھ کٹڑی پر تھا اور وہ غالباً حلیہ کے کان میں کوئی بات کہہ رہے تھے۔ لیکن منہ کا نشانہ شاید ٹھیک نہیں رہا تھا۔

اسکول سے واپسی پر میں نے اپنے اور دیگر گھروں میں غیر معمولی کھسر پھسر ہوتے محسوس کی۔ صبح کے بعد بحث مباحثہ ہونے لگا اور پھر ہمارے گھر میں آمد و رفت بڑھنے لگی۔ جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ بھائی جان کو صبح کا نا پھوسی کرتے ہوئے صرف میں نے ہی نہیں دیکھا بلکہ سامنے والے گھر سے چاچی عاتقہ بھی چشم دید گواہ تھی اور وہ اس معاملے کو نبھانے کے لیے مجھے اپنا سیکنڈ ان کمان بنانے پر تکی بیٹھی تھی۔ عقدہ یہ کھلا کہ بھائی جان نے کانا پھوسی کرتے ہوئے احتیاط سے کام نہ لیا اور بجائے کان میں کہنے کے ذرا نیچے گردن پر کچھ کہہ گزرے، وہ بھی خاصا زوردار طریقے سے جس کے نتیجے میں گوری گوری جلد پر چوٹی کے برابر ایک گول سا سرخ عنابی رنگ کا نشان پڑ گیا

تھا۔ سوائے میری اماں اور حلیہ کی ماں کے ساری خیر خواہیں اس سرخ عنابی نشان کا جائزہ بڑی ترقی لے رہی تھیں اور سوال پر سوال کیے جا رہی تھیں۔ میری رہی تھی کہ اسے دھندل کر رکھا ہے۔ اس کی ماں بھی یہی رہی تھی کہ کئی دنوں سے دھندل کے آثار نظر آ رہے تھے میری اماں نے بھی بغور ملاحظہ کرنے کے بعد کامل یقین ساتھ اپنا فیصلہ صادر کر دیا کہ لڑکی کو بلاشبہ دھندل کر رکھا ہے۔ لیکن چاچی عاتقہ مانتے والی نہیں تھی۔ مجھے ساتھ ہی جھٹ میرا زویہ اور چو بیٹھے تھے۔
”اؤں کا کہنا تھا تم رسوں پاک کی اولاد کی ہے۔ تم نے کیا دیکھا تھا۔“

نہ جانے میرے جواب میں کون کی ہونے کا شدید اثر کیا کہ بیشتر خاتون کو فسی کا دورہ پڑ گیا میں میری درجہ پر کچھ کے تائب نے ڈس کیا۔ جب مجھ سے دھندل کے آثار تشریح کرانی تھی تو میں نے یوں وضاحت کی۔

”میں نے جب دیکھا، اس وقت بھائی جان باجی کان میں کوئی بات کر رہے تھے، دھندل بعد میں لگ بھگ۔ حالانکہ میرا جی یہ چاہ رہا تھا کہ میں انہیں بتا دوں کہ بھائی، بات کان کے بجائے گردن میں کر رہے تھے۔ میں نے اپنی زبان کو مضبوطی سے دانتوں سے دبائے رکھا۔ حلیہ رو رو کر کہہ رہی تھی کہ کٹڑی سخت ہونے کی وجہ سے سے حل نہیں رہی تھی لہذا لاچار ہو کر اس نے بھائی جان کے لیے پکارا تاکہ بستر کمرے میں رکھے جو میں نے ہو چکی تو برادری کے تمام مرد بھی ہمارے گھر میں ہو گئے۔ اس صبح کا آواز ایک سرگوشی سے کیا ہوا تھا۔ ہمارے گھر میں سرگوشیوں کا ایک سلسلہ چلا نکلا۔ گردن کے لیے کرنے کو اور کوئی کام نہیں رہا تھا۔ ہم جس کے نزدیک سرگوشیوں کی بات سننے، سمجھنے کی کوشش کرتے بڑی بے رحمی سے ششکار دیے جاتے۔ بالآخر عاتقہ کے بہت سی سنہالی آگئی۔ ہوٹل سے سالن کا بڑا سادہ کپڑا اور ڈھیر ساری روٹیاں بھی لائی گئیں۔ اپنے ہی دماغ نے، جو خیر سے مولوی بھی تھے، بھائی جان در باجی میرا نکاح پڑھا دیا۔ ہم سب بچوں کو جب یہ بتایا گیا کہ یہ شادی ہے تو ہمیں بہت مایوسی ہوئی۔ ڈھول نہ باجے، بغیر منگنی۔ چٹ بیاہ۔ وہ بھی ایسا پھس پھسا۔ بہت عرصہ بعد بھی عاتقہ سے سامنا ہوتا تو وہ ضرور ہنستی اور مجھے کندھوں پر کپڑ کر دیتی۔

”ہاں بھی کانے اتنا دھندل کر کے لگتا ہے۔“

اب میں شرماتے لگا اور سمجھ گیا کہ جھڑکرو دھندل جس انداز میں نکلا وہ کوئی ایسا سادہ سا معاملہ نہیں تھا۔ بہر حال مجھے ایک خوشام آثر تجربہ ہوا کہ اب تک کی زندگی میں میری یہ سبکی صاف تھی جس پر بھائی جان نے مجھے کوئی سزا نہیں دی۔
”گھر داری کے کھیل میں، بھائی جان کے ہاتھوں سے درپہ بند ہونے کا یہ تجربہ ہوا کہ میرا اور اختر نے اپنی کی حیثیت پر ایک سے اپنی دیا بسا شرم کی ان چند ایک بہت صبر کر کے ہمیں بھی پہنچے ہوں آئے کی دعوت دی۔ جو ہم نے بعد شکر یہ قبول کر لی اور دیوار سے ساتھ چار پائی کھڑی کر کے میں اور چو پڑا اتر گئے لیکن ان کی برساتی میں وہی چار پائیاں پڑی ہوئی تھیں، جن سے وہ صرف اپنا گھر بنا پاتے اور ہم دونوں، بے خانہ چڑھ کر محض مہمان ہوا پڑا رہتا۔ ایک ہی گھر میں دونوں جوڑوں نے پیار محبت سے رہ کر ایسا رمداداری اور فراخ دلی کے اعلیٰ معیارات قائم کیے۔ درمیان میں ہمیں سے پارٹیشن کر کے میزبان جوڑے نے حثالی انصار ہونے کی روایت زندہ کر دی۔ مگر ہم نے خود ہی احساس کر لیا کہ اتنے چھوٹے گھر میں دو کنبوں کا رہنا آسان نہیں۔ اور پھر یہ امر ہماری انا اور وضع داری کے مروجہ تقاضوں کے بھی منافی تھا۔ اس کے علاوہ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہ بھی تھا کہ میں اور چو عیال دار بھی تھے۔ ہمارے دونوں کم سن بچے، پہاڑ کی سی بلندی عبور کر کے ہمراہ آنے سے ہمیشہ قاصر رہے۔ ہمیں بچوں کی یا اساتذہ نے ملتی۔ چو ناک پر انگلی رکھ کر دراخت لکھ میں مجھ سے مخاطب ہوئی۔

”نہیں کے اپ! خدا کا خوف کر رہے کرو۔ معصوم بچے اکیسے ہوں گے۔ کوئی چوٹ ہی نہ لگوا لیں۔ جہاں بیٹھ جاؤ، تمہارا ٹھنڈے کدوں ہی نہیں چاہتا۔“
اختر بول پڑی۔

”بھین! اللہ سے خیر مانگو۔ کچھ نہیں ہوگا بچوں کو۔ ابھی خانے کا وقت ہو رہا ہے۔ بغیر کھائے بالکل نہیں جاتا۔“
اپنے ”گھر والے“ کو گھور کر دیکھتے ہوئے مزید کہتی۔
”نیک بھائی! روک لے مہمانوں کو۔ کھانا کھائے بغیر چلے گئے تو برادری میں ہماری بڑی بے عزتی ہو جائے گی۔“
گھر والا بھی ہمیں روکنے پر اصرار کرنے لگا اور بڑی اپناہیت کا ٹھہر کرتے ہوئے کہتا۔

”نہ نہ بھائی صاحب! ہم نہیں جانے دیں گے۔ بڑے دنوں بعد آئے ہو۔ آج رات رہ جاؤ۔ بڑی باتیں

پاس ہیں، فکر کیوں کرتے ہو؟ اللہ مالک ہے۔“
چو جواب دیتی۔

”بھائی جان! بچوں کے ساتھ تیار بڑی سختی کرتا ہے۔ آپ کو نہیں پتا۔ ہم جانتے ہیں یا ہمارا خدا۔ ہمیں اس بندے کا ذرا بھی اعتبار نہیں۔ آپ اجازت دیں۔ زندگی ہوئی تو پھر ملیں گے اور رات رہ کر جائیں گے۔“ میں اپنی ”گھر والی“ کی تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہتا۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ بھائی اختر!۔۔۔ اور منیر یارا دعا کیا کرو۔ اللہ غیب سے مدد کرے۔ ساتھ ساتھ جوڑے کے گھر بنا لیں اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بڑوسی بن کے رہیں۔“
دونوں باری باری ”آمین“ کہتے اور اٹھ کھڑے ہوتے۔ میں اور منیر گلے ملنے لگتے تو اختر اور چو بھی بغل گیر ہو جاتیں۔ بڑی محبت اور خلوص سے رخصت کرتے۔ ہمارے دیوار سے پار اتر آنے تک ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہتے رہتے۔ آخر میں معذرت کرنا نہ بھولتے کہ وہ ہماری صحیح طرح خدمت نہیں کر پائے۔

بھائی جان نے اچانک ایک دن ہماری ہی ہستی پر دعاوا بول دیا۔ باجی حلیہ دیوار پر سے جھانکتی رہی اور اس بار نہ تری۔ جو شتر اس کے کہ بھائی جان بن بلائے مہمان کی طرح ہمارے دسترخوان پر پل پڑے، خوش قسمتی سے عین اسی وقت منیر کی اسی چھت پر آ گئیں اور بھائی جان کو گھور کر دیکھتے ہوئے بولیں۔

”تم جوان مشنڈے ان چھوٹے چھوٹے بچوں میں کیوں گھسے چلے آئے ہو؟ بھاگو یہاں سے۔“

بھائی جان نے فوراً بہانہ کھڑا کر دیا کہ وہ مجھے لینے آئے ہیں۔ میں نے ہاتھ اور سر زور زور سے لٹی میں ہلایا اور بلند آواز میں خالہ سسکی سے کہا کہ بھائی جان جھوٹ بول رہے ہیں۔ یہ ہمارا دسترخوان چٹ کرنے آئے ہوں گے۔ اس موقع پر بھائی جان نے مجھے کینہ تو نظر دوں سے گھورا اور دیوار پر بند گئے۔

تھوڑی دیر بعد چو اور میں نے میزبانوں سے رخصت چاہی تو انہوں نے حسب روایت کچھ دیر اور بیٹھنے پر اصرار کیا اور پھر اجازت دے دی۔ ہم دونوں اپنے گھر کی میزبیاں اتر رہے تھے کہ بھائی جان دھندل اور پڑھنے لگے۔ میں نے خطرے کو بھانپ لیا اور چو کو کراہاں کو بتایا کہ بھائی ہمیں مارنے آ رہا ہے۔ چو میری پیٹھ سے چپک گئی اور کمر میں بازو ڈال کر رونے لگی۔ اسے میں بھائی کی

”میں اور دو تین آدمیوں میں جا رہا ہوں۔ بیٹا میں مروڑ اٹھ رہا ہے۔ بہت جا آئے سے۔“

اسنے میں وہ ہمارے سامنے آگئے اور میرے ساتھ جھپٹتے ہوئے اندھا دھند سیزھیوں پھلانگتے گزر گئے۔ ہم دونوں سنبھل نہ پائے اور لوٹنیاں کھ کر سینڈنگ پر آن گئے۔ حسن اتفاق سے لینڈنگ اور ہمارے درمیان دو ہی سیزھیوں کا فاصلہ رہ گیا تھا، اس لیے زیادہ چوٹیں نہ لگیں، صرف خراشیں آئیں مگر چو خوف، اور دہشت کے مارے لگ چڑ کے رونے لگی۔ چھت میں بنے آٹھ دس فٹ مربع روشن دان کے سروں میں سے بھٹی نے جھانک کر بہ آواز بلند ماں سے کہا کہ جلدی میں گزرتے ہوئے کا کھرا گیا اور چو اس کے ساتھ چھٹی ہوئی تھی، اس سے دونوں گئے۔ جان بوجھ کے دھکا نہیں دیا۔ اماں نے چو اور میری خراشیں صاف کر کے پچھڑا دیا۔ اسنے میں ابا جان گھر میں داخل ہوئے اور سارا ماجرا جان کر سیزھیوں چڑھنے لگے۔ بھٹی کچھ ہی لمبریں میں گھسے بیٹھے تھے۔ ابا جی نے آواز دی تو وہ اندر سے بولے کہ پیٹ میں بڑا سخت مروڑ اٹھ رہا ہے۔ ابا جی نے کہا۔ ”تم باہر آؤ، مروڑ ایک منٹ میں ٹھیک کر دوں گا۔“ بھٹی نے نکلنے میں دیر کر دی تو ابا جان نے چار پائی ٹھیسٹ لی اور اطمینان سے بیٹھ گئے۔ ”خراشا بھٹی پیٹ پکڑے ہوئے باہر نکلے اور وہاں سے ہو کر بولے۔“

”بڑی سخت قبض ہو گئی ہے، اور بڑا شدید ہو رہا ہے۔“

ابا جی نے اس کا بازو مضبوطی سے پکڑ لیا اور لیٹرین میں ایک نظر ڈال کر لائے ہاتھ سے تیس چار ایسے زوردار پھینک دیے کہ بھائی بیدار اٹھے۔ ابا جی نے ان سے پیٹ کے ارد کے بارے میں پوچھا کہ آرام آیا یا نہ۔ ”نہیں، اور زیادہ آگئی، آٹھ میں رونے لگے تو مزید دو پھینک مارے۔“ اس نے سب سے قبض بھی ٹھیک کر کے لے لی۔“

اگلے روز منیر کے والد صاحب نے نہت پر مستری مروڑ لگا دیے، جنہوں نے رات گئے دیو پر چھٹا ہو چکی تھی۔ سب سے دیو کو، لی میں ہیٹ خوب کمر کچ کے تھلے سے کھینچ دیے۔ یوں بھٹی جان کی سب کا عمل اندازی کا یہ نقصان ہوا کہ چھت پر سے میر اور منیر کا رابطہ ناممکن ہو گیا۔ مگر اسکول میں ہماری دوستی مزید گہری ہو گئی اور کمرائے جماعت میں وہ میر سے ساتھ کی نشست پر بیٹھے رہنے لگے۔ میرا ہم نشین ہونے سے میر کو یہ فائدہ ہوا کہ بڑھائی میں اس کی انجیکشن پینٹ کی نسبت بہت زیادہ آسانی سے لگائی جاتی تھی۔

جہ عمت میں تیسری پوزیشن حاصل کی۔

کالج پہنچ کر میری اور منیر کی دوستی تو برقرار رہی مگر اس نے پری میڈیکل ور میں نے پری ٹیکنیکلنگ مضمین کا انتخاب کیا۔ ہم دونوں نے ایف ایس سی فرسٹ ڈویژن میں پاس کر لی اور میری صلیج بھر میں، اول پوزیشن آئی۔ منیر نے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں داخلہ لیا اور میں لی ایس سی انٹرنیکل انجینئرنگ کرنے کی غرض سے پنجاب یونیورسٹی چھوڑ آیا۔

وقت گزرتا آیا۔ میں نے عرار کے ساتھ سیکٹر ٹیکل انجینئرنگ میں بی۔ ایس سی پاس کیا اور اساتذہ پر مزید تعلیم کے لیے یو ایس آئیے چلا گیا۔ اہل سے ڈیگری ٹیکسٹ مراعات پر ایک مینیجمنٹ کینی کی مدت حاصل کر کے ڈس ایسٹ آگئے۔ یوں لگتا تھا جیسے قسمت نے میرے اوپر دوت کے دروازے کھول دیے ہوں۔ میرا نام کی نوعیت پتھان تھی کہ وطن بہت مختصر وقت کے لیے چند ایک مرتبہ ہی دسکا دراصل بھٹی جان نے یہاں ایک وقت کی منصوبہ بندی کر دی تھی جن کے پیٹ بھرنے کے لیے میرا پیرولس میں بنا ایک مجبوری بنا چلا گیا۔ تاہم محبت کی سحر انگیز زنجیریں میرے دل و دماغ و جسم و جان سے پٹی رہیں۔ مجھے اماں، باپ، بھائی اور بھائی ہر وقت یاد آتے۔ باجی علیہ، بھٹی جان، جاپیاں، تانیاں، پچپیاں، چچا، چچا، تانے، جاپو، جاپو، دار جان، مانا جان، مائی جان سب گزرتے، مجھے، رات، اپنا، اس کے مصافحت اور اپن اس کی ٹی موسموں، سیکھنے میرے رنگ و رہنے میں سہاگ رہیں۔ غیر مشروط محبت جیسے رمیہ کی مجبوری تھی۔ شاید میرے خدا نے میرا وجود تخلیق کیا تھا۔ اس میں محبت ہی بھری تھی۔ یہ من ملک یہ دل کی ترقی و ترقی و شکست، پر شکہ ہی رات، اور کشادہ سزکیں، مجھے متاثر نہ کرتیں لیکن اپنے شہر کی تکلیفیں، چھٹی چھٹی ایک انجی مونی سے اپنی صدیوں پرانی عمارتیں، حویلیاں، مکان، اور ان چوہا پھانسی، تانے، تانے اور خیتیں میری روح میں عالی رہیں۔ میں سوچا۔ ”اپنے وطن سے محبت کیوں نہ کروں؟“

اس عرصہ میں میر کے ساتھ بذریعہ فون اور خط کتابت میرا رابطہ رہا۔ میں نے ایم بی بی ایس کے فائنل امتحانات کے فوراً بعد اخت سے شاہی ٹریڈنگ اور ہیٹ مگر بیوٹن کے سبب یو ایس سے چلا گیا۔ گھر سے آنے والے خطوط کے ذریعے ملنے پہنچتا رہا۔ منیر کے ہاتھ نے

بڑھانے میں کامیاب رہا ہے۔ بڑھانا صفریٹ اسٹنٹ ٹیکسٹ بک سے پرفارم ہے۔ صرف اخت سے بی ایس سے ریڈیو میں پڑھا اور منیر سے شاہی ٹریڈنگ میں انکے مجھے فون کیا کرتا کہ اس نے بچپن میں لکھنا، گھر گھر ہانک تھکتے میں بدل ڈالا ہے، ہذا میں ہی چو سے کیے ہوئے جہاں کو ملنا سچ ثابت کر دیا۔ ”میں ملے۔“ اسے اسے رڈیٹ یا کے امریکن انوکا لوک سٹور میں ملازمت لیتا کروں۔ وہاں کی شہریت ملے ہی بیوی اور دونوں بچوں کو بھی پاس بلا لیا۔ اب وہ ایک ہندو پڑھنے فون کال کرتا اور یہ ضرور کہتا۔ ”یہ احمد کروناں چو سے شاہی۔ پھر لکھنا ساتھ گھر بنا کر رہیں گے۔ خیر اس کو رست یاد کرتی ہے۔“

میری یادوں پر مبنی صرف ہائی لیم یا۔ ف لیم ہی میں تھی جو دماغ میں محفوظ رہتی۔ بلکہ دل میں بے محبت کے اہم ترین عمل کی ہر دیو پر پرن مکتوں، باتوں، یادوں اور چرواں کے دل فریب نقش کندہ تھے اور اس تانے میں کی رات ریوں، داروں، درپچوں اور پچپوں میں ایک خوب صورت شہزادی ہر وقت موجود ہوتی۔ جب بھی میر اس سے سامنا ہوتا، وہ دل و دماغ میر سے قریب آ کر آسمانوں سے محبت میں سرگوشی کرتی۔

”گھر میں سب کچھ ہے کماں واپا ابز، منہ کا فضل ت۔ بسم اللہ کر کے اب لوٹ۔“

وہ شہزادی، چاچے تھے سہیلی، جس نے گھرانے کے فرد بلا شرکت غیر حسن کے بادشاہ تھے یلین غربت نے ان کی سلطنت کی انت سے اینٹ بنا رکھی تھی۔ وہ دوستیوں کا بادشاہ اربوں سالوں سے اپنی کائنات کا حکم چلا رہا ہے۔ اس کی مصیقتیں وہی جانتے۔ پچھ بچھ میں نہیں آتا۔ کیس گورنگھ خدا ہے۔ اپنے بندوں کو غصے سے بچھتے ہوئے کوئی چیز ہے حساب دے دیتا ہے اور کچھ مفر کر دیتا۔ چاہتے تھے کہ گھر حسن پر ہی تھا یا عزیز رشتہ داروں کی جانب سے ملے ان پر پردہ زکوٰۃ خیرات پر۔ میں حسب بھی ہر فٹ بھیجتا تو ماں کو لکھتا کرتا کہ سب رشتہ داروں کا خیال رکھا جائے اور چاہتے تھے کا خاص طور پر۔ میری غیہ موجودگی میں یہاں میر سے اس آخری جملے کا بڑا اثر چھڑتا تھا۔ ”سبھی کہتے تھے کہ ازور دراصل آخری جھڑت اغاظ پر ہے۔ بھٹی جان کہتے تھے کہ اسے اس مخصوص غصہ کی مہر ہو رہی ہے۔ اپنی بڑی پر بڑے ستم سے اس کا نہیں بچا جاتا۔“

یاد غیہ میں میرا ہم نشین ہونے کا بھی جھکا جاتا تھا۔

Nostalgia کے ساتھ ساتھ

قرآن کی عظمت

1935ء میں جرمنی بڑا قتل عام تھا۔ ایک لکھنؤی نے کوئی چالیس نسخے دہلی کے پادریوں کے ہاتھ لگے۔ انہوں نے پڑھ کر دیکھے تو سبھی نسخے ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ یہ دیکھ کر انہیں حیرت ہوئی۔ پھر انہوں نے مشورہ کیا کہ مسلمانوں کا قرآن دیکھتے ہیں، اگر وہ بھی اسی طرح تھا تو پھر یہ نسخے ٹھیک رہیں گے ورنہ غلط ہیں۔

انہوں نے چالیس کے بجائے دین کے مختلف نمونے سے ستر ہزار قرآن مجید اکٹھے کیے اور سالہا سال ان پر ریسرچ کرتے رہے لیکن ایک زبردست اور پیش کی بھی سبھی نکال نہ سکے۔

مرسلہ: مسلمان نہ ان، ضلع یونے

ہوں اس لیے اب نسخے دہلی لوٹ جانا چاہیے۔ میں بڑی سنجیدگی سے اس مشورے پر عمل کرنے کا سوچنے لگا اور تہیہ کر رہا تھا کہ کتنی سے میرے معادے کی معیاد ختم ہوتے ہی چھ جاؤں گا۔ بس دو ماہ سے بھی کم عمر سے کی بات تھی۔ انہی دنوں مجھے باجی حیدر کی بیٹی اور آخری چھٹی ملی۔ اس نے لکھا تھا۔

”پیارے بھائی کا کے احمد سلامت رہو۔ تمہارے بھائی جان نے تمہاری ہدایت پر بڑی عھگی سے عمل کیا ہے اور کسی رشتہ دار کا زیادہ خیال نہیں رکھا البتہ چاہتے تھے کی خوب مدد کی ہے اور اسے پوری دس پاور لومز (Power Looms) بنوادی ہیں۔ کسی چھٹک نہ بڑنے دی اور چھ سے کالج کمر کے قیدی کی، لی بھی میں منتقل ہو گیا ہے۔ ٹیکہ بی اور دونوں کھنیاں اس نے پہلے ہی پہنے نام کو رکھی ہیں۔ تم ابھی مزید رقم بھیجو۔ کیا خبر لکھارے بھائی نے ابھی دو شادیوں اور کرنی ہوں۔ ویسے بھی اب تمہیں واپس آنے کی رحمت نہیں کرنی چاہیے خدا حافظ۔ تمہاری باجی حیدر۔“

یہ ایک بیا بھونچال تھا جس سے میرے دل میں بے محبت کے عظیم شان تانے میں کی بنیادیں ہلا دیں۔ سب دیواروں میں دراڑیں پڑ گئیں۔ مجھے لگتا تھا کہ میں کسی گلی لکھے اس کے مجھے تے دب رہا ہوں گا۔ چوتھے روز دقات کار کے دوران ایک صاف سے تھیں میں شدید برقی مدت کا کا بھوکا ہوا تھا۔

بے جان اور ناکارہ گوشت کے بوتھڑے میں تبدیل ہو گیا۔ کوئی چارہ نہیں تھا۔ میرا بازو کھنٹی کے قریب سے کاٹ دیا گیا۔ میں اپنے اوارے اور بے رحمی سے ڈھیروں دولت سمیت گر گھر واپس آ گیا۔

میں اپنے پیچھے جس طرح کا شہر، محلہ، کلی اور گھر چھوڑ گیا تھا، اب وہاں بہت کچھ بدل چکا تھا۔ شہر سے باہر سڑکوں پر در بھی بہت سے جنگلے بن چکے تھے کئی شاہاچروں پر سے غربت کی دھول اترنے کے ساتھ ساتھ محبت کی بک بھی دھل چکی تھی۔ ہماری کھوہ والی نئی کوٹھی بڑی کشادہ اور عاں شان تھی، جس میں اب اور ان کے ساتھ میں رہا ش پڑا ہوا۔ گڈی اور ننھا عظیم کی غرض سے لاہور میں مقیم تھے۔ میں دن بدن کمزور ہوتا گیا۔ میں نے ملک کے بہترین طبی مراکز سے چیک اپ کرایا۔ بڑی باریکی سے تحقیق و تحقیق کی گئی تو ماہرین نے جتنی رائے دی کہ برقی صدمے کے باعث میرے خون کے اندر سرخ ذرات جل گئے ہیں۔ ان کے مزید پید ہونے کی صلاحیت باقی نہیں رہی۔ دھن میں علاج کی سہولت میسر نہیں۔ مجھے مشورہ دیا گیا کہ بیرون ملک علاج کرانے جاؤں جہاں شاید کندھے کے قریب سے بارو کاٹ دیا جائے تو زندگی میں چند برسوں کا اضافہ ممکن ہے۔ میں نے اس تجویز کو قبول نہیں کیا۔ میں ٹکڑوں میں مرنا نہیں چاہتا تھا۔ اب میں ایسی حالت میں اپنی دونوں ماؤں کو چھوڑ کر کہیں بھی جانا نہیں چاہتا۔ ایک میری ماں جس سے میں نے جنم لیا اور دوسری میری مادر وطن۔ ایک کے پہلو سے لگ کے اور اس کی ممتا بھری گود میں سر رکھ کر اپنی آخری سانسیں لیتا چاہتا ہوں۔ دوسری کے دامن میں ابدی خند سونے کا تمنا ہوں۔ ایک تیسری ہستی، جس کی روح و حقیقت زل سے میری روح سے جڑی ہوئی ہے۔ میں زندگی کے آخری لمحات میں سے اپنی بصارت میں سموئے رکھنا چاہتا ہوں۔ جو پردیس میں تو ہمہ وقت میرے پاس تھی ہی اور اب ہر ساعت میرا طواف کرتی رہتی ہے۔ بغیر آنکھ جھپکے مجھے دیکھتی رہتی ہے۔

جب دق کی ماری ہوئی سردیوں کی اس سہ پہر کو میر اور اختر مجھے ملنے کے لیے اچانک کھوہ والی کوٹھی پہنچ گئے۔ دونوں کی بڑی آن بان والی جوڑی بنی تھی۔ مجھے دیکھ کر رنجیدہ ہو گئے مگر سیر جلد ہی سنبھل گیا اور قدرے شوخ ہو کر باتیں کرنے لگا، جو درحقیقت بچپن کی وہ گد زیاں تھیں۔ اس نے بتایا کہ میری بیماری کے بارے میں سن کر بیوی بچوں سمیت صرف مجھے ملنے کی خاطر امریکا سے آیا ہے۔ ان

لمحات میں میرے آس پاس جھپکی ہوئی افسردگی چھلنے لگی اور خوش گو رسی ہمارے بیٹھنے والی کے دوست ویرانہ سائے سمندر پار سے، اندوہ کی ان گھڑیوں میں مجھے ملے چکے ہیں۔ تاہم یہ احساس بھی جاں گزرا تھا کہ میں اس کی سر پر بچپن میں جس کے ساتھ گھر گھر کھیل کرتا تھا، قیمتی زندگی کا گھر وہاں مٹانے سے محروم رہ گیا۔ میں نے میری قابل مکتوب اور بہت دیر تک تمام رچا رچوں کا مطالعہ کرتا رہا۔ رات کا کھانا ہم نے ایک ساتھ کھایا اور وہ میری قابل مکتوب سے گیا۔ اگلے روز تمام کاندھات کی فوٹو سنٹ نقل کر دیاں اور اپنے بے فائل تیار کر لی، اصل مجھے دیکھ کر دی۔ اس کی چھٹی، ایک ماہ کی تھی، مگر دس روز بعد ہی واپس چلا گیا۔

کھوہ والی کوٹھی میں میرا دل نہ لگا اور میں وہاں میں رہنے رہنے آ گیا ہوں۔ گوچر بارہ بھی اب جنگلے جیسا تھا۔ لیکن اپنے ارد گرد چھوٹے بڑے مکاؤں کے ساتھ مٹوٹی سے جڑ ہوئے۔ جیسے جیسے وہ گھر سے جتن ایک در سے کدھتے کے ساتھ کدھاما کے کھڑے ہوتے ہیں۔ ان اور اب مجھے ایک گھڑی کے لیے بھی تہ نہیں چھوڑا۔ وہ ماں جس نے میری زندگی کے ایک رب بھت میں ایک رقم ایک اب مرتبہ میرے جینے کی دعا میں نہ مان کی۔ بڑی جڑی سے اند کے حضور میرے لیے تیار ہو گئی۔ اسی ماں کے سامنے میں برف کی آبی کے مانند گھٹا چلا ہوں۔ وہ مجھے اپنے دان میں، تھیلیوں میں اور مال نے نہاں خانے میں نہیں بھی چھپا کے اب رکھ نہیں سکتی۔ جی سانسوں میں جیوں گا، وہ اسی طرح جتنی بے بسی ان سے آنسو بہاتی رہے گی۔ میرے ابا مجھے حوصلہ دیتے ہوئے چہرے کا رخ دوسری جانب موڑ کر تنہا چھپتے ہیں۔ میں تو حوصلہ ہارا ہی نہیں۔ میں اب بھی مسکراتا ہوں۔ سب سے باتیں کرتا ہوں۔ میرا جسم بستر پر ہوتا ہے لیکن میں خود چوبارے پر چڑھ جاتا ہوں۔ وہاں چار پائوں سے بے گھر کے دروازے پر آنکھ چادر کے پردے کو ٹھکراتا ہوں۔

”ہاں بھئی کرماں والی“ کچھ ہے گھر میں کھانے کو آج بڑی بھوک لگی ہے۔“
 اوپے کے گھونٹ میں سے دو نیلے تارے چلے ہیں درگاہ پر رکھی نرم ہاتھوں کی حرکت کرتی ہیں۔
 ”بسم اللہ کروں، تو بیٹھ تو ابی کرماں دایا“ سب سے بے اند کے فضل سے۔“
 لیکن۔۔۔ یہ تارے کی پندہ ماند بڑھتی ہے۔

۔۔۔ اُس میں دھندلا گئے ہیں۔ گلاب پر رکھی تارک ہاتھریاں مرجھ چکی ہیں۔ میرے دل میں کھنڈر بنے تاج محل کے کسی تارک کو شے میں سے ایک سوال بدروح کی طرح میرے سامنے نہ کھڑا ہوتا ہے۔

”جب یہاں کچھ نہیں تھا تو اند کا بڑا فضل تھا۔ اب اب نہ ہے لیکن اللہ کا فضل کہاں رخصت ہو گیا۔“
 کاروبار میں بے پناہ وسعت اور مصروفیت کے باعث بھائی جان ہمیں ملنے کے لیے زیادہ وقت نہیں نکال سکتے۔ ان کا بیٹا گڈو اور باجی حلیمہ ہمارے پاس ہی رہتے ہیں۔ چند ماہ پہلے گھر میں چھ میگوٹیاں ہونے لگیں۔ کاروبار، فیکٹری اور کوٹھیں کا سول ہڈا ہوا گیا۔ ساری برائی کے مرد اور خواتین نے بھائی جان کو حاضر کر لیا تو وہ اپنے زوایاں انداز میں بغیر کسی لگی پٹی کے بولے۔

”بے شک سب کچھ کا کے کا ہے لیکن اب نام یا نسبت سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ بے چارہ بیمار ہے۔ کل کل کچھ ہو گیا تو پھر ت سار تر دو کرنا پڑے گا۔“
 کہتے ہیں کہ باری کا کوئی عاں نہیں۔

اماں نے دو ہاتھ بیٹھا شروع کر دیا۔ وہ تھوٹی بھین کر دوں کے میں کرنے نہیں اور بے اختیار ان کے منہ سے بدعا میں نکلیں۔
 ”وے، چھو تو مریاے۔“ تجھے میڑ کی پڑے اور کا کا ش جگ جیئے۔“

میری روح کانپ کی اور۔ نکھیں پھٹ پڑیں۔ بھوں ماں اللہ سے ب کہیا، ”اب رہی ہے؟“ ماں کو غش پڑ گیا۔ ابا میرے اوپر بیٹھ گئے۔ میرے لکڑی کی طرح سوکھے ہوئے بدن اور چہرے پر آنسوؤں بھرے ہوئے برسانے لگے۔ میری خالیں، چاچیاں، تائیاں، پھپھیاں، مائیاں اور چھوٹی بڑی ٹرکی سب دھڑلے مار کے رونے لگیں۔ مرد سب اشک بار ہو گئے۔ بھائی جان باہر نکل گئے۔ مجھے یوں لگا جیسے میں مرنے سے قبل ہی آنسوؤں کے سمندر میں غرق ہو جاؤں گا۔

پچھلے دنوں گھر کا راستہ بھول گئی ہے۔ اپنا گھر اور فیکٹری دن بھر اس کی زندگی کے نقشے سے حذف ہو چکی ہے۔ وہ کافق کی نازک گڑھا جیسے شفاف پانی سے دھلا لطیف پیکر، شگون سے بھر کوئی جام، بات بات پر پھٹ جاتی ہے۔ جب بھی اسے موقع ملتا ہے یہی ایک بھیگا سول۔

”کرماں دایا تو کیا بیٹے یا پردیس؟ میں تیری ہی مائی کی دیاں پادہ کے خوش چپ چاہتا ہوں۔“

کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ میں نے آگ بگاتی تھی کوٹھیں کو؟ تیرے ساتھ میں سر کھنڈوں کی جھپکی میں ساری عمر بتا دیتی۔ تیرے بعد تائی اور تائیا نے میری سار نہ جانی۔۔۔ کا کے۔۔۔ تو سب پردیس گیا، چھر کھنڈہ مڑا۔ یہی ہے تیری سار پائی کھنٹی کائی؟ شہزادوں جیسا تھا جب یہاں سے گیا موت سیر آ گیا۔

میں چپ ہو جاتا ہوں۔ میں نے سے پردیس میں کبھی نہیں بھویا تھا۔ میں نے کی کوٹھی نہیں بھویا تھا۔ مجھے اپنی کلیوں کی اونچی نیچی وہ شیں بھی یاد ہیں جن سے شوکر کھا کر بچپن میں کئی بار گھر تھا۔ میرے پاؤں کی اٹھیلیاں اور مٹھنوں پر ہر بار سی جگہ چوٹ مٹی تھی جو پہلے ہی زخمی تھیں۔ زخم، جن پر بہ مشکل کھنڈ بنے ہوتے، پھر سے لہو ہو جاتے۔ پردیس میں اپنے مٹھنوں پر ان زخموں کے نشان دیکھ کر پیار سے سہانے لگتا تھا۔ میں ان لوگوں کو کیت بھول سکتا تھا جس کی محبت کے امرت سے میرا وجود نشوونما پا تا رہا اور راج سیراب ہوتی رہی۔ ہمارے مائیں بچپن کی محبت کا جوان مٹ اور نموں ایک رشتہ تھا یا شاید ایسی محبت جو بچپن سے بھی پہلے جب ہمارے وجود ابھی عدم میں تھے، میں کیسے بھول سکتا تھا؟ ایسی محبت کوئی بھی نہیں بھول سکتا۔ اتنا کسی ہاتھ کو بھی چاہا ہے تو وہ بھول بن جائے۔ میرا خیر ہی محبت سے اٹھایا گیا تھا۔ میرا اب بھی یہی پختہ اعتقاد ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں دی روٹی ادا کیا ہے جو کا تب تقدیر سے مجھے تفویض کر دیا تھا، میرے ایک شخص کی محنت نے کئی گھرانوں کی کایا پلٹ دی۔ لوگ جذبول کی قدر کیوں نہیں کرتے۔ میری زندگی بھر کی کمائی پر میری محبت میں بہا کی آنکھ سے ایک آنسو بھری ہے۔ میں کتنا خوش نصیب ہوں۔ سب ہی مجھ سے ب انت محبت کرتے ہیں۔ ہر آنکھ میری محبت میں روئی ہے۔ میرے آس پاس ان آنسوؤں کی دبیڑ اچھند میں میرے سارے دکھ صدمے اور محرمیاں اوچھل ہوئی ہیں۔ مجھے اور کیا چاہیے؟ محبت کے سو ایسے کرشمے کہیں نہ ہوئے ہوں گے اور پھر سدا کوئی کب جیا ہے؟

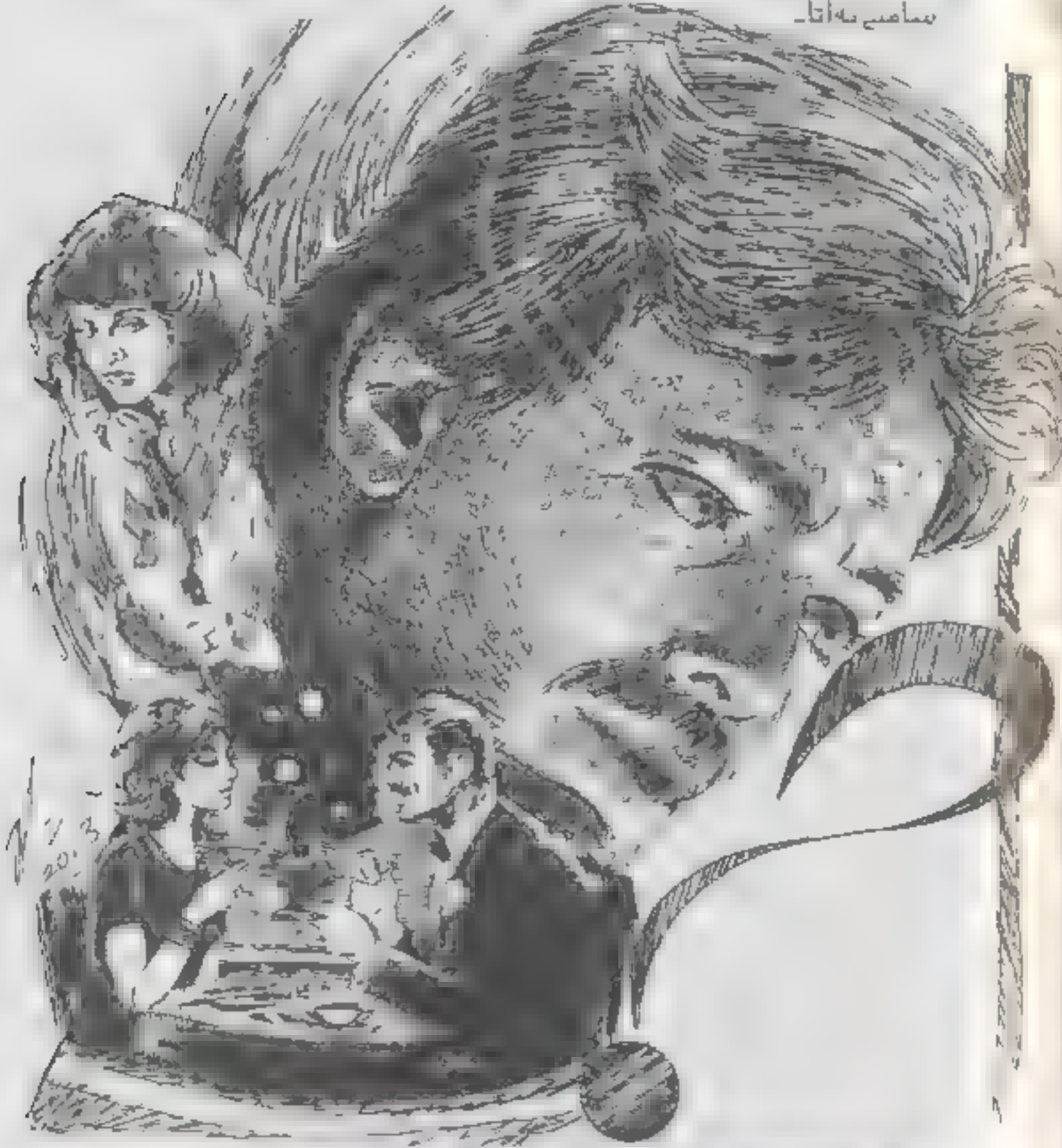
میں ب س ا غر جسم کے ساتھ زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ میں نے موت سے سمجھوتا کر لیا ہے۔ موت میری نعم سار ہے، میری سبھی اور میری آخری محبت، جو مجھے اپنی آغوش میں لے کر جسمانی آزار سے نجات دے دے گی۔ موت ہی وہ واحد دروازہ ہے جس سے گزر کر میں اپنے خالق کے روبرو پیش ہو جاؤں گا۔

تھائی جان۔۔۔ نے جو وطن، سیتے ہوئے کہا کہ میں کی

چلتا

باجیم

چلتا بازیوں میں اگرچہ مرد بھی کم نہیں ہوتے مگر اس معاملے میں عورت کے مقام کو ان کی گردی بھی نہیں چھو سکتی... اس سے ہی اس حقیقت کو سو فیصد سچ کو دکھایا... عسا جھوٹ نہ ہوتا تو ویسے سچ بھی سامنے نہ آتا۔



بہت اور بڑے ایک ایک چپ

دی جیسے اس کا شکریہ ادا کر رہی ہو۔
جف سے صبر نہ ہو سکا۔ اس نے اپنی قسمت کا حال
پانے کے لیے ایک گارڈین کو کی خولی اور اس کا
تھنے کے اس کا قد کی یہ کھول کر اس پر بھی تو کو پڑھتے

تقریبات اپنے جوتھن پر تھیں تو میں نے ہنسنے پر
محسوس کیا کہ جیسے میرے دل کی دھڑکن بہت سست
مجھے پر غنہ کی طاری ہونے لگی۔ میں نے بھرپور کوشش
اپنی آنکھوں کو کھارحاً تب اللہ کا مہربان رہا کہ میرے
سامنے آگیا۔ میں نے سرگوشی کی۔ "اے میرے رب
کے دن میرے پیاروں کی خوشیاں اور عورتی سرورہ جائیں
ت کا آخری ہے۔" چو نے یہ کہنے کے بعد بھی
میں جھپکی۔ وہ میرے پاس ٹھہر کر مسلسل مجھے دیکھ رہی تھی۔
شاید اس کے دل میں یہ سوچ ہو کہ میں وہ "تھوڑا جیتا" ہوں
مجھے نے ہر وہ چاہے۔ میں نے فون کی کھٹی پانی پانی
پر چو لڑ گئی۔ کپکپاتے ہاتھ سے ریسیدرا اٹھالیا۔ ہنسنے
پر موہوم ہی مسکراہٹ بکھر گئی اور اس سے کہا کہ موت کا
آنے سے پہلے فون پر اطلاع نہیں دیا کرتا۔ اس نے یہ
کہا اور یوں خاموش ہو گئی تو یاد دوسری جانب سے ہولنڈ
کو کہا گیا ہو۔ میری بات کا جواب نہیں دیا۔ قدرے اگلے
آواز میں بولی۔ "جی... ہاں جی... السلام علیہ
جان۔ ویسے ہی ہیں جیسے آپ دیکھ کر گئے تھے۔ ہمارے
ہماری شادی ہو گئی ہے... خیر مبارک... اللہ کے
کی رہا مبارک۔" اس کے ہونٹ کپکپاتے اور آنکھوں
آنسوؤں ہو گئے۔ فوراً بات سے آواز بھرنے لگی۔
ہی کہ پائی۔ آپ نو داں کو بتائیں۔ "زیادہ تر
سے گات ہوئے بولی۔ "میر بھلی۔" میرے کان میں
کی آواز سنائی دی۔
"نور اویزا سکندرا اور بھابی چو کو ساتھ لے کر آئے
میں نے ضروری کاغذات تجھے بھجوا دیے ہیں۔ میڈیکل
نے تیری ساری رپورٹیں پڑھ کر رائے دی کہ بیماری قدر
طلاج ہے۔ تمہیں بتا دوں، یہ امریکا کا پہلا کینسر اسپتال
جو 1904ء میں قائم ہوا تھا۔" قدرے اونچی آواز میں
اور دوبارہ بولنے لگا۔ "اوتے کا کے اتیار ہو جاؤ۔ آخر
میں نے سارا پروگرام ترتیب دے لیا ہے۔ تم دونوں
ساتھ یہاں گھر گھر کھیلنے کا۔ بس تم دونوں ایسے کرنا
ساتھ لے آؤ۔ باقی چار بابا... تمہیں چھوڑیں، وہاں
پوری کرنا ہمارا ذمہ۔"
کا۔ اختتام پذیر ہوئی تو دور کی مساجد میں
وان نجر کی دان سنائی دے رہی تھی۔ کسی لمحے سڑک کے
مسجد کز رہیدہ کے اسیکر سے حافظہ بشارت احمد کی پاٹ
آواز میں گونج اٹھی۔ "اللہ اکبر۔"

روح تمام مرد کہیں اور رہی اور جسم ان کے پاس۔ انہوں
نے اپنی فطرت کے مطابق ریحار کس دیے۔
"تم میں ہے ہی کیا؟ بس چڑی سفید ہے۔ مجھے ایسی
ہی لگی ہو جیسے کسی مریض کے لیے سوچی سے بنائی گئی بھگی اور
بد مزہ کھیر، جو تیاری کے مرحلے میں بگی رہ گئی ہو۔ تمہارے
مقدر میں ٹنڈا لٹکا تھا۔ میں ناحق خوار ہوا۔"
اب اس کی ایک آرزو ہے کہ چند لمحے، دن، مینے
جتی بھی مہلت زندگی دے، محبت کے اسی گلستان میں
چاہت کے اسی گلستان سے صدیوں کی پیاسی روح آخری
بار پیاس بجھائے۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے دل میں
بسا محبت کا تاج محل خشکی کے باد جو ابھی مہدم نہیں ہوا اور
وہ حسین شہزادی جو اس کی راہدار یوں میں گزشتہ زندگی کے
پورے عرصے میں مسلسل دبے پاؤں ادھر سے ادھر چلتی
رہی، وہ پھر سے لوٹ آئی ہے۔ وہ شاید ادھر ہی تھی، کہیں
آس پاس۔ وہ دلہیز پر کھڑی مسلسل دستک دے رہی ہے۔
میں نے ہنسنے سے اٹھ کر دروازہ نیم وا کیا ہے اور اندر
آنے کے لیے بے تاب روح سے مخاطب ہوں۔
"محبت کا یہ تاج محل کسی بھی لمحے زمین یوں ہونے کو
ہے۔ اس میں ٹھنڈا تاجراج شاید اسی گھڑی گل ہو جائے۔ تو
لوٹ جا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ساری عمر کے اندھیرے اور
ستائے تیرا مقدر بن جائیں۔" اس نے اپنی کوئل انگلیوں کی
پوروں سے کواڑ کا کنارہ تمام لیا ہے، مہادا میں اسے بند
گردوں۔ وہ جھپکے ہوئے اس لیے میں کہتی ہے۔
"محبت کی کوئی بھی نہیں بھتی، خواہ وہ پوری زندگی میں
ایک ساعت کے لیے ہی چلی ہو۔ روحوں میں اس کی حیات
افروز حرارت محفوظ ہو جاتی ہے۔ میں اپنی باقی تمام عمر اسی
ایک ساعت کے نام کرتی ہوں۔ اور تو کہ جس نے مجھے سدا
سے بے حساب چاہا ہے۔"
میں نے دروازہ کھول دیا ہے۔ میں بار جاتا ہوں۔
آخری بار کہتا ہوں۔
"چو! ایسی محبت رسموں کی پابند نہیں ہوتی۔ ایک بار تو
مطلقہ ہوئی اور اب یہ وہ ہونے چلی ہے۔" وہ نہیں مانی۔ ہر کوئی
اس کا تم تو ہے۔ میں کس کس کا کہہ سکتا۔ آج تمام دن گھر
میں جشن کا سا سماں رہا۔ مجھے اور چو کو کچ کچ کا دلہا دلہن بنایا
یا۔ زخمی اور معزز خواہتا میں نے بھی جھومر ڈالا اور خوشی کے
یت ہائے چھوٹے بڑے سب ہی ایسے خوش تھے جیسے
میں نے واقعی ایک نئی اور طویل زندگی کا آغاز کر دیا ہو۔ یوں
جیسے سب تصور کے بحر میں کہیں کھو گئے ہیں۔ سہ پہر کو

ای جیف کا چہرہ کھلا گیا اور مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

”کیا ہوا؟“ کیتھی نے پوچھا۔

جیف نے جواب دینے کے بجائے وہ کاغذ کیتھی کی جانب بڑھا دیا۔

کیتھی نے کاغذ لے کر پڑھا۔ اس پر لکھا تھا۔ ”تمہاری زندگی خطرے میں ہے۔ کسی سے کچھ بھی مت کہنا۔ تم فوری طور پر شہر چھوڑ دو اور کبھی یہاں واپس مت آنا۔“

”یہ ایک مذاق ہے، جیف۔“ یہ کہہ کر کیتھی نے جیف کی طرف دیکھ کر اس کی شکل پر طنز آمیز انداز میں ہال کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ”جیف“ کیتھی نے اس کے بازو کو چبوتے ہوئے کہا۔ ”جیف تم مجھے خوف زدہ کر رہے ہو۔“

تب جیف نے اپنی نگاہیں کیتھی کے چہرے پر جما دیں۔ ”میں..... مجھے کچھ نہیں معلوم!“ جیف کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

کیتھی حیرت سے جیف کو دیکھنے لگی۔

”ہاں، مجھے کچھ نہیں معلوم۔“ جیف نے ایک بار پھر تجسس نظروں سے ہال میں چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بچھلے پھلتے مجھے دفتر میں بھی بالکل ایسی ہی تحریر موصول ہوئی تھی۔ تب میں نے یہ بات ہنسی میں اڑا دی تھی لیکن اب میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”رکو!“ کیتھی نے کہا۔

”تم نے یہ تحریر پڑھی۔ اس میں لکھا ہے کہ میری زندگی خطرے میں ہے۔“ جیف نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

”کسی نے تمہارے ساتھ یقینی طور پر عملی مذاق کیا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ تم نے جب کسی کے ساتھ ایسا کچھ نہیں کیا کہ وہ تمہاری جان لینے کے ورے ہو جائے تو پھر تمہیں خوف کیوں محسوس ہو رہا ہے؟“ کیتھی نے ایک بار پھر وہ تحریر پڑھتے ہوئے جیف کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”یا تم نے کسی کے ساتھ واقعی کچھ کیا ہے؟“

جیف کے ہاتھ ہچک رہے تھے۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو پتلون سے پونچھ اور آگے کی جانب جھکتے ہوئے بولا۔ ”میں نے لازماً کسی نہ کسی کو ناراض کیا ہوگا۔ شاید اپنے کام پر..... مجھے کچھ معلوم نہیں۔ نہ ہی میری کچھ سمجھ میں آ رہا ہے۔ مجھے بس فوراً ہی یہاں سے نکل جانا چاہیے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے ایک بیس اور ایک پانچ ڈالر کا نوٹ میز پر اچھال دیا اور بیرونی دروازے کی جانب لپکا۔

کیتھی نے بھی اپنا پرس اور کوٹ اٹھایا اور پیچھے تیزی سے چل پڑی۔

”رکو جیف!“ اس نے دوڑتے ہوئے کہا۔

جیف بدستور تیز تیز چلتا رہا۔ کیتھی نے اس کے برابر میں پہنچ کر اس کا بازو پکڑ لیا۔ ”ساتھ ساتھ تیز قدموں سے چلتے ہو۔ اس سے تمہیں پتہ نہیں چلے گا کہ تمہاری کیا ہے۔“

”تھریر میں کہا گیا ہے۔ کسی سے کچھ بھی نہیں کہنا۔“ سمجھ کیوں نہیں رہی ہو؟“ جیف نے اپنی رفتار کم کر دی۔

”اتنی بند آواز سے مت کہو جیف۔“ اس نے کہا۔

جیف نے اسے ایک کئی میں جھنجھکیا۔

”بات کیا ہے؟“ کیتھی نے اسے ارکیر کیا۔

”میں تمہیں نہیں بتا سکتا۔“

”ہم گزشتہ چھ ماہ سے پابندی سے مددگار کر رہے ہیں اور اب مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میں تمہیں جانے تک نہیں ہوں۔“ کیتھی نے شکایتی لہجے میں کہا۔

”بائے کے لیے پٹ گئی“ شاید یہ میری فطرتی کمی۔“

”نہیں، رک جاؤ۔“ میں کیتھی رک گئی اور ٹانگیں پھیلا کر دونوں ہاتھ پٹنے لگا۔

باندھ کر خدائی ہو گئی۔ اس نے اپنا سر بدستور ایک طرف یوں گھمایا ہوا تھا جیسے ناراضی کا اظہار کر رہی ہو۔

”اوکے۔“ جیف نے کہا۔ ”بات یہ ہے کہ پندرہ سال قبل میں نے ایک ایسا کام کیا تھا جس کے نتیجے میں کون دیکھ پکڑا گیا اور اسے جیل ہو گئی۔ اور ہو سکتا ہے وہ گزشتہ پندرہ سال سے رہا ہو گیا ہو۔ اور شاید اس کے خیال میں میرے پاس ایک کوئی چیز ہے جو اس کی ملکیت ہے۔“

تب کیتھی اس کی جانب گھوم گئی۔

جیف نے ایک گہرا سانس لیا اور کیتھی کے چہرے کی نگاہیں جھاتے ہوئے بولا۔ ”آئی ایم سوری۔ میں نے یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ مجھے ڈھونڈ نکالے گا۔“

”تم یہ کیا باتیں کر رہے ہو؟“

”میرے بارے میں کچھ چیزیں ایسی ہیں جو تم نہیں جانتیں۔“ اور تمہارا نہ جاننا ہی بہتر ہے۔“ جیف نے کہا۔

”لیکن۔“

”آئی ایم سوری۔ مجھے شہر چھوڑ کر جانا پڑے گا۔“

”میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔“ کیتھی نے کہا۔

”نہیں۔“ جیف نے اپنے ہاتھ کیتھی کے شانوں پر رکھے۔ ”اگر اس نے مجھے تلاش کر لیا تو وہ مجھے بس یہ سمجھ لے گا کہ تمہاری زندگی بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔“

میرا یہ مقصد نہیں تھا کہ اس کا انجام اس طرح سے ہو۔ میں تم سے بے حد محبت کرتا ہوں، کیتھی!“

کیتھی کچھ سوچ میں پڑ گئی پھر بولی۔ ”تم کہاں جاؤ گے؟“

”بہتر یہی ہے کہ تم لاعلم رہو۔“

”لیکن اگر کچھ ہو گیا تو پھر؟ کوئی تمہیں کہاں تلاش کرے گا؟ میں تمہیں کہاں ڈھونڈوں گی؟“ کیتھی نے بے بسی سے کہا۔

جیف ایک لمحے کے لیے خاموش رہا پھر بولا۔ ”تمہیں وہ بتا دے جہاں میں تمہیں ہماری تیسری ڈیٹ پر لے گیا تھا؟ وہ جو گرانڈ فاؤنٹین کے پاس ہے؟“

”روٹ تین سو بیس سے پرے؟“

”ہاں وہی، میں نے اس شخص کو اس کیمین کے بارے میں کبھی نہیں بتایا۔ میں جب تک یہ فیصلہ نہیں کر لیتا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور میں کہاں جا سکتا ہوں، اس وقت تک وہاں محفوظ رہوں گا۔“ جیف نے کہا۔

”اوکے لیکن مجھے یہ یقین کرنے میں مشکل پیش آرہی ہے کہ تم نے واقعی چوری کی تھی۔ ایسی حرکت وہ شخص بھی نہیں کر سکتا جس سے میں محبت کرتی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے کیتھی نے جیف کے ہاتھ تھام لیے اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولی۔ ”کیا تمہارے پاس واقعی ایسی کوئی چیز ہے جو وہ شخص حاصل کرنا چاہتا ہے؟“

جیف نے قدرے تدبیر کے بعد اقرار کر لیا۔

”اور وہ شے وہاں کیمین میں چھپی ہوئی ہے؟“

جیف نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

کیتھی نے بے ساختہ جیف کا منہ چوم لیا اور بولی۔

”کیا میں تمہیں دوبارہ کبھی دیکھ سکوں گی؟“

”شاید نہیں، یا ہو بھی سکتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم لیکن جس یہ معاملہ ختم ہو جائے گا تو مجھے امید ہے کہ ہم دونوں پھر مل سکیں گے۔“ یہ کہتے ہوئے جیف نے کیتھی کو کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا اور بے ساختہ پیار کرنے لگا۔ وہ دونوں ایک تک ایک دوسرے سے جڑے رہے۔

بالآخر جیف نے کیتھی کو علیحدہ کر دیا اور کئی میں دوڑ پڑا۔ کئی کے بازو فٹ پاتھ پر پہنچ کر اس نے چوکنہ انداز میں

قابل تقلید

ایک میاں بیوی آپس میں بہت بڑا جھگڑا کرتے تھے۔ ایک دن وہ اچھے موڈ میں تھے تو انہوں نے سوچا کہ پڑوسیوں سے چل کر پوچھنا چاہیے کہ وہ بھی کیوں نہیں کرتے، تاکہ ان کے طریقے پر عمل کر کے ہم بھی اس روز روز کی توٹکار سے بچ سکیں، چنانچہ پڑوسی نے استفسار پر بتایا کہ سارا جھگڑا اس لیے نہیں ہوتا کہ سارے بڑے بڑے فیصلے میں خود کرتا ہوں جبکہ چھوٹے چھوٹے معاملات میری بیوی کے اختیار میں ہیں اور ہم نے بھی ایک دوسرے کے کام میں دخل نہیں دیا۔ انہوں نے اس بات کی وضاحت چاہی تو پڑوسی بولا کہ تمام بڑے فیصلے مثلاً امریکہ افغانستان سے جا۔ گایا نہیں، کشمیر کب آزاد ہوگا اور یہ کہ صدر بٹ کو کس پارٹیشن جیتنا چاہیے یہ روٹی کو، میں خود کرتا ہوں جبکہ یہ چھوٹے چھوٹے کام میری بیوی کے اختیار میں ہیں کہ آج بکانا کیا ہے، بچوں کی شادیاں کہاں کرنی ہیں اور کیا میرے والدین اور بہن بھائی میرے گھر آ سکتے ہیں یا نہیں اور میں نے بھی ان معمولی باتوں میں مداخلت نہیں کی۔ اس لیے ہمارا کبھی جھگڑا نہیں ہوا۔

حیرانہ ڈاکٹر مرزا انتظار انداز پر مغل، سوال کھو کھراں

سڑک پر دائیں بائیں دیکھا اور پھر تیزی سے بائیں جانب مڑ کر کیتھی کی نگاہوں سے اوچھل ہو گیا۔

کیتھی بھی آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے کئی سے باہر سڑک پر پہنچ گئی۔ اس نے سڑک پر پہنچ کر غلط نظروں سے دونوں اطراف کا جائزہ لیا اور وہیں رک گئی۔ پھر اس نے اپنے پرس میں سے اپنا سیل فون نکالا اور ایک فون نمبر ملا یا۔

دوسری جانب سے فون اٹھاتے پر وہ گویا ہوئی۔ ”وہ اپنے کیمین کی طرف روانہ ہو گیا ہے۔“ وہ چند سیکنڈ تک سنی رہی، پھر بولی۔ ”اس نے بتایا کہ رقم اس نے وہیں چھپائی ہوئی ہے۔“ پھر وہ مزید سنی رہی۔

”اوکے۔“ وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”کل دوپہر بارہ بجے میں بھی وہیں پہنچ جاؤں گی۔ پھر ملاقات ہوگی اور ہم تمہاری کامیابی اور انتقام کا جشن اسی کیمین میں منا سکیں گے سو بیٹ بارسٹ!“

جیف نے

جیف نے

جیف نے

اسیما اقبال



جرائم پیشہ افراد کے ایک گروہ نے جیل توڑ کر اپنے ان ساتھیوں کو چھڑایا تھا جو کچھ عرصے سے وہاں قید تھے۔ ان کے ساتھ کچھ اور قیدی بھی اس موقع سے فائدہ اٹھانے سے نہیں چرکے۔ انہی میں ایک قیدی بختیار بھی شامل تھا جو دو ماہ سے ایک ایسے جرم کی سزا بھگت رہا تھا جو اس نے نہیں کیا تھا۔

جیل رات کی تاریکی میں توڑی گئی تھی۔ اسی اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر بختیار شہری حدود تک پہنچ گیا۔ اس وقت صبح کی پہلی کرن پھوٹنے میں بھی کچھ دیر تھی۔ اس وقت سے فائدہ اٹھاتا بختیار کے لیے ضروری تھا۔ اس کے جسم پر جیل کے کپڑے تھے جن سے نجات حاصل نہ کرنے کی صورت میں وہ جلد ہی پھر قانون کی گرفت میں ہوتا اور اسے جیل سے فرار ہونے کا فیاضہ بھی بھگتنا پڑتا۔ وہ فیاضہ کیا ہوتا، یہ بختیار نہیں جانتا تھا۔ اسے تو سزا ہی عمر قید کی ہوئی تھی۔

شہری حدود کا آغاز غریبوں کی ایک بستی سے ہوا تھا جہاں رہنے ہوئے معمولی مکانات میں کچھ ایسے بھی تھے جن کے مچن کی دیواریں بہت زیادہ اونچی نہیں تھیں، پھر بھی نو دس فٹ کے قریب تھیں۔

بختیار کسی مکان میں گھس کر مردانہ کپڑے چرانا چاہتا تھا اگر ایسے کپڑے مل جاتے جو اس کے قد کا ٹھکے کے لیے بالکل مناسب ہوتے تو یہ اس کی خوش قسمتی ہوتی۔

اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے اسے کیا کچھ کرنا پڑتا اور قانون کی نظروں سے بچنے کے لیے کس طرح خود کو محفوظ رکھا جاتا، یہ سب کچھ بھی اسے سوچنا تھا مگر سب سے پہلے اسے جیل کے کپڑوں سے نجات حاصل کرنے کی فکر تھی۔

وہ محتاط انداز سے گلیوں کے پکر لگانے لگا۔ اسے کسی ایسے مکان کی تلاش تھی جس کے مچن کی دیواریں سات فٹ سے زیادہ اونچی نہ ہو۔ کیونکہ اس کا قد پانچ فٹ گیارہ انچ سے ذرا ہی زیادہ نہیں تھا۔

کبیں قریب ہی سے سیٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔ بختیار کا دل اچھل پڑا۔ اسے پولیس کا خیال آیا تھا۔ وہ فوراً قریب کے ایک مکان کی دیوار سے تقریباً چپک کر زمین پر لیٹ گیا۔ وہاں اس کے چھپنے کے لیے کوئی اور جگہ بھی نہیں۔

کچھ وقفے سے سیٹی کی آواز پھر سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی اس نے گلی کے سرے پر ایک آدمی کو اندھیرے کے باعث سائے کے مانند دیکھا۔ وہ دائیں سے بائیں

جاتے ہوئے بختیار کی نظروں سے دھمیل ہو گیا۔ تنہا۔ زمینان کی سانسوں۔ وہ پولیس کا نہیں نہیں، اس نے دیکھا۔ اس نے قطع کسی کی تھی۔

بختیار کھڑا ہو کر پھر دبے قدموں ایک چارپے بڑھنے لگا۔ اسے رات کی تاریکی میں کتوں کے بھونکنے اندیشہ تھا۔

کچھ دیر بعد بختیار باپوس ہونے لگا۔ اسے کوئی مکان نظر نہیں آیا تھا جس کے مچن کی دیواریں کم اونچی نہ ہوں۔ پر وہ چڑھ سکے۔ باپوسی کے عالم میں اسے ایک ایک مکان پر نظر آئی۔ اسے ایک جگہ چالیس پچاس اینٹیں نظر آئیں تھیں جو وہاں رہنے والے کسی شخص نے اپنے مکان میں بڑھوانے کے لیے رکھی ہوں گی۔

ایک امید نظر آتے ہی بختیار جیزی سے حرکت پڑ گیا۔ وہ دو اینٹیں اٹھا کر قریب ہی کے ایک مکان کے مچن کی دیوار تک لے گیا۔ کئی پکڑوں کے بعد وہ اتنا چاہتا بنانے میں کامیاب ہو گیا کہ اس پر کھڑے ہو کر اوپر چڑھنا اگرچہ بہت آسان تو تھیں لیکن بہت مشکل بھی نہیں رہا تھا۔ چوتھے کمرے کو مزید اونچا کر کے وہ اپنے لیے آسانی پیدا کر سکتا تھا مگر اسی وقت محلے کی کسی مسجد سے آواز سنائی دینے لگی تھی۔ چوترا مزید اونچے کرنے سے بختیار کے پاس اب وقت نہیں تھا۔ اذان سے بعد وہ لوگ فوراً ہی گھر سے نکل پڑتے ہیں جو پہلے ہی جا۔ چکے ہوئے ایسے لوگ اس گلی میں بھی آسکتے تھے، رات کی گلی بختیار پر دستک تھی۔

یہ صورت حال پیدا ہوتے ہی بختیار نے بعد ازاں دیوار پر چڑھنے کی کوشش کی۔ کچھ جدوجہد کے بعد وہ چڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ مکان میں دو کمرے تھے جن کے دروازے مچن کی طرف کھلے ہوئے تھے۔ اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ دونوں کمرے چھوٹے چھوٹے تھے۔ ان میں سے ایک بالکل تاریک تھا۔ دوسرے کمرے میں زردی روشنی تھی۔ اس روشنی کا چھوٹا مچن پر بھی پڑ رہا تھا۔

”اٹھ جا بیٹی! اذان ہو رہی ہے۔“ ایک عورت کی آواز سنائی دی۔

مچن میں ایک عورت چارپائی تھی۔ عورت کے چھپنے سے بختیار سمجھ گیا کہ وہ ماں بیٹی ایک ہی پنک پر سو رہی ہیں۔ دونوں میں سے ماں جاگ کر اٹھ بیٹھی تھی۔ اس وقت وہ غریبوں کی طرف نہیں تھیں جس پر بختیار چڑھا تھا۔

ذرا بھی وقت ضائع کیے بغیر بختیار مچن میں بیٹھنے لگا۔ اتنا کہ کم از کم آواز ہو لیکن کچھ آواز تو بہرحال ہوئی تھی۔

”دیکھ تو پروین، ابھر کچھ گرا ہے۔“ بڑی جلدی میں کہا گیا تھا۔ آواز اسی عورت کی تھی۔ اس طرف بختیار کو دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اس عورت کی بیٹی کا نام پروین تھا۔

بختیار بہت جیزی سے پنک کے قریب پہنچ گیا۔ اس وقت پروین بھی اٹھ بیٹھی تھی۔

”کون؟“ پروین خوف سے بکھا گئی۔ اس نے بختیار کو ایک ہیولے ہی کے مانند دیکھا ہوگا۔ وہاں اتنی روشنی نہیں تھی کہ وہ بختیار کو واضح طور پر دیکھ سکتی۔ اس وقت گلی میں دو ایک آدمیوں کے قدموں کی آوازیں ہونے لگی تھیں۔

”کون ہے بیٹی؟“ پروین کی ماں نے گھبرا کر پوچھا۔

اب بختیار کو یہ اندازہ بھی ہوا کہ پروین کی ماں کو غالباً کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔

”زیادہ آواز مت نکالنا۔“ بختیار نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔ ”چاقو ہے میرے پاس! دونوں کی گردنیں کاٹ کر پھینک دوں گا۔“ اس نے اپنے سببے میں سفاکی پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔

”چودور۔“ پروین کی ماں کی آواز بہت سہمی ہوئی تھی۔

”چارپائی سے اتر دو اور کمرے میں چلو۔“

بختیار نہیں چاہتا تھا کہ وہاں ہوے وہی باتوں کی دہم دہمی آواز بھی گلی میں جائے۔ اسے گلی سے اب باتیں کرنے کی آواز بھی آنے لگی تھی۔

پروین نے چارپائی سے اترتے ہوئے اپنی ماں کو بھی اٹھنے کے لیے سہارا دیا تھا۔

”ارے واہ! یہ اینٹیں یہاں کیوں رکھی ہیں۔“ گلی سے آواز آئی۔ ”کوئی چور تو نہیں چڑھا ہے یہاں سے؟“

بختیار کا دل جو پہلے ہی تیزی سے دھڑکنے لگا تھا، چور کا حوالہ دے جانے پر اچھل ہی پڑا۔

”کوئی پاگل ہی چور ہوگا۔“ جواب میں ہنس کر کہا گیا تھا۔ ”بے چاری! سیہ خانہ کے گھر میں ہے ہی کیا جو کوئی چرانے آئے گا۔“

اس بات پر پہلے شخص بھی ہنس اٹھا اور قدموں کی آواز دور

ہونے لگی۔ بختیار نے سکون کا سانس لیا۔ ان دونوں کی باتوں سے اسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ پروین کی ماں کا نام آسیہ تھا اور محلے میں شاید بھی اسے آسیہ خالہ کہتے تھے۔

پروین اپنی ماں کے ساتھ پنک سے کھڑی ہو گئی تھی۔ اندھیرے میں ان دونوں کے چہروں پر آنے والے خوف کی تاثیرات دیکھتے تو نہیں جاسکتے تھے لیکن بختیار کو یقین تھا کہ وہ دونوں بہت خوف زدہ ہوں گی۔

پروین کی جسامت سے بختیار نے یہ اندازہ بھی اڑا لیا تھا کہ وہ کوئی بچی نہیں، جوان لڑکی تھی۔ بختیار انہیں اس کمرے کی طرف لے جانے لگا، جہاں ایک بلب کی روشنی تھی۔

بختیار ان دونوں کے بعد کمرے میں داخل ہوا اور داخل ہوتے ہی دروازہ بند کر لیا۔

پروین اتنی خوف زدہ تھی کہ اب بھی اس نے مڑ کر بختیار کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ غائبی کی وجہ سے اس کی ماں بھی دوسری طرف منہ کیے رہی تھی۔

”اب میری طرف دیکھو، اور میری بات سنو۔“ بختیار نے دھیمی آواز میں کہا۔ وہ کمرے میں آنے کے بعد بھی نہیں چاہتا تھا کہ بلند آواز میں بات ہو۔

وہ دونوں اس کی طرف مڑیں۔ آسیہ خانہ کی عمر اتنی زیادہ معلوم ہو رہی تھی کہ اسے پروین کی دادی ہونا چاہیے تھا۔

پروین کی عمر بائیس سال کے ٹک بھگ ہو سکتی تھی۔ اس کا جسم دبلا پتلا تھا۔ نقش و نگار ایسے تھے کہ اگر اس نے آسودہ حالی میں پرورش پائی ہوتی تو خوب صورت نظر آتی۔

”دیکھ بھیا۔“ آسیہ خالہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”ہمارے گھر میں ایسا سامان نہیں ہے جسے چر کر کھجے۔“

کوئی فائدہ پہنچے۔ بس ایک سلاخی مشین رہی ہے دوسرے کمرے میں۔ اگر تو وہ بھی لے گیا تا بھیا۔ ہم تو قاتلوں سے مر جائیں گے۔“

بختیار کو اس کمرے کے سامان سے بھی انتہائی غریب کا اندازہ ہو چکا تھا۔ ایک گوشے میں کچھ میسے کپڑے پڑے ہوئے تھے۔ سامان کے نام پر وہاں بھی بس ایک چارپائی تھی جس پر کچھ دھلے ہوئے کپڑے پڑے تھے۔

”دوسرے کمرے میں کون سا ہوا ہے؟“ بختیار نے اب بھی اپنے سببے میں سفاکی پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔

”کوئی۔۔۔ کوئی نہیں۔“ پروین کی زبان سے یہ الفاظ اس طرح اٹک اٹک کر نکلے جیسے اس کا حلق خشک

اس دوران میں بختیار کو یقین ہو چکا تھا کہ آسیہ خالہ کے چہرے پر آنکھیں تو تھیں لیکن ان کی روشنی بالکل ختم ہو چکی تھی۔ وہ تپتا تھی۔

”تم دونوں میرے آگے آگے اس کمرے میں چلو۔“ بختیار نے حکم دینے کے انداز میں کہا۔ ”میں اس وقت اپنا چاقو نکال لوں گا۔ اگر مجھے وہاں کوئی نظر آیا تو میں ایک پل ضائع کیے بغیر تم دونوں کو تو چاقو مار ہی دوں گا۔“

”اس گھر میں بس ہم دونوں ہی رہتے ہیں۔“ آسیہ خالہ کچکپاتی آواز میں بولی۔

”دوسرے کمرے میں چلو۔“ بختیار غرایا۔

”چلو اماں!“ پروین نے آسیہ خالہ کا بازو پکڑتے ہوئے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

بختیار کو ان دونوں کے لب و لہجے سے اندازہ تو ہو گیا تھا کہ وہ دونوں سچ بول رہی تھیں لیکن وہ مکمل اطمینان کر لینا چاہتا تھا۔

دوسرے کمرے میں جا کر اس نے اطمینان حاصل کر لیا۔ اس کمرے کے ایک حصے میں نظر آنے والے سامان سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ جگہ باورچی خانے کے طور پر استعمال کی جاتی ہوگی۔ دوسری طرف کی دیوار کے ساتھ کچن ہوئی

پرانی سی چادر پر ہاتھ سے چدائی جانے والی سیونگ مشین رکھی تھی۔ مشین کے قریب ہی کچھ سے لیکن معمولی سے کپڑے تھے۔ ایک کپڑا مشین کی سوئی میں اٹکا ہوا تھا، جیسے بیٹے بیٹے چھوڑ دیا گیا ہو۔

”ایک گلاس پانی پلا دو۔“ بختیار نے پروین سے کہا۔ اس نے بہت دیر سے پانی نہیں پیا تھا۔ حلق خشک ہوتا جا رہا تھا۔ پروین نے اسے گلاس میں پانی لا دیا۔

”بس یہ ایک مشین ہے بس!“ آسیہ خالہ بولی۔ ”یہ مت لے جانا۔ یہ ہم ماں بیٹی کا ایک ہی سہارا ہے۔“

بختیار کو ”ماں بیٹی“ کے الفاظ پر تعجب ہوا۔ اس کے خیال کے مطابق ان دونوں کو ”دادی پوتی“ ہونا چاہیے تھا۔ لیکن اس نے اپنا دماغ اس الجھن میں نہیں پھنسا۔ وہ بڑی حد تک مایوسی کا شکار بھی ہو چکا تھا۔ جس گھر میں کوئی مرد رہتا

ہاں کی ضرورت ہے، صرف ایک جوڑے کی۔“

”ہمارے گھر میں کوئی مرد ہی نہیں تو“ آسیہ خالہ نے کہنا چاہا۔

پروین نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”تم نے اب اس ایک جوڑے تو بہت سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں اماں! اس میں سے ایک جوڑا دے دو۔“ پروین کو بتا بولنے کی ہمت

نابا اس لیے ہوئی تھی کہ بختیار نے سب نرم ہوجا اختیار کیا تھا۔ ”دو“ وہ تو ”بختیار نے آسیہ خالہ کے چہرے پر اداسی بکھرت دیکھی۔

”وہ کپڑے شاید تم نے یادگار کے طور پر رکھ چھوڑے ہیں بڑی بی“ بختیار بولا۔ ”لیکن مجھے ہر سال ایک جوڑے کی شدید ضرورت ہے۔“

”ایک جوڑا دے دو اماں!“ پروین پھر بولی۔

”اچھا۔“ آسیہ خالہ کے لہجے میں شکست خوردگی تھی۔ ”وہ پٹی سی کمرے میں ہے۔ میلے کپڑوں ہی میں کہیں دلی ہوئی۔“

”میں وہ ڈھونڈتی ہوں۔ تم بیٹھ جاؤ اماں!“ پروین نے کہا۔ وہ پھر بختیار کی طرف دیکھا جیسے اسے اس کی طرف سے کسی اعتراض کا اندیشہ ہو۔

”ٹھیک ہے۔“ بختیار اس کی نظروں کا مطلب سمجھ بولا۔ ”بھلا تم اپنی ماں کو۔“

پروین نے آسیہ خالہ کو سیونگ مشین کے قریب چادر پر بٹھا دیا اور دروازے کی طرف دیکھنے کے بعد سوائچ نظروں سے بختیار کی طرف دیکھے گی۔

میلے کپڑوں کا ڈھیر بختیار نے اس کمرے میں دیکھا تھا جہاں سے وہ ان ماں بیٹی کو دوسرے کمرے میں لایا تھا۔

”چلو! میں بھی تمہارے ساتھ چوں گا۔“ بختیار نے کہا اور پھر آسیہ خالہ کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”دیکھو بڑی بی!“

اگر تم نے یہاں سے باہر جا کے شور مچایا تو مجھ کو کہ تمہاری بیٹی کی گردن کاٹنے میں مجھے دیر نہیں لگے گی۔“

آسیہ خالہ نے سرد آہ بھری۔ ”مجھے دکھائی ہی نہیں دیتا تو ہر کیسے جاؤں گی۔ میں تو کہیں جاتی ہوں تو پروین کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر چلتی ہوں۔“

”گھر کے باہر کہیں جاتی ہوگی اس طرح۔“ بختیار نے کہا۔ ”گھر کا ایک ایک گوشہ تو تمہارے سمجھا ہوجا ہوا۔“

”انہیں اپنی جان سے زیادہ میں عزیز ہوں۔“

اس جواب سے بختیار نے محسوس کیا کہ پروین تھوڑی سی پڑھی لکھی ضرور تھی۔ وہ اس کے ساتھ دوسرے کمرے میں گیا۔ پروین نے میلے کپڑوں سے ایک پٹلی نکال کر اس میں سے دو جوڑے نکالے۔

”تم یہ دونوں ہی لے لو۔“ وہ بولی۔ ”میں تو چاہتی تھی کہ یہ کپڑے گھر میں نہ رہیں۔ اماں کبھی بھی ان کپڑوں کو

نکال کر بیٹے سے لگاتی ہیں اور پھر سارے دن بالکل اداس رہتی ہیں۔“

”کیا تمہارے باپ کا انتقال ہو چکا ہے؟“

”اگر وہ زندہ ہوتے تو ہمیں اکیلا کیوں رستہ پڑتا۔“ پروین افسردہ ہو گئی۔

بختیار ان دونوں میں سے ایک لباس پہنے جسم سے ناپنے لگا۔

”یہ آٹھ نو سال پرانے ہیں۔“ پروین نے بتایا۔

”لیکن اب انے بس سال بھر ہی پہنے تھے۔ پھر ان کا انتقال ہو گیا تھا۔“

بختیار کا دھیان کپڑوں کی طرف تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ کپڑے اس کے جسم پر قدرے ٹک رہیں گے۔

”تم جیل سے بھاگے ہوئے لگتے ہو۔“ پروین پھر بولی۔

بختیار نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اب اسے یقین بھی ہو گیا کہ پروین تھوڑی بہت پڑھی ہوئی ضرور تھی۔ بالکل ان پڑھ لڑکیاں عموماً انہیں جانا سکتیں کہ جیل کے قیدیوں کا لباس کیسا ہوتا ہے۔ پروین یہ بات جانتی تھی ورنہ وہ جیل سے اس کے فرار کی بات نہ کرتی۔

”لیکن تم بہت برے آدمی نہیں معلوم ہوتے۔“ وہ پھر بولی۔

”یہ تم نے کیسے سمجھ لیا؟“ بختیار نے اسے گھور کر دیکھا۔

معلوم ہوتے۔“ پروین نے کہا اور دوسری طرف مت کر کے کھڑی ہو گئی۔

بختیار نے کپڑے تبدیل کیے۔ وہ اس کے جسم پر ٹک تو تھے لیکن اتنے نہیں جتنا اس نے اندازہ لگایا تھا۔ وہ ان کپڑوں میں خود کو کس ہوا محسوس نہیں کر رہا تھا۔

”اب لم میری طرف مڑ سکتی ہو۔“ بختیار نے پروین سے کہا۔

پروین مڑی اور اس پر بس ایک نظر ڈالتے کے بعد بولی۔ ”اتنی دیر لگ گئی۔ اماں کو وہاں بول آ رہا ہوگا۔“

”چلو، وہیں چلو۔“

”تم یہ دوسرا جوڑا بھی لے لو۔ تمہیں یہی چاہیے تھا نا! اب تمہیں جانا چاہیے ہمارے گھر سے! میں باہر کے دروازے کی کٹڑی کھول دوں گی۔ تم ادھر ادھر دیکھ کر باہر نکل جانا۔“

”دوسرے کمرے میں چلو۔“ بختیار غرایا۔ ”اپنی ماں کے پاس۔“

پروین جس نے نہ جانے کیسے خود کو سنبھال لیا تھا، اس کے لہجے سے ایک بار پھر سم گئی۔

بختیار کو خود اس بات سے تکلیف پہنچ رہی تھی کہ وہ ان ماں بیٹی سے کسی نہ کسی حد تک زیادتی کر رہا تھا لیکن اس کے حالات اسے اس کے لیے مجبور کر چکے تھے۔ اس نے مستقبل میں جو کچھ کرنے کا ارادہ کیا تھا، اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ خود کو محفوظ رکھنے کے لیے جو کچھ بھی کر سکا ہو، کرے۔

پروین کے ساتھ وہ باہر نکلا۔ اب صبح کی ہلکی ہلکی روشنی بھینکنے لگی تھی۔ گلی میں قدموں کی آہٹیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ لوگ آپس میں باتیں ہی کر رہے تھے۔ اسی وقت کسی نے زور سے بیرونی دروازہ کھٹکھٹایا جو کھنکھنایا۔

بختیار کے اعصاب میں تناؤ آ گیا۔

”دودھ والا تو اتنی جلدی نہیں آتا۔“ پروین بڑبڑائی۔

”آسیہ خالہ!“ باہر سے آواز آئی۔

”جیسی جواب دو! پوچھو کون ہے؟“ بختیار نے سختی سے لیکن سرگوشی کرنے والے انداز میں کہا۔

ہنس کر کہا گیا۔ "یہ اپنا جمیل ہے نا، یہ کہہ رہا تھا، کوئی چور نہ گھسا ہو آسیر خالہ کے گھر میں!"

"یہاں کوئی کیا چراسے آئے گا بابو چاچا!" پروین نے جواب دیا۔

"میں نے بھی یہی بولا تھا جمیل سے۔۔۔۔۔! رات کو محلے کے دو ایک لونڈوں نے وہاں بیٹھ کر گھیس ہانکنے کے لیے بیٹایا ہوگا وہ چبوترہ۔"

"ہاں بابو چاچا! رات کو ادھر سے کچھ آوازیں تو آ رہی تھیں۔"

ہنسنے کی آواز آئی اور پھر دو افراد کے قدموں کی آوازیں دور ہوتی چلی گئیں۔

بختیار نے محسوس کیا تھا کہ پروین اس سے مکمل تعاون کرنے پر آمادہ تھی۔ اس نے اس کی ہدایت کے بغیر "بابو چاچا" کو مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی۔

وہ دونوں دوسرے کمرے میں پہنچے۔

"میں آگئی اماں!" پروین بولی۔

"چلا گیا وہ؟" آسیر خالہ نے بے تابی سے پوچھا۔

"پھر خود ہی کہنے لگی۔" عجیب چور تھا، ایک جوڑا کپڑا لینے کے لیے گھسا تھا ہمارے گھر میں۔"

پروین نے بختیار کی طرف دیکھا۔

"میں ابھی نہیں ہوں بڑی بی!" بختیار بولا۔

آسیر خالہ چونک گئی۔

"تم دونوں ناشتا تو کرو گی۔" بختیار نے پروین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "شاید تمہارے پاس کھانے کے لیے کچھ زیادہ نہ ہو لیکن ایک پیالی چائے کی گنجائش تو نکل آتا ہے۔"

"ارے اب ہمارا پیچھا چھوڑ دے بیبا!" آسیر خالہ نے کسی قدر جھنجھلائے اور کسی قدر انتہائی انداز میں کہا۔ "تجھے گیزرے چاہیے تھا نا، ادھ مل گئے تجھے ایہ سلائی کی مشین لے جانا چاہتا ہے تو یہ بھی لے جا! پیچھا چھوڑ دے اب ہمارا۔"

لیکن بختیار کچھ اور ہی فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے سوچا یہ تھا کہ صرف جیل کے باس سے چھٹکارا سے قانون کی نظر سے نہیں بچا سکتا۔ ضروری تھا کہ وہ اپنی وضع قطع میں تبدیلی کرتا جوئی کی طرف اس طرح ہو سکتی تھی کہ وہ اپنا شیو، تانا بڑھالے کہ چھوٹی سی ڈاڑھی بن جائے۔ اس عرصے میں سر کے بال بھی بڑھ جاتے اور مونچھیں بھی نکل آتیں۔ یہ سب کچھ کرنے کے لیے اس نے کچھ دن اسی گھر میں رکنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کے انداز سے کے مطابق یہ ماں بیٹی اس

کے لیے بے ضرر ثابت ہو سکتی تھیں۔ کسی جگہ کچھ دن گزارنے کے لیے اسے اس گھر کے دو افراد سے بہتر نہ کہیں نہیں مل سکتے تھے۔

بختیار نے بھی آسیر خالہ کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ پروین کمرے کے اس گوشے کی طرف بڑھ کر بیٹھ کر باورچی خانے کا سامان تھا اور دیوار سے ایک تل بھی لگا ہوا تھا جس سے برتن دھوئے جاسکتے تھے۔

"آسیر خالہ!" بختیار نے چلی مڑتے ہوئے "بڑی بی" کے الفاظ استعمال نہیں کیے۔ اس نے نرم لہجے میں کہا۔ "ابھی میں کچھ دن تمہارا مہمان رہوں گا۔"

یہ بات سن کر پروین نے بھی چونک کر بختیار کی طرف دیکھا لیکن ایسا نہیں ہوا کہ سمجھتی رہ جاتی۔ وہ کچھ سوچے ہوئے چائے کی کیتلی اٹھانے لگی۔

"نہ بھنا نہ!" آسیر خالہ بولی۔ "تو ہماری سوائی مشین بھی ہے جاگ رہا پیچھا چھوڑ!"

"میں کوئی برا آدمی نہیں ہوں آسیر خالہ!" بختیار نے بدستور نرم لہجے میں کہا۔ "میں ایک مجبوری کی وجہ سے مجھے چوروں کی طرح تمہارے گھر میں آنا پڑا۔ بس ایک روز۔ کپڑے کی ضرورت تھی مجھے۔ میں جو کپڑے پہنے ہوئے تھا وہ برست گندے ہو گئے تھے۔"

"تو ایک جوڑے کے لیے تجھے ہمارا ہی گھڑا اور اب تو یہاں رہنا بھی چاہتا ہے، نہ بابا نہ! بس چائے پی اور چلا جا!"

"مجھے سختی پر مجبور نہ کرو۔" بختیار نے لہجہ نرم ہی رکھا۔ "کیا میں نے اب تک کوئی نقصان پہنچایا تم دونوں کو؟"

"جان تو آدمی کر دی ہے۔"

"تم ماں بیٹی اتنی باتیں بھی اس لیے کر سکتی ہو کہ میں نے جیب سے چاقو نکال کر دکھایا بھی نہیں! اگر میں ایسا کرتا تو تمہاری بیٹی کے چہرے پر تو ہونیوں نے تکتیں۔ کوئی بات کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تم دونوں کو۔"

"چپ ہو جاؤ اماں!" پروین بول پڑی۔

آسیر خالہ نے پہلو بدلا اور نرمی سے کچھ بڑبڑ کر رہ گئی۔ اس کے چہرے سے پریشانی ورتشائش ظاہر ہو رہی تھی۔ اسے یہ خیال ضرور ہوگا کہ گھر میں اس کی ایک بیٹی بھی ہے اور ایک اجنبی گھر میں آ گیا ہے جس کا نہ جانے کیا ارادہ ہے۔

پروین نے چائے بن کر اسے دی۔ پیوں کی طشتی میں ایک پاپ بھی تھا۔

اس سے پہلے کہ بختیار کچھ استفادہ کرنا، پروین بول پڑی۔ "میں اور اماں ابھی چائے نہیں پی سکتے، یہ تھوڑا سا دودھ تو کھل جائے ہو۔ اب دودھ وا آتا ہی ہوگا۔ اس کے بعد پروین کا جملہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ باہر سے کسی اسکورٹر کی آواز سنائی دی جو دروازے پر آ کے رکی تھی۔ پروین ہنسات ہوئی چھوڑ کر جلدی سے بولی۔ "آگیا ہے۔"

"اماں نے ایک کیتلی اٹھائی۔ بختیار بھی چائے کی پیالی تھم میں لے جلدی سے کھڑا ہو گیا تھا۔ پروین اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔" بختیار نے کہا۔

جب تم دودھ لینے کے لیے دروازہ کھولو گی تو میں آڑ میں کھڑا ہوں گا۔"

وہ فی الحال ان ماں بیٹی میں سے کسی پر بھی مکمل اعتماد کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

پروین کچھ بولے بغیر کمرے سے نکلی۔ بختیار پیالی لے کر اس کے پیچھے ہو گیا تھا۔ جب پروین دروازہ کھولنے لگی تو بختیار دروازے کی بائیں جانب دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا اور پروین کے چہرے پر نظر رکھے رہا۔

پروین دودھ لے کر دروازہ بند کرنے لگی۔ پھر وہ رہیں کمرے کی طرف مڑی۔ اب بختیار اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

"تم کسی کھاتے پیتے کچھ کھ کے نکلتے ہو۔ پروین بولی۔

"یہ تم نے کیسے سمجھ لیا؟"

"غریبوں میں تم جیسے سادہ رستہ اور اتنے خوب صورت لوگ نہیں ہوتے۔" پروین بڑی سادگی سے کہہ گئی۔

"اچھا!" بختیار خفیف سا مسکرایا۔ "خوب صورت گی ہوں میں؟"

"جیل کیوں گئے تھے؟" پروین نے پوچھا اور کمرے سے چند قدم کے فاصلے پر رکی گئی۔ وہ ماں کے سامنے اس قسم کی باتیں نہیں کرنا چاہتی ہوگی۔

"کسی نے سازش کر کے مجھے کسی کے قتل کے کیس میں پھنسا دیا تھا۔ میں اپنی صفائی میں کوئی ثبوت نہیں دے سکا۔ یہ سب مجھے سزا سنائی گئی۔"

"جیل سے بھاگے کیسے؟"

اس سوال کا جواب بختیار نے سچ سچ لیکن بہت مختصر کر دیا۔

پروین نے پوچھا۔ "کب تک بھاگتے رہو گے؟"

"مجھے بھگنا نہیں، بس اس وقت تک چھپن ہے۔ جب تک میں اپنی بے گناہی ثابت کرنے میں کامیاب نہ ہو جاؤں!"

"ہو جاؤ گے؟"

"مجھے یقین ہے۔"

کمرے سے آسیر خالہ کی بلند آواز آئی۔ "کہاں رہ گئی پروین؟"

"رہی ہوں ماں!" پروین نے جلدی سے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "پہل کا انگوٹھا ٹوٹ گیا تھا۔ اسے ٹھیک کرنے لگی تھی۔"

بختیار اس کے جھوٹ پر اس کا منہ دیکھ کر رہ گیا۔

جب وہ دونوں کمرے میں داخل ہوئے تو آسیر خالہ نے پوچھا۔ "ٹھیک ہو گئی پہل؟"

"نہیں اماں!" اسے گئی۔ "پروین نے پھر جھوٹ بولا۔

بختیار نے چائے کی پیالی جہاں چھوڑی تھی، وہاں سے اٹھ لی۔

پروین نے کیتلی میں پانی بھرا اور اسے ایک طرف رکھ کر دودھ کی پیالی چاہے پر رکھ دی۔ اس کا دماغ یقیناً ابھرا ہوا تھا ورنہ وہ پہلے دودھ چوھے پر رکھتی، اس کے بعد کیتلی میں پانی بھرتی۔

ذہن بختیار کا بھی الجھ گیا تھا۔ دودھ لے کر وہیں آتے ہوئے پروین ایک بالکل بدلی ہوئی لڑکی نظر آتی تھی۔ اس نے اس طرح باتیں شروع کر دی تھیں جیسے "میں بد بے مہمان" کو اس نے ذہنی طور پر قبول کر لیا ہوا اور اب اس کے بارے میں سب کچھ جاننا چاہتی ہو۔ بختیار اس الجھن کا شکار بھی تھا کہ اس کے خیال کے مطابق اسے کچھ دن گزارنے کے لیے اس گھر سے زیادہ بہتر کوئی جگہ نہیں مل سکتی تھی لیکن کیا واقعی وہ وہاں رک کر محفوظ رہ سکتا تھا؟

کچھ دیر بعد بختیار اور پروین کو باتیں کرنے کا موقع اس وقت ملا جب آسیر خالہ رفع حاجت کے لیے گئی۔ وہ جگہ کمرے کے برابر میں ذرا اندر کی طرف تھی۔

"جیل سے کب بھاگے تھے؟" پروین نے پوچھا۔

"مگر وہ بجے کے قریب جیل توڑی گئی تھی۔ اس وقت بھاگ گیا تھا۔ نہ جانے کہاں کہاں سے ہوتا ہوا یہاں تک پہنچے ہوں۔ راستے میں ایک جگہ کنواں مل گیا تھا۔ وہاں سے پیاس بجھائی گئی ورنہ یہاں تک آتے۔ تب تو حق میں کانے پڑ جاتے۔" بختیار نے جواب دیا۔ پھر فوراً سے پروین کی

طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم میرے بارے میں بہت زیادہ جان لیتا چاہتی ہو۔“

”میں جان بھی چکی ہوں۔“ پروین نے بے تاثر چہرے کے ساتھ کہا۔

”کیا جان چکی ہو۔“ بختیار اسے گھورتا رہا۔ ”تم تھوڑی بہت پڑھی لکھی بھی معلوم ہوتی ہو۔“

ابا کا انتقال ہو تو میں آٹھویں پاس کر چکی تھی رانا بختیار صاحب!“

بختیار اتنی شدت سے چونکا جیسے کچھ سے ٹک رہا ہو۔

”آپ کسی بینک میں منبر تھے۔“ پروین نے ذرا دھماکا کیا۔

بختیار کے جسم میں سنسناہٹ پھیل گئی۔

”ماڈل گرل کا نام شبانہ تھا جو قتل ہوئی!“ پروین کا ایک اور دھماکا۔

”تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہو گیا!“ بختیار کے لہجے میں حیرت تھی۔ ”اور کیا جانتی ہو؟“

”بس اتنا ہی جانتی ہوں۔“ پروین نے جواب دیا۔ یہ ساری باتیں اس نے بالکل سناٹ لہجے میں کہی تھیں۔ وہ مزید بولی۔ ”میں نے تو پہلے ہی سمجھ لیا تھا کہ آپ کوئی پرے آدمی نہیں ہیں۔ جب میں دودھ لے کر لوٹ رہی تھی تو آپ نے جو باتیں بھی کی تھیں، سچ سچ کی تھیں۔ جھوٹ نہیں بولا تھا۔“

اس گفتگو میں وہ بکا یک بختیار کو ”تم“ کہتے کہتے ”آپ، جناب“ پر آگئی تھی لیکن بختیار اس پر دھیان اس وقت دیتا جب پروین کے انکشافات کے دھماکے اسے کچھ اور سوچنے کی مہلت دیتے۔

”آپ جیسا آدمی کسی کو قتل کر ہی نہیں سکتا۔“ پروین اپنی رو میں کہتی چلی گئی۔ ابا کہا کرتے تھے، شریف لوگ اگر کسی مصیبت میں پڑ جائیں تو ان کی مدد کرنا چاہیے۔ میں بھی آپ کی مدد کروں گی جو بھی مجھ سے ہو سکے گی۔ آپ جب تک چاہیں، اس گھر میں چھپے رہیے۔ بالکل اطمینان سے! میں ماں کو سمجھا دوں گی۔ اب یہ چاہو تو کوئی بات مجھ سے نہ کیجیے گا۔ آپ کے پاس چاہو تو نہیں ہوگا۔ یہ بات مجھے ور اماں کو ڈرانے کے لیے تھی۔ اب اس کی ضرورت نہیں۔ خود کو چھپنے کے لیے خود آپ کو بھی خیال رکھنا ہوگا۔ جو عورتیں مجھ سے کپڑے سنواتی ہیں، ان کا آنا جانا رہتا ہے۔ جب میں ساتویں کلاس میں داخل ہوئی تھی تو میں نے سلائی ٹرہائی کا کورس بھی کیا تھا۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔ ”اس

وقت مجھے کیا معلوم تھا کہ ابا کے مرنے کی وجہ سے وہ میرے کام آئے گا جو میں سمجھ رہی تھی۔“

”ابھی لڑکی!“ بختیار نے بھرپور سی آواز کہا۔ ”تم نے مجھے بری طرح ہلا کر رکھ دیا ہے۔ آخر تمہارا چاٹک میرے بارے میں کئی باتیں کیسے معلوم ہو گئیں؟“

”اخبار سے۔“ پروین نے جواب دیا۔ ”دو دن پہلے اخبار بھی بیچتا ہے۔ اخبار اس کی اسلور سے پیٹھ پر بندے رہتے ہیں۔ میری نظر ایک خبر کی سرخی پر پڑ گئی تھی۔ ٹوٹنے کے بارے میں لکھا تھا۔ فرار ہونے والوں میں میں نے بختیار رانا کا نام بھی تھا اور ماڈل گرل شبانہ کی تصویر۔ ساتھ آپ کی تصویر بھی تھی۔ چھوٹی سرخی میں لکھا تھا کہ شبانہ کے قتل کے جرم میں عمر قید کی سزا ہوئی تھی۔“

پروین کے دھماکوں سے بختیار کے اعصاب شرارتناؤ آیا تھا، وہ ختم ہو گیا۔ اس نے ایک طویل سانس لی۔

”تم وہ خبر اور میری تصویر دیکھ کر چونکی نہیں تھیں تمہیں اپنے اعصاب پر بہت قابو ہے۔“

پروین اب کچھ نہیں بولی۔ بختیار سوچے بغیر نہ رہا کہ پروین کا چہرہ کیا پیدائشی طور پر بے تاثر تھا؟ لیکن جب وہ اس مکان میں آیا تھا تو وہ اس سے خوف زدہ تو نظر آتی تھی۔

وہ کچھ رک کر بولی۔ ”جو عورتیں کپڑوں کی سلائی لے آتی ہیں، میں انہیں اسی کمرے میں بٹھاتی ہوں جہاں سدا کی مشین رکھی ہے۔ کبھی کوئی عورت اماں سے ملے دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ اب میں اماں کوئی اپنے ساتھ بٹھالیا کروں گی۔ آپ دوسرے کمرے سے وقت بھر مت نکلا کیجئے گا۔“

پروین ”آسیہ خالہ نے پکارا۔“

”آلی ماں!“

پروین کا سہارا لے کر آسیہ خالہ باہر نکلی اور کمرے تک آگئی۔

بختیار جہاں تھا، وہیں کھڑا رہ گیا۔ پروین نے انکشافات کا پس منظر اگرچہ سامنے آچکا تھا، پھر بھی باتیں بختیار کے دماغ میں کچھ دیر تک سا میں سا رہ کر رہیں۔

ساتھ بہر حال اب یہ ظاہر ایسے ہو گئے تھے۔ کچھ دن اس گھر میں بے خوف و خطر گزار سکتا تھا۔ اب قابل اعتماد بن چکی تھی، وہ اپنی ماں کو اس طرح سمجھا رہی تھی کہ وہ اس کے ساتھ رہے۔ اس کا نام بھی نظر آ رہا تھا۔

اپنی ماں کو سمجھنے میں ناکام نہیں رہے گی۔

آئندہ دو ایک دن میں یہ ثابت بھی ہو گیا۔ آئیہ خالہ اپنی زبان پر پھر بھی اس کی کوئی بات نہیں لائی کہ وہ اب اس گھر کا چچا چھوڑ دے۔

سو اسلف کے بے بھی بری دین ہی کو گھر سے نکلتا پڑتا تھا۔ اور اس وقت وہ نفل لگا کر جاتی تھی۔ جب وہ پیسے پہل گھر سے گئی تھی تو بختیار قدرے وسوسے کا شکار ہوا تھا کہ پروین کسی کو اس کے بارے میں بتا دے مگر دو تین روز کے بعد اسے عمل اطمینان ہو گیا۔

بختیار کے بے وہ ایک عجیب لڑکی اس اعتبار سے بھی ثابت ہوئی تھی کہ اس نے ایک بار بھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ بختیار، ذل گزل شہانہ کے قتل میں کیسے پھنس گیا تھا لیکن بختیار کے دماغ میں اپنے ماضی کے وہ واقعات چکراتے ہی رہتے تھے۔

یہ بختیار کی زندگی کا لمحہ تھا کہ وہ جس لڑکی کی محبت میں گرفتار ہوا تھا، وہ لڑکی کسی اور کو چاہتی تھی۔ لڑکی کا نام فروزاں تھا۔ وہ بینک کے وائس پریذیڈنٹ عبداللہ خان کی بیٹی تھی۔

بختیار نے بہت کم عمری میں ترقی کی منازل طے کی تھیں۔ وہ اکیس سال کی عمر میں کلرک کی حیثیت سے بینک میں ملازم ہوا تھا اور پچیس سال کا ہونے تک طیجر بن گیا تھا۔ ابتدا میں اسے ایک چھوٹی سی براجنگ ملی تھی۔ پھر دو سال گزرتے گزرتے اسے ایک بہت بڑی براجنگ کا فیجر بنا دیا گیا۔ اسی براجنگ کی اوپری منزل پر اس کے بینک کے وائس پریذیڈنٹ عبداللہ خان بیٹھا کرتے تھے۔

وہ بختیار کو اس وقت سے جانتے تھے جب وہ فیجر بنا تھا۔ پھر جب وہ بڑی براجنگ میں آیا اور قربت بڑھی تو عبداللہ خان اسے پہلے سے زیادہ پسند کرنے لگے۔ ابتدا میں انہیں بختیار کی صرف صلاحیتوں کا علم تھا، قربت ہوئی تو انہوں نے جانا کہ وہ ایک اچھا انسان بھی تھا۔ عبداللہ خان خود بھی ایک اچھے انسان تھے۔

فروزاں انہی کی بیٹی تھی جو اس وقت تعلیم کے آخری مراحل طے کر رہی تھی۔ وہ بھی بھی اپنے والد سے ملنے بینک آیا کرتی تھی۔ اوپر کی منزل تک جانے کے لیے بینک کے اندر آنا ضروری تھا۔ اسی بے بختیار نے اس بینک کا فیجر بننے کے بعد تیسرے ہی دن اسے دیکھ لیا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ ایسا تو ممکن ہی نہیں تھا کہ بختیار نے ایک سے بڑھ کر

ایک حسین لڑکی پہلے کبھی نہ دیکھی ہو لیکن ایسا حسن اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا جسے ”سوگوار حسن“ بھی کہا جا رہا تھا۔ فروزاں کے خوب صورت چہرے پر یہ قویا شعاعیں بال کھولے سوری تھیں۔

جب وہ نظروں سے گھس ہو گئی تو بختیار چونکا۔ اسے خیال آیا کہ سی لڑکی کو اس طرح نکتے رہ جانا ایک غیر مہذبان حرکت تھی۔ بختیار نے اپنے کہین کے شیشوں سے بینک میں کام کرنے والوں کا طائرانہ جائزہ لیا۔ تو اسے بینک کے کیشئر رندھاوا کے اونٹوں پر خفیف مسکراہٹ نظر آئی۔ وہ کن آنکھوں سے بختیار کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے غصے کو ادھر ادھر نظریں دوڑاتے دیکھا تو سر جھکا کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

بختیار اس وقت اپنے کہین میں اکیلا تھا۔ اس کے سامنے میز پر ایک کلائنٹ کی درخواست تھی جس میں اوور ڈرافٹ کے لیے لکھا گیا تھا۔ بختیار دوبارہ اس درخواست کی طرف پوری طرح متوجہ نہیں ہو سکا۔ اس کے ذہن میں فروزاں چکراتی رہی جس کے نام بینک سے بھی وہ اس وقت واقف نہیں تھا۔

آدھے گھنٹے بعد اس نے فروزاں کو واپس بلانے دیکھا۔ مزید آدھے گھنٹے بعد ایک بچے بینک کے روبرو بند کر دیے گئے۔

رندھاوا کو بختیار نے اپنے کہین کی طرف آنے دیکھا۔ ان دونوں کے تعلقات خاصے پرانے تھے۔ بختیار جب بینک کی ایک براجنگ میں کلرک تھا، وہاں بھی رندھاوا کیشئر ہی تھا۔ اس میں بینکاری کی صلاحیت نہیں تھی یا شاید کوئی اور سبب ہو، وہ بہر حال ترقی نہیں کر سکا تھا۔ اس کی بختیار سے دس سال زیادہ تھی۔

اس کا تبادلہ کئی براجنگ میں ہوتا رہا تھا لیکن اس دوران میں بختیار سے اس کی ملاقاتیں رہی تھیں۔ اب بختیار اس براجنگ میں فیجر کی حیثیت سے آیا تھا جہاں رندھاوا کوہ کرتے ہوئے چھوٹا گزر چکے تھے۔

”آؤ رندھاوا!“ بختیار نے اس سے نظریں ملائے بغیر قدرے جھپٹے ہوئے انداز میں کہا۔

”شرما کیوں رہے ہو۔“ رندھاوا ہنستا ہوا اس سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

”میں تم سے اس بارے میں بات کرنا چاہتا تھا۔ بختیار نے سنی ان سنی کرتے ہوئے اپنے سامنے رکھی ہون درخواست کی طرف اشارہ کیا۔

”ابھی اس پر بھی بات کر لیں گے۔“ رندھاوا نے کہا۔ ”میں تمہیں اس لڑکی کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔ وہ تیسرے چوتھے دن آتی رہتی ہے اور اس کے آنے کا وقت یہی ہوتا ہے۔ بہتر ہوگا کہ آئندہ تم اسے اس طرح مت نکتے۔ اگر بات بڑے صاحب تک پہنچ گئی، تمہارے بارے میں ان کی رائے تبدیل ہو سکتی ہے۔ اب تک تو وہ تمہارے خاصے گرویدہ ہیں۔ وہ لڑکی“

”کوئی بڑی اکاؤنٹ ہونڈر ہے“ بختیار نے اس کی بات کاٹی۔

”نہیں۔“ رندھاوا نے جواب دیا۔ ”اس کا نام فروزاں ہے۔ وہ وہاں سے بڑے صاحب کی بیٹی ہے۔“

بختیار چونکا۔ ”عبداللہ صاحب کی بیٹی؟“

رندھاوا نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ”پھر وہ۔“ پچھلی سڑک پر جو کالج ہے، اسی میں پڑھتی ہے۔ جب وہ آتی ہے، اس وقت اس کا کوئی پیریڈ شاید خالی ہوتا ہو، یا سبب کچھ بھی ہو، وہ وہ آتی اسی وقت ہے۔“

”خیر چھوڑو!“ بختیار نے کہا۔ ”اس پر میری نظریں تک گئی کہ ایسے حسین چہروں پر میں نے ایسی اداسی بھی نہیں دیکھی۔ کیا اس کے ساتھ کوئی ایسا ہو گیا ہے؟“

”خیر چھوڑو؟“ رندھاوا معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ ہوا۔ ”یہ بھی کہہ رہے ہو اور پھر اسی کے بارے میں سوال بھی کر رہے ہو۔ خیر میں بھی کہہ دیتا ہوں کہ خیر چھوڑو، لیکن بتا دیتا ہوں کہ اس کے ساتھ ہرگز کوئی ایسا نہیں ہوا۔ اس کے نقشہ نگار ہی ایسے ہیں کہ وہ اس نظر آتی ہے۔“

دوسری مرتبہ ”خیر چھوڑو“ کہتے وقت بختیار نے سنجیدگی سے فیصلہ کیا تھا کہ وہ فروزاں کا خیال ذہن سے جھٹک دے گا۔ وہ سنجیدگی سے رندھاوا سے اس درخواست کے بارے میں بات کرنے کا حراس سے سامنے رکھی تھی۔ لیکن وہ سنجیدگی بس اتنی دیر کی تھی جتنی دیر رندھاوا اس کے کہین میں رہا۔ رندھاوا کو رخصت کرتے ہی فروزاں پھر اس کے تصور میں آ گئی۔ نہ صرف اس وقت بلکہ آئندہ دو تین دنوں میں بھی ایسا ہوتا رہا کہ فروزاں اس کے تصور میں ابھری اور وہ اس کے بارے میں سوچتا رہا۔

چوتھے دن اس نے فروزاں کو ایک بار پھر بینک میں آتے دیکھا۔ اس موقع پر اس نے خود کو بے قابو نہیں ہونے دیا۔ یعنی ایسا نہیں ہوا کہ وہ فروزاں کو تنکھارہ جاتا، البتہ اس نے فروزاں پر دو تیس مرتبہ اپنی سی نظر بہر حال ڈالی تھی۔

”یہ تو شاید کچھ اور ہی معاملہ ہو گیا ہے آپ کے ساتھ

بختیار صاحب!“ اس نے دل ہی دل میں کہا۔

آنے والے دنوں میں فروزاں کے بارے میں اس کی سوچ بہت ترقی شدت اختیار کرتی چلی گئی۔ اس کے دل میں یہ خواہش اٹھنے لگی کہ وہ فروزاں سے ملے۔

تین دن بعد جب فروزاں کے آنے کی توقع تھی، بختیار اس کی آمد کے وقت سے ذرا پہلے ایک فائل لے کر اس کی بات کرنے کے بہانے عبداللہ خان کے پاس پہنچ گیا۔

گفتگو پانچ منٹ ہی جاری رہی تھی کہ دروازے پر بلکی سی دستک دے کر فروزاں اندر آئی۔ اس نے پاپ کو سلام کیا، اور بختیار پر ایک اچھٹی سی نظر ڈالی۔

”آؤ بیٹی! بیٹھو!“ عبداللہ خان نے کہا، پھر بختیار سے بولا۔ ”کافی تو منگواؤ بختیار! ہمارے بیٹی کو کافی

اودھ میں تم دونوں کا تعارف کرانا تو بھول ہی گیا۔ یہ تو تم کچھ ہی گئے ہو گے کہ یہ میری بیٹی ہے، فروزاں اور فروزاں! یہ ہیں بختیار اس براجنگ کے فیجر انہایت ذہین اور ہونہار۔“

”ہائے!“ فروزاں اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرائی۔

”ہیلو!“ بختیار بھی مسکرایا۔

اس نے کبھی کبھی فروزاں کے بارے میں سوچتے ہوئے اس کے اداس حسن کے لیے ”زرد گلاب“ کی تمثیل سوچی تھی لیکن اس وقت وہ مسکرائی تو یوں لگا جیسے زرد گلاب کا ایک سرخ ہو گیا ہو۔ اداسی اس کے چہرے سے غائب ہو گئی تھی۔

بختیار نے انٹرکام کار میسور اٹھ کر کسی کو دوپہلی کافی لانے کی ہدایت کی۔

عبداللہ خان بول پڑے۔ ”اپنے لیے بھی منگواؤ بختیار!“

”جی نہیں سر!“ بختیار بولا۔ ”آپ سے اس فائل پر جتنی بات ہو چکی ہے، اس سے ہی میں نے پورا معاملہ سمجھ لیا ہے۔ اب میں نیچے جاؤں گا، کچھ اور کام دیکھتا ہوں۔“ وہ فائل لے کر کھڑا ہو گیا۔ وہ عبداللہ خان پر یہ تاثر ڈال رہی تھی چھوڑنا چاہتا تھا کہ وہ وہاں اس کی بیٹی کی وجہ سے رکا ہے، نہ کہ اس کا دل یہی چاہ رہا تھا۔ اس کی یہ خواہش عبداللہ خان نے پوری کر دی اور اسے بہ اصرار روکا۔

بختیار نے دوبارہ انٹرکام اٹھ کر تین بیلی کی ہدایت کر دی۔

[illegible]

مختصر رپاٹ: یہ کام بینک کے کسی ورگڈی کے سپرد کر کے شائد اچھے نتائج سے مال سلاقت لیکن اس سے بہتر

”نیش اس شہر کے ہر نیک نام اور بدنام شخص کے
بارے میں جتھے تکچھ ضرور جانتا ہوں۔ ذرا پیچ کے رہنا

یہ جملہ نالے کے محل کا ایک حصہ تھا جو تختیاہری
ہو شیاری سے مبینہ طور پر محیط ہو گیا۔

بات کرتے مختیار کے کہیں میں نہیں آیا۔
 شام کو مختیار آئیں کونسل گیا۔ فروزاں سے آستانہ
 ہوا تو "ہیلو ہائے" بھی ہوئی۔
 پھر آئندہ چند دن بھی اسی طرح گزرے۔ اگر بھی
 دونوں کچھ اور لوگوں کے ساتھ ہوتے تو ان میں ضروری کی
 باتیں بھی ہو جاتیں۔ فروزاں کا وہ کھنڈاؤ مختیار نے شدت
 سے محسوس کیا۔ اسے یہ بھی محسوس ہونے لگا جیسے اس کا دل
 ٹوٹ گیا ہو۔ اس نے آئیں کونسل جانا بھی کم کر دیا۔ فروزاں
 کے روئے نے اسے اتنا دل برداشتہ کیا تھا کہ اس کی اداسی
 بڑھتی چلی گئی۔

عبداللہ خان سے ملاقات کرتے کے لیے فروزاں
 کی آمد کا سلسلہ جاری رہا تھا لیکن اب اس میں ایک تبدیلی
 آگئی تھی۔ پہلے وہ آتی تھی تو اوپر جاتے جاتے مختیار کے
 کہیں کی طرف دیکھتے ہوئے ایک بار مسکرتی ضرور تھی
 لیکن اب مسکراتا تو کیا، وہ کہیں کی طرف، چنتی سی نظر بھی
 نہیں ڈالتی تھی۔

ایک دن مختیار نے رندھاوا کو اپنے کہیں میں بدیا۔
 رندھاوا آکر سنجیدگی سے بیٹھ گیا۔ غالباً اسے بھی اندازہ ہو گیا
 تھا کہ مختیار اس سے کوئی خاص بات کرنا چاہتا تھا۔
 "تم شراب پیتے ہو نا رندھاوا؟"

رندھاوا چونک گیا۔ "یہ تو تم خود جانتے ہو۔ لیکن
 میں زیادہ پینے والوں میں سے نہیں ہوں۔ بس رات کو
 کھانے سے پہلے دو پیگ لیتا ہوں۔"
 "میں یہ نہیں جانتا پتا کہ تم کتنی پیتے ہو۔ میں
 پوچھ رہا ہوں کہ تم لاتے کہاں سے ہو؟"
 "میں نہیں لاتا۔ ایک مہربان ہیں۔ وہ دے دیتے
 ہیں، میرے لیے ایک بوتل ہفتے بھر کے لیے کافی ہوتی
 ہے۔" جواب دیتے ہوئے رندھاوا کے چہرے سے ابھرنے
 آشکارا تھی۔

مختیار نے پوچھا۔ "اپنے مہربان سے زیادہ نہیں
 منگوا سکتے؟"
 "منگوا سکتا ہوں۔ مگر کیوں؟"
 "مجھے چاہیے۔"

رندھاوا نے طویل سانس لی۔ "پوٹ کھا
 گئے؟ ہاں یہ تو ہونا ہی تھا۔ مجھے بہت م امید تھی کہ وہ
 بدل جائے گی۔"
 "کیا مطلب؟"
 "دل ہار بیٹھے تھے، فروزاں کو کچھ کر۔"

فروزاں سے ملاقاتیں برابر جاری تھیں۔ ایک شام
 وہ دونوں آئیں کونسل کی کینٹین میں ایک میز پر بیٹھے
 کولڈ ڈرنک پی رہے تھے، ان کے ساتھ کوئی تیسرا نہیں تھا۔
 اتنا حیرت گزر جانے کے بعد ان دونوں میں بھی اتنی بے تکلفی
 ہو گئی تھی کہ وہ ایک دوسرے کو "آپ" کے بجائے "تم"
 کہنے لگے تھے۔

"ہم بڑے اچھے دوست تو بن گئے ہیں۔" مختیار
 نے مسکرا کر کہا۔ اس روز اس نے دل کی بات کہنے کی ٹھان
 لی تھی۔

"یقیناً۔" فروزاں بھی مسکرائی۔ "یہاں میرے کئی
 اچھے دوست ہیں۔ ان میں سے ایک تم بھی ہو۔"
 "لیکن دوسروں نے تمہارے بارے میں اس طرح
 نہیں سوچا ہوگا جس طرح میں سوچتا رہا ہوں۔"
 "کتنی؟" فروزاں سنجیدہ ہو گئی۔
 "اب تم زرد گلاب نظر آ رہی ہو۔"
 "کیا مطلب؟"

"تمہارے نقوش عجیب و غریب میں فروزاں!"
 مختیار نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "جب تم سنجیدہ ہوتی ہو تو
 اس نظر آنے لگتی ہو حالانکہ سنجیدگی اور اداسی دو مختلف
 چیزیں ہیں۔ پھر جب مسکراتی ہو، یا خوشگوار انداز میں باتیں
 کرتی ہو تو وہ اداسی غائب ہو جاتی ہے۔ جب میں نے تمہیں
 پہلی بار دیکھا تھا تو تمہاری اداسی کو دیکھ کر میرے تصور میں
 زرد گلاب ابھر آیا تھا، اور پھر جب تم مسکرائی تھیں تو مجھے ایسا
 لگا تھا جیسے گلاب کی زردی سرخی میں بدل گئی ہو۔ تمہاری
 یہی کشش تو ہے کہ میں تمہارے قریب ہوتا چلا گیا ہوں۔"
 "بہتر ہوگا کہ آئندہ اتنا زیادہ قریب ہونے کی
 کوشش نہ کرنا۔" فروزاں نے حد درجہ سخت اور کھردرے
 لہجے میں کہا۔ پھر وہ فوراً ہی اٹھ کر اس طرف بڑھتی چلی گئی
 جہاں آئیں کونسل میں آنے والے اپنی کاریں کھڑی کیا
 کرتے تھے۔

مختیار دم بخود رہ گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے
 فروزاں اس کے منہ پر چھڑر سید کر گئی ہو۔ مختیار جب دم
 بہ بخود رہ جانے والی کیفیت سے نکلا تو اس کے چہرے پر
 اداسی تھی۔

دوسرے دن وہ اداسی اس کے چہرے پر اس وقت
 بھی تھی جب وہ بینک میں کام کر رہا تھا۔ دوسروں نے اس
 میں یہ تبدیلی محسوس کی ہو یا نہ کی ہو لیکن رندھاوا نے متعدد
 بار اسے معنی خیز انداز میں دیکھا تھا۔ اس کے باوجود وہ کوئی

مختیار جب چاہا اسے دیکھتا رہا۔
 "آئیں کونسل بھی جانے لگے تھے۔" رندھاوا نے
 کہا۔ "وہ تمہارے کہیں کی طرف دیکھ کر مسکراتے بھی لگی
 تھیں۔ میں سوچا کرتا تھا کہ شاید تمہاری وجہاں اس کی
 بہت کا دھارا موز دے اس لیے میں نے پہلے سے کچھ
 رندھاوا دلی تو زنا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔"

"کیا نہیں بتا دیتے تم نے؟" مختیار نے بہو بدل۔
 "کنور ٹھکین کا نام تو تم نے سنا ہی ہوگا۔ چند دنوں
 سے اخبارات میں اس کا نام خاصا آنے لگا ہے۔ وہ
 بہت کے میدان میں کود رہا ہے۔ جانتے ہو کچھ اس
 کے بارے میں؟"

"ہاں۔" مختیار نے کہا۔ "وہ شاہی پہاڑی علاقے کی
 ایک چھٹی سی ریاست کے والی کا بیٹا ہے۔ اس نے سوشل
 کام بھی بہت کیے ہیں۔"

"صرف شہرت کے لیے۔" رندھاوا نے تلخی سے کہا۔
 "اپ کی موت کے بعد بے تاجا دولت کا مالک بن گیا
 ہے۔ سوشل کاموں میں شہرت حاصل کرنا اس کی منصوبہ
 بندی تھی۔ وہ سیاست میں آنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ تواجی
 تے میں غریبوں کے لیے ایک بستی بھی بنوائی تھی اس
 نے، ٹھکین آباد کا نام تم نے سنا ہی ہوگا۔"
 "تم ان تھیلیات میں کیوں جا رہے ہو؟ اصل بات
 تو یہ ہے۔"

"وہ اسے چاہتی ہے۔"
 "فروزاں؟" مختیار چونکا۔
 "اور کس کی بات ہو رہی ہے؟"

مختیار کو اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا۔ "پھر تو۔" وہ
 بھر جھرتی ہوئی سی آواز میں بولا۔ "پھر تو ٹھیک ہے۔"
 "کیا ٹھیک ہے؟"

"وہ پہلے ہی سے کسی کو پسند کرتی ہے، یا تمہارے
 رشتہ کے مطابق اسے چاہتی ہے تو پھر اس کے ہر وہ اور کیا
 ہو سکتا تھا کہ مجھے ٹھکرا دے۔ اگر تم مجھے پہلے سے یہ بات بتا
 دیتے تو میں ممکن تھا کہ میں خود کو سنبھال لیتا۔"

"میں نے یہ سوچا تھا کہ شاید تمہاری وجہاں اسے
 پسند ہے۔ تم غیر معمولی طور پر وجہ بہ ہو۔ کیا تمہیں اس کا
 سرا نہیں؟"

"محبت صرف وجہاں سے نہیں ہوتی۔" مختیار نے
 لفظی سانس لے کر کہا۔ "وہ کنور ٹھکین سے محبت کرتی ہے تو
 مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میں اس کی راہ میں دیوار بنوں۔"

اولاد نہیں ہو سکتی

آج بھی لاکھوں گھرانے اولاد کی نعمت سے
 محروم سخت پریشان ہیں۔ مایوسی گناہ ہے۔
 انشاء اللہ اولاد ہوگی۔ خاتون میں کوئی اندرونی
 پرالیم ہو یا مردانہ جراثیم کا مسئلہ۔ ہم نے ویسی
 طبی یونانی قدرتی جزی بوٹیوں سے ایک خاص
 قسم کا بے اولادی کوہس تیار کیا ہے۔ جو آپ
 کے آگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھلا سکتا
 ہے۔ آپکے گھر میں بھی خوبصورت بیٹا پیدا ہو سکتا
 ہے۔ آج ہی گھر بیٹھے فون پر تمام حالات
 سے آگاہ کر کے بذریعہ ڈاک وی پی VP
 بے اولادی کو رس منگوائیں۔

المسلم دارالحکمت رجسٹرڈ (دواخانہ)
 ضلع و شہر حافظ آباد۔ پاکستان

0300-6526061
 0547-521787

صبح 9 بجے سے رات 11 بجے تک

”حق پہنچے یا نہ پہنچے۔“ رندھاوا نے زور دے کر کہا۔
”تمہیں اگر اس سے محبت ہے تو اس کے راستے کی دیوار ضرور بنو۔“

”یہ تو میری خود غرضی ہوگی۔“
”نہیں۔“ رندھاوا نے کہا۔ ”یہ تمہاری محبت کا تقاضا ہوگا کہ تم اسے تباہی سے بچاؤ۔“
”تباہی؟“ بختیار الجھا۔

”ہاں۔“ رندھاوا نے کہا۔ ”کنور فطین ہر اعتبار سے اویاش ہے۔ شرابی، جواری، عورتوں کا رسیا، رئیس کو رس وہ جاتا ہے۔ چوری چھپے چلنے والے جوئے کے اڈوں میں اس کے قدم پہنچتے ہیں۔ وہ فروزاں سے شادی نہیں کرے گا اور اگر کسی وجہ سے کر بیٹھا تو کچھ دن بعد اسے چھوڑ بھی دے گا۔“
”کیا فروزاں کو نہیں معلوم؟“ بختیار نے حیرت سے پوچھا۔

”کیا نہیں معلوم؟“
”کنور فطین ایسا ہے۔“

”نہیں معلوم ہوگا اسے! بہتوں کو نہیں معلوم! وہ تمام برے کام بڑی احتیاط سے کرتا ہے۔ اس کی ان حرکتوں کو صرف وہی لوگ جانتے ہیں جو خود بھی ان حرکتوں میں ملوث ہیں۔ مجھ جیسے شاید وہ ایک ہی آدمیوں کو معلوم ہوگا کہ کنور فطین کتنے گھناؤنے کردار کا مالک ہے۔ وہ شاید ابھی فروزاں کے محلے میں زیادہ سنجیدہ نہیں ہوا ورنہ اسے برباد کر چکا ہوتا، اور اگر کسی وجہ سے اس نے فروزاں سے شادی کر بھی لی تو کچھ دن بعد اسے چھوڑ دے گا۔“
”تم یہ بات دوسری بار کہہ رہے ہو کہ وہ اسے چھوڑ دے گا۔“

”مجھے معلوم ہے تا اس کا مزاج! لڑکیوں کی کی نہیں ہے اس کے لیے! وہ مستقل روگ نہیں پالنا چاہتا۔ ایک بہت خوب صورت لڑکی اس کی کمزوری بن گئی تھی۔ وہ ویسے اس کے ہاتھ نہیں لگ سکتی تو اس نے اس سے شادی کر لی لیکن صرف تین ماہ بعد چھوڑ دیا۔“

”لڑکی نے احتجاج نہیں کیا؟“
”کیا احتجاج کرتی۔۔۔ مہر کے کئی لاکھ کا چیک اس نے لڑکی کے منہ پر دے مارا اور کہا کہ وہ جسے چاہتا ہے اسے ہر قیمت پر خرید لیتا ہے۔“

”تمہیں یہ سب کچھ کیسے معلوم؟“
”مجھے۔“ رندھاوا نے چمکی سی مسکراہٹ کے

ساتھ کہا۔ ”تم میرے، مجھے دوست تو ہیں مگر انکس نے سے نہیں دیکھ سکے۔ میں اپنا اندرون کسی پرکھ کر رہا کرتا۔ میرا ٹھکانہ ٹھنڈا ہر جگہ ہے۔ بڑے مطلق میں میں چھوٹے حلقوں میں بھی۔ اچھے حلقوں میں بھی۔ اچھے حلقوں میں بھی لیکن میں نے برے حلقوں کا اثر قبول نہیں کیا۔ چھوٹے حلقوں کا۔ اسی لیے آج تک میں کسی شرمسوار چینگ کا۔“ رندھاوا کی مسکراہٹ میں کئی آگئی۔ ”مجھے پند ہے کہ وہ دھولس دھولس اور ترقی کی صلاحیت مجھ میں نہیں ہے۔“

بختیار حیرت سے اس کا منہ تکتا رہ گیا۔ وہ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ رندھاوا اتنا گہرا آدمی ہوگا۔
”تمہارے سوالوں نے دھکیل دیا۔“ بختیار نے بے طرف۔“ رندھاوا سنجیدگی سے بولا۔ ”کوئی ضرورت نہیں کہ میں تمہیں اپنے بارے میں یہ سب کچھ بتاتا۔ شاید یہ جان کر جذباتی ہو گیا تھا کہ تم فروزاں کا اس سے شادی کر سکتے۔ میری شدید خواہش تھی کہ تم کامیاب ہو جاؤ اور اچھی لڑکی تباہی سے بچ جائے۔ تمہیں اب بھی اپنی کوتاہی جاری رکھنا چاہیے۔ کسی طرح بھی فروزاں کا اس سے کوشش کرو۔ اس سے محبت ہے تو اسے تباہی سے بچاؤ۔ تمہیں شراب کی کپڑی سوچھی؟ کیا رکھا ہے شراب میں؟“
”میں اپنے تم اس میں ڈوبو بیٹا چاہتا تھا۔“ بختیار ٹھنڈی سانس لی۔

”خام عیالی ہے تمہاری کہ تم اب کر رہے ہو۔“ رندھاوا نے کہا۔ ”یہ کیا بیوی کی باتیں ہیں؟ شراب کی تم بھلائے جاسکتے ہیں۔ شراب کا نشہ دہنگی تو نہیں ہوتا۔ ادھر نشہ ختم ہوا اور ادھر رنجیدہ خیالات پھر دماغ پر سوار ہاں اگر آدمی آنکھ کھلنے سے لے کر سونے تک بیدار رہے تو اور بات ہے۔ کیا تم اپنی زندگی اس طرح برباد کر رہے کہ اور کسی کام کے نہ رہ جاؤ؟“

بختیار چپ رہا۔ رندھاوا کی باتوں میں غائر شراب سے قطع نظر فروزاں کو تباہی سے بچانا ضروری تھا۔ اسے فروزاں سے محبت تھی اس لیے۔ فروزاں کو کنور فطین سے بچانے کی کوشش کرنا ہی چاہیے۔ لیکن یہ بات اس کی سمجھ میں کئی دن تک نہیں آ سکی۔ یہ کام وہ کیسے کر سکتا ہے۔ اس نے پھر باقاعدگی سے کونسل چانا شروع کر دیا۔ وہ خواہاں تھا کہ اسے فروزاں سے تباہی میں بات کرنے کا موقع مل جائے لیکن بڑی ہوشیاری سے خود کو اس سے دور رکھتی رہی۔

آخری مرحلہ

ایک مہینہ اسی طرح گزر گیا۔ بختیار پر پھر مایوسی ڈونے لگی۔ اس کے لیے بینک کے کاموں میں دس گھنٹے کا دن تھا۔
ایک روز جب وہ بینک میں ہی تھا وہ اس کے نڈ کا کام کیا۔ دوسری طرف عبداللہ خان تھے ”بختیار“ نہیں۔ ”بینک کے لیے جب بینک بند ہو جائے۔ تو یہ سب آج ہی ضروری بات کرنا ہے۔“
”جی سر!“

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ بختیار نے پہلی سے ریسیور رکھ دیا۔ اس کے دماغ میں پہلا خیال آیا تھا کہ بینک میں ان دنوں وہ جس ناکارگی کا شکار رہا ہے اس کے بارے میں عبداللہ خان کو اس کا علم ہو گیا ہوگا۔ پندرہ منٹ بعد ہی جب بینک بند کیا گیا تو وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر بوجھل قدموں سے میز صیوں کی طرف بڑھا۔

”آؤ بختیار!“ عبداللہ خان نے خوشگوار لہجے میں کہا جب بختیار روٹک دینے کے بعد ان کے کمرے میں داخل ہوا۔

بختیار نے عبداللہ خان کے لہجے سے اندازہ لگایا کہ اس نے کچھ اور ہے۔ اگر عبداللہ خان اس کی ناکارگی سے خوش ہوتے تو ان کا لہجہ مختلف ہوتا۔ وہ بہت گھبرائے ہوئے لگتے۔

”بیٹھو!“ انہوں نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آج مجھے تم سے جو باتیں کرنا ہیں، وہ تمہارے لیے شاید تعجب خیز ثابت ہوں۔“

بختیار سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ عبداللہ خان پھر بولے۔ ”میں نے تم سے ہمیشہ دفتر معاملات پر گفتگو کی ہے۔ تم کی، میں کسی سے بھی اس کے ساتھ اور گھریلو معاملات پر بات کرنا مناسب نہیں سمجھتا لیکن آج مجھے تم سے کچھ ایسی ہی باتیں کرنا ہیں۔ میں تمہارے فروالوں کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔“

بختیار نے اطمینان کی سانس لی۔ بات وہ نہیں تھی جس سے خیال آیا تھا۔

”سر!“ وہ دھیمی آواز میں بولا۔ ”اگر آپ میرے والدین یا میرے بھائی بیویوں کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں تو میں عرض کروں گا کہ میرا نہ تو کوئی بھائی ہے، نہ سگی بہن۔ میرے والد کا انتقال میری پیدائش سے دو ماہ قبل ہوا تھا۔ جب میں دو سال کا تھا تو میری والدہ بھی

دنیا سے سدھار گئی تھیں۔“
”اوہ!“ عبداللہ خان کے لہجے سے انہوں کا اظہار ہوا۔ ”میں نے تو غیر ارادی طور پر ایک غم ناک موضوع۔۔۔“

”تیس سر!“ بختیار نے ان کی بات کاٹی۔ ”یہ سب کچھ اب بہت پرانی باتیں ہو چکی ہیں، وقت کی گرد میں دب چکی ہیں۔“

”تو پھر تمہاری پرورش۔۔۔ تمہاری تعلیم و تربیت؟“
”میں اس کے لیے اپنی خالہ اور خالو کا احسان مند ہوں۔ میں انہی کے سایہ عاطفت میں بڑا ہوا ہوں۔ دراصل میری خالہ کی کوئی اولاد نہیں ہو سکی تھی اس لیے انہوں نے مجھے اپنے سگے بیٹے کی طرح پالا ہے۔ مجھے ہی نہیں بلکہ آفتاب کو بھی! دراصل میری ایک ور خالہ اور ان کے نو ہر ایک حادثے میں ہلاک ہو گئے تھے۔ ان کا چار سال کا ایک بیٹا تھا، میں نے ابھی اسی کا نام لیا ہے۔“

”یعنی آفتاب؟“
”جی۔“ بختیار نے کہا۔ ”آفتاب مجھ سے دو سال بڑا ہے۔“

”تمہارے خالو کیا کرتے ہیں؟“
”وہ ایک بڑے بزنس مین ہیں۔ وراثت میں بھی انہیں بہت کچھ ملا تھا۔ مجھے مذمت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی لیکن میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنے بیروں پر کھڑا ہونا چاہتا تھا۔ خالو کی خواہش تو تھی کہ میں تجارت کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹاؤں لیکن میرا تھان شروع ہی سے بینکنگ کی طرف تھا۔ خالو نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ وہ اب بھی اکیلے ہی اپنا سارا کاروبار دیکھ رہے ہیں۔ مجھ سے پہلے انہیں آفتاب کی طرف سے بھی مایوسی ہو چکی تھی۔“

”آفتاب کیا کرتا ہے؟“
”وہ سیاست میں شغس گیا ہے۔ اسے یہ ظاہر کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہو سکی لیکن وہ اپنا وتیرہ بد لئے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس کا ربط ضبط انتہا پسند گرد پس سے ہے۔ خالہ اور خالو کو اس قسم کی زندگی پسند نہیں لیکن وہ اس سلسلے میں آفتاب سے کچھ زیادہ نہیں کہتے۔ انہیں اندازہ ہے کہ ایسی صورت میں آفتاب سرکش ہو جائے گا اور وہ نہیں چاہتے کہ ایسا ہو۔“

”یعنی وہ، چھ انسان ثابت نہیں ہوا؟“
”سر، وہ بھائی خالہ اسکی۔“ بختیار نے کہا۔ ”لیکن

میں اس کے لیے یہ الفاظ اپنی زبان پر نہیں لاسکتا۔
 "سوری! مجھے ایسی بات نہیں کہنا چاہیے تھی۔"
 "سوری کر کے مجھے شرمندہ نہ کیجیے سہ!"
 "آفتاب کی شادی ہو چکی؟"
 "جی نہیں سہ!"

"تم سے اس کے تعلقات خوشگوار ہیں؟"
 "ناخوشگوار نہیں ہیں۔" اختیار نے مبہم جواب دینے کی کوشش کی۔ اپنے گھر کی ساری تفصیلات بتانے کے باوجود اس نے اس اظہار سے پہلو تھکی کی تھی کہ آفتاب اس سے حسد کرنے لگا تھا۔ اس کی ترقی آفتاب کو ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔ خاص طور سے اس وقت وہ بہت کڑھ جاتا تھا جب خالہ یا خالو سے اختیار کی مثال دے بیٹھتے تھے۔
 "خیر!" عبداللہ خان قدرے توقف سے بولے۔
 ان کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ "میری بیٹی فروزاں کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟"
 فروزاں کا نام آنے سے تو اختیار چونکا ہی تھا لیکن یہ بات بھی اس کے لیے تعجب خیز تھی کہ عبداللہ خان فروزاں کے بارے میں اس کی رائے لینا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ بھی اس کے لیے چکر دینے والی بات تھی کہ اس کے خاندان کی تفصیل جانتے کے بعد عبداللہ خان نے اچانک فروزاں کا ذکر چھیڑ دیا تھا۔
 "جواب نہیں دیا تم نے اختیار!" عبداللہ خان کچھ انتظار کے بعد بولے۔

"میں پریشان ہو گیا ہوں سہ!" اختیار نے صاف صاف کہہ دیا۔ "میری سمجھ میں نہیں آسکا ہے کہ آپ ان کے بارے میں میری رائے کیوں جانا چاہتے ہیں؟"
 "میں اپنی پیاری بیٹی کے بارے میں ہر ایک کی رائے پوچھتا ہوں اختیار! مجھے اپنی بیٹی میں خوبیاں ہی خوبیاں نظر آتی ہیں لیکن کبھی کبھی یہ سوال بھی میرے ذہن میں ابھرتا ہے کہ وہ میری عزیز بیٹی ہے لہذا مجھے اس میں خوبیاں ہی خوبیاں نظر آتی ہیں۔ کوئی عیب دکھائی نہیں دیتا۔ دوسروں کی رائے اسی لیے پوچھتا ہوں کہ شاید مجھے اپنی بیٹی کے بارے میں کچھ زیادہ خوش بھی ہو گئی ہو۔"
 "دوسروں کی رائے کیا ہے سہ؟"

"مجھ نے یہ کہا ہے کہ وہ مہذب ہے، یا اخلاق ہے، بڑوں کا ادب کرتی ہے اور تعلیم کے حصول میں بھی نمایاں رہتی ہے۔ کچھ دن بعد وہ گریجویشن بھی کر لے گی۔"
 "اسی رائے کا اظہار میں بھی کر سکتا ہوں سہ!"

"نہیں۔" عبداللہ خان نے سنجیدگی سے دوستوں کی رائے زیادہ اہم ہوتی ہے۔ فروزاں دوست اور بھی ہیں لیکن میں تمہاری رائے سے زیادہ ہوں۔ بہت دن سے تم آئیں کونسل جا رہے ہو۔ فروزاں بھی بد مانعہ جاتی ہے۔ وہاں تم دونوں کی ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ کچھ عرصے پہلے فروزاں ہی نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے اچھے دوست ہو۔"

اختیار کچھ گھبرا گیا کہ فروزاں نے اپنے باپ سے یہ بات اس دن سے پہلے کہی ہوگی جب اختیار نے اس سے اظہار محبت کرنا چاہا تھا۔
 اختیار نے احتیاط سے جواب دیا۔ "دوسروں کی حیثیت سے بھی ان کے بارے میں میری یہی رائے ہے۔ عبداللہ خان فوراً کچھ نہیں بولے۔ ان کے چہرے سے ظاہر ہونے لگا تھا کہ وہ کسی سوچ میں ڈوب گئے تھے۔ آخر انہوں نے سکوت ختم کیا اور سکڑ کر بولے۔ "تمہارا پروگرام ہے؟ شادی کب کرو گے؟"

اختیار کا دل دھک سے رہ گیا اور اس کے ذہن میں سوال ابھرا کہ وہ اب جس نتیجے تک پہنچ رہا ہے، یہ ہو سکتا ہے؟
 "سہ!" وہ نظر میں جھکا کر بولا۔ "میری خالہ کو بھی اب جلدی ہے کہ میری شادی کر دیں لیکن میں ان سے کہہ چکا ہوں کہ میں اس وقت تک شادی نہیں کروں گا جب تک وائس پریذیڈنٹ نہ بن جاؤں۔"
 "وہ تو تم شاید اسی سال بن جاؤ گے۔" عبداللہ خان نے مسکرا کر کہا۔

"جی ا!" اختیار چونکا۔
 "ہاں۔" عبداللہ خان بولے۔ "اوپر کی سطح پر یہ بات زیر غور ہے کہ تمہیں وائس پریذیڈنٹ بن دیا جائے۔" اتنی جلدی؟ اختیار کو حیرت ہوئی۔

"صلاحیت ہو تو انسان بہت سی منزلیں ایک دن میں سر کر سکتا ہے اور تم میں یہ صلاحیت ہے جس سے بینک کے بڑے بے خبر نہیں ہیں۔"
 اختیار نے طویل سانس لی۔ "اگر ایسا ہو گیا تو تو کوں؟" شبہ یقین میں بدل جائے گا۔

"کیسا شبہ؟"
 "لوگ سمجھنے لگے ہیں کہ میری اتنی تیزی سے ترقی سے پیچھے کوئی بڑی سفارش کا مکر کر رہی ہے۔"
 "ناکارہ لوگ اسی طرح سوچتے ہیں۔ تمہیں کیا

پر دانتیں کرنا چاہیے۔ خیر! ہم موضوع سے کچھ ہٹ گئے۔ اگر تمہاری خالہ کو فروزاں جیسی کوئی لڑکی نظر آجائے تو کیا وہ اسے تمہارے لیے منتخب کر لیں گی؟"
 اس مرتبہ اختیار کا دل بہت زور سے دھڑکا اور اس نے طعنے بھرا کر دیکھی آواز میں کہا۔ "بیٹا!"

"تو پھر اپنی خالہ کو میرے گھر بھیج دو۔ میرا گھر تو ریت ہی ہے اور ہمارے مشرقی رواج کے مطابق بڑے والوں ہی کو لڑکی والوں کے گھر بھیجا جاتا ہے۔"

"سہ!" اختیار کی اوپر کی سانس پر در نیچے کی سانس خچے رہ گئی۔ وہ عبداللہ خان کا منہ ٹکٹے لگا جو شفقت میز مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔
 "لیکن سہ!" اختیار کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

عبداللہ خان کا ایک سنجیدہ ہو گئے۔ "یہ تم کی اور بیٹی کا انتخاب کر چکے ہو؟"
 "جی نہیں سہ! میں تو یہ کہنا چاہتا تھا کہ آپ نے اپنی بیٹی سے کب پوچھا ہے؟"

"پوچھ لوں گا۔ میں اس سلسلے میں فکر مند نہیں ہوں۔ وہ ہمیشہ کہتی رہی ہے کہ میں اس کے لیے کبھی کچھ برا نہیں کر سکتا لہذا میں جب اسے تمہارے بارے میں بتاؤں گا تو وہ انکار نہیں کرے گی۔"

اختیار کو ان باتوں سے جو خوشی حاصل ہو رہی تھی، وہ جاتی ثابت ہوئی۔ اسے خیال آیا تھا کہ فروزاں اسے قبول کرنے سے انکار کر دے گی اور عبداللہ خان کی خوش فہمیاں دھری کی دھری رہ جائیں گی۔

ایک خیالات تھے جن کی وجہ سے اس نے اپنی خالہ کو عبداللہ خان کے گھر نہیں بھیجا، اور نہ ان سے اپنی اور عبداللہ خان کی باتوں کا ذکر کیا، لیکن آٹھ دن دن گزر جانے کے بعد امتحان پھر اس کے سر پر کھڑا تھا۔
 "تم نے بھیجا نہیں اپنی خالہ کو!" عبداللہ خان نے اسے اپنے دفتر میں بلا کر پوچھا۔

"جی..... وہ....." اختیار کی سمجھ میں نہیں آسکا کہ کیا کہے۔

"تمہاری شرط مجھے منظور ہے اختیار!" عبداللہ خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم جب وائس پریذیڈنٹ بن جاؤ گے، شادی بھی ہوگی اور ہاں! میں نے فروزاں سے بھی بات کر لی ہے۔ میں نے کہا تھا کہ وہ میری بات نہیں ٹال سکتی۔"

اختیار چونکا۔ عبداللہ خان نے جیسے تیسہ کر لیا تھا کہ وہ

اسے ہر ملاقات میں چونکا رہے ہیں گے۔
 "ہاں اختیار!" عبداللہ خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "فروزاں کی شادی تم سے ہو جائے، اس پر فروزاں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ میری خواہش کے سامنے سر جھکا دیا۔"

اختیار ان باتوں سے رندھاوا کو برابر آگاہ کرنا رہتا تھا۔ اس نے اس دن کی باتیں بھی رندھاوا کو بتائیں۔ رندھاوا نے ایک طویل سانس لی۔ "گویا اس نے باپ کی وجہ سے سر جھکا یا ہے لیکن مجھے ڈر ہے اختیار کہ اس سے تمہاری شادی کا سیاب نہیں ہو سکے گی۔ میرے علم کے مطابق اس کے اعصاب پر اب بھی کنٹرول ٹھیک نہیں ہو رہا ہے۔"

"رندھاوا!" اختیار نے پر جوش انداز میں کہا۔ "جب وہ میرے قریب ہو جائے گی تو اسے میری محبت کی شدت کا اندازہ ہوگا۔ میں اسے اتنا خوش رکھوں گا کہ وہ بھول جائے گی کنٹرول ٹھیک نہ ہو۔"

رندھاوا کی سنجیدگی برقرار رہی۔ "اگر تمہیں خود پر اتنا اعتماد ہے تو اپنی وائس پریذیڈنٹ کی شرط کو پس پشت ڈال دو۔ جلد از جلد شادی کر لو۔ کنٹرول ٹھیک کے لیے لڑکیوں کی نہیں ہے اس لیے وہ اب تک فروزاں کے معاملے میں سنجیدہ نہیں ہوا ہے لیکن اسے فروزاں کی شادی کا علم ہوگا تو پھر وہ فروزاں کو....." رندھاوا جو کچھ بھی کہنا چاہتا تھا، کہہ نہ سکا۔

"میں سمجھ گیا۔" اختیار نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں اپنی شرط ختم کر دوں گا۔ خالہ سے یہ بھی کہلوادوں گا کہ فروزاں شادی کے بعد بھی گریجویشن کر سکتی ہے۔"
 "شاید یہی بہتر ہو۔" رندھاوا نے کہا، پھر اس نے پوچھا۔ "فروزاں نے اس بارے میں تم سے کچھ کہا؟"
 "میں ان دنوں آئیں کونسل نہیں جا رہا ہوں۔"
 "اس سے مل لیتے تو اچھا تھا۔"

"میں چاہتا ہوں کہ جب خالہ بات کہی کر آئیں، اس کے دوسرے دن فروزاں سے ملوں۔"
 رندھاوا کچھ سوچتا رہا، پھر بولا۔ "خیر! جیسا تم مناسب سمجھو۔"
 اور اختیار نے وہی مناسب سمجھا جو اس نے رندھاوا سے کہا تھا۔

اس نے جب خالہ کو اپنی خواہش سے آگاہ کیا تو وہ خوشی سے کھل اٹھیں۔ خالہ بھی خوش ہوئے۔ خالہ کو اختیار نے

سب کچھ خاتمہ کے ساتھ یہ بھی سمجھا دیا۔ شادی کے سلسلے میں بگت سے کام لیا جائے۔

اور جب خالہ پیدائش کے صبرست لوئیں تو انہوں نے بتایا کہ ایک ماہ بعد کی تاریخ بھی مگر لی ہے۔

دوسرے دن عبد اللہ خان نے اسے اپنے دفتر میں طلب کیا اور مسکراتے ہوئے بولے۔ "شرط واہیں لے لی تم نے؟ چلو خیر اس کی حرج نہیں ہے۔ فروزاں سے مگر میں نے کہہ دیا ہے کہ مگر بوجہ شادی کے بعد کرے۔ اب میں سمجھ گیا ہوں کہ تم میری بیٹی کو پسند کرنے کے لئے تم سے صبر نہیں ہو سکا۔"

بختیار نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ نظریں جھکا لیں۔

اسی دن شام کو وہ آرٹس کونسل گیا۔ فروزاں پہلے سے موجود تھی۔ اس روز اس نے خود کوشش کی کہ بختیار سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع نکالے اور اس نے موقع نکال ہی لیا۔

"جیت گئے تم؟" فروزاں سپاٹ لہجے میں بولی۔

"مبارک ہو!"

"کیا تم مبارک باد نہیں لوگی؟" بختیار مسکرایا۔

"یک درخواست کرنا چاہتی ہوں۔" فروزاں کا چہرہ سپاٹ رہا۔

"کیسی بات کر رہی ہو فروزاں اور خواست کیا مطلب؟ تم مجھے حکم دو۔ کیا چاہتی ہو؟"

"جو بات میں تم سے کہنا چاہتی ہوں وہ تم کسی وقت سے نہیں۔"

"نہیں بتاؤں گا۔" بختیار مسکرایا۔

"وعدہ کرتا رہے ہو وعدے کی اہمیت جانتے ہو؟"

"خوب جانتا ہوں۔"

"تو سنو! میں چاہتی ہوں کہ شادی سے پہلے تم ایک گھر کا بندوبست کر لو جہاں صرف میں اور تم رہو۔ میں ساس، سر، جیٹھ دیور یا خندوں کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔"

بختیار سنجیدہ ہو گیا۔ "وہ میری ماں نہیں، خالہ ہیں فروزاں!"

"خلیا ساس سہی، ہیں تو ساس! خالو بھی ہیں تمہارے ایک خالہ زاد بھائی بھی ہے۔ میں ان سب کے ساتھ نہیں رہ سکوں گی۔"

"لیکن فروزاں!"

"تم وعدہ کر چکے ہو۔" فروزاں نے اسے مزید نہ

کہنے سے روکا۔

بختیار نے ٹھنڈی سانس لی۔ "اچھا! اگر تم چاہتی ہو کہ میں اپنی خالہ کا دل دکھاؤں تو ٹھیک ہے۔ میں وعدہ ایفا کروں گا۔"

لیکن یہ وعدہ ایفا کرنے کے لیے بختیار کو نہایت سے گزرنا پڑا۔ فروزاں کی شرط کو اس نے اپنی خواہش کے خلاف کے سامنے پیش کرنا تو ان کی آنکھوں میں آنسو آگے۔

تھیں انہیں یہ مشکل سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس زمانے میں ساس بھوکا رشتہ بہت نازک ہو چکا ہے لہذا شادی کے بعد الگ رہنے ہی میں بہت قائم رہتی ہے۔ اس معاملے میں اس کے خالو نے بھی اس سے یہ بے دلی سے اس کی مدد کی۔ خالہ کو تھیراؤ دیا۔

"لیکن بیاہ کر پتلے دن اسے نہیں لانا پڑے گا۔" تھیراؤ دینے کے ساتھ ہی وہ اس بات پر اڑھیں گئیں۔

"دوسرے دن تم اسے جہاں چاہو لے جانا۔"

اب بختیار کو خاموش ہونا پڑا۔

دوسرے دن اس نے فروزاں کو خالہ کی شرط سے آگاہ کرنے کے بعد بڑی لجاجت سے کہا۔ "بختیار! فروزاں! کم از کم اس بات سے انکار نہ کرنا۔ خالہ مجھے بہت چاہتی ہیں۔ وہ تمہیں بھی چاہیں گی۔ ان کی اتنی سی بات تو رکھ لو۔"

اندیشوں کے برخلاف بختیار کو زیادہ کوشش نہیں کرنا پڑی۔ فردراں نے بات مان لی، پھر کہا۔ "آج کے بعد شادی تک میں آرٹس کونسل نہیں آؤں گی۔ میں نہیں چاہتی کہ تم پھر کوئی شرط لے آؤ۔ مجھے اس دوراں میں فون بھی مت کرنا۔ اگر کرو گے تو میں ریسو نہیں کروں گی اور کسی اجنبی نمبر سے آنے والی کال تو میں ریسو ہی نہیں کرتی ہوں۔"

آرٹ کونسل میں اس لیے بھی نہیں آؤں گی کہ اب میں شادی تک خود کو گھر میں قید کر لوں گی۔ کالج بھی نہیں جاؤں گی۔" پھر وہ کھوئے کھوئے سے انداز میں بولی۔ "شاید کسی کا فون ریسو نہ کروں۔"

بختیار نے اندازہ لگایا کہ وہ "دکسی" کنور فکشن بھی ہو سکتا تھا۔ بہر حال اسے اس بات سے خوشی ہوئی کہ فردراں خود کو اپنے ہی گھر میں قید کر لینا چاہتی تھی۔ بختیار کے لیے اس میں خوشی کا پہلو یہ تھا کہ اب اگر کنور فکشن کو فروزاں کی شادی کا علم ہو جاتا تو بھی وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

ایک ماہ شادی کی تیاری کے لیے کم ہوتا ہے لیکن جب دونوں طرف پیسے کی کمی نہ آو تو ساری تیاریاں ایک

نہایت میں بھی ہو جاتی ہیں۔ بختیار اتنا زیادہ پیسہ خرچ نہیں کر سکتا تھا لیکن اس کے خالو کے پاس کوئی کمی نہیں تھی۔ سور نے پیسہ پانی کی طرح بہایا اور یہ شادی نہایت دھوم دھماکے سے ہو گئی۔

شادی کی پہلی رات.....! اسکوں اور ولولوں کی رات.....! ہر شادی دوپہانگی کی رات! لیکن یہ سب کچھ بختیار تک محدود رہا۔ فروزاں برف کی سل انی رہی۔

"خیر۔" بختیار نے اپنے دل میں کہا۔ "میں تمہاری موت حیت کر رہوں گا فروزاں!"

اس شام بختیار کے خالو نے ایک بڑے سردار میں ویسے کا اہتمام کیا تھا (شادی سے قبل) ویسے کے دعوت ناموں کی خاصی بڑی تعداد عبد اللہ خان کو بھی بھجوائی گئی تھی۔ ان کی طرف سے آئے ہوئے مہمانوں کی تعداد بھی کم نہیں تھی لیکن دعوت ناموں کی تعداد سے کم تھی۔

خود فروزاں نے بھی اپنے دوست لڑکوں اور لڑکیوں کو بلایا تھا۔ ان میں سے جن کا خلیق آرٹس کونسل سے تھا، وہ سب تو نہیں آئے لیکن جو آئے۔ تھے وہ فروزاں اور بختیار کے مشترک مہمان تھے۔ ساڑھے نو بجے تک سب مہمان آچکے تھے یا جو تھوڑے بہت رہ گئے تھے، وہ آتے جا رہے تھے۔ جب فروزاں اور بختیار مہمانوں میں گھل مل گئے تو جگہ جگہ ان کے جاننے والوں نے انہیں گھیرا۔ بختیار سب سے پیسے مسکراتے ہوا مل رہا تھا لیکن فروزاں کے ہونٹوں پر ہنس ہلکی سی مسکراہٹ رہی جو بختیار کے خیال کے مطابق جبری تھی۔

ایک جگہ فروزاں چونکی۔ بختیار نے اس شخص کی طرف دیکھا جو فروزاں کے چومنے کا سبب بنا تھا۔

"حیران رہ گئیں مجھے دیکھ کر!" وہ آدمی قریب آتے ہوئے بولا۔ پھر قریب آکر اس نے بختیار کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ بختیار نے بھی ہاتھ بڑھادیا۔

"مجھے فکشن کہتے ہیں۔" وہ بولا۔ "اور یہ لوگوں کی محض محبت ہے کہ وہ مجھے کنور فکشن کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔"

"آپ کی شخصیت ایسی ہے کہ آپ کنور فکشن بھی ہیں۔" بختیار نے خوش دلی کا مظاہرہ کیا۔ وہ فروزاں کو شبہ بھی نہیں ہونے دینا چاہتا تھا کہ وہ اس کے اور کنور فکشن کے بارے میں کچھ جانتا ہے۔

"کنور فکشن نے کہا اور پھر فروزاں کا نام لے کر اس کی طرف متوجہ ہوا، پھر جلدی سے دوبارہ بختیار کی طرف دیکھ کر بولا۔ "براہمت مانے گا کہ میں

انہیں مسخرہ بختیار کہنے کے بجائے ان کا نام لے رہا ہوں۔ دراصل ہم بہت پرانے دوست ہیں، فروزاں نے بھی آپ سے میرا ذکر نہیں کیا؟"

"شاید کیا ہو۔" بختیار نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"دراصل ان کے بہت سے دوست ہیں۔ میں زیادہ تر کے نام بھول چکا ہوں۔"

کنور فکشن نے مسکراتے ہوئے اپنے سر کو خفیف سی جنبش دی، پھر دوبارہ فروزاں کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

"ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا تم سے کہ شادی کی بگت میں کچھ نام تمہیں یاد نہیں رہے ہوں گے۔ ان میں سے ایک نام میرا بھی ہو گا اس لیے تم نے مجھے بھی اپنی شادی کا دعوت نامہ نہیں بھیجا لیکن میں نے سنا تو خود ہی آ گیا۔ میں بن بلا یا مہمان ہوں۔"

بختیار نے محسوس کیا کہ فروزاں اس وقت جذباتی ہو گئی تھی۔ اس کے ہونٹ لرزنے لگے تھے۔ اس نے جواب میں کچھ کہنا چاہا مگر کچھ کہہ نہ سکی۔ اس کے اس مشکل وقت میں شبانہ اس کے کام آئی۔

"میں بھی بن بلا یا مہمان ہوں۔" وہ ہنستے ہوئے کسی جانب سے ان کے قریب آئی اور بختیار کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "مجھے بینک سے معلوم ہو گیا تھا کہ آج آپ کا ولیمہ ہے۔ اگر کل معلوم ہو جاتا تو میں شادی میں بھی ایک بن بلا یا مہمان ہوتی۔" اس کا لہجہ بہت شوخ تھا۔

"ہاں۔" بختیار نے خوش گوار لہجے میں کہا۔ "میں اپنے کئی جاننے والوں کو بلانا بھول گیا۔ یہاں تک کہ دو ایک دوستوں کو بھی بھول گیا ہوں۔"

شبانہ کی مسکراہٹ گہری تھی۔ "آپ مجھے باور کرنا چاہتے ہیں کہ میں آپ کی دوست نہیں ہوں۔"

"دراصل۔" بختیار سنجیدہ ہوا۔ "آپ سے آرٹس کونسل میں کبھی کبھی ملاقات ہوتی ہے۔ میں آپ کو اپنے بینک کی کلاسٹ کی حیثیت سے زیادہ جانتا ہوں اور ایک منبر کی حیثیت سے مجھے خوف تھا کہ اگر میں نے آپ کو دوست کہا تو شاید آپ برا مان جائیں۔"

"ہرگز برا نہیں مانوں گی۔" شبانہ نے کہا۔ "آپ مجھے دوست صرف کہیں نہیں بلکہ سمجھیں بھی!"

"ہیلو شبانہ!" ایک جانب سے آواز آئی۔

شبانہ اس طرف متوجہ ہوئی۔ اس طرح بختیار بھی ایک مشکل جواب دینے سے بچ گیا۔

اس مختصر دورانیے میں فروزاں نے اپنی جذباتی

کیفیت پر قابو پایا تھا۔ وہ کنور ثقلین سے بولی۔ "معاف کرنا کنور! میں واقعی بھول گئی تھی، ویری سوری۔"

"کوئی بات نہیں، ہو جاتا ہے ایسا۔"

"پھر ملاقات ہوگی تم سے! میں ذرا کچھ اور مہمانوں کو دیکھ لوں۔"

"شیور، شیور، ضرور۔"

فروزاں نے اختیار کا ہاتھ پکڑ کر قدم آگے بڑھائے۔ اس قریب کے دوران میں یہ پہلا موقع تھا جب فروزاں نے اس کا ہاتھ خود پکڑا تھا۔ غالباً وہ نہیں چاہتی تھی کہ اختیار اور کنور ثقلین میں کوئی اور بات ہو۔

اس محفل میں رندھاوا بھی موجود تھا مگر غم نہ جاتے کیوں اس کی کوشش تھی کہ وہ فروزاں اور اختیار سے دور دوری رہے۔

فروزاں اور اختیار آگے بڑھے ہی تھے کہ اختیار کے خالہ زاد بھائی آفتاب سے سامنا ہو گیا۔ اس کے ساتھ شانہ بھی تھی۔

"آج تم بہت اچھے لگ رہے ہو اختیار! وہ بولا۔

"اور یہ؟" اختیار نے فروزاں کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ آخر تمہارا انتخاب ہیں۔ یہ ہمیشہ ہی اچھی لگتی ہوں گی۔" آفتاب نے کہا، پھر فروزاں سے بولا۔ "کیوں بھا۔۔۔ اوہ، نہیں۔" وہ ہنسا۔ "میں بھابی کہنے والا تھا۔ کوئی شک نہیں ہوگی اس کی۔ اختیار مجھ سے چھوٹا ہے۔ میں اس کا نام لیتا ہوں اور یہ مجھے بھیما کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔"

"آپ میرا نام لے سکتے ہیں۔" فروزاں نے سنجیدگی سے کہا۔

"یہ بولی بات! آفتاب ہنسا۔

شانہ اس کے ہر پر میں کھڑی مسرتی رہی۔

"اب آپ اپنی گپ شپ جاری رکھیں بھیا! ہم اور مہمانوں کو دیکھتے ہیں۔" اختیار نے کہا اور قدم آگے بڑھا دیے۔ اس کے ساتھ فروزاں نے بھی قدم بڑھائے۔ اب اس نے اختیار کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

شانہ اور آفتاب کو باتیں کرتے دیکھ کر اختیار چونک گیا تھا۔ پہلے بھی اسے خیال نہیں آیا تھا کہ شانہ سے آفتاب کی بھی شناسائی یا دوستی ہوگی۔ آفتاب بھی آفس کونسل میں نظر نہیں آیا تھا۔

کچھ دیر بعد اس نے آفتاب اور کنور ثقلین کو بھی ایک جگہ کھڑے باتیں کرتے ہوئے دیکھا لیکن یہ اس کے لیے کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ اسے یہ تو معلوم ہی تھا کہ آفتاب

سیاست دانوں میں گھسار ہوتا ہے اور رندھاوا اسے تو یہ تھا کہ کنور ثقلین اب سیاست میں باقاعدہ قدم رکھ چکا تھا۔ وہ آئے والے انتخابات میں حصہ بھی لیتا۔

قریب تیس گنتی سیاست دان نظر آ رہے تھے۔ سبھی عہدہ دار تھے۔ مہمان ہو سکتے تھے۔ اختیار کا یہ کہنے کے خالو کا کی سیاست ان سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

بارہ بجے سے پہلے قریب ختم ہوئی جب فروزاں نے اختیار، ہال سے رو نہ ہونے لگے تو آفتاب نے کہا۔

"تم دونوں کے تحائف کل پہنچا دوں تمہارے۔"

فروزاں نے

اختیار کو نہ جانے کیوں یہ اچھا نہیں لگا کہ آفتاب سے یہ بات اس سے کہنے کے بجائے فروزاں سے کہی تھی۔

دوسرے دن آفتاب اپنے کہنے کے مطابق انہیں تحائف پہنچنے آئے جو ایک بہت بڑا زحیر تھا۔ وہ ڈھیر اپنی کار میں آیا تھا۔ ساتھ میں ایک ملازم بھی تھا جس نے سب تیسری منزل تک پہنچایا۔

ملازم کو رخصت کرنے کے بعد آفتاب وہاں رہا۔

"کیا چائے نہیں پلو! ڈاک کی میری چھوٹی سی ریائی بھولی! اس نے چپکنے کے سے انداز میں کہا۔

اختیار کو یہ انداز اچھا نہیں لگا۔ وہ فروزاں سے متعلق ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

فروزاں نے اسے جواب دیا "بھئی ہمارے کوئی ملازم نہیں رکھا۔ یہ کانا شام نے باہر جا کے سونے میں رکھا۔ وہ پھر ورت سے کھانے کے لیے کچن پہنچا پڑے گا۔"

"تو کھانا آج بیا کرو!" آفتاب نے کہا۔ "میں خواہی دو ایک ڈشز خاص تمہارے لیے۔ یہ کروں گا۔ اختیار معلوم ہے کہ میں کچھ خاصا اور پتی ہوں۔ وہ ملازم فروزاں سے کوئی جواب دینے کے لیے کھڑی ہوئی اور اختیار کی طرف آگئے ہوئے۔ بہت ہی سنجیدہ لہجے میں بولی۔

"میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتی ہوں۔" وہ تیزی سے غلاب گاہ کی طرف چلی گئی۔

آفتاب اس کی بے رخی پر چند لمحے کے لیے سنجیدہ ہوا۔ اس کے بعد پھر ہنسا۔ وہ ہنسی کھسکا ہٹ کی تھی۔ وہ کھاتے ہوئے بولے بولا۔ "میں اب چلتا ہوں اختیار۔"

"شکر یہ بھیا! آپ نے ناحق زحمت کی۔ تحائف کی ملازم سے بھجوا دیجئے۔"

"میں نے سوچا تھا کہ چھا خیر! چلتا ہوں

اختیار اسے رخصت کرنے کے لیے دروازے تک گیا۔ پھر دروازہ بند کر کے جواب گا: میں پہنچی۔ فروزاں نے غصے سے لپٹی ہوئی تکی بنیں یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اتنی جلدی سو جائے۔

"فروزاں! اختیار اس کے پیر میں بیٹے سو۔"

"تم ابھی سوئی تو نہیں ہوگی۔"

ہوں۔" فروزاں آنکھیں بند کی رہی۔

"تم مجھ سے شادی کر کے بالکل خوش نہیں ہو گئیں!"

فروزاں نے نہ صرف آنکھیں کھولیں بلکہ تختی کی طرف کروٹ بھی لی اور بڑی سنجیدگی سے بولی۔ "آفس کونسل میں تم نے میرے رویے سے اندازہ نہیں لگا سکتا۔ میں تمہیں دوست سے زیادہ سمجھنے کے لیے آمادہ نہیں تھی۔"

"تو پھر تم نے مجھ سے شادی کیوں کی؟"

"ڈیڈ کی کوئی بات رو کرنا میرے لیے مشکل تھا۔"

اختیار چند لمحے خاموش رہا، پھر بولا۔ "کل دینے میں کنور ثقلین سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس کی باتوں سے ظاہر ہوا تھا کہ تم اس کی پرانی دوست ہو۔ پھر تم نے اسے مدعو کیوں نہیں کیا تھا؟"

"بھول گئی تھی۔"

"کیا تم اسے جوں جوں مانتی ہو؟"

فروزاں نے یہ دیکھ کر اس کی طرف اٹھنا۔

"کیوں؟ کیا کسی کو کھانا میں نہ کھا سکتا؟ کل تم بھی شانہ سے کھ رہے تھے کہ دو ایک دوسراں ہونا چاہتے تھے۔"

"لیکن تم کنور ثقلین کو نہیں مانتی۔ ان سنیں! اختیار اس وقت کھل کر غصہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ کنور فوراً اٹھیں کرو۔

میں تمہیں بہت شدت سے چاہتا تھا اور اب بھی چاہتا ہوں۔ اس لیے میری خوش بے کہ تم تمہیں بہت چھو بتا دوں۔"

فروزاں خاموشی سے مستفسر اندہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

اختیار اس کی طرف دیکھے بغیر ذرا کی اندر میں بولنے لگا۔ "میں تمہیں شدت سے چاہنے لگا تھا۔" اس نے اپنی بات دہرائی۔ "یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا تھا کہ تم کنور کو چاہتی ہو۔ یہ جاننے کے بعد میں کوشش کرتا کہ اپنی محبت کا ٹکڑا تم کو مل سکے لیکن مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا جن سے مجھے اندازہ ہوا کہ اگر تم نے کنور سے شادی کی تو یہ تمہارے حق میں اچھا نہیں ہو گا۔"

"ٹھیک ہو، کہ تمہیں کنور سے میری محبت کا علم ہو چکا ہے۔" فروزاں نے کچھ تکی سے کہا۔ "لیکن یہ تم کیوں کہہ رہے ہو کہ اس سے میری شادی میرے حق میں کبھی ثابت نہیں ہوتی۔"

"کنور ایسا ہی آدمی ہے۔ نئی نئی لڑکیوں سے آمادہ ہوتا۔ اس کا شوق ہے۔ تم سے وہ شادی نہیں کرتا۔ اسی کے الفاظ کے مطابق وہ مستقل روٹ پاش کا قائل نہیں۔ وہ کسی وقت بھی تمہیں خیر چھوڑ دے گا۔ یہ بات کھل کر مانگے اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ اگر مجبوراً اسے تم سے شادی کرنا ہی پڑ جاتی تو وہ ایک ماہ میں تم سے دل بھر جانے کے بعد تمہیں طلاق دے دیتا۔"

"بند کرو یہ فحش باتیں۔" فروزاں تقریباً چیختی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ "میں اب تمہاری بیوی ہوں اس لیے اب کسی کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتی، میں کنور پر اس قسم کے الزامات بھی میں برداشت نہیں کر سکتی۔"

"ابھی میں تمہیں اس کے بارے میں وہ کچھ بھی بتاؤں گا جو تم نہیں جانتیں۔" اختیار نے کبھی لہجے میں کہا اور پھر وہ سب کچھ بیان کر ڈالا جو اسے کنور کے بارے میں رندھاوا سے معلوم ہو تھا۔

"بس کرو! فروزاں چیختی ہوئی بستر سے اٹھ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ اس طرح اپنے کانوں پر رکھ لیے تھے جیسے وہ اختیار کی آواز اس کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی۔

"اختیار نے سنا بات جاری رکھی۔

تمہیں اس چٹوڑے بچے کی کہانی کے لیے میں نے تم سے شادی کی ورنہ۔"

"چپ ہو جاؤ اب! فروزاں نے آفس کی رفتار بڑھا دی۔ اس کا چہرہ اُسے سے گھٹ گیا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ دن بن چکی ہوں اور میں شانہ جیٹن ٹرک نہیں ہوں۔ اس میں کنور سے ملنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی، لیکن میں اس کے بارے میں یہ خرافات بھی نہیں سنتا چاہتی۔"

اب اختیار کو بھی کچھ غصہ آیا وہ بولے "میں اگر کوشش کروں تو ثبوت بھی حاصل کر لوں گا کہ وہ آوارہ ہے، بد معاش ہے، شہدہ ہے۔"

غصے سے فروزاں کی مٹھیاں بھینچ گئیں۔ وہ سمجھ بول تو نہیں لیکن یکایک بند کی درواز کی طرف گئی۔ اس درواز میں اس کا رک کی چابی بھی پڑی ہوئی تھی جو عبداللہ خان نے جہیز میں دی تھی۔ چابی لے کر وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ باہر نکل کر اس نے دروازہ بڑی رور سے بند کیا

تھا۔ بختیار دم بہ خود بیخارہ گیا۔ اسے ذرا بھی توقع نہیں تھی کہ فروزاں اتنی چراغ پا ہو جائے گی۔ بیرونی دروازہ بھی اتنی ہی زور سے بند کیا گیا تھا کہ بختیار کو اس کی آواز صاف سنائی دے گئی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کر رہ گیا۔ اسے اب خیال آ رہا تھا کہ اس نے فروزاں کو سمجھانے کے لیے مناسب وقت کا انتظار نہیں کیا اور شاید مناسب الفاظ بھی استعمال نہیں کیے تھے۔

وہ بستر پر پڑا رہا۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے بھی کہیں نہیں گیا۔ پھر شام ہو گئی۔ اس کا خیال تھا کہ زیادہ سے زیادہ شام تک فروزاں کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا اور وہ جہاں بھی گئی ہوگی، وہاں سے واپس آ جائے گی لیکن جب رات کے نو بج گئے تو وہ کمرے میں بے چینی سے ٹپٹپٹ لگا۔

وہ بیٹھنے والے تھے جب اس نے موبائل پر فروزاں سے رابطہ کیا۔

”کہاں ہو؟“ اس نے نرمی سے پوچھا۔

”میں اپنے کمرے آ گئی ہوں۔“ فروزاں نے رکھائی سے جواب دیا۔

”کمرہ تو تمہارا یہ ہے۔“

”میرا مطلب ہے کہ میں اپنے پہلے کمرے آ گئی ہوں، ڈیڈی کے کمرے۔“

”کب آؤ گی؟“

”واپس آنے کے ارادے سے نہیں ٹل گئی وہاں سے۔“

”ذرا سی بات کو اتنا بڑھاؤ۔“

”ذرا سی بات نہیں تھی وہ اول پرچہ کے لگائے ہیں تم نے میرے۔“

”اس بد معاش کی بات سے چر کے لگ گئے تمہارے دل پر؟“

بختیار روانی میں اپنا جملہ توہور کر گیا جبکہ فروزاں نے لفظ ”بد معاش“ سننے ہی رابطہ منقطع کر دیا تھا۔

بختیار نے جھنجھلا کر موبائل ایک طرف ڈالا اور بستر پر گر پڑا۔ صبح کے ناشتے کے بعد ایک کھیل بھی اڑ کر اس کے منہ میں نہیں گئی تھی لیکن کچھ کھانے کو اس کا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ اسی عالم میں کسی وقت اس کی آنکھ لگ گئی۔

صبح جب وہ بیدار ہوا تو چومیس گھنٹے بھوکا رہنے کی وجہ سے کچھ تھابت محسوس کر رہا تھا۔ اسی حالت میں اس نے جیسے تیسے غسل کیا اور کپڑے تبدیل کر کے دفتر روانہ ہو گیا۔ شادی کے لیے اس نے پانچ دن کی چھٹی لی تھی جو گزشتہ روز ختم ہو چکی تھی۔

دفتر پہنچ کر وہ سیدھا اپنے کیمین میں چلا گیا اور دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر کہنیاں میز پر نکادیں۔ پھر وہ اس وقت چونکا جب رندھاوا اس کے کیمین میں آیا۔

”خیریت تو ہے؟“ وہ بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

اس کی طرف دیکھتے ہوئے بختیار کی آنکھیں ڈھل آئیں۔ فروزاں کے اس طرح چلے جانے سے وہ بہت دکھی ہو گیا تھا۔

”کیا بات ہے بختیار؟“ رندھاوا بے چہن نظر آیا۔

بختیار نے کچھ رگ رگ کر مختصر طور پر گزشتہ روز کا واقعہ رندھاوا کو بتا دیا۔

سب کچھ سن کر رندھاوا نظریں جھکا کر سوچ میں ڈوب گیا، پھر ایک طویل سانس لے کر اس نے سر اٹھایا اور بختیار کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”تمہارا چہرہ بہت اترا ہوا سا ہے۔ کل سے تم نے کچھ کھایا بھی؟“

بختیار نے نفی میں سر ہلایا۔ ”دل ہی نہیں چاہ رہا ہے۔“

پھر وہ ”نہیں نہیں“ کرتا رہ گیا لیکن رندھاوا نے چہرے کو ہلکا کرنا شالانے کے لیے قریبی ریسٹوران بھیج دیا۔

انٹرکام کی گھنٹی بجی۔ بختیار نے ریسٹوران اٹھایا۔

دوسری طرف سے عبداللہ خان کی آواز آئی۔

”آؤ بختیار!“

”جی۔“ بختیار نے اتنا ہی کہہ کر ریسٹوران رکھا اور کھڑا ہو گیا۔

رندھاوا بڑبڑایا۔ ”میں حیران تھا کہ آج بڑے صاحب تم سے بھی دو منٹ پہلے آگئے۔ عام طور پر دس بجے سے پہلے نہیں آتے۔“

بختیار کیمین سے نکلا اور میزچیوں کی طرف بڑھا۔ بینک میں کام کرنے والے اسے بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے اپنے منبر کو اتنا بدلا ہوا بھی نہیں دیکھا تھا۔

بختیار نے عبداللہ خان کے کمرے میں قدم رکھا۔

”آؤ بیٹھو!“ عبداللہ خان نے سنجیدگی سے لیکن نرم لہجے میں کہا۔

بختیار سر جھکائے بیٹھ گیا۔

”ایسا۔“ عبداللہ خان بولے۔ ”ایسا بہت کم۔۔۔“

شاؤنادر ہی ہوتا ہے کہ شادی کے بعد دو ہی دن میں میاں بیوی کا کوئی سنگین نوعیت کا جھگڑا ہو جائے۔ کل سب فروزاں آئی تھی تو بہت اداں تھی۔ میں نے اس سے استفسار کیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ رات تک میں نے اس سے کئی بار جھانک کر کئی حد تک نہیں دیکھا۔ میرے

سور کرتے ہی وہ بس رو پڑتی ہے۔ رات کو بھی وہ تمہارے پاس نہیں گئی۔ اسی سے مجھے اندازہ ہوا کہ معاملہ کچھ سنگین ہے۔ جی! سب سے کچھ اصول ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میاں بیوی کو اپنے جھگڑے خود ہی ٹھنڈا چاہئیں۔ بڑوں کی دخل اندازی مناسب نہیں ہوتی، تاوقتیکہ چھوٹے خود نہ چاہیں اور فروزاں نے مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ اس کے جواب دینے سے میں سمجھتا ہوں کہ بات کچھ اتنا سا بے جودہ مجھے نہیں بتانا چاہتی۔ مجھے نہیں معلوم کہ تم جی بڑا چاہو گے یا نہیں۔“

بختیار نے مسکرانے کی کوشش کی اور کہا۔ ”آپ زیادہ فکر مند نہ ہوں۔ میں فروزاں کو منالوں گا۔ دور کروں گا اس کی ناراضی۔“

”ٹھیک ہے۔ میں خود بھی اسی بات کا قائل ہوں کہ میاں بیوی میں جھگڑا ہو تو وہ تعفیہ بھی خود ہی کریں۔ اب تم جی۔ اپنا کام دیکھو۔“

”جی۔“

بختیار اٹھ کر اپنے کیمین میں آ گیا۔ ناشتا آچکا تھا۔ اس کی خوشبو سے بھی بختیار کی اشتہا نہیں جاگ سکی لیکن رندھاوا نے اصرار کر کے اسے ناشتا کرایا اور ناشتے کے دوران میں پوچھا کہ عبداللہ خان نے اسے کیوں بلایا تھا۔

بختیار نے سب کچھ بتا دیا۔

ناشتا کرنے کے بعد رندھاوا نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ فروزاں سے یہ سب کچھ کہنے میں تم نے جھلت سے کام لیا ہے۔“

بختیار خاموش رہا۔

پھر دن گزرتے رہے۔ بختیار کی حالت غیر ہوتی رہی۔ وہ یہ معلوم کرنے سے بھی قاصر تھا کہ فروزاں کس حال میں تھی۔

اس دوران میں اس کی خالہ کے کئی فون آئے۔ بختیار مصروفیت کے بہانے انہیں ٹالتا رہا۔ وہ اداں تھیں کہ بختیار نے ان کے پاس آنا تک چھوڑ دیا تھا۔

آخر ایک دن بختیار ضبط نہ کر سکا اور اس نے موبائل فون پر فروزاں سے رابطہ کیا۔

”کہاں ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”کمرہ پر ہی ہوں۔“ فروزاں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ”ایک دن کے لیے کیا، گھنٹا بھر کے لیے بھی باہر نہیں نکلی۔ اطمینان رکھو کہ میں نے فون پر بھی کنوڑ سے کوئی بات نہیں کی۔“

”اچھا اب غصہ تمہوک دو۔“

”میں اب غصے میں نہیں۔ بس اذیت میں ہوں۔“

”اذیت؟ کیوں؟“

”دل پر لگے ہوئے چوکوں کی وجہ سے۔“

”میں تمہارے زخم مندمل کر دوں گا۔ گھر آ جاؤ۔“

کچھ توقف کے بعد دوسری طرف سے آواز آئی۔

”میں اس دن بہت جذباتی ہو گئی تھی۔ میں نے کنوڑ کو ایس ایم ایس کیا تھا اور تم نے اس پر جوابزادات لگائے تھے، وہ سب لکھ دیے تھے۔ پھر اس کا ایس ایم ایس آیا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ اس کے بارے میں یہ میری ذاتی رائے ہے یا یہ سب کچھ مجھ سے کسی اور نے کہا ہے لیکن میں نے اسے جواب نہیں دیا۔ میں نہیں جانتی کہ اس وقت میری ذہنی کیفیت کیا تھی کہ میں اسے وہ ایس ایم ایس کر بیٹھی۔“

”کوئی بات نہیں۔ تم آؤ گی تو ہم بات کر لیں گے۔“

اس مرتبہ پھر کچھ توقف سے جواب آیا۔ ”میں صرف ایک شرط پر آ سکتی ہوں۔“

”بولو!“

”میں تمہیں کنوڑ کا قبر ویتی ہوں۔ اسے ایس ایم ایس کرو۔ اسے بتاؤ کہ وہ سب کچھ مجھ سے تم نے کہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی تم اس سے معافی بھی مانگو۔“

”کیا!“ بختیار اکھڑ گیا۔ ”میں اس سے معافی مانگوں؟“

”ہں۔“ فروزاں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ”میں اسی شرط پر واپس آ سکتی ہوں۔ جب مجھے معلوم ہو جائے گا کہ تم نے اس سے معافی مانگ لی ہے تو میں آ جاؤں گی۔“

یہ سب کچھ سنتے ہوئے بختیار کے خون کی گردش تیز ہوتی رہی تھی۔ اس نے فروزاں کے خاموش ہوتے ہی جڑے بھیج کر کہا۔ ”یہ ناممکن ہے کہ میں اس سے معافی مانگوں۔“

دوسری طرف سے کچھ کہے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

”ٹھٹ۔“ بختیار کے منہ سے نکلا۔

وہ اسی وقت بینک سے لوٹا تھا اور فروزاں سے بات کی تھی۔ شام تک اس کی حالت غیر ہو چکی تھی۔ اندھیرا پھلتے پھلتے وہ کمرے سے نکلا اور تیز رفتاری سے کار چلاتا ہوا رندھاوا کے گھر پہنچ گیا۔

”خیریت؟“ رندھاوا اسے دیکھ کر چونکا۔ ”آؤ، اندر آؤ!“

”تمہیں میں بس کھڑے کھڑے آیا ہوں۔ اچھا ہوا کہ تم مل گئے۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ فون کر کے آؤں۔ اب میں بس یہ چاہتا ہوں کہ اس وقت تم صبح کا کردار ادا کرنا چھوڑ جاؤ۔ میں تمہیں اس وقت ایک چارہ سارہ کھنچ چاہتا ہوں۔“

”میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے، تم کیا کہہ رہے ہو۔“ رندھاوا نے حیرت سے کہا۔

”شراب ہوگی تمہارے پاس۔“ اختیار نے کہا۔ ”مجھے اس کی ضرورت ہے۔“

”لیکن اختیار اتم۔“

”تم میری بات سمجھنے کی کوشش تو کرو۔“

”تو ٹھیک ہے، میں مسلسل پیتا رہوں گا۔“ بڑا بڑا ہوئے اس نے چونک کر شراب کی بوتل پر نظر ڈالی۔ اس نے تین گلاسوں میں اتنی شراب انڈلی تھی کہ بقیہ ایک چوتھائی سے کم رہ گئی تھی۔ ”یہ ختم کرتے کرتے نیند تو آجائے گی مجھے۔“ وہ پھر بڑبڑایا۔ ”صبح جاگوں گا تو۔۔۔ کیا کروں گا؟“

اس کی پلکیں پوچھل ہوئے گی تھیں۔ اس نے سوال نہ کر رندھاوا سے رابطہ کیا۔ ”ورننگ کی میرے لیے؟“

دوسری طرف ایک طویل سانس لی گئی، پھر نہ کیا۔ ”تم پہلی مرتبہ پی رہے ہو۔ ابھی تم نے دوا نہ لی۔ یہ سے زیادہ نہیں پیے ہوں گے تمہارا سہ سبب میں منت آگئی ہے۔“

”آگئی ہے نا۔“ اختیار کھٹکھٹا رہنا۔ وہ تیسرا گلاس ختم کر چکا تھا۔ اس نے کہا۔ ”آگئی ہے تو آنے دو سال کو! فروزاں نہیں آتی تو نہ آئے، نکلت تو آرہی ہے نا! یا یہ نکلت یہ کسی لڑکی کا نام بھی ہو سکتا ہے۔“ وہ بے ذہن ہونے لگا۔ ”میرے لیے۔۔۔ اور منگائی؟“ اس نے رندھاوا سے پوچھا۔

”کل لا دوں گا۔“

”تاہم! صبح اٹھ کر کیا پیوں گا؟ ابھی چاہیے! کہیں سے بھی منگاؤ، ابھی منگاؤ نہیں تو میں شہر میں لوگوں سے پوچھتا ہوں گا کہ شراب کہاں ملتی ہے۔“

”پلیز۔۔۔ رندھاوا جدی سے ہو۔“ اس حالت میں اس نے زندگی میں پہلے کسی نہیں پی تھی لیکن قلموں میں دیکھ چکا تھا کہ گلاس میں شراب کی مقدار کم اور پانی کی مقدار زیادہ ہوتی ہے۔ بعض افراد پانی ملائے بغیر پیتے ہیں لیکن سب سے پینے والوں کے لیے خالص شراب پینا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔

پہلا گھونٹ لیتے ہی اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے سینے میں آگ تر گئی ہو۔ منہ میں کڑواہٹ پھیل گئی۔ ہاتھ ہی اسے ابکائی بھی آئی لیکن اس نے خود کو قے کر۔۔۔ سے روکا۔ دوسری مرتبہ اس نے چھوٹا سا گھونٹ لیا۔

دھیرے دھیرے وہ کڑواہٹ اور آگ اس کے لیے قابل برداشت ہوتی چلی گئی۔ تیسرا گلاس بنا کے اس نے گھونٹ لیا اور پھر کسی سے کھڑا ہو کر ٹپٹنے لگا۔

”بہت محبت ہے تم سے۔“ وہ پھر بڑبڑایا۔ ”لیکن تم ہی مجھے ذلیل کروانا چاہتے ہو تو یہ نہیں ہوگا۔“

اس نے اپنے قدموں میں ڈنگا ہٹ محسوس کی تو پھر کسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے دماغ میں رندھاوا کے حوالہ کو بچے۔ ”شراب کا نشہ داتی نہیں ہوتا۔ شراب ہی گرم نہیں بھلایا جاسکتا۔ ہاں اگر تھکے کھنٹے سے لے کر سونے تک پیتے رہو تو وہ بات ہے۔“

”تو ٹھیک ہے، میں مسلسل پیتا رہوں گا۔“ بڑبڑا۔ ہوئے اس نے چونک کر شراب کی بوتل پر نظر ڈالی۔ اس نے تین گلاسوں میں اتنی شراب انڈلی تھی کہ بقیہ ایک چوتھائی سے کم رہ گئی تھی۔ ”یہ ختم کرتے کرتے نیند تو آجائے گی مجھے۔“ وہ پھر بڑبڑایا۔ ”صبح جاگوں گا تو۔۔۔ کیا کروں گا؟“

اس کی پلکیں پوچھل ہوئے گی تھیں۔ اس نے سوال نہ کر رندھاوا سے رابطہ کیا۔ ”ورننگ کی میرے لیے؟“

دوسری طرف ایک طویل سانس لی گئی، پھر نہ کیا۔ ”تم پہلی مرتبہ پی رہے ہو۔ ابھی تم نے دوا نہ لی۔ یہ سے زیادہ نہیں پیے ہوں گے تمہارا سہ سبب میں منت آگئی ہے۔“

”آگئی ہے نا۔“ اختیار کھٹکھٹا رہنا۔ وہ تیسرا گلاس ختم کر چکا تھا۔ اس نے کہا۔ ”آگئی ہے تو آنے دو سال کو! فروزاں نہیں آتی تو نہ آئے، نکلت تو آرہی ہے نا! یا یہ نکلت یہ کسی لڑکی کا نام بھی ہو سکتا ہے۔“ وہ بے ذہن ہونے لگا۔ ”میرے لیے۔۔۔ اور منگائی؟“ اس نے رندھاوا سے پوچھا۔

”کل لا دوں گا۔“

”تاہم! صبح اٹھ کر کیا پیوں گا؟ ابھی چاہیے! کہیں سے بھی منگاؤ، ابھی منگاؤ نہیں تو میں شہر میں لوگوں سے پوچھتا ہوں گا کہ شراب کہاں ملتی ہے۔“

”پلیز۔۔۔ رندھاوا جدی سے ہو۔“ اس حالت میں اس نے زندگی میں پہلے کسی نہیں پی تھی لیکن قلموں میں دیکھ چکا تھا کہ گلاس میں شراب کی مقدار کم اور پانی کی مقدار زیادہ ہوتی ہے۔ بعض افراد پانی ملائے بغیر پیتے ہیں لیکن سب سے پینے والوں کے لیے خالص شراب پینا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔

اس نے اپنے قدموں میں ڈنگا ہٹ محسوس کی تو پھر کسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے دماغ میں رندھاوا کے حوالہ کو بچے۔ ”شراب کا نشہ داتی نہیں ہوتا۔ شراب ہی گرم نہیں بھلایا جاسکتا۔ ہاں اگر تھکے کھنٹے سے لے کر سونے تک پیتے رہو تو وہ بات ہے۔“

اس نے اپنے قدموں میں ڈنگا ہٹ محسوس کی تو پھر کسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے دماغ میں رندھاوا کے حوالہ کو بچے۔ ”شراب کا نشہ داتی نہیں ہوتا۔ شراب ہی گرم نہیں بھلایا جاسکتا۔ ہاں اگر تھکے کھنٹے سے لے کر سونے تک پیتے رہو تو وہ بات ہے۔“

اس نے اپنے قدموں میں ڈنگا ہٹ محسوس کی تو پھر کسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے دماغ میں رندھاوا کے حوالہ کو بچے۔ ”شراب کا نشہ داتی نہیں ہوتا۔ شراب ہی گرم نہیں بھلایا جاسکتا۔ ہاں اگر تھکے کھنٹے سے لے کر سونے تک پیتے رہو تو وہ بات ہے۔“

اس نے اپنے قدموں میں ڈنگا ہٹ محسوس کی تو پھر کسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے دماغ میں رندھاوا کے حوالہ کو بچے۔ ”شراب کا نشہ داتی نہیں ہوتا۔ شراب ہی گرم نہیں بھلایا جاسکتا۔ ہاں اگر تھکے کھنٹے سے لے کر سونے تک پیتے رہو تو وہ بات ہے۔“

اس نے اپنے قدموں میں ڈنگا ہٹ محسوس کی تو پھر کسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے دماغ میں رندھاوا کے حوالہ کو بچے۔ ”شراب کا نشہ داتی نہیں ہوتا۔ شراب ہی گرم نہیں بھلایا جاسکتا۔ ہاں اگر تھکے کھنٹے سے لے کر سونے تک پیتے رہو تو وہ بات ہے۔“

اس نے اپنے قدموں میں ڈنگا ہٹ محسوس کی تو پھر کسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے دماغ میں رندھاوا کے حوالہ کو بچے۔ ”شراب کا نشہ داتی نہیں ہوتا۔ شراب ہی گرم نہیں بھلایا جاسکتا۔ ہاں اگر تھکے کھنٹے سے لے کر سونے تک پیتے رہو تو وہ بات ہے۔“

”کل لا دوں گا۔“

”تاہم! صبح اٹھ کر کیا پیوں گا؟ ابھی چاہیے! کہیں سے بھی منگاؤ، ابھی منگاؤ نہیں تو میں شہر میں لوگوں سے پوچھتا ہوں گا کہ شراب کہاں ملتی ہے۔“

”پلیز۔۔۔ رندھاوا جدی سے ہو۔“ اس حالت میں اس نے زندگی میں پہلے کسی نہیں پی تھی لیکن قلموں میں دیکھ چکا تھا کہ گلاس میں شراب کی مقدار کم اور پانی کی مقدار زیادہ ہوتی ہے۔ بعض افراد پانی ملائے بغیر پیتے ہیں لیکن سب سے پینے والوں کے لیے خالص شراب پینا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔

اس نے اپنے قدموں میں ڈنگا ہٹ محسوس کی تو پھر کسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے دماغ میں رندھاوا کے حوالہ کو بچے۔ ”شراب کا نشہ داتی نہیں ہوتا۔ شراب ہی گرم نہیں بھلایا جاسکتا۔ ہاں اگر تھکے کھنٹے سے لے کر سونے تک پیتے رہو تو وہ بات ہے۔“

اس نے اپنے قدموں میں ڈنگا ہٹ محسوس کی تو پھر کسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے دماغ میں رندھاوا کے حوالہ کو بچے۔ ”شراب کا نشہ داتی نہیں ہوتا۔ شراب ہی گرم نہیں بھلایا جاسکتا۔ ہاں اگر تھکے کھنٹے سے لے کر سونے تک پیتے رہو تو وہ بات ہے۔“

اس نے اپنے قدموں میں ڈنگا ہٹ محسوس کی تو پھر کسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے دماغ میں رندھاوا کے حوالہ کو بچے۔ ”شراب کا نشہ داتی نہیں ہوتا۔ شراب ہی گرم نہیں بھلایا جاسکتا۔ ہاں اگر تھکے کھنٹے سے لے کر سونے تک پیتے رہو تو وہ بات ہے۔“

اس نے اپنے قدموں میں ڈنگا ہٹ محسوس کی تو پھر کسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے دماغ میں رندھاوا کے حوالہ کو بچے۔ ”شراب کا نشہ داتی نہیں ہوتا۔ شراب ہی گرم نہیں بھلایا جاسکتا۔ ہاں اگر تھکے کھنٹے سے لے کر سونے تک پیتے رہو تو وہ بات ہے۔“

اس نے اپنے قدموں میں ڈنگا ہٹ محسوس کی تو پھر کسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے دماغ میں رندھاوا کے حوالہ کو بچے۔ ”شراب کا نشہ داتی نہیں ہوتا۔ شراب ہی گرم نہیں بھلایا جاسکتا۔ ہاں اگر تھکے کھنٹے سے لے کر سونے تک پیتے رہو تو وہ بات ہے۔“

اس نے اپنے قدموں میں ڈنگا ہٹ محسوس کی تو پھر کسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے دماغ میں رندھاوا کے حوالہ کو بچے۔ ”شراب کا نشہ داتی نہیں ہوتا۔ شراب ہی گرم نہیں بھلایا جاسکتا۔ ہاں اگر تھکے کھنٹے سے لے کر سونے تک پیتے رہو تو وہ بات ہے۔“

آری تھی تو اس کا نام کسی زبان پر کیوں آیا؟

نشر نہیں ہوئے اس نے جسکی انداز میں سوچا وہ یہ نکاس ایک ہی سانس میں سانس کر بیٹھا۔ گلاس میر پر رکھ کر اس نے صوفے کی پشت گاہ سے نیک لگائی اور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا۔ اسے وقت گزرتے کا احساس نہیں رہا۔ موبائل فون کی گھنٹی کی آواز سن کر وہ حیدھا ہوا۔ اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ وہ جیب خالی تھی۔ اس نے دوسری جیب میں ہاتھ ڈالا۔ موبائل اس کے ہاتھ میں آ گیا۔

”بے“ اس نے موبائل کان سے گایا۔ دوسری طرف خاموشی رہی۔ ”ہل“ ”لو“ وہ قدرے زور سے بولا۔ جواب اب بھی نہیں آیا۔

”بولو... یارا“ بختیار نے منہ بنایا۔ اب اس کی آواز ایسی ہو گئی تھی جیسے زبان موٹی ہو گئی ہو۔ ”کون ہو تمہاری میاں؟“

اس مرتبہ دوسری طرف سے ہلکی سی نسوانی ہنسی سنائی دی اور پھر دوسری ہی طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ بختیار موبائل اپنے چہرے کے سامنے لایا۔ کون تھی یہ؟ اس نے سوچا، فردزاں؟

بختیار کے دوسرے ہاتھ کی منگی بھج گئی اور موبائل پر گرفت اتنی سخت ہوئی کہ ہاتھ کی رگیں ابھرا آئیں۔ پھر اس نے نیا گلاس بھرا۔ وہ فردزاں کو اتنا بھول جاتا چاہتا تھا کہ اس کا نام بھی اس کی زبان پر نہ آئے۔

وہ چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگا مگر کچھ جلدی جلدی آدھا گلاس خالی ہوا تھا کہ کال بیل کی آواز سنائی دی۔

کون آگیا اب؟ اس نے سوچتے ہوئے دیو رگیں کاٹاک پر نظر ڈالی اسے دو کے بجائے چار رسوئیاں گنڈھنی نظر آئیں۔ وہ ہنسنا آنکھوں نے بھی شراب پی لی ہے وہ صوفے سے اٹھا۔ گلاس ہاتھ میں لیے وہ ڈکھڑاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ ونڈل پر گرفت کرنے میں اسے کچھ دقت ہوئی۔ بہر حال اس نے دروازہ کھولا۔ باہر ایک لڑکی کھڑی تھی۔ بختیار نے آنکھیں چھپا کر اسے پہچانا چاہا مگر نہیں پہچان سکا۔

”کون کون“ بختیار تباہی بول گا۔ ”اتنی کیوں پی لی تم نے؟“ لڑکی نے کہا اور اندر

گئی۔

”بیس پی سی“ مرضی میری“ بختیار نے جھومتے ہوئے کہا۔

لڑکی نے دروازہ بولٹ بھی کیا۔ اس نے دروازہ بولٹ بھی کیا۔

”تم نے تو گھر بھی نہیں ہوا جا رہا ہے ٹھیک سے؟“ کی سے کہا۔ ”آؤ۔“ اس نے بختیار کا ایک ہاتھ اپنے شانے پر پھیرا لیا۔ ”مجھ پر زرا اس کر چھو۔“

بختیار نے قدم بڑھانے ہوئے ایک گھونٹ لیا۔ ”یو آر ہی بے تمہارے لباس سے۔“ لڑکی نے ”شاید تم نے“

بختیار کچھ نہیں بولا۔ اب اسے ساری دنیا گھومتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ اس کے ہاتھ سے گلاس گرا اور ٹوٹ گیا۔ جو شراب اس میں تھی، وہ بہہ گئی۔ دماغ پر اندھیرا پھیل چلا گیا۔

”حواس جب بیدار ہوئے تو وہ ڈرائنگ روم سے صوفے پر پڑا ہوا تھا۔ وہ آنکھیں پوری طرح کھولنے کی کوشش کرتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ اس کے ہونٹ بہت دزنی محسوس ہو رہے تھے۔ فوری طور پر اسے یہ بھی یاد نہیں آسکا کہ وہ کون تھا اور کہاں تھا۔ دھیرے دھیرے ہی اسے یاد آنا شروع ہوا۔ پہلے اسے یہ رگ ہوا کہ وہ کون ہے۔ پھر یاد آیا کہ وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا شراب پی رہا تھا۔

مزید کچھ یاد آنے سے پہلے وہ ایک بیک اسی طرح چھل کر کھڑا ہوا جیسے اسے کسی اسپرنگ نے اچھال دیا ہو۔ وہ آنکھیں پھڑپھڑے اس لاش کی طرف دیکھنے لگا جو غائب سے ذرا بہت کر فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ ایک چاقو اس کی ٹھوڑی کے نیچے گردن میں پھوست تھا۔

وہ شش شبانہ کی تھی۔ اس کی گردن میں بہت سے چاقو کا دست بھی خون سے رنگین تھا، جیسے قاتل نے چاقو اس کی گردن میں اتارنے کے بعد اس پر اپنی گرفت اس وقت تک قائم رکھی ہو جب تک شبانہ نے تڑپ تڑپ کر جان نہ دے دی ہو۔

خون اس کی گردن سے اوپر ادھر پھیلا تھا اور بہتے ہوئے اس کی سوئی پتلی دھاریں بھی کئی اطراف گئی تھیں۔ ان میں سے دو کا رخ بیرونی دروازے کی طرف تھا۔ ایک دروازے کے قریب جا کر ختم ہو گئی تھی لیکن دوسری دروازے کے نیچے ختم ہو گئی تھی۔

”خدا یا!“ بختیار کے منہ سے نکلا اور اس نے

آنکھیں بند کرتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ لیے۔ فوراً اسے اپنے چہرے پر پتلی ہٹ محسوس ہوئی تھی۔ بختیار نے جلدی سے ہاتھ چہرے سے ہٹ کر ان کی طرف دیکھا تھا۔ اس کا دیاں ہاتھ خون میں ڈوبا ہوا تھا اور وہ خون تازہ معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے کچھ دھڑکنے لگے۔ ہاتھ پر بھی آئے تھے۔

نشر ہانکل کا فوراً ہو جانے کے باوجود بختیار پر لمبی سی پک ہٹ طاری ہو گئی تھی۔ اسے یاد آیا کہ جب کال بیل نی تھی تو اس نے نشے ہی کی حالت میں حاکم دروازہ کھولا تھا، اور کوئی لڑکی اندر آئی تھی۔ بختیار اپنی آنکھوں پر بار بار چھتی ہوئی دھند اور گہرے نشے کے باعث اسے پیچھے سے قاصر رہا تھا۔

کیا وہ لڑکی شبانہ ہی تھی؟ بختیار اپنے دماغ میں ابھرنے والے سوال پر توجہ نہیں دے سکا کیونکہ اسی وقت بیرونی دروازے کے باہر کچھ قدموں کی آہٹیں ہوئی تھیں اور پھر ایک مردانہ آواز سنا دی تھی۔ ”اک کھولے۔“

لاک میں چابی گھونٹنے کی آواز آئی۔ ”نہیں کھل رہا۔“ فردزاں کی آواز آئی۔ ”اندر سے پورٹ کیا گیا ہے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ توڑنا پڑے گا۔“ اس کے بعد دروازہ توڑنے کی کوششیں کی جانے لگیں۔ اس وقت بختیار کے کسی کی حالت میں میٹھا ہو تھا۔ پھر دروازہ توڑ کر جو لوگ اندر آئے، ان میں فردزاں کے ساتھ پولیس کے لوگ تھے۔ ”بیس۔“ بختیار کا ایک پاگلوں کی طرح چیخ پڑا۔ ”یقل میں نے نہیں کیا۔“

لیکن اس طرح چیخ اس کے کام نہیں آسکا۔ اسے گرفتار کر لیا گیا۔ فردزاں آنکھیں پھاڑے کبھی شبانہ کی لاش کی طرف دیکھ کر رہی تھی۔

بختیار جب حوالات میں تھا تو اسے معلوم ہوا کہ فردزاں اپنی کچھ ضروری چیزیں لینے کے لیے صبح ہی صبح وہاں آئی تھی۔ ایک کی دوسری چابی اس کے پاس تھی لیکن دروازہ کھولنے سے پہلے وہ اس وقت تک گئی جب اس نے وہ خون حاکم ہوا دیکھ جو دروازے کے نیچے سے باہر تک پہنچ گیا تھا۔

ساتھ بختیار کو زندہ ہوا سے معلوم ہوئی تھیں جو اس

سے ملے آیا تھا اور بہت دیر تھا اس کی باتوں نے خد کر دیا کہ وہ بختیار کو قاتل نہیں سمجھ رہا تھا۔ بختیار کی خال، خالو حاکم، ابھی آفتاب اور عبداللہ خان تک اسے قاتل تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھے۔

مگر ان سب کے خیالات کچھ بھی ہوں۔ مقدمہ عدالت میں پیش ہوا تو تمام ثبوت بختیار کے خلاف ہی تھے۔ قلیٹ منتقل تھا۔ اس کی ایک چابی بختیار کے پاس اور دوسری فردزاں کے پاس تھی۔ اسے یاد تھا کہ اس قاتل میں فردزاں کا ہاتھ ہوگا۔ شبانہ کی گردن میں پوسٹ چاقو کسی حد تک اس کی گردن کے پھر سے تنک میں دھنس گیا تھا اور اتنی طاقت فردزاں میں نہیں تھی۔ دوسرے یہ کہ شبانہ کا قاتل رات ایک بجے کے لگ جگ ہوا تھا اور اس وقت فردزاں عبداللہ خان کے ساتھ تھی۔ وہ دونوں بیرون ملک جانے والے اپنے کسی عزیز کو ایئر پورٹ چھوڑ کر واپس لوٹے تھے۔

بختیار ایک الزام سے الیہ نکل گیا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق شبانہ تین ماہ کی حاملہ تھی اس لیے بختیار کا ڈی این اے ٹیسٹ لیا گیا تھا۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ وہ اس بچے کا باپ نہیں تھا۔

مخالف وکیل نے یہ کہانی بنائی تھی کہ شبانہ اور بختیار آرٹس کونسل میں ایک دوسرے سے واقف ہوئے تھے۔ شبانہ ماڈل گرل ہونے کے ساتھ ساتھ مختلف لوگوں سے تعلقات بھی رکھتی تھی۔ انہی میں سے کوئی اس کے ہونے والے بچے کا باپ ہو سکتا تھا۔ شبانہ بارہ بجے کے قریب بختیار سے ملنے پہنچی تھی۔ اس نے بختیار کے ساتھ شراب نوشی کے دوران میں کوشش کی کہ بختیار اس کا گماہ اپنے سر لے لے۔ اس پر نشے کے باعث دونوں میں کچھ تلخ کلامی ہوئی تو بختیار نے شراب کے نشے اور غصے میں شبانہ کو قتل کر دیا اور چونکہ بختیار بہت زیادہ پی چکا تھا اس لیے نشے میں اپنے جرم کی سنگینی کا احساس نہ کر سکا اور دھت ہو کر وہیں سو گیا۔

میڈیکل ٹیسٹ سے یہ بات ثابت ہوئی تھی کہ بختیار بہت زیادہ پی گیا تھا اور جو شراب اس نے پی تھی، وہی شبانہ کے معدے میں بھی پائی گئی تھی۔ کمرے کی تپائی پر شراب کے دو گلاس بھی ملے تھے جن میں سے ایک پر شبانہ کی انگلیوں کے نشانات اور لپ اسٹیک کے داغ تھے جبکہ چاقو کے دستے پر بختیار کی ساری انگلیوں کے نشانات تھے۔ بختیار کو جب گرفتار کیا گیا تھا، اس وقت بھی اس کے ہاتھ شبانہ کے خون میں لتھڑے ہوئے تھے۔

بختیار کے بہت زیادہ پیے کی وجہ سے تائی گئی تھی کہ

شادی کے دو دن بعد ہی کوئی جھگڑا ہونے پر اس کی بیوی اسے چھوڑ کر اپنے باپ کے پاس چلی گئی تھی۔ گواہی کے لیے فروزاں کو بھی عدالت میں پیش ہونا پڑا تھا۔ اس نے جھگڑے کی وجہ ذاتی بتاتے ہوئے اس کے اظہار سے گریز کیا تھا لیکن یہ بات صاف صاف کہہ دی تھی کہ اس جھگڑے کا شائد سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

محلف وکیل نے یہ قیاس بھی کیا تھا کہ گفتار، شائد کے بچے کا باپ نہ سکی مگر ان دونوں میں تعلقات ضرور تھے۔ بارہ بجے سے کچھ دیر پہلے فون پر ان دونوں کا رابطہ ہوا تھا، بختیار نے رات گزارنے کے لیے اسے اپنے گھر بلایا ہوگا اور رات بھر وہاں رہنے کے ارادے ہی کے باعث شائد اپنی کار کے بجائے ٹیکسی سے وہاں پہنچی تھی۔

پولیس کو وہ ٹیکسی ڈرائیور بھی مل گیا تھا جس نے شائد کو اپنی ٹیکسی سے بختیار کے پارکمنٹ کے سامنے اتارا تھا۔ بختیار اس کے علاوہ کوئی بیان نہیں دے سکا کہ وہ بہت زیادہ نشے میں تھا جب کوئی لڑکی اس کے پارکمنٹ میں آئی تھی۔ وہ نشے کے باعث اسے پہچان بھی نہیں سکا تھا۔ شراب اس کے پاس کہاں سے آئی؟

عدالت کے اس سوال کے جواب میں بختیار نے اپنے دوست رندھاو کو ٹوٹ کر نادوستی کے آداب کے مطابق بگھنے ہوئے یہ بات شائد ہی پر ڈال دی تھی۔ "مجھے علم تھا کہ وہ شراب پیتی تھی۔ بختیار نے کہا تھا کہ میری عمر بٹش پر وہ شادی کی مجھے زیادہ دیکھ کر شراب پیتی تھی۔"

بختیار کے بیان کی وجہ سے محلف وکیل نے اس قیاس کو حتمی قرار دیا۔ ان دنوں میں ناچار تعلقات تھے۔ بختیار کی رہائی میں اختیار وکیل قید کی سرپرستی میں تھی۔

پولیس جب اسے عدالت سے لے جا رہی تھی، فروزاں نے اسے روک کر اس سے مطالبہ کیا کہ وہ اسے حلاق دے دے کیونکہ وہ عمر بھر اس کے انتظار میں بیٹھی نہیں رہ سکتی۔

بختیار نے اس کو جواب دیا تھا کہ حلاق دینا کوئی ہنس کھیل نہیں کہ کھڑے گھاٹ دے دی جائے لیکن فروزاں اس پر رڑکی تھی کہ تین مرتبہ طلاق کا اعلان کر دیا جائے تو طلاق ہو جاتی ہے۔

بختیار کے خیال کے مطابق اس طرح طلاق نہیں

ہو سکتی تھی لیکن جب ان کی باتوں کو سن کر لوگ جمع ہونے لگے اور دوسری طرف پولیس بھی سے وہاں سے لے جائے کے لیے بے چارے بھی ہتھیار ختم کرنے کے لیے اس نے صرف اتنا کہا کہ "تم جو پاؤ ہو بھوکو میری طرف تو پرکھو پاندی نہیں ہے" اور اتنا کہ وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا تاکہ بات مزید نہ بڑھ سکے۔

عدالت سے وہ مل پہنچی گیا جہاں اسے دس دن سے زیادہ نہیں گزارنا پڑے۔ نامعلوم جرائم پیشہ افراد نے جیل توڑی تو بختیار کو بھی وہاں سے بھگتے کا موقع مل گیا۔ چھپتے چھپتے پولیس سے بچتے، اس نے غریبوں کی ایک نواچی ہستی میں قدم رکھا اور وہاں سے پروین کے گھر میں پناہ مل گئی۔

بیس دن گزر گئے "بختیار کے پاس خاصی تیزی سے بڑھتے تھے۔ ان دنوں اس کے سر کے بالوں کے ساتھ شیعہ بھی اکتا پڑھا کہ فزحی معلوم ہونے لگی اور سوچیں بھی تھیں خاصی ہو سکیں۔ ابتدا کی دنوں میں بختیار چند روز کے لیے بن رہی تھی۔ سو گیا تھا۔ عدالت کے لیے گھر سے لکھا اس نے منہ سب نہیں سمجھا تھا۔ کچھ دنوں کے نام اسے یہ تھے نورین۔ اسے قریب کے کسی میاں گل اسٹور سے لکھی تھیں۔ اس کے یہ اوقات بھی پروین ہی پر رہ کر رہی تھی۔

تین دو ایک۔ تو اپنے گھر سے تھک کر ستر پر چرائی تھی کھیت مانی ہوئے ہی تھی۔ رہاں جیتے رہاں لڑنے لگا تھا۔ اسے اپنی آنکھوں سے اسے ایسا جتنا اٹھائی دینے لگی تھیں جو ان کے شام بھی نہیں دیکھیں۔ پھر ایک بار یہ بھی ہو کہ اسے فزحی سے مل گئی۔

فروزاں اس کے سر سے تھک چکی تھی اور اس سے فروزاں کو اپنی آغوش میں چھتے یا تھا۔

پھر جب اس کا بخیر تر تو وہ سب کچھ سے کر خوب کی طرح یاد تھا۔ "میں تم لوگوں کے سپاہی اعتبار سے بھی بے بیزار کر رہ گیا ہوں۔" بختیار نے پروین سے کہا تھا۔ "لیکن جب بھی میں اپنے حالات درست کر سکا، واپس آ کر سب کچھ ادا کروں گا۔"

"میں اخراجات پورے کرنے کے لیے سلائی زیادہ کرنے لگی ہوں۔" پروین کی آواز معمول کے مطابق پٹاٹ تھی۔ "تھوڑا بہت جوز کے بھی رکھا تھا جو ہمارا تھا۔ آپ

اس کے لیے پریشان نہ ہوں۔" بیماری کے ان دنوں میں پروین نے اس کا خیال بھی بہت رکھا تھا۔ اس کے کھانے کے لیے ملکی غذا میں بھی تیار لی تھیں۔ اس کے رہنے کے لیے وہ مراغھم کر دیا گیا تھا جہاں سید خاندان بھی تھے مگر ان دنوں میں اس نے اپنا ٹھکانا اسی کمرے میں کر لیا تھا جہاں ساری مشینیں لگی تھیں۔ اس طرح پڑے سلائے والی عورتوں کو اس سے بچنے کے لیے اس کمرے میں آنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی جہاں آسیہ خاں اپنا دن کا وقت گزارا کرتی تھی۔ رات کو تو وہ دونوں ماں بیٹی محکم ہی میں سو یا کرتی تھیں۔

ایک سو دن بختیار نے فیصلہ کیا کہ وہ رات کے اندھیرے میں یہاں سے نکل جائے گا۔ اس نے پروین کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا۔

"میں دل پندرہ دن بعد ضرور واپس آؤں گا۔" اس نے مزید کہا۔ "تم نے مجھ پر جو احسان کیا ہے، اس کا سلسلہ تو نہیں دیا جاسکتا، میں تم دونوں ماں بیٹی کے لیے جو کچھ بھی کر سکا ضرور کروں گا۔"

"آپ کچھ کریں یا نہ کریں، آئیے گا ضرور۔ آپ مجھے یاد رہیں گے۔" آخری فقرہ کہتے ہوئے پروین کی نظریں جھک گئی تھیں۔ بختیار نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس وقت بھی پروین کے چہرے پر یہ قسم کے تاثرات نہیں تھے۔ اس کا آخری فقرہ لکھ کر ہی رکھتا تھا۔ بختیار کے دماغ میں بہت سے باتیں چل رہی تھیں۔

"یہاں سے وہ سب قریب سے جہاں سے اس وقت سے۔ پروین نے بڑھاپے سے نظریں اٹھا کر کہا۔ "جب میں اس وقت میں آیا تھا تو وہاں اس کی پوجا تھی۔" "تیرا رہا ہے ایسا۔ اس نے یہ رکھ لیا۔" اس نے اس کے دونوں نکال کر بختیار کی طرف بڑھا دیے۔

بختیار نے اب تک عقد چھو نہیں یا تھا۔ اب بھی اس کا ہاتھ آگے نہ بڑھ سکا تو پروین نے وہ نوٹ اس کے قریب رکھ دیے ورتیزی سے چلتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

رات کا اندھیرا پھیلے جب دو گھنٹے گزر چکے تو پروین، بختیار کے ساتھ بیرونی دروازے پر پہنچی۔ طے پایا تھا کہ پروین دروازہ کھول کر باہر دیکھے گی اور جب گلی میں سنا ہوگا تو اس کا اشارہ ملے ہی بختیار باہر نکل جائے گا۔ پروین تو ایسا وہ خود بھی نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اسے اس گھر سے نکلے دیکھے۔

"خدا حافظ۔" پروین کی توڑتھنی تھنی ہی تھی جب

بختیار اس کا اشارہ ملنے ہی تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔ اس کے دماغ کو ہلکا سا جھٹکا گا۔ پروین کی آواز کا وہ گھٹا گھٹا انداز اس کے جذباتی ہوجانے کا مظہر تھا۔ بختیار کا۔ بن اس سواں میں لکھ گیا کہ پروین سے رخصت کرتے ہوئے جذباتی کیوں ہو گئی تھی؟ بختیار کو اس کی یہ بات بھی یاد تھی کہ وہ سے یاد رہے گا۔

بختیار واپس ہوا کہ وہ سیدھی سادی لڑکی اسے پسند کرنے لگی تھی، یا اس کی پسندیدگی محبت کی حدوں کو چھونے لگی تھی۔

اگر واقعی ایسا ہے تو اس میں کچھ زیادہ تعجب کی بات نہیں، بختیار آگے قدم بڑھاتے ہوئے سوچتا رہا۔ جب کوئی نوجوان لڑکا یا لڑکی زندگی میں پہلی مرتبہ جنس مخالف کے قریب ہوتے ہیں تو اسی کو پسند کرنے لگتے ہیں اور پروین ایک ایسی ہی سیدھی سادی لڑکی تھی جو اپنی زندگی میں پہلے کبھی کسی مرد کے اتنا قریب نہیں رہی ہوگی۔

بختیار نے اپنے دل میں پروین کے لیے ہمدردی محسوس کی اور ایک ٹھنڈی سانس لی۔

سامنے سے وہ آدمی آ رہے تھے۔ بختیار خود کو ان کی طرف سے بے پروا ظاہر کرتے ہوئے آگے بڑھتا رہا۔ اس نے بس کن انکھیاں سے دیکھا تھا کہ وہ دونوں اسے غور سے دیکھتے ہوئے گھر سے تھے۔ غائب اس ہستی میں رات کے وقت کی بھٹی کا تر نہیں ہوتا ہوگا۔ دوسرے بختیار کی وضع قطع بھی وہاں کی ہی تھی۔ اس کے ہاں حالت بڑھتے ہوئے تھے۔ باڑھی سا چھین بھی ترشی ہوں نہیں۔ بختیار اس آدمی کو دیکھا۔ اس نے باڑھی اور اس کے بالوں میں شام کا رنگ بھی کر لیا تھا۔

بڑک چھپنے کے بعد اس سے جوں آتی، بھٹی، ہی ہو ہاتھ اس کے روتے ہوئے اس میں رہا ہو گیا۔ اس میں بچہ ہی مسافر تھے۔ انہوں نے بھی اسے غور سے دیکھا۔ بختیار کو یہ یقین تھا کہ اسے "مفرد قیدی" کی حیثیت سے شامت نہیں کیا جائے گا لیکن اسے مشکوک شخص سمجھا جاسکتا تھا۔ اگر اس میں ٹنگ پوئس کا کوئی آدمی سادہ لباس میں موجود ہوتا تو وہ بختیار کے لیے سی پریشانی کا سبب بن سکتا تھا۔

لیکن ایسی کوئی صورت پیش نہیں آئی اور بس جب شہر کے ماروتے عورتوں میں، اٹل ہوئی تو بختیار ان سب مقدمات کو بچھنے لگا۔

ایک جگہ وہ اس سے تر گیا۔ وہاں سے رندھاو کا

چاہتی ہیں۔ خالو کو بھی رنج تو ہوا ہے۔ تم نے اچھا کیا جو وہاں کا رخ نہیں کیا۔ جیل سے تمہارے فرار کے بعد پولیس کو خیال تھا کہ تم وہاں پہنچو گے پولیس نے دس بارہ دن تک وہاں کی کڑی نگرانی کی ہے اور کچھ تعجب نہیں کہ خفیہ طور پر اب بھی ہو رہی ہو۔“

”تمہارے دوست جمال کو تو معلوم ہو سکتا ہے۔“
 ”اگر وہ معلوم کرنا چاہے۔“ رندھاوا نے جواب دیا۔
 ”لیکن ہم دونوں ہی نے اس کی ضرورت نہیں محسوس کی۔ پولیس کو خواہ مخواہ کیوں معلوم ہو کہ سی آئی ڈی کا کوئی افسر اس معاملے میں دلچسپی لے رہا ہے۔“

”نختیار! ثبات میں سر ہلا کے کچھ سوچتے لگا۔“
 رندھاوا نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
 ”فروزاں سے ملنے کے بارے میں تو نہیں سوچ رہے ہو؟“
 ”سوچ تو رہا تھا لیکن..... تمہاری باتوں کے بعد.....“ نختیار نے اپنی بات پوری نہیں کی۔
 ”ہاں۔“ رندھاوا نے کہا۔ ”فی الحال اس کا خیال ذہن سے نکال دو اور اطمینان سے یہاں رہو۔“

”اطمینان سے!“ نختیار پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔
 ”یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میرے گھر والے بھی ادھر اس وقت تک نہیں آتے جب تک میں نہ لاؤں۔ یہاں ہاتھ روم بھی ہے۔“ رندھاوا نے ہاتھ روم کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ ”کل میں تمہارے لیے مناسب لباس بھی خرید لاؤں گا۔ اب تمہیں آرام کرنا چاہیے۔ تم غڈ حال نظر آ رہے ہو۔“

”کھاتے کے بعد واقعی خود کو غڈ حال محسوس کر رہا ہوں۔“
 ”ڈاڑھی اور سر کے بال بڑھا کر تم خاصے بدل گئے ہو لیکن مناسب ہوگا کہ یہ مناسب انداز میں ترشوائے جائیں۔ بے تحاشا بڑھی ہوئی ڈاڑھی مونچھوں کی وجہ سے تم کسی کی نظر میں مشکوک ہو سکتے ہو۔“
 ”کسی ہیئر ڈریسر کے پاس جانا بھی تو ٹھیک نہیں رہے گا۔“

”میں تمہیں کل دن میں تو نہیں لیکن کچھ اندھیرا پھیلنے کے بعد کسی فٹ پائمنی تائی کے پاس لے چلوں گا اور کل دن میں جب تمہارے لیے کپڑے لاؤں گا تو ایک چشمہ بھی خرید لاؤں گا۔ چشمے کی وجہ سے تم اور بدلے ہوئے نظر آؤ گے۔ اب تم آرام کرو۔“

اس کمرے میں صوفی سیٹ کے ساتھ ایک دیوان بھی تھا۔ کیونکہ گرمیوں کے دن تھے اس لیے کبل وغیرہ کی

ضرورت نہیں تھی۔

ایک طرف چھوٹے اسکرین کا ٹی وی بھی رکھا تھا۔ رندھاوا نے اسے آرام کرنے سے پہلے پانی کا فلاسک جسے اورنگ لاس رکھ دیا۔ ایک ٹکیہ اور چادر بھی آوی جبکہ گرمی کے اس موسم میں چادر کی ضرورت نہیں تھی۔

نختیار جب لیڈ دیگر بہت سے خیالات کی طرف کے دماغ میں یہ بات بھی تھی کہ باغی میں وہ بھی کسی جہاز جانتا تھا اور اس نام سے اس کی قربت بھی رہی تھی۔ نختیار کے دماغ میں آنے والے دوسرے خیالات زیادہ کبیر تھے اس لیے جمال کا خیال ان خیالات میں دب گیا۔
 دوسری صبح وہ معمول کے مطابق جلدی جا گا۔

رات کو ایر سے سویا تھا۔
 رندھاوا نے ناشتا اس کے ساتھ اسی کمرے میں کی۔ اس نے اپنے گھر والوں کو بتایا تھا کہ اس کا کوئی دوپٹہ بیرونی شہر سے آیا ہے اور چند دن وہیں رہے گا۔ اس دوران میں گھر کا کوئی فرد اس طرف نہ جائے۔

ناشتے کے دوران میں طے پائے والے پروگرام کے تحت رندھاوا صرف ایک گھنٹے کے لیے بینک گیا۔ کوئی ایمر جیسی ہتاکر چند دن کی چھٹی لے لی۔ جب وہ واپس لوٹا تو اس میں سب چیزوں سے بھرا ہوا تھا جو نختیار کے لیے موزوں تھے۔ ان میں ایک فاما پائل فون بھی تھا جس کی سم اس نے اپنے ہی نام سے اپنی ویٹ کروائی تھی۔

”جمال نے آج ڈی این اے ٹیسٹ کے لیے آدمیوں کا خون لے لیا ہے۔“ اس نے کھانے کے دوران میں بتایا۔

نختیار سر جھٹک کر بولا۔ ”میری بھج میں نہیں۔“ تاکہ کوئی بھی شخص اپنا خون دینے کے لیے کیسے تیار ہو سکتا ہے جب تک اس پر قانون کا دباؤ نہ ہو۔

”راہ چلتے کسی کے ہن چھو دینا کوئی مشکل کام ہے؟“ رندھاوا مسکرایا۔
 ”کیا مطلب!“

”اور جب ہن چھو تو ہلکی سی سسکاری لے کر ادھر ادھر دیکھتے ہو اس شخص کو معلوم بھی نہ ہو سکے کہ اسے ہن کرنے نے چھوئی تھی تو۔“

”تم سیلیاں بچھا رہے ہو۔“
 ”دراصل اب رافٹورمنٹ اینجنیئریں میں کچھ آدمیوں کو اس کی تربیت بھی دی جاتی ہے۔“ رندھاوا نے بتایا۔ ”ان کے لیے مخصوص قسم کی بہت چھوٹی سرنگ مانی

آخری مرحلہ

جاتی ہیں۔ اس سرنگ کے نکلنے سے آدمی کو پس اتنا محسوس ہوتا ہے کہ اسے ہن چھپی ہے۔ یہ کام کرنے والے کو بڑی پھرتی کا ثبوت دینا پڑتا ہے۔ اس کی ضرورت اسی لیے محسوس کی گئی کہ جس پر قانون کا دباؤ نہ ڈالا جاسکے، اس کا خون بھی لے جائے۔“

”اوہ!“ نختیار کے منہ سے اتنا ہی نکلا۔
 ”بال کے ٹکے میں بھی ایسی مہارت رکھنے والے موجود ہیں۔ انہی میں سے ایک کو جمال نے اپنے اعتماد میں لے لیا ہے۔“
 اب بات نختیار کی سمجھ میں آگئی تھی۔

”جمال نے ایسے آدمیوں کی فہرست تیار کر لی ہے جن سے شبانہ بے تکلف تھی۔“ رندھاوا نے مزید بتایا۔ ”وہ کہہ رہا تھا کہ اگر ان سب میں سے کوئی مطلوب شخص نہ ملا تو پھر وہ ان لوگوں کو بھی دیکھے گا جن سے شبانہ کے تعلقات یہی سرکاری سے نظر آتے ہیں۔“

دفعۃً نختیار کے دماغ میں ایک جھماکا سا ہوا۔ وہ جلدی سے بولا۔ ”تمہارے اس دوست جمال کے والد کا کیا نام ہے؟“

”کیوں؟“ رندھاوا حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”میں رات سے ہی سوچتا رہا ہوں کہ باغی میں اس نام کا مجھ سے گہرا تعلق رہا ہے۔ ابھی تم نے باتیں کرتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ آٹھویں جماعت سے میٹرک تک ایک لڑکا جمال میرا کلاس فیلو تھا۔ اس سے میری خاصی جتنی تھی۔

پھر وہ پڑھنے کے لیے باہر چلا گیا تھا۔ اس کے بعد وہ جو کہتے ہیں تاکہ آنکھ اوچھل، پہاڑ اوچھل..... تو بس وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسکول کے زمانے کی بہت سی باتیں یاد نہیں رہیں۔ میں اس جمال کو بھی بھول گیا۔ شاید وہ بھی مجھے بھول چکا ہوگا لیکن یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ تمہارا دوست جمال واقعی جمال ہوگا جو میرا کلاس فیلو رہا تھا۔ اگر تم اس کے والد کا نام بتا دو تو بات واضح ہو جائے گی۔“

”مجھے اس کے والد کا نام نہیں معلوم۔“ رندھاوا نے جواب دیا۔ ”لیکن اس کی تصویر میرے موبائل میں موجود ہے۔“

”دیکھو۔“ نختیار نے بے تابی سے کہا۔
 رندھاوا نے اپنے ہی اپن موبائل نکال لیا تھا۔ اس سے تصویر نکھائی۔
 ”وہی“ نختیار پر حیرت ہوئی۔ ”یہ وہی ہو سکتا ہے۔“

اگرچہ برسوں پرانی بات ہوگئی لیکن اس کے نقش و نگار بتا رہے ہیں کہ یہ وہی ہے۔ تم اس سے اس کے والد کا نام پوچھو۔ مجھے تو یہ ہی معلوم ہوتا ہے۔“
 ”نام تو میں پوچھ لوں گا لیکن اگر یہ وہی ہوا تو کیا تم اس سے ملو گے؟“

نختیار کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ وہ بڑبڑانے والے انداز میں بولا۔ ”یہ سب کچھ میں نے ابھی نہیں سوچا۔ وہ اب ایک سرکاری آفیسر ہے اور میں جیل سے بھاگا ہوا ایک قیدی! میں یہ اندازہ بھی نہیں لگا سکتا کہ اب میرے لیے اس کے جذبات کیا ہوں گے۔“

”نام تو آج میں کسی بھانے پوچھ لوں گا۔“
 رندھاوا چپ ہوا ہی تھا کہ اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ رندھاوا نے اسکرین پر نظر ڈالی اور تیزی سے بولا۔
 ”یہ جمال ہے، میں اسے تکران کر دیتا ہوں۔ اس کی آواز سن لو۔ اتنے برس گزر جانے کے بعد آواز میں بھی کچھ تبدیلی تو آتی ہے لیکن.....“

دوسری مرتبہ گھنٹی بجی۔ رندھاوا نے بات ادھوری چھوڑ کر کال ریسیو کی۔ ”ہیلو جمال!“ اس نے کہا۔
 ”تم جس پر زیادہ شبہ کر رہے ہو، وہ تو آج آگیا ہے۔“ اسے تکرار سے آتی ہوئی آواز نختیار نے بھی سنی۔
 ”کنوٹر ٹھیکین؟“ رندھاوا نے چونک کر پوچھا۔
 ”ہاں۔“

نختیار کا جسم سٹنا گیا۔
 اسے تکرار سے جمال کی آواز آرہی تھی۔ ”اس نے ایک صحافی کو فون کر کے بتایا ہے کہ وہ ایک نئی کام کے سلسلے میں نہایت خاموشی سے کہیں چلا گیا تھا مگر اس کی عدم موجودگی میں یہاں افواہیں پھیل گئیں کہ اسے کسی کی طرف سے اپنی جان کا خطرہ محسوس ہو گیا تھا جو قطعی غلط ہے۔ اس نے سختی سے اس بات کی تردید کی ہے۔“

”خیر! جو کچھ بھی ہو۔“ رندھاوا نے کہا۔ ”اس کا ڈی این اے ٹیسٹ بہت ضروری ہے۔“

”وہ تو تم بتا چکے ہو۔“ انہیں اسی پر زیادہ شبہ ہے لیکن اس کے معاملے میں یہ کام آسان نہیں ہوگا۔ جب سے اس نے سیاست میں قدم رکھا ہے، عام لوگوں میں مکمل مل جانا اس نے چھوڑ دیا ہے۔ وہ ہڈی کا راز بہ وقت اپنے ساتھ رکھتا ہے۔
 ”کچھ دن ہوئے، میں نے اسے ایک تقریب میں دیکھا تھا۔“ رندھاوا کو نختیار کا یہ جواب آگیا۔ ”اس

اب بختیار نے سرگھا کر اس کی طرف دیکھا اور پلکیں
جھپکائے بغیر کھٹی کھٹی سی آواز میں بولا۔ "کنور فکلین کو کسی
نے گولی مار دی۔"

"کیا! رندھاوا کے منہ سے نکلا۔ اگر اس وقت اس
کے ہاتھ میں کھانے کی ٹرے ہوتی تو یقیناً گر جاتی۔
فکلین نے اسے ہر رنگ میوز کے بارے میں بتایا۔
ذرا دیر بعد خبروں کا وقت تھا۔ اس اثنا میں رندھاوا
نے کچھ قیاس آرائیاں کیں۔ بختیار "ہاں، ہاں" کرتا رہا۔
جانے کیوں اس کے دماغ پر شہید بوجھ بڑھ گیا تھا۔ وہ اور
رندھاوا اس وقت کھانا کھانا بھی بھول گئے تھے۔

خبروں میں بتایا گیا کہ پولیس تحقیقات میں مصروف
تھی اور ابھی وضاحت سے کچھ بتانے کے بجائے صرف
قیاس کیا جا رہا تھا کہ گولی بہت دور سے اور رائل سے چلائی
گئی تھی۔ نشانہ باز یقیناً بہت ماہر تھا جس نے زیادہ درمیانی
فاصلہ ہونے کے باوجود صرف ایک گولی چلا کر کنور فکلین کی
زندگی ختم کر دی تھی۔

خبر میں بعض لوگوں کے تجزیے بھی شامل کیے گئے
مگر ان میں سے کوئی بھی نتیجہ خیز نہیں تھا۔ یہ بات بھی گئی تھی
کہ کنور فکلین بعض لوگوں کے خیال کے مطابق اپنی زندگی
کو لاحق کسی خطرے کے باعث ملک سے کہیں چلا گیا تھا یا
روپوشی اختیار کر لی تھی لیکن دوسرا پہلو یہ بھی تھا کہ سائے
آنے کے بعد اس نے اس قسم کی باتوں کی سختی سے تردید
کی تھی۔

"برے آدمیوں کا انجام برا ہی ہوتا ہے۔" رندھاوا
نے تیسرہ کیا، پھر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "میں کھانا
دوبارہ نکلواتا ہوں۔ یہ تو ٹھنڈا ہو گیا ہوگا۔"

بختیار کچھ نہیں بولا اور رندھاوا ٹرے اٹھا کر اندر چلا گیا۔
کچھ دیر بعد وہ دونوں کھانا کھا رہے تھے۔ کھانے
کے دوران میں بھی ان کا موضوع گفتگو فکلین ہی رہا۔
رندھاوا نے یہ بھی کہا کہ اب بختیار کو فروزاں کی وجہ سے
اپنے ذہنی انتشار سے توجہ نہ مل گئی ہوگی۔

کھانے کے بعد بھی یہ باتیں جاری رہیں۔ وہ خبریں
بھی سنتے رہے۔ بارہ بجے کی خبروں میں بتایا گیا کہ پوسٹ
مارم کی ابتدائی رپورٹ سے معلوم ہوا ہے کہ گولی سر کے اوپر
لگی تھی اور ٹھوڑی کی ہڈی تک چلی گئی تھی۔ اس سے یہ نتیجہ
اخذ کیا گیا تھا کہ فائر کچھ فاصلے کی کسی عمارت کی اوپری منزل
سے کیا گیا تھا۔ دور مار رائل کی ساخت کے بارے میں بھی
کچھ اندازے لگا لیے گئے تھے اور دو عمارتوں کو مشتبہ سمجھا

جا رہا تھا۔ خبروں میں ان عمارتوں کی نشاندہی نہیں کی گئی تھی۔
تفتیش کا سلسلہ جاری تھا۔

دوسرے دن رندھاوا دس بجے کے قریب بختیار سے
ملنے چلا گیا۔ اسے کسی پہانے جمال سے اس کے والد کا نام
معلوم کرنا تھا لیکن اس وقت تک بختیار یہ نہیں سوچ سکا تھا کہ
اگر یہ وہی جمال نکلا جو بھی اس کا کلاس فیلو تھا تو وہ اس سے کیا
فائدہ اٹھا سکے گا۔

فروزاں اب بھی اس کے دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔
وہ اس سے بات کرنے کے لیے اس کی آواز سننے کے لیے
بے چین تھا۔ اسے ہچکچاہٹ یہ بھی کہ فروزاں اس سے نہ
جانے کس طرح بات کرے۔ کنور فکلین کا قتل کم از کم
کے لیے تو غم ناک ہی ہونا چاہیے تھا۔

خاصے مذہب کے بعد بختیار نے تمام منفی خیالات
دہن سے نکلنے اور مثبت فون پر فروزاں سے رابطہ قائم کیا۔
دوسری طرف کئی مرتبہ کھٹی کھٹی جی لیکن بال ریسو نہیں کی
گئی۔ بختیار سوچنے لگا کہ فروزاں شاید ایک اجنبی صبر سے
نے والی کال ریسو کرنا منہ سب نہ سمجھ رہی ہو۔

بختیار سو بائیں کان سے لگائے رہا۔ وہ خود بخود قطع
کرنے کے بجائے دوسری طرف سے رابطہ منقطع کرنے کا
انتہا کرنا چاہتا تھا لیکن یہ نہیں ہوا۔ آخر دوسری طرف
سے کال ریسو کر لی گئی۔

"ہیلو! فروزاں کالج بہت مرجھایا ہوا سا تھا۔
"کیسی ہو فروزاں؟" بختیار یہ مشکل بول سکا۔

دوسری طرف سے جواب نہیں آیا۔ فروزاں وہ خود
رہ گئی ہوگی۔ اسے بالکل توقع نہیں ہوئی۔ بختیار اسے فون
کرے گا۔

"میں بختیار بول رہا ہوں فروزاں! "
"تم! " فروزاں کی آواز کانپ گئی۔

"مجھے کیا یہ امید رکھنا چاہیے کہ تم مجھے
شہید کا قاتل سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہوگی۔" بختیار رک رک
کر بولا۔

"تم نے میرے " اتنا کہنے کے بعد فروزاں کی
آواز رندھ گئی۔ "زخموں پر نمک چھڑکنے کے لیے فون
کیا ہے؟"

"یہ بات نہیں فروزاں! " بختیار نے جدی سے کہا۔
"میں تمہاری آواز سننے کے لیے بے قرار تھا۔"

"تم تم " فروزاں کے لہجے میں غم کے ساتھ
غصہ بھی تھا۔ "تم ہی نے میرے کنور کو بھی قتل کیا ہوگا

لیکن اس طرح تم مجھے دوبارہ تو حاصل نہیں کر سکو گے۔ تم
مجھے آزاد کر چکے ہو۔"

"میں نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا لہذا وہ مطلق نہیں ہوئی
ہے۔" بختیار نے زور دے کر کہا۔ "اور یہ بھی تم غلط سمجھ رہی
ہو کہ کنور کو میں نے قتل کیا ہوگا۔"

"جموٹ مت بولو۔" فروزاں ہنسنے لگی۔

"فروزاں! " بختیار نے افسردگی سے کہا۔ "میں
نے ایڈرندگی میں وہی چھوٹا مونا بختیار بھی آپ ہاتھ
میں نہیں لیا۔"

"پولیس تم سے سب کچھ معلوم کر لے گی۔" فروزاں
کی آواز سے ظاہر ہوا، جیسے وہ رو بھی رہی ہو اور غصے سے
دانت چیس رہی ہو۔ "تم ہمیشہ قانون کے ہاتھوں سے دور
نہیں رہو گے۔"

"میں قسم کھاتا ہوں فروزاں

"شٹ اپ بے رحم انسان! " فروزاں چیخ پڑی اور
ساتھ ہی اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

بختیار کو فروزاں سے اتنی محبت تھی کہ اس نے آنکھوں
میں آنے والے آنسوؤں پر تو کسی طرح قابو پا لیا مگر اس کا
درو پڑا۔ اب وہ بچتا بھی رہا تھا کہ اس نے فرور سے
بٹل کیا۔ اسے سارے معاملات درست ہو جانے تک صبر
کرنا چاہیے تھا۔

رندھاوا لگ بھگ دو گھنٹے بعد واپس لوٹا۔ وہ خاصا
پر جوش نظر رہا تھا۔

"کھیل اب ختم ہی سمجھو۔" وہ چھوٹے ہی بولا۔
"کیا مطلب! "

"جمال سے مجھے جو کچھ معلوم ہوا ہے، وہ میں تمہیں
ترتیب سے بتاتا ہوں۔" رندھاوا نے بیٹھے ہوئے کہا۔
پولیس کو تمہاری تلاش تو ہے ہی لیکن وہ یہ بھی جانتا چاہتی
ہے کہ وہ شخص کون ہے، شبانہ جس کے بچے کی ماں بننے والی
تھی۔ جب تم پولیس کی حراست میں تھے، اس وقت تمہارا
ای این اے تو لے لیا گیا تھا۔ اس رپورٹ سے یہ بات
ثابت تھی کہ اس بچے کے ذمے دایرہ نہیں تھی۔ پولیس کو
اس بچے کے باپ کی تلاش اس لیے تھی کہ

"تھی؟ " بختیار جدی سے بولا۔ "کیا نہیں ہے؟"

"تم پوری بات تو سنو! " رندھاوا نے کہا۔ "سوچو یہ
بارہا تھا کہ اگر اس بچے کے باپ کا پتا چل جائے تو ممکن ہے
کہ شبانہ کے قتل کے پس منظر میں کچھ اور گتیاں بھی سامنے
آئیں۔ اس سوچ سے اس معاملے میں گھبراہٹ پیدا ہو گئی تھی

اس لیے کل یہ سارا کیس پولیس سے ہی آئی ڈی کو منتقل کر دیا
گیا تھا۔ جمال نے کوشش کر کے یہ کیس اپنے ہاتھ میں لے
لیا۔ دراصل اب تک جمال کو تمہارے بارے میں تفتیش
بہت رازداری اور احتیاط سے کرنا پڑ رہی تھی۔ اس کیس کی
قاتل ہاتھ میں آجاتے کے بعد وہ آزادانہ طور پر کام کر سکتا تھا۔
چنانچہ اسے جو ایک شہ تھا، اسے یقین میں بدلنے کے لیے وہ
کل رات ہی کارروائی کر چکا تھا۔

"یعنی؟ " بختیار نے بے بسی سے پوچھا۔

"صبر سے نہیں سن سکتے۔" رندھاوا ہنسا۔ وہ بہت
خوش تھا۔ اس نے کہا۔ "دراصل جمال کے دماغ میں یہ
بات آئی تھی کہ شبانہ کا قاتل دروازہ استعمال کرنے کے
بجائے کوئی اور طریقہ اختیار کرے تو وہ کیا ہو سکتا ہے۔ اس
طرح اس کا دھیان اپارٹمنٹ کی بالکونی کی طرف گیا۔ اس
نے سڑک پر کھڑے ہو کر بالکونیوں کا جائزہ لیا۔ بالکونی

استعمال کرنے کے لیے نیچے سے رسی کا پھندا اوپر پھینکا
جا سکتا ہے۔ اگر وہ کسی جگہ چھس جائے تو رسی کے سہارے
اوپر چڑھا جا سکتا ہے لیکن تمہارا اپارٹمنٹ تیسری منزل پر
ہے اس لیے یہ طریقہ اختیار کرنے کا امکان معدوم سمجھو۔

دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ تمہارے اپارٹمنٹ کے اوپر
کے اپارٹمنٹ کی بالکونی سٹش کی جائے۔ کیونکہ وہ عمارت
چار منزلہ ہے، اس لیے چوتھی منزل کے اپارٹمنٹ کی بالکونی
میں رسی باندھ کر تمہارے اپارٹمنٹ کی بالکونی میں اترا
جائے، درجہ وہیں سے واپسی ہو سکتی ہے اسی صورت میں ممکن

ہے جب اس اپارٹمنٹ میں رہنے والے یا رہنے والا قاتل
کا ساتھ دے۔ جمال نے تحقیقات کر لی تھی کہ اس
اپارٹمنٹ میں رہنے والی فیملی ایسی نہیں جو کسی جرائم پیشہ کا
ساتھ دے۔ اس کے بعد تیسرا راستہ یہ رہ جاتا ہے کہ
تمہارے اپارٹمنٹ کے برابر کا اپارٹمنٹ استعمال کیا جائے
اور اس کی بالکونی سے۔۔۔۔۔"

"ہاں۔" بختیار بول پڑا۔ "وہ اپارٹمنٹ خالی بھی
تھا۔"

"جمال نے سڑک پر کھڑے ہو کر اسی بات کا
جائزہ لیا۔ اس عمارت کے بلڈز یا لیٹر کی شان میں
قصیدہ پڑھنے کو بھی چاہتا ہے۔ ایک اپارٹمنٹ کی بالکونی
سے برابر کے اپارٹمنٹ کی بالکونی تک جانا مشکل تو
کیا، خاصا آسان ہے۔"

"تو قاتل نے وہی راستہ اختیار کیا؟"

"ہاں۔" رندھاوا نے جواب دیا۔ "جمال نے

اشارہ نہیں ملا تھا کہ شبانہ کے قتل میں بھی کنور فطین کا ہاتھ ہونے کے امکان کا جائزہ لیا جا رہا تھا۔

”اُنی خبر آ جانا بھی میرے حق میں بہت اچھا ہوا۔“
 اختیار نے مسکرا کر کہا۔ ”اب فریڈرک کی کہیں تک جاؤ گی۔ وہ جان لے گی کہ میں نے اسے کنور ٹھکانے کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا، اس سے کہیں زیادہ کی بات ہے۔ اگر یہ سب یہ خبریں لی ہوگی تو اب وہ کچھ پر نہیں ہنسنے گی۔ سب وہ مجھ پر یہ الزام نہیں لگا سکے گی کہ میں نے ہی کنور ٹھکانے کو بھی قتل کیا ہوگا۔“

”یہ الزام اس نے تم پر کب لگایا؟“ رعد عباد ا نے
نفرت سے پوچھا۔

”ابھی جب تم گئے تھے تو میں نے اسے فون کیا تھا۔“
 ”کیا؟“ رندھاوا گھبرا گیا۔ ”کیا باتیں ہوتی تھیں
 اس سے؟“

”گھبرا کیوں رہے ہو؟ اس نے تمہیں نہیں، مجھے برا ملا کہا تھا۔“

”بات کیا ہوئی تھی؟“ رند عادا نے بے چینی سے پوچھا۔

”جائے کیوں پریشان ہو رہے ہو تم؟“ بھگتیار نے سر اٹھا کر اور پھر وضاحت سے وہ ساری باتیں بتادیں جو قروڑوں سے ہوئی تھیں۔

”یہ کیا غضب کر بیٹھے تم!“ رنو حاد اپنے سر حمام لیا
پھر یکا یک کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ”اب ہمیں یہاں
بھاگنا ہوگا۔“

”کیوں؟“ مختیار حیرت سے بولا۔

”میں ابھی آتا ہوں۔“ دندھادا نے اندرونی
 اڑے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ”گھروالوں سے
 کہہ دوں، پھر نکلتے ہیں یہاں سے!“

اس سے پہلے کہ اختیار کچھ کہتا، وہ تیزی سے اندر گیا۔

مختیار پریشانی سے ٹپٹنے لگا۔ ٹی وی سے خبریں جاری
 مگر اب مختیار کی توجہ ان کی طرف نہیں تھی۔ ان خبروں
 حق کوور تعلیم سے نہیں تھا۔

رندھاواواہیں آیا تو بھی خاصا پریشان تھا۔
 "آؤ" اس نے بختیار کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی
 ۔ بڑھتے ہوئے کہ۔

" 21 "

”جیسا کہ ہے۔ چلے جاؤ گے۔“

تھی کہ سنو رٹھکین کی زندگی کو خطرہ لاحق تھا اور وہ کسی سی
غائب ہو گیا تھا اور اب جب اس کا دشمن مارا جا رہا تھا وہ
سہنے آ گیا۔

لیکن نور ظلیں کا اس حد تک متعلق ہو جاتا ہے کہ
حلقی تھی۔ سال کے دنوں کے مطابق سے دن مارا۔ اور
اس کے دشمن ہی کے گروہ کا کوئی آدمی ہوگا۔ جن منہ
عمارتوں کی بات خبروں میں آئی تھی، ان میں سے ایک
عمرت کی پشت پر کچھ ایسے نشانات تھے جس سے
اندازہ لگایا گیا ہے۔ کنوڑیٹھیں پر گولی وہیں سے چلائی گئی
تھی۔ وہاں کی مسجد پر چھ ٹھکیوں کے نشانات بھی تھے
ہیں۔ ان نشانات کو جو نم پیشہ افراد کے "اسٹور" پر
سے ملا کر دیکھا جائے گا جو پولیس کے پاس پہلے سے
موجود ہیں۔"

”یہ خبریں ابھی تک ٹی وی پر نہیں آئیں۔“

”شاید بآئیں۔“ زید حوا اپنے ریوٹ تھا سڑکی
 کی آٹ سی۔ یہ خبر شاید ابھی چھپائی جاے نہ تمہارے
 اپر ریسٹ میں یا گولی کے ذریعے داخل ہوے وہاں سے
 نظر پریش مل گئے ہیں۔ یہ خبر آئے سے وہ شخص
 ہواے گا جس نے تمہارے اپر ریسٹ میں داخل ہوے
 کے بعد تیار نہ ہوئے یہ تمہارے

مفتیس یہ کیسے تھا۔

”اس کے کھر پر بھی میں پاب رکھ گیا ہے۔ دراصل
نے بتایا۔ ”وردہاں سے کچھ معمولات حاصل ہو گیا
کے بعد اور بھی دو تین جگہ ریڈ کیا گیا ہے۔ معلوم ہوا ہے
”تین آواز سے“

زندہ دوانے بات ادا حوری بنی چھوڑ دی۔ وہ اور کھتا
 لی دی کی طرف متوجہ ہو گئے تھے جو بریکنگ نیوز کا احاطہ
 کر رہا تھا۔

وہ بریکنگ نیوز ٹیلی ویژن کے بارے میں تھا۔ وہ ایک سائنس دان تھا۔ اس خبر میں وہی سب باتیں تھیں جو پہلے کو رہنما داد سے معلوم ہو چکی تھیں، البتہ یہ بات خبروں پر عمل نہیں آئی تھی کہ کسی عمارت کی چھت سے پلنے والے فنگر پر مشعل (چشمہ) دوسرے شہر اُڑنے کے باعث یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ کمانڈر ٹھیس کو وہیں سے گولی ماری تھی۔

ان خبروں میں شبانہ کے قتل کے بارے میں کوئی شے
نہیں تھی۔ ابھی تک کسی خبر یا ادارے کو نہیں سنا۔

چھان بین کی تو معلوم ہوا کہ اس اپارٹمنٹ میں رہنے والے پندرہ ماہ قبل لاہور منتقل ہو گئے تھے۔ کسی وجہ سے انہوں نے اپارٹمنٹ نہ تو بیچا تھا، نہ کرائے پر اٹھایا تھا۔ جمال نے کسی طرح ان کا لاہور کا پتا معلوم کیا اور اپنے ایک ماتحت کو لاہور بھیجا۔ اپارٹمنٹ کے مالک سے فون پر بات پہلے ہی کر لی گئی تھی۔ وہ شریف آدمی قانون سے تعاون کرنے کے لیے فوراً آمادہ ہو گیا تھا۔ جمال کا آدمی رات کی فلائٹ سے اس اپارٹمنٹ کی جانی لے آیا۔ جمال یہ بھی کر سکتا تھا کہ اس اپارٹمنٹ کا منتقل کھولنے کے لیے چابی بنوایا لیکن ایک قانونی راستہ موجود ہوتے ہوئے غیر قانونی طریقہ اختیار کرنے کی ضرورت نہیں تھی جبکہ قاتل نے یہی طریقہ اختیار کیا تھا۔“

مختیار تیزی سے بولا۔ ”فائل اسی اپارٹمنٹ سے
میرے اپارٹمنٹ میں آیا تھا؟“

”بالکل۔“ زندہ دانت جواب دیا۔ اس کے ثبوت
میں چبے ہیں۔ وہ اپنا ٹھنٹہ بالکل خالی پڑا ہے۔ مطلب یہ
کہ سامان نام کی بھی کوئی چیز نہیں ہے۔ کئی جگہ تزیینوں
نے چائے تات لیے ہیں۔ فرش پر گرود ہے۔ اس پر حقوں
کے نشانات ملے ہیں جو بالکونی تک گئے ہیں۔ وہاں تک
جوتے تار کر بالکونی پر چڑھا تھا۔ وہاں سے تھہری بالکونی
تک ہاتھوں کے نشانات ملتے ہیں۔“

”سنو ٹیلیفون کے ہیں یا نہیں، اس کی رپورٹ ابھی“

”یہس نئی ہے۔“ زندہ عداوانے بختیار کی بات کانٹے ہوئے کہا۔ ”یہ کام آج صبح ہی تو مکمل ہوا ہے، یا شاید جمال نے مجھے بتایا نہیں۔۔۔۔۔۔ ویسے امکان یہ ہے کہ وہ نشانات کنور ثقلین کے نہیں ہوں گے۔ اگر اس معاملے میں اس کا ہاتھ ہے، تو بھی یہ کام اس نے کسی اور سے کروایا ہوگا۔“

”یہ قیاس تم نے کیوں کر لیا؟“
”کنور کھلین ایک بہت بڑا اینکسٹر تھا۔“

بختیار چونک گیا۔

مرے پہلے خفیہ حکموں کو رپورٹ ملی تھی کہ انڈر ورلڈ کے دو بڑوں میں کچھ رسا کشی ہو گئی ہے۔ ان میں سے ایک کا نام بھی معلوم ہو گیا تھا۔ پراسوں رات وہ ایک پولیس مقابلے میں مارا جا چکا ہے۔ اب یہ بات بھی معلوم ہو گئی ہے کہ وہ دوسرا آدمی کنور تھا۔“

"نہیں، لیکن یہ سب کو یاد آنا چاہیے کہ حقیقت

معاملہ صاف ہو جائے گا۔“

”آئی ایم۔۔۔ سو ری۔۔۔ رندھاوا۔“ بختیار بہت مسرور تھا۔

رندھاوا نے کار ایک شینک پڑنے کے سامنے روک کر کہا۔

”شکر ہے۔۔۔ پارکنگ کی جگہ مل گئی۔“

”اب کرنا کیا ہے؟“ بختیار پوچھا۔

”سب سے پہلے تو مجھے تمہاری فکر ہے۔“ رندھاوا

نے کار سے اترتے ہوئے کہا۔

بختیار بھی اتر آیا۔ رندھاوا نے اس کا ہاتھ پکڑا اور

تیزی سے ایک گلی میں مڑا۔ اس نے پریشانی کے عالم میں

کہا۔

”پولیس میری کار بھی تلاش کر سکتی ہے لہذا اس سے

چھٹکارا بھی ضروری تھا۔“

”تو اب؟“

وہ بہت تیزی سے چل رہے تھے اس لیے رندھاوا

جواب میں کچھ نہیں کہہ سکا لیکن اس کے عمل سے جواب ظاہر

ہو گیا۔ ان کی خوش قسمتی سے ایک ٹیکسی دوسری شاہراہ پر مل

گئی۔ رندھاوا نے اسے روک کر انگریزی میں کہا۔

”اس شہر کی سب سے خوبصورت جگہ کون سی ہے؟“

”میں انگریزی نہیں جانتا صاب!“ ڈرائیور نے

جواب دیا۔

رندھاوا کے انگریزی بولنے کا سبب بختیار کی سمجھ میں

اس وقت آیا جب ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد رندھاوا نے اس

سے کہا۔ ”اب ہم انگریزی میں اپنی باتیں جاری رکھ سکتے

ہیں۔“ پھر اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو ایک ہوٹل کا نام بتایا۔

”کیا اب ہوٹل میں قیام کرنا ہوگا؟“ بختیار نے

انگریزی میں پوچھا۔

”نہیں۔ میں اس دوران میں تم سے باتیں بھی کرتا

رہا ہوں اور سوچتا بھی رہا ہوں۔ پہلے مجھے ہوٹل ہی کا خیال

آیا تھا لیکن وہ مناسب نہیں۔ اب تمہارے لیے سب سے

بہتر جگہ تمہارا گھر ہی ہو سکتی ہے۔“

”اپارٹمنٹ؟“ بختیار چونکا۔

”نی الحال تو وہ سیل کر دیا ہے پولیس نے اس میں اس

گھر کی بات کر رہا ہوں جہاں تم نے زندگی گزار لی ہے۔“

”یعنی خالہ کا گھر؟“

”ہاں۔ اس کے علاوہ کوئی جگہ نہیں جہاں تم اس وقت

تک روپوش رہ سکو جب تک تمہارے دشمن سے یہ وار

دھم نہ جائے، ورنہ مجھے امید ہے کہ یہ دغ بہت جلد حل

جائے گا۔“

”تم نے خدشہ ظاہر کیا تھا کہ وہ اس کی فیکٹری ٹائیڈ

اب بھی بول رہی ہو۔“

”مجھے جمال سے باتوں یا خوابوں میں معلوم ہو چکا ہے

کہ ٹرائی ٹیس کی جارہی ہے۔ پولیس کا خیال ہے کہ تم اس

شہر سے ہی بھاگ گئے ہو۔ تمہاری قصہ پردہ سے شہروں کی

پولیس کو بھیج دی گئی ہے۔“

بختیار نے سنکر انداز میں سر ہلایا، پھر رندھاوا کی

طرف دیکھ کر بولا۔ ”ٹیکسی ڈرائیور کو تو تم نے ہوٹل کا نام بتایا

ہے۔“

”وہاں سے ہم دوسری ٹیکسی کریں گے۔ بہت احتیاط

کی ضرورت ہے۔“

بختیار پچھلے سے انداز میں مسکرایا۔ ”تمہیں تو جمال

کے محکمے میں ہونا چاہیے تھا۔“ پھر اس نے جلدی سے پوچھا۔

”تم نے اس کے والد کا نام معلوم کیا؟“

”ہاں میں نے کسی بہانے سے اس کا شناختی کارڈ

لے کر دیکھا تھا۔“ رندھاوا نے جواب دینے کے بعد جمال

کے والد کا نام بتایا۔

”پھر تو۔“ بختیار جو شیلا ہو گیا۔ ”یہ وہی ہے۔ میرا

کلاس فیلو۔“

”مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا بختیار۔“

رندھاوا نے کہا۔ ”اس کے مزاج میں فرض شناسی کوٹ کوٹ

کر بھری ہے۔ اس نے صاف صاف کہا تھا کہ رندھاوا، اگر

تمہارا خیال غلط ثابت ہوا اور شبانہ قاتل تمہارے دوست

نے ہی کیا ہے تو میں تمہاری خاطر بھی تمہارے دوست کے

یہ کچھ نہیں کر سکوں گا۔“ وہ مسکرایا۔ ”اسے قانون اپنی

ذات سے زیادہ عزیز ہے لیکن اب اس سے کوئی فرق نہیں

پڑتا۔ اس نے مجھ سے یہ باتیں پہلی ملاقات میں کہی تھیں۔

اب تو دوسرے اپارٹمنٹ سے ملنے والے نشانات کی وجہ

سے اس کو یقین ہو چکا ہے کہ شبانہ کے قاتل تم نہیں ہو لیکن

جب تک تم بے گناہ ثابت نہیں ہو جاتے، تمہارا روپوش رہنا

ضروری ہے۔ پولیس کو تمہارا سراغ ملے گا تو وہ تمہیں گرفتار

کر کے رہے گی۔“

”خط اب میری وجہ سے تمہارے لیے بھی ہے۔“

”میں تمہیں تمہارے گھر پہنچا کر اپنا بھی کچھ

بندوبست کروں گا۔“

”میرے ساتھ ہی رہو۔ خالہ، خالو، سبھی تمہیں

جانتے ہیں۔" بختیار نے کہا۔ "شاید آفتاب اس وقت گھر میں نہ ہو، بلکہ خالو بھی نہیں ہوں لیکن جب میں ان دونوں کو بتاؤں گا کہ تم اس معاملے میں میری مدد کر رہے ہو تو وہ بہت خوش ہوں گے۔ تمہارے وہاں روپوش رہنے پر کسی کو اعتراض نہیں ہوگا۔"

"نہیں۔ میں تمہیں چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔ تم میری فکر نہ کرو، ایک بات میں تمہیں اور بتا دوں۔ جمال نے مجھ سے کچھ کہا تو نہیں لیکن اسے شہر تو ہو گیا ہے کہ تم میرے رابطے میں ہو۔"

"شہر تو ہونا ہی چاہیے۔"

"یہ بھی ممکن ہے کہ اپنے شہر کی تصدیق کے لیے اس نے میرے گھر کی گمرانی کر دئی ہو اور وہ اب جان بھی چکا ہو کہ تم میرے ساتھ ہو لیکن اب وہ تمہارے لیے خطرہ نہیں بنے گا۔ میں نے ابھی کہا تھا کہ دوسرے اپارٹمنٹ سے ملنے والے نشانات کے باعث اب اسے یقین ہو چکا ہے کہ شبانہ کے قاتل تم نہیں ہو لہذا اب وہ اصل قاتل کے چکر میں ہوگا، جو کنور ٹھکین کے گروہ کا کوئی شخص ہو سکتا ہے۔"

"یہ بھی معلوم ہو گیا تو فروزاں مجھ سے بہت شرمندہ ہوگی۔"

ان باتوں کے دوران میں سفر طے ہو گیا۔ جیسی ہوئی کے سامنے رکی۔ دونوں اترے۔ رندھاوا نے کرایہ ادا کیا۔ پھر جب جیسی دور جا کر نظروں سے اوجھل ہو گئی تو دونوں ایک اور جیسی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہوئے۔

"خالہ مجھے اس حلیے میں پہچانیں گی کیسے؟"

بختیار بڑبڑایا۔

"جب تم سر سے ٹوپی اور آنکھوں سے چشمہ اتار کر اپنی آواز بھی انہیں سنا دو گے تو ان کا نہ پہچانا ممکن ہی نہیں۔ تمہارا ناک نقشہ تو تبدیل نہیں ہوا۔ صرف سر کے بڑے بڑے بال اور ڈاڑھی موچیں اضافی ہیں۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن وہ مجھ سے مل کر خوش ہونے کے ساتھ ساتھ پریشان بھی ہوں گی۔ ان کے ذہن میں تو یہی ہوگا کہ شبانہ کو میں نے قتل کیا ہے۔"

"احتیاطاً تم ابھی اپنا یہ حلیہ تبدیل نہ کرنا۔" رندھاوا نے مشورہ دیا۔

بختیار کا یہ خیال بالکل درست ثابت ہوا کہ خالہ نے اسے پہچان کر اپنے سینے سے تو لگا لیا لیکن چہرے پر گھبراہٹ کے تاثرات بھی ابھرے۔

"یہ تم کیا کر بیٹھے ہو میرے بچے!" وہ رندھی ہوئی سی

آواز میں بولیں۔

بختیار نے ممکنہ حد تک خالہ کو یقین دلایا کہ وہ شبانہ کا قاتل نہیں ہے اور جلد ہی اصل قاتل کا چٹا لگ جائے گا۔

خالو اور آفتاب گھر پر نہیں تھے۔ خالہ نے دونوں کو فون کیا کہ ایک ضروری کام ہے اس لیے وہ فوراً گھر آئیں۔ یہ مشورہ انہیں بختیار ہی نے دیا تھا کہ وہ انہیں اس کی آمد کے بارے میں نہ بتائیں۔ یہ مناسب نہیں تھا کہ فون پر اس کا نام لیا جاتا۔

خالو نے جواب دیا کہ وہ آدھے گھنٹے میں آ جائیں گے۔ آفتاب نے بھی جلد آنے کے لیے کہا۔ خالو آدھے گھنٹے میں آ گئے۔ بختیار کو وہی سب کچھ خالو سے بھی کہنا پڑا جو وہ خالہ سے کہہ چکا تھا۔ اس نے اپنا حلیہ تبدیل نہیں کیا اور اس کی وجہ بھی خالہ اور خالو کو بتادی۔

کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ ان تینوں نے کھانا کھایا۔ آفتاب اس وقت تک نہیں آیا تھا۔

"وہ بھی وقت پر آیا ہے جواب آئے گا۔" خالہ ناخوش گوار انداز میں بڑبڑاتی تھیں۔

کھانے کے بعد ان دونوں نے بڑی محبت سے بختیار کو آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ بختیار کو اس وقت آرام سے زیادہ تنہائی کی ضرورت تھی۔ وہ اس وقت صرف سوچنا چاہتا تھا اور اسے یہ خواہش بھی تھی کہ وہ دوبارہ فروزاں سے بات کرے۔ اسے یقین تھا کہ کنور ٹھکین کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی ہوگی۔ ممکن نہیں تھا کہ فروزاں بے خبر رہی ہو۔ اب وہ شرمندہ ہی ہوتی کہ اس نے کنور ٹھکین کے بارے میں بتائی جانے والی باتوں پر یقین نہیں کیا تھا۔

اپنے کمرے میں داخل ہو کر بختیار کو کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ گزرے ہوئے سارے واقعات اس کے دماغ میں چکرانے لگے۔ حوالات میں گزرا ہوا وقت، جیل کے شب و روز، فرار، نواتی بستی میں ٹھکانا آسیہ خالہ اور اس کی بیٹی کا گھر!

اچھی لڑکی ہے، بختیار نے پروین کے بارے میں سوچا اور فیصلہ کیا کہ حالات ٹھیک ہونے کے بعد وہ آسیہ خالہ کے گھر ضرور جائے گا اور ان ماں بیٹی کی مالی امداد میں کوئی کسر نہیں اٹھائے گا۔

گھر میں تین ٹیلی فون تھے جن میں سے ایک بختیار کے کمرے میں بھی تھا لیکن اس نے فروزاں کو فون نہیں کیا۔ ایک تو یہ کہ احتیاط اب بھی ضروری تھی، دوسرے یہ کہ بختیار

اس حوالے سے بھی تذبذب کا شکار رہا کہ فروزاں اسے شبانہ کا قاتل تو اب بھی سمجھ رہی ہوگی۔

بستر پر لیٹے اور سوچتے ہوئے بختیار کو ایک گھنٹا گزرا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ بختیار نے صرف چونکا بلکہ اس کے جسم میں مستحاثہ بھی پھیل گئی۔ اول تو اس کے شبہاؤں کا حلقہ زیادہ نہیں تھا اور جو تھے ان سے بھی توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ اس نمبر پر رینگ کریں گے۔ یہ نمبر خالہ اور خالو نے خود کسی کو بھی نہیں بتایا تھا۔

"تم جس کو چاہو، یہ نمبر بتانا۔ خالو نے اسی وقت کہہ دیا تھا جب وہ ٹیلی فون اس کے کمرے میں لگوا دیا گیا تھا۔ کئی گھنٹیاں بچ چکی تھیں جب کمرے کا دروازہ کھول کر خالہ اندر آئیں۔ "فون کیوں نہیں اٹھا رہے ہو بچا!"

"آپ دیکھیں خالہ، کون ہے۔" بختیار نے فکر مندی سے کہا۔ "مجھے ڈر ہے کہ اگر میں نے کال ریسیو کی تو کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤں۔"

یہ بات سن کر خالہ کے چہرے پر بھی تشویش کے آثار پیدا ہوئے۔ انہوں نے قریب آ کر ریسیور اٹھایا۔ "ہیلو!"

پھر دوسری طرف سے جو کچھ کہا گیا، وہ سن کر خالہ فحش چڑیں اور پھر ریسیور بختیار کی طرف بڑھاتے ہوئے بولیں۔

"تمہارا دوست ہے رندھاوا۔"

بختیار نے بے اختیار ایک لمبی سانس لی۔ خالہ اور خالو کو وہ یہ تو بتا چکا تھا کہ اس سارے معاملے میں رندھاوا اس کی امداد کر رہا ہے۔

"ہیلو رندھاوا!" بختیار نے ریسیور لے کر کان سے لگا یا۔ "میں سمجھا تھا، نہ جانے کس کا فون ہو، اس لیے ریسیور نہیں اٹھا رہا تھا۔ یقیناً کوئی خاص بات ہوگی جو تم نے فون کیا ہے۔"

"بات تو یقیناً خاص ہے۔" رندھاوا کی آواز آئی۔ "لیکن خالہ کو لگا ایک نہ بتا دینا۔ انہیں جان کر صدمہ ہوگا کہ آفتاب کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔"

"کیا!" بختیار حیرت سے تقریباً چیخ پڑا۔ خالہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

"ہاں بختیار!" رندھاوا نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "شروع سے مجھے اسی پر شبہ تھا۔ اب ثابت ہو گیا ہے شبانہ کا قتل اسی نے کیا تھا اور وہی شبانہ کے اس بچے کا باپ ہے جو اس دنیا میں نہیں آسکا۔"

"کیا کہہ رہے ہو!" بختیار کی آواز کانپ گئی۔ "نہ جانے کیوں، میں بے چین تھا کہ تمہیں یہ اطلاع

دے دوں۔ میں ایک گھنٹے بعد آ کر تفصیل بتاؤں گا۔ ابھی میں جمال کے ساتھ ہوں۔ اس نے معلوم کر لیا تھا کہ تم میرے گھر میں تھے۔ تمہارا نام سن کر اسے بھی یاد آ گیا ہے کہ اس کا کوئی کلاس فیلو بختیار بھی تھا۔ ممکن ہے کہ میرے ساتھ وہ بھی تم سے ملے آئے۔"

"اپنے کالوں پر یقین نہیں آ رہا ہے کہ۔۔۔"

"آ کر سب کچھ بتاؤں گا۔ اب تم اپنا حلیہ درست کر لو۔ ڈاڑھی موچوں کی ضرورت نہیں رہی۔"

"اچھا۔" بختیار نے مردہ سی آواز میں کہا۔ اگر اس نے ریسیور رکھا ہی تھا کہ خالہ بے چینی سے بول پڑیں۔ "کیا بات ہے بختیار! کیا بتایا ہے رندھاوا نے؟"

جو کچھ رندھاوا نے بتایا تھا، وہ خالہ اور خالو، دونوں ہی کے لیے ایک صدمہ تھا۔ آفتاب کو کسی حد تک ناپسند کرنے کے باوجود انہیں اس سے محبت تو تھی۔ آخر پال پوس کر جوان کیا تھا۔ ان کا صدمہ فطری بات تھی۔

ایک بھانجا بنا کردہ قتل کے جرم میں سزاوار ہوا اور دوسرا اسی قتل کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔

بختیار کے خالو معلومات حاصل کرنے کے لیے بھاگ دوڑ میں مصروف ہو گئے۔ خالہ مہتمم کر بیٹھ گئیں۔ ایک گھنٹے بعد رندھاوا آیا۔ بختیار نے اس دوران ڈاڑھی موچھ صاف کر کے اپنا گھریلو لباس پہن لیا تھا۔

رندھاوا نے خالہ کو مختصر طور پر کچھ بتانے کے بعد کہا کہ تفصیلات کا علم شام تک ہوگا لیکن تنہائی میں بختیار سے کہا۔ "خالہ سے وہ سب کچھ بتاتے ہوئے مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا ورنہ مجھے سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ خالہ کو کل کے اخبارات سے معلوم ہو جائے گا یا خالو آئیں گے تو وہ بتا دیں گے۔ ممکن ہے کہ کئی دی کی خبروں میں بھی بتا دیا جائے۔"

"تو تم سب کچھ جانتے ہو؟" بختیار نے بے تابی سے پوچھا۔

"جمال نے بتایا ہے مجھے۔" رندھاوا نے جواب دیا۔ "اس نے سب سے پہلے جن دو آدمیوں کا خون حاصل کر کے ڈی این اے رپورٹ لی تھی، اس سے یہ ثابت ہو گیا تھا کہ شبانہ کے ہونے والے بچے کا باپ آفتاب ہی تھا۔ یہ رپورٹ ملنے کے بعد جمال کو بڑی حد تک یقین ہو گیا تھا کہ شبانہ کو قتل بھی اسی نے کیا ہوگا۔ ہالکونی سے فکر پرش مل ہی چکے تھے۔ اس کے بعد جمال اس فکر میں تھا کہ کسی طرح آفتاب کے فکر پرش حاصل کرے۔ یہ کام بھی وہ کسی نہ کسی

میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ حالات نہیں جانا پڑے گا تمہیں ایک منٹ کے لیے بھی نہیں اجمال نے اب تک یہ بندوبست کر لیا ہوگا کہ ادھر تم اپنی گرفتاری دو، اور ادھر تمہاری ضمانت کرائی جائے۔

”گرفتاری دینا ضروری ہے؟“ بختیار پریشان ہو گیا تھا۔
”اس کے بغیر تم قانوناً ایک آزاد گھری نہیں بن سکتے۔ ضمانت کے بعد بھی تمہیں عدالت کے دو ایک چکر تو لگانا ہی پڑیں گے۔ اب اگر تم کہو تو میں فون پر جمال سے پوچھ لوں کہ اس نے تمہاری ضمانت کا بندوبست کر لیا یا نہیں۔“

”پوچھ لو۔“ بختیار نے مردہ سی آواز میں کہا۔ ”لیکن یہ بات خالہ کے علم میں ابھی نہ آئے۔ میں انہیں پولیس اسٹیشن سے واپس آنے کے بعد بتا دوں گا۔“

”یہ ٹھیک ہے، اس میں کوئی حرج نہیں۔“
”میں جلد از جلد فون پر فروزاں سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن بہتر یہی ہے کہ پہلے اس مرحلے سے گزر لیا جائے۔“
”ہاں۔ اس کے بعد تم اسے فون کرنے کے بجائے اس سے ملنے بھی جاسکتے ہو۔“

”پہلے تو میں فون ہی کروں گا۔“
”جیسا تم چاہو۔“ رندھاوا نے کہا اور موبائل پر جمال کا نمبر ملانے لگا۔

بختیار بڑبڑایا۔ ”یہ آخری مرحلہ بھی طے کر ہی لیا جائے۔“

ذرا دیر بعد وہ اور رندھاوا گھر سے روانہ ہوئے۔ خالہ سے رندھاوا نے یہاں کیا تھا کہ وہ اسی معاملے کی چھان بین کے لیے جا رہا ہے۔ خالہ پریشان تھیں۔ ان حالات میں وہ اکیلی تھیں۔ خالو ابھی واپس نہیں لوٹے تھے مگر انہوں نے بختیار کو روکا نہیں۔

پولیس اسٹیشن پہنچے، گرفتاری دینے اور وہیں موجود ایک مجسٹریٹ کے سامنے ضمانت ہونے کے بعد وہ رندھاوا کے ساتھ پولیس اسٹیشن سے نکلا۔ جمال اس وقت بھی وہاں نہیں تھا مگر فون پر اس نے بتا دیا تھا کہ انتظامات مکمل ہیں لہذا بختیار قطعاً پریشان نہ ہو۔

پولیس اسٹیشن سے نکلنے کے بعد بختیار نے رندھاوا کے موبائل فون پر فروزاں کو اپنے نام سے ایک ایس ایم ایس کیا کہ وہ اسے کال کر رہا ہے۔ پھر اس نے فروزاں کے نمبر ملائے۔ اسے دھڑکا لگا ہوا تھا کہ فروزاں شاید کال ریسیو نہ کرے مگر ایسا نہیں ہوا۔ کال ریسیو کی گئی لیکن دوسری

کہ تم نشے میں دھت ہو چکے ہو۔ اس کے بعد ہی اس نے شبانہ کو تمہارے پاس بھیجا ہوگا۔“

”نی الحال تو میں اندازہ ہی لگا سکتا ہوں۔ اس نے شبانہ کو پیٹی پڑھائی ہوگی کہ وہ تمہارے پاس جائے اور تمہیں رجھانے کی کوشش کرے۔ اگر تم نشے کی وجہ سے بہک گئے تو شبانہ بعد میں تمہیں بلیک میل کر سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ اس نے شبانہ کو اور کوئی لالچ دیا ہو۔ جب تک آفتاب کا مکمل بیان سامنے نہیں آجاتا، یقیناً سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ شبانہ بہر حال کوئی اچھی لڑکی نہیں تھی۔ کسی بھی قسم کے لالچ میں وہ آفتاب کی بات مان سکتی تھی۔“ رندھاوا رک کر سوچتا ہوا بولا۔

”اس کے بعد آفتاب دوسرے اپارٹمنٹ کی بالکونی سے تمہارے اپارٹمنٹ میں پہنچا۔ شبانہ کو چاقو سے ہلاک کرنے کے بعد اس نے تمہارا ہاتھ اس چاقو کے دسے پر جھپٹا ہوا۔ تم اس وقت مدہوش تھے اس لیے تمہیں کچھ معلوم نہیں ہو سکا ہوگا۔ اس طرح آفتاب نے ایک تیر سے دو شکار کھیلے۔ شبانہ سے اپنی جان چھڑائی اور تمہیں اس کے قتل میں پھنسا دیا۔ اب تم غالباً یہ اعتراض کر سکتے ہو کہ دوسرے اپارٹمنٹ کی چابی اس نے پہلے سے کیوں بنوائی تھی؟“

”ہاں یہ سوال تو پیدا ہوتا ہے۔“

”مجھے پھر کہنا پڑے گا کہ آفتاب کا بیان سامنے آئے گا، تبھی ہر بات کی وضاحت ہوگی۔ نی الحال تو میں اس معاملے میں بھی قیاس ہی کر سکتا ہوں۔ شاید اس نے تمہارے اپارٹمنٹ میں کس کر خود ہی تمہیں قتل کرنے کا منصوبہ بنایا ہو۔ بعد میں جب اسے تمہارے نشے کی بات معلوم ہوئی تو اس نے دوسرا کھیل، کھیل ڈالا۔“

بختیار اپنی پیشانی مسلتے لگا۔

”اب جمال کا ایک پیغام بھی سن لو۔“ رندھاوا نے کہا۔

”میرے ذریعے یہ پیغام تمہارے لیے ہے۔“

”تم نے کہا تھا کہ وہ بھی مجھ سے ملے آئے گا۔“
”ابھی وہ آفتاب کے سلسلے میں بہت مصروف ہے۔ ایک آدھ دن بعد ملے گا تم سے انی الحال تمہارے لیے اس کا پیغام یہ ہے کہ تم خود کو گرفتاری کے لیے پولیس کے سامنے پیش کر دو۔“

”کیوں؟“ بختیار تیزی سے بولا۔

”اب تو اصل قاتل پکڑا جا چکا ہے۔“

”تم ایک مفروضہ قیدی اب بھی ہو۔ تمہارے بری ہونے کا فیصلہ تو عدالت ہی کرے گی لیکن تمہیں اس سلسلے

میں کوئی دلچسپی نہیں لی اور کہا۔ ”میں تو یہ پوچھ رہا ہوں کہ یہ اس نے آخر کس طرح کیا۔“

”وہی بتا رہا ہوں۔ ایک بات تم کو یہ بھی بتا دوں کہ میں شراب پیتا تو ہوں لیکن خود بھی نہیں خریدتا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ مجھے کسی شراب فروش کے ساتھ دیکھا جائے۔ میں پیتا بھی کم ہوں، یہ تم جانتے ہو۔ میں نے آفتاب سے کہہ دیا تھا کہ وہ مجھے دس دن میں ایک بوتل مہیا کر دیا کرے۔ میں اسے ادا بھی کر دیا کرتا تھا۔ دراصل آفتاب سے میری پہلی ملاقات ایک محفل میں ہوئی تھی جہاں وہ شراب پی رہا تھا۔ میرے اور تمہارے تعلقات اس کے علم میں تھے اس لیے اس نے مجھ سے نہایت عاجزانہ درخواست کی تھی کہ بھائی کو نہ بتانا۔“

بختیار نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”گھر والوں کو اس کی ایک حرکت کا علم ہے۔“

”نہ نہ کہو۔“ رندھاوا نے کہا۔ ”وہ تو کنور ثقلین کے لیے بھی کام کرتا تھا۔“

بختیار حیرت زدہ رہ گیا۔

رندھاوا نے بات جاری رکھی۔ ”لیکن شبانہ کے معاملے میں شاید کنور ثقلین کا کوئی ہاتھ نہ ہو۔ دراصل سارے معاملات کلی طور پر ابھی جمال کے علم میں بھی نہیں ہیں۔ آفتاب سے پوچھ کچھ کی جا رہی ہوگی۔ سارا معاملہ وضاحت کے ساتھ اسی وقت سامنے آئے گا۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ تمہارے لیے میں نے جو شراب مہیا کی تھی، وہ بھی آفتاب ہی سے لی تھی اور چونکہ تم نے زیادہ شراب کی بات کی تھی، اس کی وجہ سے آفتاب کو تعجب ہوا تھا۔ اس نے مجھے ٹوٹنے کے لیے تمہارا ذکر کیا تھا کہ تم فروزاں کے چلے جانے سے بہت ڈسٹرب ہو گے۔ میں نہیں جانتا کہ فروزاں کی بات اسے کیسے معلوم ہو گئی تھی۔ یہ ممکن ہے کہ فروزاں نے فون پر ثقلین کو بتایا ہو اور ثقلین سے آفتاب کو معلوم ہو گیا ہو۔ بہر حال اس نے مجھے باتوں میں ایسا گھیرا کہ میں اسے بتا بیٹھا کہ وہ شراب میں تمہارے لیے ہی لے رہا ہوں۔“

بختیار مستفسر اندہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ رندھاوا کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ”تم نے بتایا تھا نا کہ شبانہ کی آمد سے پہلے تمہارے پاس کسی کی کال آئی تھی لیکن دوسری طرف سے کوئی بولا نہیں تھا۔“

”ہاں۔“
”میرا خیال ہے کہ آفتاب ہی نے شبانہ سے وہ کال کروائی ہوگی۔ اس نے تمہاری آواز سے اندازہ لگایا ہوگا

طرح کر ہی لیتا لیکن آفتاب نے خود ہی اسے یہ موقع فراہم کر دیا۔ اس نے آج اپنی کار ایک غلط جگہ پارک کر دی تھی۔ پولیس والوں نے اسے لٹھر میں اٹھا کے پولیس اسٹیشن پہنچا دیا تھا۔ جمال کے آدی آفتاب کی نگرانی کر رہے تھے۔ انہوں نے اس کی اطلاع جمال کو دی۔ جمال فوراً پولیس اسٹیشن پہنچ گیا۔ آفتاب پولیس والوں کو کچھ دے دلا کے کار واپس لے آتا لیکن جمال نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ آفتاب نے اپنے ایک شاسا مجسٹریٹ تک دوڑ لگائی کہ اس کے ذریعے سے اپنی کار چھڑا لے۔ جمال نے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی کیونکہ اس دوران میں وہ اپنا کام کر چکا تھا۔ اس نے اپنے محکمے کے منکر پرنٹ سیکشن کے لوگوں کو بلوا کر ان سے کار کے اندر پائے جانے والے تمام نشانات کے پرنٹس بنوا لیے تھے۔ آفتاب اپنی کار لینے کے بعد کہیں چلا گیا تھا۔ دوسری طرف جمال نے ان پرنٹس کے ساتھ بالکونی میں ملنے والے پرنٹس محکمے کے متعلقہ افسر کو دیے۔ اس نے تصدیق کر دی کہ وہ ایک ہی آدی کے ہاتھ اور انگلیوں کے نشانات تھے۔ اس کے بعد جمال نے آفتاب کو گرفتار کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ میں جب تمہیں یہاں چھوڑ کر گیا تھا، اس کے آدھے گھنٹے بعد آفتاب کو اس وقت گرفتار کر لیا گیا جب وہ کار میں اسی طرف..... میرا مطلب ہے تمہارے اسی گھر کی طرف آ رہا تھا۔“

”اسے خالہ نے فون کیا تھا کہ ایک ضروری کام ہے لہذا وہ فوراً گھر آئے۔“ حشکر بختیار نے کہا۔ ”خالہ بہت خوش تھیں، وہ چاہتی تھیں کہ خالو اور آفتاب فوراً جان لیں کہ میں گھر آ گیا ہوں۔“

”یہ بہت اچھا ہوا کہ آفتاب اس وقت گرفتار ہو گیا ورنہ وہ یہاں آ کر تم سے ملنے کے بعد کسی نہ کسی طرح پولیس کو اطلاع بھجوا دیتا کہ جیل سے فرار ہونے والا بختیار اپنے گھر پہنچ گیا ہے۔“

”آخر اس نے مجھ سے کس بات کی دشمنی نکالی۔“
بختیار کی آواز بھرا گئی۔

”میرا خیال ہے کہ وہ خالو کی وراثت میں اکیلا حصے دار بننا چاہتا ہوگا۔ اس نے ایک طرف تو شبانہ سے نجات حاصل کی اور دوسری طرف تمہیں اس قتل میں پھنسا دیا۔“
”لیکن یہ اس نے آخر کس طرح کیا؟“

”اب میں تمہیں ایک بات بتاؤں۔“ رندھاوا نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”آفتاب سے واقفیت میری بھی تھی۔“
”کیا؟“ بختیار حیرت سے بولا۔ مگر اس نے اس بات

طرف سے کچھ کہا نہیں گیا۔

”کیسی ہو فروزاں؟“ بختیار کا مخصوص جملہ اس کی زبان پر آ گیا۔

”ٹھیک ہوں۔“ فروزاں کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”اور بہت شرمندہ ہوں تم سے۔۔۔ فون پر تمہیں جانے کیا کیا کہہ ڈالا تھا۔“

”بھول جاؤ وہ سب!“ بختیار نے کہا۔ پھر پوچھا۔ ”ڈیڈی کہاں ہیں؟“

”ظاہر ہے کہ وہ ابھی آفس ہی میں ہوں گے۔“ اس وقت چار بجے تھے۔

بختیار نے کہا۔ ”اچھا میں تم سے ملنے آ رہا ہوں۔“

”کیا؟“ فروزاں چونکی۔ ”تم جہاں بھی جیسے ہوئے ہو وہاں سے نکلتے ہوئے تمہیں پولیس کا ڈرنس لگے گا؟“

”اب ڈرنے کا جواز ختم ہو چکا ہے۔ ابھی ابھی میری ضمانت ہو چکی ہے اور وہ اس لیے کہ وہ شخص گرفتار کیا جا چکا ہے جس نے واقعی شبانہ قتل کیا تھا۔“

”کیا۔۔۔ کیا کہہ رہے ہو تم!“ فروزاں حیرت زدہ تھی۔

”کل کے اخبارات سے تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا اور شاید کسی نیوز چینل پر بھی یہ خبر آ جائے۔“

”اگر یہ خبر سچی ہے تو میں خوشی کا اظہار کروں گی۔“

”میں تم سے ملنے آ رہا ہوں۔“

”اب کیا ضروری رہ گیا ہے ملنا!“ فروزاں کے لہجے میں افسردگی تھی۔ اس کے ذہن میں اب بھی یہی تھا کہ اسے طلاق ہو چکی ہے۔

بختیار نے فون پر کوئی بحث چھیڑنے کے بجائے کہا۔

”ہم دوستوں کی حیثیت سے تول سکتے ہیں۔“

”اگر تم اصرار کر رہے ہو تو میں کہیں آ جاتی ہوں۔ تم مت آؤ۔“ فروزاں کے دماغ میں جو خیال جم گیا تھا، وہ بس جم گیا تھا۔

بختیار نے ضد نہیں کی اور ایک لائبریری کا نام بتایا جہاں ملاقات کی جاسکتی تھی۔

اس پبلک لائبریری کا خیال بختیار کو کسی وجہ سے آ گیا تھا۔ اس نے رندھاوا کا موبائل اسے واپس کرنا چاہا لیکن اس نے نہیں لیا۔

”تمہیں جلدی ہے، تم جاؤ اور یہ لے جاؤ۔“ رندھاوا نے مسکرا کر کہا۔ ”میں خرید لوں گا دوسرا موبائل۔۔۔! ہاں ایک بات کا خیال رکھنا۔ اپنی پہلی فرصت میں اس کی سم بدلو لیتا اور اسے اپنے نام سے ایکٹی ویٹ کروانا۔“

بختیار جیسے سے انداز میں مسکرا دیا۔ وہ اس وقت متضاد کیفیات میں ڈوبا ہوا تھا۔ ایک طرف اسے اپنی خواب جیسی رہائی اور فروزاں سے ملنے کی خوشی تھی تو دوسری طرف یہ رنج کہ اس کے خالہ زاد بھائی آفتاب کا ایک گھناؤنا رد آپ اس کے سامنے آیا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد وہ اور فروزاں لائبریری میں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے تھے۔ فروزاں کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ لائبریری کی لمبی میز کے گرد اس وقت چھ سات سے زیادہ افراد نہیں تھے جبکہ کرسیاں چالیس کے قریب تھیں۔

بختیار نے فروزاں کو ان حالات سے آگاہ کرنا شروع کیا جن سے وہ دوچار ہوا تھا۔ اس کے بعد اس نے آفتاب کے بارے میں وہ ساری باتیں بتائیں جو اسے رندھاوا سے معلوم ہوئی تھیں۔

فروزاں نے سب کچھ خاموشی سے سنا پھر وہ بختیار کے خاموش ہونے کے بعد ذرا سارک کر دھیمی آواز میں بولی۔

”دنیا میں اب یہی ہو رہا ہے۔ اتنے قریب کے لوگوں کا خون بھی سفید ہو چکا ہے۔“

”کیا اب گھر چلیں؟“ بختیار نے ایک بار پھر وہ موضوع چھیڑنے کی کوشش کی جو اسے بہر حال چھیڑنا تھا۔

”میری بات کا تعین کرو اس طرح تمہیں طلاق نہیں ہوتی ہے۔“ بختیار نے زور دے کر کہا۔ ”اگر میں نے تمہیں خاموش کرانے کی خاطر ایسا جملہ کہہ دیا تھا تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہمارے درمیان میاں بیوی کا رشتہ ختم ہو جائے گا۔“

”نہ جانے تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ کیا میں زمانے کے رواج سے واقف نہیں؟“

”فقط رواج پڑ گیا ہے اور میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، اسے ثابت بھی کر سکتا ہوں۔“

”نہیں کر سکتے۔“ فروزاں نے پیکل سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

بختیار اپنی کرسی سے اٹھا اور دو مختلف الماریوں سے تین کتابیں لا کے فروزاں کے سامنے کھولیں۔ ان میں سے دو صفحات کھولے جو طلاق کے حوالے سے تھے۔ وہ اس نے فروزاں کے سامنے رکھے۔

”ان تینوں کتابوں کے یہ صفحات پڑھ لو۔ تم مانو یا نہ مانو لیکن قیسری کتاب ایک بہت بڑے عالم کی ہے۔“

فروزاں کے چہرے پر ابھرنے کے تاثرات تھے۔ اس کا دماغ بھی الجھا ہوا ہو گا جب وہ ان کتابوں کے صفحات

پڑھ رہی تھی۔

صفحات پڑھنے کے بعد وہ ہکلائی۔ ”یہ تو۔۔۔ یہ تو۔۔۔“

”یہ ثبوت ہے تا میری بات کا۔“ بختیار بولا۔ ”اور اگر تم اسے بھی نہ مانو تو میں ایک ایسی کتاب بھی تمہارے سامنے رکھ سکتا ہوں جس سے بڑی کتاب دنیا میں کوئی نہیں۔“

”ضرورت نہیں اس کی۔“ فروزاں نے کہا لیکن وہ پریشان نظر آ رہی تھی۔ وہ بولی۔ ”کیا ڈیڈی ان کتابوں سے مطمئن ہو سکیں گے۔“

”وہ پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ کشادہ ذہن رکھتے ہیں۔ یہ کتابیں ہی انہیں قائل کر دیں گی۔ یہاں تو نو اسٹیٹ کا بندوبست ہے لیکن ڈیڈی کو دکھانے کے لیے میں یہ کتابیں بازار سے خرید لوں گا۔“

”تو کیا گھر چلیں۔“ فروزاں پہلی مرتبہ کسی قدر خوشی سے مسکرائی۔ ”ڈیڈی اب کچھ دیر میں گھر پہنچنے ہی والے ہوں گے۔“

جواب میں بختیار کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا تھا کہ موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ بختیار نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف رندھاوا تھا۔

”تم لائبریری ہی میں ہو؟“ اس نے تیزی سے پوچھا۔

”ہاں۔ کیوں؟“

”وہاں ٹی وی تو نہیں ہو گا۔“

”کم از کم میں نے تو لائبریریوں میں ٹی وی نہیں دیکھا۔“

”تو پھر تم نے خبریں بھی نہیں سنی ہوں گی۔“

”کوئی خاص خبر؟“ بختیار نے جلدی سے پوچھا۔

”کنور ٹھکین کے حوالے سے ایک اور بات سامنے آئی ہے۔ میں کل رات ہی تمہیں کچھ باتیں تو بتانے والا تھا لیکن ٹی وی کی بریکنگ نیوز آنے کی وجہ سے میری بات مکمل نہیں ہو سکی تھی۔“

”اب کچھ بتاؤ گے بھی!“ بختیار تھوڑا سا جھنجھلایا۔

”یہ تو میں کل رات ہی بتا دیتا کہ کنور ٹھکین ایک ہوس پرست شخص تھا۔“

”اس بارے میں کچھ بات پہلے بھی ہو چکی ہے۔“

”کل رات یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ جو لڑکیاں تعلقات کی بنا پر اس کے ہاتھ نہیں لگتی تھیں، انہیں وہ اغوا کر دیا لیتا تھا اور جب اس کی ہوس پوری ہو جاتی تھی تو وہ ان لڑکیوں کو قتل کر کے ان کی لاشیں غائب کر دیتا تھا۔ کل رات بھی اس کی ہدایت پر اس کے آدمیوں نے ایک نوجوانی بستی سے ایک لڑکی کو اغوا کر کے اسے ایک ایسے جھگے میں پہنچایا تھا جو کنور

ٹھکین اپنی عیاشی کے لیے استعمال کرتا تھا۔ پولیس اس کے کئی ٹھکانوں پر ریڈ کر چکی ہے۔ اس جھگے سے وہ لڑکی بھی برآمد کر لی گئی ہے جسے ٹھکین آباد سے اغوا کیا گیا تھا۔ پولیس نے اس کا میڈیکل کروایا تو معلوم ہوا کہ وہ لڑکی داغ دار ہے لیکن اس نے یہ بتانے سے صاف انکار کر دیا کہ اسے داغدار کس نے کیا تھا۔ وہ اس معاملے میں کنور ٹھکین یا اس کے کسی آدمی کو بھی ذمے دار قرار نہیں دے رہی ہے۔ جس وقت کنور ٹھکین کو گولی ماری گئی ہے، لڑکی کو اس سے آدھے گھنٹے پہلے اغوا کیا گیا تھا۔ مجھے اس لڑکی کے اغوا کے بارے میں تو معلوم ہو چکا تھا لیکن یہ بات ٹی وی پر ابھی آئی ہے کہ اس لڑکی کا نام پروین ہے اور اس کی ماں کا نام آسیہ تھا۔“

”اوہ گاڈ!“ بختیار نے ایک ہاتھ سے اپنا سر تھام لیا۔

فروزاں ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

رندھاوا کہہ رہا تھا۔ ”تم نے جس گھر میں پناہ لی تھی، اس گھر کی مالکہ کا نام خالہ آسیہ اور لڑکی کا نام پروین بتایا تھا؟“

”ہاں۔“ بختیار کی آواز گھٹی گھٹی سی تھی۔

”پروین کے اغوا ہونے سے خالہ آسیہ پر دل کا دورہ پڑ گیا تھا۔ اسے اسپتال لایا گیا لیکن وہ بچ نہیں سکی۔ آج پروین اس کی لاش لے کر اپنے گھر روانہ ہو گئی ہے۔ پولیس تو چاہتی تھی کہ اسے دارالامان بھیج دیا جائے لیکن وہ بعد ہے کہ اپنے گھر میں رہے گی کیونکہ اسے کسی کا اظہار کرنا ہے۔“

بختیار کے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ اسے یاد آ گیا۔ پروین نے اسے روانہ کرتے وقت کہا تھا۔ ”آئیے گا ضرور آپ مجھے یاد رہیں گے۔ میں اظہار کروں گی۔“

”کیا یہ وہی پروین ہو سکتی ہے؟“ رندھاوا کی آواز بختیار کو کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔

بختیار موبائل بند کرتے ہوئے ایک جھگے سے کھڑا ہو گیا۔

”تم اپنی گاڑی پر آئی ہو؟“ اس نے فروزاں سے پوچھا۔

”ہاں، کیوں؟“ فروزاں ابھی کھڑی ہو گئی۔

”مجھے فوراً کہیں جانا ہے، اور میرے پاس گاڑی بھی نہیں ہے۔“

”تو چلو۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔“

بختیار جیڑی سے مڑا۔ فروزاں اس کے پیچھے چلی۔

بختیار اس وقت یہ بھی بھول گیا تھا کہ جو کتابیں اس نے نکالی تھیں، وہ اسے واپس بھی رکھنا چاہیے تھیں۔ اسی لیے لائبریرین اسے ناگوار انداز میں دیکھتا رہ گیا تھا۔

”گاڑی میں چلاؤں گا۔“ بختیار نے فروزاں سے

چابی لیے ہوئے کہا۔

فروزاں نے خاموشی سے چابی اسے دے دی اور ڈرائیونگ سیٹ کے برابر میں بیٹھ گئی۔

بختیار نے انجن اسٹارٹ کیا اور گاڑی تیزی سے دوڑا دی۔
”احتیاط ہے۔“ فروزاں بولی۔

لیکن بختیار نے اس کی بات پر دھیان نہیں دیا۔
”تم پر اتنا جنون کیوں سوار ہو گیا ہے بختیار؟“

فروزاں پھر بولی۔ ”کیا بات معلوم ہوئی ہے تمہیں؟“
”بات۔“ بختیار کے ہونٹ کانپ گئے۔ ”قیامت

کی بات معلوم ہوئی ہے۔“
”کچھ بتاؤ تو؟“

بختیار لائبریری میں فروزاں کو بتا چکا تھا کہ جیل سے فرار ہونے کے بعد اس نے نواحی بستی کے جس مکان میں

پناہ لی تھی، اس میں پروین اور اس کی بوڑھی ماں رہتی تھیں۔۔۔۔۔ اب اس نے فروزاں کو یہ بھی بتایا کہ رندھا دا سے

اسے کیا اطلاع ملی تھی۔
”مگر۔۔۔۔۔“ فروزاں بولی۔ ”تم کہہ رہے تھے کہ وہ

بہت معصوم لڑکی تھی۔ آخر وہ داغدار کیسے ہو گئی؟“
”یقیناً کسی نے اس پر جبر کیا ہوگا۔“ بختیار نے غصے

سے کہا۔ ”اس نے پولیس کو کچھ نہیں بتایا لیکن میں اس سے پوچھ کر رہوں گا۔ میرا خیال ہے وہ مجھے بتانے سے ہچکچائے

گی بھی نہیں۔ وہ مجھے بہت اچھا آدمی سمجھنے لگی تھی۔ شاید وہ مجھے بتا بھی دیتی لیکن غالباً تذبذب کا شکار رہی۔ اسی لیے

اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں دوبارہ ضرور آؤں۔ اس نے سوچا ہوگا کہ اس دوران میں وہ مجھے حقیقت بتانے کی ہمت

کرنے لے گی۔“
”اس نے بتا بھی دیا تو تم کیا کر سکو گے؟“

”میں اس معصوم لڑکی کی خاطر وہ سب کچھ کر گزروں گا جو کر سکوں گا جس نے بھی اس پر جبر کیا ہے، میں اسے ہر قیمت

پر مجبور کروں گا کہ اب وہ اس سے شادی بھی کرے۔“
فروزاں چپ ہو گئی۔

کار تیز رفتاری سے دوڑتی رہی۔ بختیار کو عقلیں آباد کا راستہ معلوم نہیں تھا اور بس میں وہاں سے آتے وقت بھی وہ

راستوں کا دھیان نہیں رکھ سکا تھا لیکن دو ایک لوگوں سے پوچھتے ہوئے وہ عقلیں آباد پہنچ گیا۔

اگرچہ وہ مگلی تنگ تھی لیکن بختیار کسی نہ کسی طرح کار آسیہ خاں کے گھر کے قریب تک لے جانے میں کامیاب

رہا۔ عین گھر کے سامنے وہ اس لیے نہیں پہنچ سکا کہ وہاں

پائس پڑوس کے بہت سے لوگ موجود تھے۔

کار سے اتر کر لوگوں سے پوچھا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ لوگ آسیہ خاں کو دفن کر کے ابھی واپس لوٹے تھے۔

”پروین کہاں ہے؟“ بختیار نے کسی سے پوچھا۔
”آپ کون ہیں؟“ بختیار کو گھر سے ہر تنگ دیکھا گیا۔

”آپ بس ایک احسان کیجیے مجھے پرا“ بختیار نے اپنی جھجلاہٹ دباتے ہوئے کہا۔ ”کسی طرح پروین تک یہ

بات پہنچا دیجیے کہ بختیار آیا ہے۔“
وہ آدمی بختیار کے لہجے سے مرعوب ہو کر بولا۔ ”میں

ابھی کچھ کرتا ہوں۔“
ذرا دیر بعد ہی بختیار اور فروزاں، پروین کے سامنے تھے۔

گھر میں عورتیں بھی جمع تھیں لیکن پروین نے اس کمرے سے تمام عورتوں کو باہر نکال دیا تھا۔ وہ پلنگ پر

اجڑی اجڑی سی بیٹھی تھی۔ بکھرے ہوئے بالوں اور آنسوؤں میں ڈوبا ہوا چہرہ، وہ خالی خالی نظروں سے بختیار

اور فروزاں کو دیکھنے لگی۔
”مجھے نی دی سے سب کچھ معلوم ہو گیا ہے

پروین!“ بختیار نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”مجھے بتاؤ، وہ کون ہے جس نے تمہارے ساتھ زیادتی کی تھی۔

میں اسے پاتال سے بھی نکال لاؤں گا۔“
”آپ کو یاد نہیں صاحب!“ پروین رو دینے والے

انداز میں بولی۔ ”جب یہاں آپ بیمار پڑے تھے۔ آپ پر مدد ہوشی طاری ہو گئی تھی۔ کچھ ہوش نہیں رہا تھا آپ کو۔۔۔۔۔!

آپ نے کسی فروزاں کو تصور میں دیکھا اور اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ وہ فروزاں نہیں تھی صاحب! وہ میں

تھی۔“ پروین کی نظریں جھک گئیں اور آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپک گئے۔ ”میں بہت مگلی تھی صاحب!“ وہ کانپتی آواز

میں بولی۔ ”مگر آپ نے مجھے نہیں چھوڑا اور۔۔۔۔۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

بختیار پتھر کے جسے کی طرح کھڑا رہ گیا۔ اسے وہ سب کچھ یاد آ گیا تھا جسے اس نے اپنا خواب سمجھا تھا۔ اس کے ساتھ

کھڑی ہوئی فروزاں کے چہرے کا رنگ بدل چکا تھا۔
لیکن معصوم پروین کی بربادی کا ادا ہو گیا۔ کچھ ہی

دن بعد اس کے نام ”پروین“ کے ساتھ ”بختیار“ کا اضافہ ہو گیا۔ پروین بختیار!

اور بختیار کی زندگی کا یہ آخری مرحلہ فروزاں کی خواہش سے طے پایا تھا۔

